میکسم گورکی

ماں

ناول دو حصوں میں

حصہ اول

1

کارخانے کی سیٹی روز مزدوروں کی بستی کے اوپر کی چکنی اور کثیف فضا میں تھرتھراتی ہوئی چیختی اور اس بلاوے کی تعمیل میں اداس اور بیزار انسان، توانائی بخش نیند سے قبل از وقت ہی بیدار ہو کر اپنے چھوٹے چھوٹے مٹیالے مکانوں سے خوفزدہ حشرات الارض کی طرح نکل پڑتے۔ وہ سرد تاریک فضا میں کچی سڑک پر اس کارخانے کی اونچی پتھریلی کوٹھڑیوں کی طرف چل کھڑے ہوتے جو ایک سرد مہر اور خشک خود اعتمادی کے ساتھ ان کا انتظار کرتا ہے رہتا تھا، اور جو اپنی درجنوں مربع، روغنی آنکھوں سے سڑک کو روشن کرتا تھا۔ کیچڑ ان کے پیروں کے نیچے چپچپاتا۔ وہ بھاری اور نیند سے بوجھل آوازوں میں چلاتے اور اپنی گندی گالیوں کے شور سے فضا کو چیر دیتے تھے، اور اسی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے کانوں میں دوسری آوازیں بھی آتیں: مشینوں کی بھدی بھنبھناہٹ اور بھاپ کی سنسناہٹ۔ لمبی سیاہ چمنیاں موٹے لٹھوں کی طرح بستی پر ڈراؤنے انداز میں جھکی ہوئی رہتیں۔

شام کے وقت جب غروب ہوتا ہوا سورج مکانوں کی کھڑکیوں میں تھکے تھکے سایے دیکھتا تھا تو کارخانہ لوگوں کو اپنے پتھریلے خانوں سے اگل دیتا جیسے وہ محض میل کچیل ہوں اور وہ لوگ ایک بار پھر سڑکوں پر نکل آتے۔ تیل میں ڈوبے ہوئے اور چپچپاتے ہوئے سایہ چہرے لئے ہوئے، ان کے بھوکے

دانت چمکتے ہوئے ہوتے تھے اوران کے جسموں میں سے مشین کے تیل کی چکٹی ہوئی بو نکلتی ہوئی۔اب ان کی آوازیں زیادہ کراری اور پرجوش بلکہ پرمسرت بھی ہو جاتی تھیں۔ایک دن کا کام اورختم ہوگیا۔گھر پر کھانااورآرام ان کے انتظار میں ہوں گے۔

دن کارخانے نے نگل لیا،جس کی مشینوں نے اپنی حسب ضرورت مزدوروں کی محنت نچوڑ لی تھی۔ دن ایک ذرا سا نشان تک چھوڑے بغیر ختم ہوگیا اورانسان اپنی قبر کی طرف ایک قدم اورآگے بڑھ گیا۔ لیکن اب وہ آرام کی اوردھوئیں سے گھٹے ہوئے شراب خانے کی تفریحات کا پرامید انتظار کررہا تھا،اور وہ مطمئن تھا۔

اتوارکواوردوسرے چھٹی کے دنوں میں لوگ دس بجے تک سوتے رہتے اور پھر باعزت شادی شدہ لوگ اپنے بہترین کپڑے پہن کرعبادت کے لئے جاتے اورنوجوانوں کوان کی مذہب سے بےتعلقی کے لئےلعن کرتے۔عبادت کے بعدوہ گھرآتے،"پیروگی"* کھاتے اورایک بار پھر شام تک کیلئے سوجاتے۔ سالہاسال کی مجتمع تھکن نے ان کی بھوک اڑادی تھی اس لئے وہ شراب نوشی سے بھوک کوتیز کرنے کی کوشش کرتے اورووڈکا ☆ کے تیز ڈنک سے اپنے معدوں میں ہیجان پیدا کرتے تھے۔

* پیروگی۔ایک قسم کاروسی سموسہ جس کے اندرگوشت،ترکاری یاجام بھرا ہوا ہوتا ہے۔(مترجم)۔

شام کووہ سڑکوں پرہواخوری کے لئے نکلتے۔جن کے پاس ربر کے جوتے تھے وہ وہی پہنتے چاہے زمین خشک ہو،اورجن کے پاس چھتریاں تھیں وہ چھتریاں ساتھ لے کر چلتے،خواہ موسم خوشگوارہی کیوں نہ ہو۔

اپنے دوستوں سے ملنے پر وہ ہمیشہ کارخانے اورمشینوں کی باتیں اوراپنے فرومین کا تذکرہ کیا کرتے تھے اورایسی کسی چیز کے متعلق کبھی بات چیت نہیں کرتے تھے جس کاتعلق ان کے کام سے نہ ہو۔ شاذونادر مذبذب اوردھندلے خیالات کی منتشر چنگاریاں ان کی زندگی کی بےکیف وبےرنگ یکسانیت میں ٹمٹماتی تھیں۔جب مرد گھر واپس آتے تو اپنی بیویوں سے لڑتے جھگڑتے اوراکثرانہیں مارتے پیٹتے بھی تھے۔نوجوان لوگ شراب خانے یااپنے دوستوں کے یہاں چلے جاتے جہاں وہ اکارڈین بجاتے،

غلیظ بھدے گانے گاتے، ناچتے، گالیاں بکتے اور بدمست ہو جاتے تھے۔ وہ سخت محنت کی وجہ سے تھک کر چور تو ہوتے ہی تھے اور اسی لئے ان پر فوراً نشہ طاری ہو جاتا تھا اور ایک عجیب نا قابل فہم سی کوفت اور جھلاہٹ ان کے سینوں میں خلش پیدا کرتی اور باہر نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے لگتی تھی۔ اسی لئے وہ اپنے احساسات کو تسکین دینے کا معمولی سے معمولی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے، اور ذرا سے اشتعال پر ایک دوسرے پر وحشیانہ غصہ کے ساتھ جھپٹ پڑتے۔ نتیجہ کے طور پر خوں ریزی ہوتی، بعض اوقات یہ لڑائیاں شدید چوٹوں اور زخموں پر ختم ہوتیں اور گاہے گاہے قتل پر۔

☆ وودکا۔ ایک روسی شراب جو بہت تیز ہوتی ہے۔ (مترجم۔)

ان کے باہمی تعلقات پر دبے دبے بغض و عناد کا احساس غالب رہتا تھا اور یہ احساس اتنا ہی پرانا تھا جتنی ان کے عضلات کی نا قابل علاج تھکن۔ لوگ روح کا یہ روگ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتے اور یہ روگ تاریک سائے کی طرح وہ مرتے دم تک ان کے ساتھ ساتھ رہتا اور ان سے ایسی حرکتیں سرزد کراتا جو اپنی احمقانہ بے رحمی کی وجہ سے سخت قابل نفرت معلوم ہوتی تھیں۔

اتوار کے دن نوجوان رات کو دیر سے گھر آتے۔ کپڑے پھٹے ہوئے، سر سے پاؤں تک خاک دھول میں اٹے اور کیچڑ میں بھرے ہوئے، آنکھیں سوجی ہوئی، ناک سے خون بہتا ہوا۔ کبھی وہ معاندانہ انداز میں شیخی بگھارتے آتے تھے کہ دوستوں کو کیسا مزہ آتے تھے۔ وہ نشہ میں دھت اور قابل رحم، افسوس ناک اور قابل نفرت ہوتے تھے۔ اکثر و بیشتر ماں باپ اپنے بیٹوں کو کسی دیوار کے سایہ میں یا کسی شراب خانے کے فرش پر شراب کے نشے میں بے ہوش پڑا پاتے تھے۔ اس پر بزرگ انہیں بہت برے الفاظ میں کوس دیتے، ان کے کثرت شراب نوشی سے کمزور شدہ جسموں کی اچھی طرح مرمت کرتے اور ایک طرح کی فکرمندی کے ساتھ ان کو بستروں پر لٹا دیتے تھے۔ لیکن یہ صرف صبح تک کے لئے ہوتا تھا، کیونکہ جب کارخانے کی سیٹی کی چیخ صبح کاذب کے سینے کو ایک سیاہ دھارے کی طرح چیرتی ہوئی اندر گھس آتی تھی تو وہ فوراً ہی جگا دئے جاتے تھے۔

وہ لوگ یوں تو اپنے بچوں کو بے دردی سے مارتے اور گالیاں دیتے تھے لیکن نوجوان کی لڑائی اور شراب خواری کو ایک امر کی طرح تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جب باپ جوان تھے تو وہ بھی لڑتے اور بدمست ہو جاتے تھے اور ان کے ماں باپ بھی اسی طرح انہیں مارتے پیٹتے تھے۔ زندگی کا ہمیشہ یہی رنگ رہا تھا۔ وہ

سالہا سال سے اسی طرح ایک گدلے دھارے کی شکل میں بہہ رہی تھی، آہستگی اور یکسانیت کے ساتھ۔ اور روز روز وہی ایک سی، غیر متنوع باتیں سوچنے اور کرنے کی عادت، جس کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط تھیں، سب چیزوں مضبوطی سے ایک جگہ باندھے ہوئے تھی اور کسی میں ذرہ برابر خواہش بھی نہیں تھی کہ کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔

کبھی کبھی دوسرے علاقوں سے نئے لوگ کارخانے کی بستی میں رہنے کے لئے آجاتے تھے۔ شروع شروع میں تو وہ محض اپنے نووارد ہونے کی وجہ سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے تھے اور پھر ان میں ایک سطحی سے دلچسپی ان دوسری جگہوں کے قصوں کے سبب سے بھی قائم رہتی تھی جہاں وہ کام کر چکے تھے۔ لیکن یہ نیا پن جلد ہی ختم ہی ہو جاتا، لوگ ان کے عادی ہو جاتے ان کی طرف توجہ کرنا ختم کر دیتے تھے۔ نووارد جو کچھ بھی بتاتے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی کہ محنت کشوں کی زندگی ہر جگہ یکساں ہی ہے، اور اگر یہ بات سچ تھی تو پھر باتیں کرنے کو رہ ہی کیا جاتا ہے؟

لیکن نوواردوں میں سے کچھ لوگ ایسی چیزوں کے بارے میں بھی باتیں کرتے جو بستی والوں کے لئے نئی تھیں۔ ان سے کوئی بھی بحث نہ کرتا لیکن ہر شخص ان کی باتوں کو شک وشبہ کے ساتھ سنتا۔ بعض لوگ نوواردوں کی باتوں سے بلاوجہ جھنجھلا جاتے، چند ایک مبہم طور پر کچھ خطرہ محسوس کرنے لگتے اور چند اور لوگوں کو امید کا ایک موہوم سایہ تشویش اور الجھن میں ڈال دیتا تھا اور اسی وجہ سے وہ اور زیادہ شراب پیتے تاکہ ان ناخوشگوار اندیشوں کو دلوں سے نکال باہر کر سکیں جو زندگی کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔

اگر بستی والوں کو کسی نووارد میں کوئی غیر معمولی بات نظر آتی تو وہاں سے عرصہ تک وجہ شکایت بنائے رکھتے اور وہ ہر اس شخص کی طرف سے محتاط اور چوکنا رہتے تھے جو ان سے مختلف ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں یہ خطرہ ہو کہ یہ شخص ان کی زندگیوں کی اداس اور یکساں باقاعدگی کو درہم برہم کر دے گا اور ان کی زندگیاں گو کٹھن تھیں مگر کم سے کم پرسکون اور خاموش تو تھیں۔ لوگ اس بات کے عادی ہو گئے تھے کہ زندگی ہمیشہ انہیں ایک ہی انداز سے کچلے اور چونکہ انہیں بہتری کی کوئی امید نہیں تھی اس لئے نہیں یقین تھا کہ ہر تبدیلی ان کی مشکلات میں اضافہ ہی کرے گی۔

بستی کے محنت کش خاموشی کے ساتھ ایسے لوگوں سے پہلو بچا جاتے جو نئے خیالات پیش کرتے تھے۔ اس لئے نووارد اکثر وہاں سے چلتے جاتے تھے۔ اگر کبھی شاذ و نادر ایسا ہوتا کہ وہ وہیں کام کرنے لگیں

تو پھر وہ یا تو رفتہ رفتہ اپنے دوسرے ساتھوں کی طرح ہو جاتے یا ان سے الگ تھلگ زندگی گذارنے لگتے...

ایسی زندگی کے کم وبیش پچاس گذارنے کے بعد آدمی مرجاتا تھا۔

2

میخائل ولاسوف کی زندگی بھی اسی طرح گزر رہی تھی۔ وہ ایک اکل کھرا، بدمزاج مستری تھا جس کے جسم پر بال ہی بال تھے اور جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کی گھنی بھوؤں کے نیچے سے شکی پن اور کینہ پرورانہ حقارت کے ساتھ چمکتی تھیں۔ وہ کارخانے کا سب سے اچھا مستری اور بستی کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی تھا لیکن اپنے بالا دستوں کے ساتھ بڑی بدمزاجی سے پیش آتا تھا اور اسی وجہ سے بہت کم پیسہ کماتا تھا، ہر چھٹی کے روز وہ کسی نہ کسی کو مار بیٹھتا تھا اور اسی لئے سب لوگ اس سے خائف رہتے اور اسے ناپسند کرتے تھے۔اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی ہر کوشش اس کے مقابلہ میں ناکام ہو جاتی تھی۔ جب کبھی ولاسوف دیکھتا کہ لوگ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آرہے ہیں تو وہ کوئی بڑا سا پتھر یا لکڑی کا تختہ یا لوہے کی سلاخ اٹھالیتا، دونوں پیر پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اور خاموشی سے دشمن کا انتظار کرتا۔اس کے بالوں بھرے بازو اور اس کا چہرہ جس پر آنکھوں سے لے کر گردن تک گھنی سیاہ ڈاڑھی پھیلی ہوئی تھی، لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھے۔لیکن لوگ خاص طور پر اس کی آنکھوں سے ڈرتے تھے جو چھوٹی اور تیز تھیں اور آدمی کے جسم کو چھیدتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔جس شخص کی نظر بھی اس کی جمی ہوئی نظروں سے لڑ جاتیں اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک وحشیانہ قوت کے روبرو ہے جو ذرہ برابر خوف یا رحم کے بغیر حملہ کرنے کے لئے آمادہ ہے۔

"کتے کے پلے!" وہ ان کی طرف چیخ کر صرف اتنا ہی کہتا۔حقارت کی وجہ سے اس کی آنکھیں پیش قبض کی طرح تیز معلوم ہوتیں۔ پھر وہ سر پیچھے کی طرف جھکائے ان کا تعاقب کرتا اور سرکشی سے چیختا جاتا:

" کیوں، مرنا کون چاہتا ہے؟"

مرنا کوئی بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ کم سخن تھا اور "کتے کا پلا" اس کا پندیدہ فقرہ تھا۔ وہ پولیس والوں اور افسروں اور اپنے کارخانے

کے حکام کے لئے یہی گالی استعمال کرتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو ہمیشہ "کتیا" کہتا تھا۔

"اے کتیا دیکھتی نہیں میرا پتلون پھٹ گیا ہے؟"

جب اس کا بیٹا پاویل چودہ برس کا تھا تو وہ ایک بار اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھانے والا ہی تھا کہ پاویل نے ایک وزنی ہتھوڑا اٹھالیا اور روکھے پن سے کہا:

"یہ کیا؟" اس کے باپ نے اپنے لمبے دبلے پتلے بیٹے کی طرف اس طرح بڑھتے ہوئے پوچھا جیسے ایک بادل کا تاریک سایہ بید کے درخت کی طرف بڑھ رہا ہو۔

"بہت ہو گیا!" پاویل نے کہا۔ "اب میں برداشت نہیں کروں گا..."

اور اس نے ہتھوڑا اوپر اٹھایا۔

اس کے باپ نے اسے ایک نظر دیکھا اور اپنے بالوں والے ہاتھ اپنی پشت کے پیچھے چھپا لئے۔

"اچھی بات ہے..." اس نے مختصر سی ہنسی ہنس کر کہا۔ پھر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا:

"تو ہے کتے کا پلا..."

اس کے کچھ عرصے بعد اس نے اپنی بیوی سے کہا:

"اب مجھ سے پیسے مت مانگنا۔ آج سے تمہیں پاویل کما کر کھلائے گا..."

"اور تم شاید اپنی ساری تنخواہ شراب میں اڑا دو گے؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

"تجھ سے کوئی تعلق نہیں کتیا! اگر ضرورت ہو گی تو ایک عورت بھی کر لوں گا...

اس نے کوئی عورت تو نہ کی لیکن اس وقت سے اپنی موت تک، تقریباً دو سال، اس نے اپنے بیٹے کو ہمیشہ نظر انداز کیا اور اس سے کبھی بات نہیں کی۔

اس کے پاس ایک کتا تھا جو اسی کی طرح لحیم شحیم اور جھبرا تھا اور اس کے ساتھ روز صبح کارخانے تک جاتا اور شام کو پھاٹک پر اس کا انتظار کرتا تھا۔ چھٹی کے دن ولاسوف ایک شراب خانے سے دوسرے شراب خانے تک جانے میں صرف کرتا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پر کسی سے بات نہ کرتا اور لوگوں کے چہروں کو بغور دیکھتا جاتا تھا گویا کسی کا متلاشی ہے۔ اور کتا تمام دن اپنی بڑی جھبری دم گھسیٹتا ہوا اپنے مالک کے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا۔ جب ولاسوف خوب پی پلا کر گھر آتا تو وہ کھانے کے لئے بیٹھ جاتا اور اپنے پیالے سے کتے کو بھی کھلاتا جاتا۔ وہ اسے نہ تو کبھی گالیاں دیتا اور نہ مارتا، لیکن کبھی پیار بھی نہیں کرتا تھا۔ کھانے کے

بعد اگر اس کی بیوی میز صاف کرنے میں ذرا سی بھی دیر کرتی تو وہ سارے برتن زمین پر پھینک دیتا۔ اس کے بعد اپنے سامنے وودکا کی ایک بوتل رکھ لیتا، دیوار سے پیٹھ لگاتا، آنکھیں بند کر لیتا اور منہ پھیلا کر بھیانک آواز میں کوئی اندوہ گیں سا گیت گانا شروع کر دیتا تھا۔ غمناک، بھونڈی آوازیں اس کے گل مچھوں میں پھنس جاتیں اور روٹی کے ٹکڑوں کو وہاں سے اڑا دیتی تھیں۔ مستری اپنی ڈاڑھی اور مونچھوں کو اپنی موٹی انگلیوں سے تھپکتا جاتا اور گاتا جاتا تھا۔ اس کے گانے کے الفاظ مبہم اور منتشر سے ہوتے تھے اور اس کا ترنم سردیوں میں گیدڑوں کے رونے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ جب تک وودکا ختم نہ ہوتا وہ گاتا رہتا اور اس کے بعد یا تو بنچ پر گر جاتا یا میز پر سر رکھ لیتا اور کارخانے کی سیٹی بجنے تک سوتا رہتا۔ کتا اس کے برابر ہی لیٹا رہتا۔

وہ فتق کے مرض میں مبتلا ہو کر مرا۔ پانچ دن تک بستر پر پڑا تڑپتا رہا اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا، آنکھیں بند تھیں، اور وہ برابر دانت پیس رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی بیوی سے کہتا:

"مجھے تھوڑا سا سنکھیا کھلا دو... مجھے زہر دے دو..."

ڈاکٹر نے پلٹس باندھنے کے لئے کہا لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ میخائل کا آپریشن کرنا ضروری ہے اور اسے اسی دن دواخانے پہنچا دیا جائے۔

"جہنم میں جاؤ تم! میں تمہاری مدد کے بغیر ہی مر جاؤں گا! کتے کا پلا!" میخائل نے ہانپ کر کہا۔

جب ڈاکٹر چلا گیا اور اس کی بیوی نے بہ چشم نم اس کی خوشامد کی کہ آپریشن کرا لے تو اس کو گھونسہ دکھاتے ہوئے اس نے کہا:

"اگر میں اچھا ہو گیا تو تجھے اور مزا چکھاؤں گا!"

صبح کے وقت وہ مر گیا، بالکل اسی وقت جب کہ کارخانے کی سیٹی بج رہی تھی۔ تابوت میں لیٹے ہوئے اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کی تیوریوں پر بل تھا جیسے وہ کسی سے خفا ہو۔ اس کی بیوی، اس کے بیٹے، اس کے کتے اور دانیلو ویسوف شیکوف (ایک پرانا چور اور شرابی جسے کارخانے سے نکال دیا گیا تھا) اور بستی کے چند فقیروں نے مل کر اسے دفنا دیا۔ بیوی تھوڑا سا روئی اور بہت خاموشی سے۔ پاویل بالکل ہی نہیں رویا۔ بستی کے جن لوگوں نے اس مختصر سے جنازے کے جلوس کو دیکھا اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا لیا۔

"چلا گیا تو بے حد خوش ہوگی کہ چلو اچھا ہوا مر گیا" انہوں نے کہا۔

" کتا تھا اور کتے کی موت مرا" دوسروں نے کہا۔

تابوت دفن کرنے کے بعد لوگ چلے گئے لیکن کتا تازی مٹی پر بیٹھا خاموشی سے قبر کو سونگھتا رہا۔ چند دنوں بعد کسی نے اسے مار ڈالا۔

3

اپنے باپ کے انتقال کے دو ہفتہ بعد ایک اتوار کو پاویل ولاسوف نشے میں دھت گھر آیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا، رینگتا ہوا میز کے سرے کی نشست کے پاس پہنچا اور تختے پر زور سے مکا مارا جیسے اس کا باپ اکثر کیا کرتا تھا اور ماں سے مخاطب ہو کر چلایا:

" کھانا!"

ماں بیٹے کے نزدیک بیٹھ گئی، اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور اس کا سر کھینچ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ لیکن اس نے اسے دور ہٹا دیا۔

"جلدی کرو، ماں، بہت جلدی!"

"نادان بچہ!" اس کی ماں نے افسوس اور محبت سے کہا اور اس کے ہاتھ ہٹا لئے۔

اور... میں پائپ بھی پیوں گا! اب کا پائپ مجھے دو..." اپنی موٹی زبان کو مشکل سے حرکت دیتے ہوئے پاویل بڑبڑایا۔

وہ پہلی بار نشے سے بدمست ہوا تھا۔ وودکا نے اس کے جسم کو کمزور کر دیا تھا مگر اس کا شعور ختم نہ ہوا تھا اور اس کے ذہن میں یہ سوال بار بار رہا تھا:

" کیا میں نشے میں ہوں؟ کیا میں نشے میں ہوں؟"

وہ اپنی ماں کی نرمی اور شفقت سے کچھ الجھن میں پڑ گیا اور اس کی آنکھوں میں تکلیف دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ وہ رونا چاہتا تھا اور اس جذبے کو چھپانے اور اپنے آنسوؤں کو روکنے کے لئے وہ جتنا بدمست تھا اس سے بھی زیادہ خود کو ظاہر کرنے لگا۔

اس کی ماں نے اس کے نم آلود الجھے ہوئے بالوں کو تھپتپایا۔

" تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا..." اس نے آہستہ سے کہا۔

اسے متلی محسوس ہونے لگی۔ قے کے شدید دورے کے بعد تولیہ رکھ دیا۔اس سے وہ ذرا ہوش میں آیا لیکن اس کا سراب بھی چکرا رہا تھا اور اس کے پپوٹے اتنے بوجھل ہو رہے تھے کہ آنکھ بھی نہیں کھولی جاتی تھی۔ منہ میں بدمزہ مٹیالے مزے کو محسوس کرتے ہوئے اس نے نیم وا آنکھوں سے اپنی ماں کے بڑے سے چہرے کو دیکھا اور سوچا:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ابھی شراب نوشی کے لئے بہت کم عمر ہوں۔ دوسرے لوگ پیتے ہیں اور انہیں کچھ نہیں ہوتا لیکن میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے..."

کہیں بہت دور سے اس کی ماں کی نرم آواز آئی:

"اگر تم نے پینا شروع کر دیا تو پھر میرا خرچ کیسے برداشت کرو گے؟"

"ہر شخص پیتا ہے..." اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کرتے ہوئے اس نے کہا۔

اس کی ماں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ وہ خود جانتی تھی کہ شراب خانہ ہی وہ واحد جگہ ہے جہاں لوگ بمشکل خوشی کے چند قطرے حاصل کر سکتے تھے۔

"لیکن تم شراب پینا مت شروع کرو!" اس نے کہہ ہی دیا۔ "تمہارے باپ نے اپنے اور تمہارے دونوں کے حصے سے بھی زیادہ پی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے مجھے کچھ کم تکلیف پہنچی۔ کیا تمہیں اپنی ماں پر ذرا سا بھی ترس نہیں آ سکتا؟"

ان درد بھرے نرم الفاظ کو سنتے سنتے پاویل کو خیال آیا کہ اپنے باپ کی زندگی میں اسے اپنی ماں کے وجود کا کبھی مشکل ہی سے احساس ہوتا، کیونکہ اس نے ہمیشہ خاموشی اور مار پیٹ کے مستقل خوف میں زندگی گذاری تھی اور خود پاویل جہاں تک ہوتا گھر سے باہر ہی رہتا تا کہ باپ سے سامنا نہ ہو اور اسی لئے وہ ماں سے کچھ دور ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا نشہ کم ہوتا گیا تو اس نے اپنی ماں کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔

وہ لمبی اور کسی حد تک جھکی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر سخت محنت اور اپنے شوہر کی مار پیٹ کے نشانات تھے، وہ بڑے دبے پاؤں کچھ آڑا آڑا سا چلتی جیسے اسے ہمیشہ خطرہ رہتا ہو کہ کسی چیز سے ٹکرا نہ جائے۔ اس کا بھرا بھرا جھریوں والا بڑا سا بیضوی چہرہ اس کی سیاہ آنکھوں کی وجہ سے روشن رہتا جن میں خوف اور غم بھرا تھا جیسے بستی کی زیادہ تر عورتوں کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے سیدھے ابرو کے اوپر ایک گہرے زخم کا

نشان تھا جس کی وجہ سے ابرو ذرا اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کا سیدھا کان بھی الٹے کان کی بہ نسبت زیادہ اوپر چڑھ گیا ہے۔ اسی سبب سے اس کے چہرے پر ایک ایسے آدمی کی سی کیفیت طاری رہتی تھی جو ہمیشہ فکر مندی کے ساتھ جو کس رہتا ہو۔

اس کے سیاہ گھنے بالوں میں سفید لکیریں چمکنے لگی تھیں۔ وہ سرتاپا نرم دلی، حزن وملال اور تسلیم ورضا کا مجسمہ تھی...

آنسو اس کے گالوں سے ہو کر آہستہ آہستہ نیچے ٹپک رہتے تھے۔

"روؤمت!" اس کے بیٹے نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے تھوڑا سا پانی دو۔"

"میں تمہارے لئے تھوڑا برف کا پانی لاتی ہوں..."

لیکن جب وہ واپس آئی تو وہ سو چکا تھا۔ ایک لمحے تک وہ اسے دیکھتی رہی، ڈونگا اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا اور برف برتن سے ٹکرا رہا تھا۔ پھر اس نے ڈونگے کو میز پر رکھ دیا اور مقدس تصویروں کے سامنے خاموشی سے گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ باہر کی بدمست زندگی کی آوازیں کھڑکی سے آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ خزاں کی شام کی نم آلود سیاہی میں ایک اکارڈین باجا چیخا، کسی نے پھٹی ہوئی آواز میں گانا گایا، کسی اور نے گندی گالیوں کی بوچھار کر دی، عورتوں کی تھکی اور جھلائی ہوئی، آوازیں آرہی تھیں جو بڑی پریشان کن تھیں...

ولاسوف خاندان کے چھوٹے سے گھر میں زندگی پہلے سے زیادہ سکون اور خاموش کے ساتھ اور دوسرے گھروں سے ذرا مختلف انداز میں گذرنے لگی۔ ان کا گھر بستی کے کنارے دلدل کی طرف جانے والے بند کے اوپر تھا جو اگر بہت اونچا نہیں تو کافی ڈھلوان ضرور تھا۔ گھر کا ایک تہائی حصہ باورچی خانے اور ایک چھوٹے کمرے نے گھیر رکھا تھا۔ کمرے کو ایک اوٹ سوتی تھی۔ باقی دو تہائی میں ایک مربع کمرہ تھا جس میں دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک کونے میں پاویل کا بستر تھا دوسرے میں ایک میز اور دو بنچیں تھیں۔ باقی سامان چند کرسیوں، ایک چھوٹا سا آئینہ لگی ہوئی سنگار میز، کپڑوں کے ایک صندوق، دیوار پر لگے ہوئے ایک گھنٹے اور کونے میں رکھی ہوئی دو مقدس تصویروں پر مشتمل تھا۔

پاویل نے وہ سب کچھ کیا جس کی ایک نوجون سے توقع کی جاتی تھی۔ اس نے اپنے لئے ایک اکارڈین خریدا، سامنے کی طرف کلف دی ہوئی ایک قمیص خریدی، ایک بھڑکیلی ٹائی، ربر کے جوتے اور

ایک چھڑی خریدی اور اس طرح اپنے ہمجولیوں میں شام ہو گیا۔ شام کو وہ دعوتوں میں جاتا، پولکا اور دوسرے ناچ سیکھتا، اتوار کو گھر پر خوب پی کے پہنچتا لیکن وودکا کی وجہ سے اس کی طبیعت ہمیشہ خراب ہو جاتی۔ پیر کی صبح کو جب وہ جاگتا تو اس کے سر میں درد ہوتا، سینے میں سوزش ہوتی اور اس کے چہرے پر زردی اور تکلیف کے آثار ہوتے۔

"کیوں کل رات بہت اچھا وقت کٹا؟" ایک مرتبہ اس کی ماں نے پوچھا۔

"واہیات!" اس نے بیزار ہو کر غصہ سے کہا۔ "اس سے اچھا تو مچھلی کا شکار ہے یا پھر میں ایک بندوق خریدوں گا اور شکار کا جاؤں گا۔"

وہ مستعدی سے کام کرتا، کبھی ناغہ نہ کرتا اور نہ کبھی سستی کی وجہ سے اس پر جرمانہ ہوا۔ وہ بڑا خاموش، کم سخن لڑکا تھا اور اس کی بڑی نیلگوں آنکھوں میں جو بالکل اس کی ماں کی طرح تھیں، ایک بے اطمینانی اور بے چینی تھی۔ اپنے لئے اس نے نہ تو بندوق خریدی اور نہ وہ مچھلی کے شکار پر گیا۔ لیکن بہت جلد ہی یہ بات نمایاں ہوگئی کہ وہ اس راستے سے ہٹ رہا ہے جس پر ہر شخص چلتا تھا۔ اب وہ دعوتوں میں بہت کم جاتا اور گو وہ ہر اتوار کو غائب ہو جاتا تھا لیکن ہمیشہ گھر بغیر پئے پلائے اور بدمست ہوئے واپس آتا...اس کی ماں کی تیز نگاہوں نے دیکھ لیا کہ اس کے بیٹے کا بھورا چہرہ دبلا ہوتا جا رہا ہے، اس کی آنکھیں زیادہ سنجیدہ ہوتی جا رہی اور ہونٹ مضبوط سے بھینچ کر سخت لکیر بن گئے ہیں۔ یقیناً وہ اپنے دل میں کسی شکایت کو دبائے پھر رہا ہے یا شاید کس بیماری کی وجہ سے گھلا چلا جا رہا ہے۔ پہلے اس کے دوست اکثر اس سے ملنے آجایا کرتے تھے لیکن اب اسے اکثر بیشتر گھر پر نہ پا کر انہوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ماں یہ دیکھ کر خوش تھی کہ اس کا بیٹا کارخانے کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف تھا لیکن وہ ایک مبہم سا خوف محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنے گرد و پیش کی عام زندگی کے تاریک دھارے سے اپنی زندگی کا رخ موڑنے کی اتنی جان توڑ کوششیں کر رہا ہے۔

"تمہیں یقین ہے پاشا کہ تم بالکل اچھے ہو؟" وہ کبھی کبھی اس سے پوچھتی۔

"میں بالکل اچھا ہوں!" وہ جواب دیتا۔

"تم اتنے دبلے ہو!" وہ ٹھنڈا سانس بھرتی۔

اس نے گھر میں کتابیں لانا شروع کر دیں۔ وہ انہیں چوری چھپے پڑھتا اور ختم کرنے کے بعد انہیں

چھپا دیتا۔ کبھی کبھی وہ کسی کتاب میں سے کچھ نقل کرتا اور کاغذ کو چھپا دیتا۔

وہ دونوں بہت ہی کم باتیں کیا کرتے اور بہت تھوڑی سی دیر کے لئے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ صبح وہ بہت خاموشی سے چائے پیتا اور کام پر چلا جاتا اور دوپہر کو کھانے کے لئے آتا۔ اس دوران میں دونوں یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کر لیتے۔ اس کے بعد شام تک کے لئے وہ پھر غائب ہو جاتا۔ شام کو وہ نہاتا، کھانا کھاتا اور دیر تک پڑھتا رہتا۔ اتوار کو صبح ہی گھر سے نکل جاتا اور رات کو دیر سے گھر آتا۔ ماں کو معلوم تھا کہ وہ شہر جاتا ہے اور کبھی کبھی تھیٹر چلا جاتا ہے لیکن شہر سے اس سے ملنے کبھی کوئی نہ آتا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کا بیٹا دن بدن کم سے کم تر باتیں کرنے لگا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے غور کیا کہ وہ نئے الفاظ استعمال کرنے لگا ہے جن کے معنی وہ نہ سمجھ پاتی اور پہلے جس طرح کے بھونڈے بھدے جملے استعمال کیا کرتا تھا وہ اب اس کی بول چال میں بالکل نہ رہے تھے۔ پاویل کے انداز اور رکھ رکھاؤ میں بہت سی نئی تفصیلات نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے بھڑک دار کپڑے پہننا چھوڑ دیا اور اب اپنے جسم اور کپڑوں کی صفائی پر زیادہ دھیان دینے لگا۔ اس کی حرکات وسکنات میں زیادہ آزادی اور چستی پیدا ہو گئی، طور طریقوں میں زیادہ سادگی آ گئی اور روکھا پن کم ہو گیا۔ لیکن اس کی ماں ان ناقابل تشریح تبدیلیوں کی وجہ سے متفکر اور پریشان تھی۔ وہ اب ماں کے ساتھ بھی مختلف طریقے سے برتاؤ کرنے لگا۔ کبھی کبھی وہ گھر میں جھاڑو دینے لگا، اتوار کو ہمیشہ اپنا بستر خود ٹھیک کرتا اور عام طور پر کام میں اس کی مدد کرتا تھا۔ بستی میں کسی مرد نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا...

ایک دن وہ ایک تصویر لایا اور اسے ایک دیوار پر لٹکا دیا۔ اس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ تین آدمی سڑک پر جاتے ہوئے آپس میں بڑی محویت سے مصروف گفتگو ہیں۔

"از سر نو زندہ ہونے کے بعد عیسیٰ مسیح ایماس کی طرف جا رہے ہیں!" پوویل نے سمجھایا۔

تصویر سے ماں بہت خوش ہوئی لیکن اس نے دل میں سوچا:

"اگر تجھے یسوع اتنا عزیز ہے تو پھر گرجا کیوں نہیں جاتا؟"

جاذب نظر الماری کے خانوں میں، جسے پاویل کے ایک بڑھئی دوست نے بنایا تھا، کتابوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ کمرہ اب زیادہ آرام دہ معلوم ہونے لگا۔

وہ اسے عموماً "ماں" کہتا لیکن کبھی کبھی اسے اور بھی پیار سے پکارتا:

"اماں جی، میرے لئے پریشان مت ہونا۔آج میں رات کو دیر سے آؤں گا..."

اسے یہ بات پسند آتی۔اسے پاویل کے الفاظ میں ایک مضبوطی اور سنجیدگی محسوس ہوتی۔

لیکن اس کی تشویش و پریشانی بڑھتی گئی۔ پریشانی کی وجہ صاف سمجھ میں نہیں آئی لیکن پھر بھی اس کے دل کا بوجھ زیادہ سے زیادہ بھاری ہوتا گیا اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ عام باتوں سے ہٹ کر کچھ ہورہا ہے۔کبھی کبھی وہ اپنے بیٹے سے ناراض بھی ہوجاتی اور اس وقت سوچتی:

"آخر یہ دوسرے لوگوں کی، عام آدمیوں کی طرح کیوں نہیں رہتا؟ یہ تو بالکل راہب ہے۔اتنا سنجیدہ اس کی عمر میں یہ بات زیب نہیں دیتی..."

اس کے بعد وہ پھر سوچتی:

"ممکن ہے کوئی لڑکی اس کی دوست ہے۔"

لیکن لڑکی کے لئے روپیہ چاہئے اور وہ اپنی تقریباً ساری تنخواہ اس کے حوالے کر دیتا تھا۔

اس طرح ہفتے اور مہینے گذرتے گئے یہاں تک کہ دو سال بیت گئے۔اس مبہم خیالات اور روز افزوں اندیشوں سے پر عجیب و غریب اور خاموش زندگی کے دو سال۔

ایک شام کھانا کھانے کے بعد پاویل نے کھڑکی پر پردہ کھینچ دیا اور اپنی کرسی کے اوپر ٹنگی ہوئی کیل پر ٹین کا چراغ لٹکانے کے بعد کونے میں بیٹھ گیا اور پڑھنا شروع کیا۔ برتن دھو چکنے کے بعد ماں باورچی خانے سے باہر آئی اور آہستہ آہستہ اس کے پاس گئی۔اس نے سر اٹھایا اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں قانوناً ممنوع کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ان کے پڑھنے پر اس لئے پابندی عائد ہے کہ وہ مزدوروں کے متعلق سچی باتیں بتاتی ہیں...ان کتابوں کو چھپ کر خفیہ طریقہ سے چھاپا جاتا ہے اور اگر مجھے یہ کتابیں پڑھتے دیکھ لیا گیا تو جیل میں ڈال دیا جاؤں گا۔جیل میں اس لئے کہ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔سمجھیں؟"

دفعتاً اسے سانس لینے میں دقت محسوس ہوئی،اس نے آنکھیں کھول کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ اجنبی تھا۔اس کی آواز مختلف تھی۔زیادہ گہری اور بھرپور،لطیف اور کھنک دار۔ اس کے بیٹے نے اپنی باریک،نرم مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور کنکھیوں سے عجیب طرح کونے کی طرف دیکھنے

لگا۔ ماں اپنے بیٹے کے لئے خوف زدہ ہوگئی اوراس کے لئے اس کا دکھنے لگا۔

"تم ایسا کیوں کرتے ہو پاشا؟"اس نے پوچھا۔

پاویل نے سراوپر اٹھایا اوراس کی طرف دیکھا۔

"اس لئے کہ میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں"اس نے خاموشی اور متانت سے جواب دیا۔

اس کی آواز میں نرمی مگر پختگی تھی اور آنکھوں میں ایک ضد کی چمک تھی۔ ماں نے سمجھ لیا کہ اس کے بیٹے نے ہمیشہ کے لئے کسی خفیہ اور خوفناک چیز کے لئے اپنی زندگی وقف کردی ہے۔ وہ زندگی میں ہر چیز کو ناگزیر سمجھ کرتسلیم کر لیتی تھی اور بے چون و چرا اسے قبول کرلیا کرتی تھی، اوراس لئے اب وہ خاموشی سے روتی رہی، وہ صدمہ اور کرب سے اس حدتک مغلوب ہوگئی تھی کہ اب اسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"روؤ مت!"پاویل نے نرمی اور محبت سے کہا لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ الوداع کہہ رہا ہو۔" ذرا سوچو تو ہم کیسی زندگی گذراتے ہیں! ایک تم ہو۔ چالیس برس کی عمر ہوگئی اور اب تک تم نے زندگی میں کیا پایا؟ باپ نے ہمیشہ تمہیں مارا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی پریشانیوں کا، اپنی زندگی کی ساری تلخیوں کا غصہ تم پر اتارتے تھے، کوئی چیز ان پر حاوی ہوگئی تھی، انہیں دبا رہی تھی اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا ہے۔ انہوں نے تیس برس تک مزدوروی کی، اس وقت کام شروع کیا جب ساری کارخانے میں صرف دو کھاتے تھے اور اب سات ہیں!"

وہ اس کی باتیں بڑے ذوق وشوق سے مگر ایک قسم کے خوف کے ساتھ سنتی رہی۔ اس کے بیٹے کی آنکھوں میں ایک دلکش چمک تھی۔ میز پر اپنے سینے کو سہارا دیتے ہوئے وہ جھک کر اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کے قریب آیا اور آج اس صداقت کے متعلق جسے اس نے سمجھ لیا تھا، اپنی پہلی تقریر کی۔ اپنی جوانی کی ساری قوت اور ایک طالب علم کے سارے ولولے کے ساتھ، جسے اپنے علم پر فخر اور اپنی صداقت پر مکمل اعتماد ہوتا ہے، اس نے ان چیزوں کے متعلق باتیں کیں جو اس پر واضح ہو چکی تھیں۔ اس نے جو باتیں کیں ان کا مقصد اپنی ماں کو یقین دلانا کم اور خود اپنا امتحان لینا زیادہ تھا۔ کبھی وہ الفاظ نہ ملنے کی وجہ سے رک جاتا اور پھر اسے احساس ہوتا کہ اس کے سامنے ایک ایسا چہرہ ہے جس میں دکھ درد ہے اور جس کی پیار بھری آنکھیں آنسوؤں کے پیچھے سے چمک رہی ہیں۔ وہ آنکھیں، مرعوب اور متحیر، اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اپنی ماں کے لئے اس کا دل رنج وافسوس سے بھر گیا اور جب

اس نے پھر باتیں شروع کیں تو وہ خود ماں کے متعلق اور اس کی زندگی کے متعلق تھیں۔

" تمہیں کبھی کوئی مسرت حاصل ہوئی ؟" اس نے پوچھا۔ "ماضی نے تمہیں کیا دیا جسے تم یاد کرسکو؟"

اس نے سب کچھ سنا اور غمناک انداز میں اپنا سر ہلایا۔ اسے کسی نئی نامعلوم چیز، کسی مسرت آمیز اور دردناک چیز کا احساس ہو رہا تھا جو اس کے دکھے ہوئے دل کے لئے مرہم کا کام کر رہی تھی۔ آج پہلی مرتبہ اس نے اپنے اور اپنی زندگی کے متعلق کسی شخص کی زبان سے کچھ سنا تھا، اور ان الفاظ نے مبہم سے خیالات کو پھر سے بیدار کر دیا جو عرصہ ہوا سو چکے تھے۔ انہوں نے نامعلوم طریقے سے زندگی سے اس کی ختم ہوتی ہوئی بے اطمینانی کو، گذری ہوئی جوانی کے خیالات اور احساسات کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اپنی جوانی کے زمانے میں اس نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ زندگی کے متعلق باتیں کی تھیں۔ اس نے ہر چیز کے متعلق تفصیل سے گفتگو کی تھی لیکن اس کی تمام سہیلیوں نے، اور خود اس نے، ہمیشہ شکایت ہی کی اور اپنی زندگی کی کٹھنائی کی وجہ تلاش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ لیکن اس وقت اس کا بیٹا اس کے سامنے بیٹھا تھا اور اس کی آنکھوں، اس کے چہرے اور اس کے الفاظ کے سارے تاثر سے وہ اپنے دل کی گہرائیوں تک متاثر ہو رہی تھی، اور اس کا دل اپنے بیٹے پر فخر کر رہا تھا جو اپنی ماں کی زندگی کو اتنی اچھی طرح سمجھتا تھا، جو اس سے خود اس کی مصیبتوں کی باتیں کر رہا تھا اور جو اس پر اپنا دل دکھا رہا تھا۔

ماؤں پر کبھی رحم نہیں کیا جاتا۔

وہ یہ جانتی تھی۔ پاویل نے عورتوں کی زندگی کے متعلق جو کچھ بھی کہا وہ ایک جانی پہچانی تلخ حقیقت تھی اور ماں کے سینے میں طرح طرح کے ملے جلے جذبات موجیں مارنے لگے جن کے نئے پن اور نرمی نے اس کے دل کو گرم دیا۔

"تو تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" اس نے پاویل کو ٹوکتے ہوئی کوٹو کتے ہوئے پوچھا۔

" پہلے پڑھنا اور پھر دوسروں کو پڑھانا چاہتا ہوں۔ ہم مزدوروں کو پڑھنا چاہئے۔ ہمیں یہ معلوم کرنا اور سمجھنا چاہئے کہ ہماری زندگی اتنی کٹھن کیوں ہے۔"

اسے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے بیٹے کی نیلگوں آنکھیں جو ہمیشہ سخت اور سنجیدہ رہتی تھیں اب ایک نرم و نازک روشنی سے لبریز ہیں۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ماں کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی، حالانکہ اس کے گالوں کی جھریوں میں آنسو اب تک کانپ رہے تھے۔ وہ دو متضاد احساسات کے بیچ میں گھری ہوئی

تھی۔ایک طرف تو اسے اپنے بیٹے پر فخر تھا جس نے زندگی کی تلخ کو اتنی اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور دوسری طرف اسے احساس تھا کہ وہ ابھی بہت کم عمر ہے اور یہ کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں مختلف قسم کی باتیں کرتا تھا اور اس نے تن تنہا اس زندگی کے خلاف جدوجہد کرنے کا ارادہ کر لیا تھا جس کا ہر شخص عادی ہو چکا تھا اور جس کی وہ خود عادی ہو چکی تھی اور وہ اس سے کہنا چاہتی تھی:

"میرے لعل تو تن تنہا کر ہی کیا سکتا ہے؟"

لیکن اسے یہ بھی خیال تھا کہ اس صورت میں وہ تحسین اور قدر دانی کا جذبہ کم ہو جائے گا جو وہ اپنے بیٹے کے لئے محسوس کرنے لگی تھی، اپنے اس بیٹے کے لئے جس نے دفعتاً دکھا دیا تھا کہ وہ کتنا ہوشیار ہے...اور جسکو وہ اچھی طرح سمجھنے سے قاصر تھی۔

پاویل نے اپنی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی، اس کی محویت کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں محبت کو دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی ماں کو اس حقیقت سے روشناس کرانے میں کامیاب ہو گیا ہے جس کی وہ وکالت کرتا تھا۔اپنے الفاظ کی تاثیر پر بھرپور فخر نے اس کی خوداعتمادی کو دوبالا کر دیا۔اب وہ جوشیلے انداز میں بول رہا تھا کبھی مسکراتا کبھی تیوریوں پر بل ڈالتا، اور کبھی اس کے الفاظ میں نفرت کی گونج سنائی دیتی اور اس کی ماں یہ الفاظ، یہ سخت اور گونجتے ہوئے الفاظ، سن کر خائف ہو گئی اور اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے اپنے بیٹے سے آہستہ سے پوچھا:

"کیا سچ مچ ایسا ہی ہوتا ہے پاشا؟"

"ہاں بالکل ایسا ہی!" اس نے مضبوطی سے جواب دیا۔اور اس نے اسے ان لوگوں کے متعلق بتایا جو انسانوں کی مدد کرنے کے لئے بے تاب تھے اور ان کے درمیان صداقت کے بیج بو گئے تھے جس کی وجہ سے زندگی کے دشمنوں نے ان کا جانوروں کی طرح شکار کیا، انہیں قید خانوں میں ڈالا اور انہیں قید بامشقت کی سزائیں دیں۔

"میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے!" اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔"دھرتی کے بہترین سپوت ہیں!"

ایسے لوگوں کے تصور نے ماں کو دہشت زدہ کر دیا اور ایک بار پھر وہ اپنے بیٹے سے دریافت کرنا چاہتی تھی کہ کیا سچ مچ یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن اسے یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔سانس روکے ہوئے ان

لوگوں کے قصے سن رہی تھی جنہیں وہ نہیں سمجھتی تھی لیکن جنہوں نے اس کے بیٹے کو ایسی خطرناک باتیں کرنا اور سوچنا سکھایا تھا۔ آخر اس نے اپنے بیٹے سے کہا:

"اب صبح ہونے والی ہے، تم جا کر بستر پر لیٹ جاؤ اور تھوڑا سا سو لو!"

"ہاں ابھی جاتا ہوں" وہ راضی ہو گیا۔ پھر ماں کی طرف جھکتے ہوئے اس نے کہا" لیکن کیا تمہاری سمجھ میں آیا جو کچھ میں نے کہا؟"

"ہاں!" اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ آنسو ایک بار پھر بہنے لگے اور دفعتاً کسی جذبے کے تحت وہ چیخ پڑی" تم تباہ ہو جاؤ گے!"

وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے کے دوسری طرف چلا گیا۔

"خیر تو اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کہاں جاتا ہوں "اس نے کہا۔ "میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے! اور اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے اماں، تو میری صرف یہ درخواست ہے کہ میری راہ میں حائل نہ ہونا!"

"میرے لعل، میرے لعل!" وہ رو رہی تھی۔ "اچھا ہوتا کہ تو مجھے یہ سب کچھ بتاتا ہی نہیں!"

اس نے ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور مضبوطی سے دبایا۔

جس چاؤ سے اس نے لفظ "اماں" ادا کیا تھا اور جس عجیب اور غیر معمولی طریقہ سے اس کا ہاتھ دبایا تھا اس سے وہ حد متاثر ہوئی۔

"میں کچھ نہ کہوں گی" اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ "ہاں تم اپنا خیال ضرور رکھنا۔ اپنا خیال رکھنا!"

اپنے بیٹے کے امکانی خطرے کے محض ایک موہوم ترین احساس کے ساتھ اس نے درد بھرے لہجے میں کہا:

"تم روز بروز زیادہ دبلے ہوتے جا رہے ہو..."

اس نے پاویل کے مضبوط اور بلند قامت جسم کو اپنی محبت بھری نظروں میں سمو لیا۔

"تم جس طرح چاہے زندگی بسر کرو۔ میں ہرگز تمہارے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالوں گی، مگر میں صرف ایک بات چاہتی ہوں۔ ذرا اچھی طرح خیال رکھنا کہ کن لوگوں سے بات کرنی چاہئے اور کن سے نہیں۔ ہمیشہ لوگوں سے ڈرتے رہنا، وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں! ان کی زندگی لالچ اور حسد

میں گزرتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ ایک بار تم انہیں ان کی اصلی شکل دکھا دو، ان پر الزام لگا دو، پھر تم دیکھو وہ تم سے کتنی نفرت کرنے لگیں گے اور تمہیں ختم کرنے پر تل جائیں گے۔"

اس کا بیٹا دروازے میں کھڑا اس کے کرب آمیز الفاظ سن رہا تھا۔ جب اس نے بات ختم کر لی تو وہ مسکرایا:

"تم سچ کہتی ہو، لوگ واقعی خراب ہیں" اس نے کہا۔ "لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک چیز ایسی بھی ہے جسے حق اور صداقت کہا جاتا ہے تو لوگ مجھے بہتر معلوم ہونے لگے!"

وہ پھر مسکرایا اور بولا:

"مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ یہ کیسے ہوا۔ بچپن میں میں سب سے ڈرا کرتا تھا، پھر جب میں بڑا ہوا تو ہر شخص سے نفرت کرنے لگا۔ بعض سے ان کی کمینگی کی وجہ سے اور بعض سے معلوم نہیں کیوں، شائد یوں ہی۔ لیکن اب ہر چیز مجھے مختلف معلوم ہوتی ہے شائد اس لئے کہ لوگوں کے لئے میرا دل دکھنے لگا ہے۔ کچھ ایسا ہوا کہ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ لوگ ہمیشہ اپنی کمینگی کے لئے قابل الزام نہیں ہوتے تو میرا دل نرم پڑ گیا..."

وہ بولتے بولتے رک گیا جیسے وہ اپنے اندر کی کوئی آواز سن رہا ہو پھر اس نے آہستہ سے سوچتے ہوئے کہا:

"تو یہ تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے صداقت کو جاننے کی وجہ سے آدمی میں!"

"میرے یسوع! تم میں بڑی خطرناک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے" اس کی ماں نے اس پر نظر ڈالتے ہوئے زیر لب کہا۔

جب وہ سو گیا تو ماں اپنے بستر سے خاموشی سے اٹھی اور اس کی طرف چلی۔ پاویل چت لیٹا ہوا تھا۔ سفید تکیئے کے پس منظر میں اس کے بھورے چہرے کے گمبھیر اور سرکش خط وخال نمایاں ہو گئے تھے۔ اس کی ماں شب خوابی کے لباس میں ننگے پاؤں، دونوں ہاتھوں کو سینے پر دبائے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹ بے آواز طریقے سے ہل رہے تھے اور موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر بہہ بہہ کر نیچے گر رہے تھے۔

وہ لوگ پھر اپنی خاموش زندگی گزارنے لگے۔ ایک دوسرے سے دور مگر بہت نزدیک۔

5

ایک ہفتہ کے وسط میں تعطیل کے دن گھر سے جاتے ہوئے پاویل نے ماں کی طرف مڑ کر اس سے کہا:

"شہر سے!" اس کی ماں نے دھرایا اور پھر دفعتاً وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''ماں بات کیا ہے؟'' پاویل نے جھلا کر پوچھا۔

اس نے اپنے پیش بند سے آنسو پونچھے۔

''مجھے نہیں معلوم اس نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے کہا۔'' کوئی خاص بات نہیں...''

''ڈرتی ہو؟''

''ہاں!'' اس نے اعتراف کیا۔

وہ اس کی طرف جھکا اور اپنے باپ کی طرح ترش روئی سے بولا:

خوف نے ہم سب کو برباد کر دیا ہے۔ اور جو لوگ ہم پر حکمرانی کرتے ہیں وہ ہمارے خوف ہی سے فائدہ اٹھا کر ہم پر اور زیادہ ظلم کرتے رہتے ہیں۔''

''خفا مت ہو!'' اس کی ماں نے دکھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میں کیسے نہ ڈروں؟ ساری زندگی ڈرتی آئی ہوں۔ میرے روح پر خوف ہی خوف طاری ہے۔''

''مجھے معاف کر دو، مگر راستہ یہی ہے'' اس نے نرمی سے کہا۔ اور وہ چلا گیا۔

تین دن تک اس کا دل لرزتا رہا۔ جب بھی سوچتی کہ کچھ اجنبی اور خوفناک قسم کے لوگ اس کے گھر آئیں گے تو وہ چونک سی پڑتی اور اس کا دل بیٹھ جاتا۔ ان ہی لوگوں نے تو اس کے بیٹے کو وہ راستہ دکھایا تھا جس پر وہ چل رہا تھا...

سنیچر کے دن پاویل شام کو کارخانے سے گھر آیا، منہ ہاتھ دھویا، کپڑے تبدیل کئے اور پھر باہر جانے لگا۔

''اگر کوئی آئے تو کہنا کہ میں ابھی آتا ہوں'' اس نے ماں کی طرف دیکھے بغیر کیا۔ ''اور خدا کے لئے

تم ڈرومت...''

وہ کمزوری سے ایک بنچ پر بیٹھ گی۔ پاویل نے اکھڑے اکھڑے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ...آج تم کہیں اور...چل جاؤ'' اس نے تجویز پیش کی۔

اس کے الفاظ سے ماں کو تکلیف پہنچی۔

''نہیں، میں کیوں چلی جاؤں؟''

نومبر کے آخری دن تھے۔ دن کے وقت یخ بستہ زمین پر باریک اور خشک برف گر چکی تھی اور اس نے اپنے بیٹے کے جاتے وقت اس کے قدموں کے نیچے برف کے چرمرانے کی آواز سنی۔ تاریکی کھڑکیوں سے لپٹی دل میں عداوت سے لئے کسی کی تاک میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہ وہیں دونوں ہاتھوں سے بنچ کو پکڑے دروازے پر نظریں گاڑے بیٹھی رہی...

اسے ایسا محسوس ہوا کہ ہر طرف سے برے لوگ عجیب وغریب کپڑے پہنے اندھیرے میں رینگ رہے ہیں۔ پھر گھر کے چاروں طرف دبے پاؤں چلنے کی آوازیں آنے لگیں اور دیواروں پر انگلیوں کی سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

اس نے سنا کہ کوئی شخص سیٹی میں کوئی دھن بجا رہا ہے۔ آواز نے خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کیا، مغموم اور سریلی آواز ویران تاریکی میں بھٹکنے لگی جیسے کسی کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ پھر وہ آواز نزدیک آتی گئی اور اسی کھڑکی کے پاس پہنچ کر دفعتاً ختم ہوگئی جیسے دیوار کی لکڑی میں سرایت کرگئی ہو۔

ڈیوڑھی میں پیروں کی چاپ سنائی دی۔ ماں چونک کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی بھویں تنی ہوئی تھیں۔

دروازہ کھلا۔ پہلے ایک سر جس پر لمبے لمبے بالوں کی بڑی سی ٹوپی تھی نمودار ہوا، اس کے بعد چھوٹے سے دروازے سے ایک لمبا جسم جھک کر سامنے آیا۔ اس کے بعد وہ شخص سیدھا ہوا۔ اس نے سلام کے لئے سیدھا ہاتھ اٹھایا اور ٹھنڈا سانس بھر کر کہا:

''آداب!''

ماں نے کچھ کہے بغیر جھک کر سلام کا جواب دیا۔

''پاویل گھر پر ہے؟''

نووارد نے اطمینان سے سمور کا جیکٹ اتارا۔ ایک ٹانگ اوپر اٹھا کر اپنی ٹوپی سے بوٹ کی برف

صاف کی پھر دوسری ٹانگ کے ساتھ یہی عمل کیا، کونے میں اپنی اچھال کر پھینک دی اور بڑی سبک گامی سے کے دوسرے کونے میں چلا گیا۔ ایک کرسی کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد جیسے اطمینان کر رہا ہو کہ وہ اسے سنبھال سکے گی یا نہیں، وہ اس پر بیٹھ گیا ورا پنے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لی۔ اس کا سر سڈول تھا اور بال چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے۔ ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی۔ البتہ اس کی مونچھیں ضرور تھیں جن کے سرے نیچے کی طرف لٹک رہے تھے۔ اس نے اپنی بڑی بڑی، بھورے رنگ کی، ابھری ہوئی انکھوں سے کمرے کا بڑے غور سے جائزلیا۔

''یہ آپکا اپنا جھونپڑا ہے یا کرایا پر لیا ہوا ہے؟'' اس نے پیر پر پیر رکھتے اور کرسی پر جھولا سا جھولتے ہوئے دریافت کیا۔

''کرایہ کا ہے'' ماں نے، جو اس کے مقابل میں بیٹھی ہوئی تھی، جواب دیا۔

''زیادہ اچھی جگہ نہیں ہے'' اس نے رائے ظاہر کی۔

''پاشا ابھی آجائے گا۔ بس تھوڑی دیر انتظار کرو۔''

اس کے سکون واطمینان، اسکی نرم آواز اور اس کے سیدھے سادے چہرے کی وجہ سے ماں کی ہمت بندھی۔ اس کی نگاہوں سے صاف دلی اور دوستی کا اظہار ہوتا تھا اور اس کی شفاف آنکھوں کی گہرائیوں میں مسرت کے شعلے رقصاں تھے۔ اس دبلے پتلے، جھکے ہوئے اور لمبی ٹانگوں والے جسم میں ایک قسم کی کشش تھی۔ وہ ایک نیلی قمیص اور ڈھیلا سا سیاہ پتلون پہنے ہوئے تھا جس کے پائینچے اس کے جوتوں میں گھسے ہوئے تھے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور آیا وہ اسکے بیٹے کو بہت دنوں سے جانتا ہے لیکن وہ دفعتاً آگے کی طرف جھکا اور اس نے خود ہی پہلے باتیں کرنا شروع کیں۔

''تمہارے ماتھے پر اتنی زور سے کس نے مارا تھا ننکو☆؟'' اس نے پوچھا۔

اس کی آواز میں ہمدردی تھی اور اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ جھلک رہی تھی لیکن عورت کے جذبات کو اس سوال سے ٹھیس پہنچی۔

''تمہیں کیا تعلق، نوجوان؟'' اس نے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے سرد مہر شائستگی کے ساتھ پوچھا۔

''اس میں خفا ہونے کی کوئی بات نہیں!'' اس نے ماں کی طرف پوری طرح جھکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم سے صرف اس لئے پوچھا کہ میری رضاعی ماں کے بھی اسی قسم کا زخم تھا، جیسے تمہارے ہے۔ اسے اس کے مرد نے مارا تھا جس کے ساتھ وہ رہتی تھی۔ وہ موچی تھا اور اس نے اسے لکڑی کے قالب سے مارا تھا۔ وہ دھوبن تھی اور وہ موچی۔ اسے کہیں مل گیا تھا۔ اور اسے ہمیشہ پچھتاوا ہی رہا کیونکہ وہ پکا شرابی تھا۔ یہ سب مجھے گود لینے کے بعد ہوا۔ اف! اسے کس طرح مارتا تھا! میرا تو ڈر کے مارے برا حال ہو جاتا تھا!''

اس کے اعتماد نے ماں کو لاجواب کر دیا اور اسے ڈر ہوا کہ اس کو روکھائی سے جواب دینے پر پاویل اس سے خفا نہ ہو جائے۔

''میں دراصل خفا نہیں تھی'' اس نے مجوب تبسم کے ساتھ کہا۔ ''لیکن تم نے بہت اچانک سوال کر ڈالا۔ خدا اسے جنت۔

☆ ننکو۔ یوکرین میں ماں کو محبت سے ننکو کہتے ہیں۔ (مترجم۔)

نصیب کرے، مجھے بھی میرے مرد ہی نے مارا تھا۔ تم تاتاری ☆ ہو کیا؟''

اس شخص نے اپنے پیروں کو جنبش دی اور کھیسیں نکال کر اس طرح ہنسا کہ اس کے کان بھی ہل گئے پھر اس نے سنجیدگی سے کہا:

''تمہاری بول چال روسیوں کی طرح کی نہیں ہے'' ماں نے مذاق کو سمجھتے ہوئے مسکرا کر اپنا مطلب سمجھایا۔

''میرا لہجہ تو روسیوں سے بھی بہتر ہے'' مہمان نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''میں خوخول ☆☆ ہوں، کانیف شہر کا رہنے والا۔''

''یہاں بہت دنوں سے ہو؟''

''شہر میں تو تقریباً سال بھر سے ہوں لیکن کارخانے میں آئے ہوئے ایک مہینہ ہوا۔ یہاں مجھے اچھے لوگ ملے ہیں: تمہارا بیٹا اور چند اور لوگ۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اب شاید یہیں رہوں گا'' اس نے اپنی مرنچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔

اسے یہ شخص اچھا معلوم ہوا۔ اور اس کے بیٹے کے متعلق اس نے جو کلمات خیر کہے تھے اس

کے لئے وہ اسے کوئی صلہ دینا چاہتی تھی۔

''ایک پیالی چائے تو ضرور پیو گے؟''اس نے دریافت کیا۔

☆پرانے کپڑے خریدنے والوں کو عام طور پر تاتاری کہا جاتا تھا۔(مترجم۔)

☆☆خوخول۔اکتوبر انقلاب سے پہلے یوکرین کے رہنے والوں کو روسی مذاقاً خوخول کہتے تھے۔(مترجم۔)

''صرف میں ہی کیوں پیوں ؟ ''اس نے اپنے شانوں کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔''دوسروں کو بھی آنے دو۔پھر ہم سب کی خاطر کرنا...''

اس کے الفاظ نے ماں کے خوف کو پھر تازہ کر دیا۔

''کاش دوسرے بھی اسی شخص کی طرح ہوں''اس نے سوچا۔

ڈیوڑھی میں ایک بار پھر پیروں کی چاپ سنائی دی۔دروازہ تیزی سے کھلا اور ماں ایک بار پھر کھڑی ہوگئی۔لیکن اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک لڑکی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔وہ کچھ چھوٹی سی تھی ،کسانوں کی طرح سیدھا سادہ چہرہ تھا اور کے سنہرے بالوں کی ایک موٹی سی چوٹی گندھی ہوئی تھی۔

''کیا مجھے دیر ہوگئی؟''لڑکی نے ملائمت سے پوچھا۔

''نہیں،دیر نہیں ہوئی''خوخول نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔''پیدل آئی ہو؟''

''اور نہیں تو کیا۔آپ پاویل میخائلووچ کی ماں ہیں؟آداب۔میرا نام نتاشا ہے...''

''اور تمہارا پدری نام☆؟''ماں نے دریافت کیا۔

واسیلیونا۔اور آپ کا نام؟''

''پلاگیا نلوونا۔''

''تو اب ہم لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہوگئے ہیں۔''

''ہاں''۔ماں نے لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔اس وقت اس کی آواز میں خفیف سا ارتعاش تھا۔

☆روسیوں کے نام کے تین حصے ہوتے ہیں:ذاتی نام،باپ کے نام کی نسبت سے ایک اور خاندانی نام۔(مترجم۔)

''سردی لگ رہی ہے؟'' لڑکی کا لبادہ اتارتے ہوئے خوخول نے پوچھا۔

''بے انتہا۔ باہر کھیتوں میں تو بلا ہوا ہے!''

اس کی آواز گہری، لطیف اور نرم تھی۔ اس کا دھن چھوٹا اور ہونٹ بھرے بھرے تھے اور مجموعی طور پر اس کا جسم سیب کی طرح تازہ، گول اور گداز تھا۔

اپنا کوٹ وغیرہ اتارنے کے بعد اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے، جو سردی کی وجہ سے سوج گئے تھے، اپنے گلرنگ رخساروں کو رگڑا۔ فرش پر جوتوں کی ایڑیوں سے شور مچاتی ہوئی تیزی سے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئی۔

''یہ لڑکی ربر کے جوتے نہیں پہنتی'' ماں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''اررر'' لڑکی نے تھرتھراتے ہوئے کہا۔ ''میں تو سردی سے بالکل جم گئی!''

''ٹھیرو میں ابھی سماوار رکھتی ہوں'' ماں نے جلدی سے باورچی خانے میں جاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ایک منٹ میں...''

اسے ایسا ہوا جیسے وہ اس لڑکی سے ایک عرصہ سے واقف ہے اور وہ ایک ماں کی پیاری، ہمدردانہ محبت کے ساتھ اسے چاہنے لگی۔ دوسرے کمرے میں ہونے والی گفتگو کو سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''کیا سوچ رہے ہو نخور کا؟'' لڑکی نے دریافت کیا۔

''کوئی خاص بات نہیں'' خوخول نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''بیوہ کی آنکھیں بڑی اچھی ہیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے میری ماں کی آنکھیں بھی ایسی ہی ہوں۔ میں اکثر اپنی ماں کے متعلق سوچتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔''

''لیکن تم نے تو کہا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔''

''میری رضاعی ماں کا انتقال ہوا تھا، میں اپنی ماں کی بات کر رہا ہوں۔ وہ شاید کیف کی سڑکوں پر بھیک مانگ رہی ہوگی اور ووڈکا پی رہی ہوگی۔ اور جب زیادہ پی جاتی ہوگی تو شاید پولیس والے اسے تھپڑ مارتے ہوں گے۔''

''بیچارہ لڑکا'' ماں نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے سوچا۔

نتاشا نے کوئی بات بڑے تیز، نرم، ملائم اور جوشیلے انداز میں کہی۔ خوخول کی آواز ایک دفعہ پھر گونجی:

''تم ابھی بالکل بچہ ہو، تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی! انسان کو جنم دینا بڑا کٹھن کام ہے لیکن اس سے بھی مشکل کام ہے اسے شرافت سکھانا۔''

''ہائے بیچارہ!'' ماں نے اپنے آپ ہی کہا اور اس کا جی چاہا کہ وہ اس خوخول کے پاس جا کر ہمدردی کے الفاظ کہے، لیکن دروازہ کھلا اور بڑھے چور دانیلو کا بیٹا نکولائی وسوف شیکوف داخل ہوا۔ وہ ساری بستی میں اپنے آپ کو لئے دئے رہتا تھا اور اسی وجہ سے لوگ اس کو چھیڑتے اور چڑاتے تھے۔

''کیا بات ہے نکولائی؟'' ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''پاویل گھر میں ہے؟'' اس نے اپنے چوڑے چیچک رو چہرے کو اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے، ماں کو سلام کئے بغیر دریافت کیا۔

''نہیں۔''

اس نے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور پھر اندر چلا گیا۔

''آداب ساتھو...'' اس نے کہا۔

''یہ بھی!'' ماں نے ناپسندیدگی کے ساتھ سوچا اور جب اس نے دیکھا کہ نتاشا نے اس طرح ہاتھ ملایا جیسے اس سے مل کر اسے خوشی ہوئی ہو تو اسے بڑا تعجب ہوا۔

نکولائی کے بعد دو آدمی اور آئے۔ دونوں ابھی نوعمر لڑکے ہی تھے۔ ماں ان میں سے ایک کو جانتی تھی جس کا ناک نقشہ تیکھا، بال گھنگریالے اور ماتھا چوڑا تھا۔ اس کا نام فیدور تھا اور وہ کارخانے کے پرانے مزدور سیزوف کا بھتیجا تھا۔ دوسرا شرمیلا سا تھا۔ اس کے بال سیدھے تھے اور سر پر چپکے ہوئے سے تھے۔ ماں اسے نہیں جانتی تھی لیکن اس کی ذات سے بھی کوئی خوف و دہشت پیدا نہیں ہوا۔ آخر کار پاویل بھی داخل ہوا۔ اس کے ساتھ کارخانے کے دو نوجوان مزدور تھے جنہیں وہ جانتی تھی۔

''تم نے سماوار بھی چڑھا دیا؟'' پاویل نے نرمی اور ملائمت سے کہا۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

''میں جا کر تھوڑی سی وودکا خرید لاؤں؟'' اس نے دریافت کیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس نامعلوم چیز کے لئے اظہار تشکر کس طرح کرے جس کو وہ الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر تھی۔

''نہیں، ہم شراب نہیں پیتے ہیں'' پاویل نے ایک لطف آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اسے خیال ہوا کہ اس کے بیٹے نے اس کا مذاق اڑانے کے لئے اس اجتماع کے خطرے کو بڑھا بڑھا کر بیان کیا تھا۔

''یہی ہیں وہ لوگ جنہیں قانون خطرناک کہتا ہے؟'' اس نے زیر لب پوچھا۔

''ہاں یہی ہیں'' پاویل نے جواب دیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

''کیا واقعی!'' اس نے اسے سناتے ہوئے شفقت سے کہا اور بزرگانہ التفات سے سوچنے لگی ''یہ ابھی تک بالکل بچہ ہی ہے!''

جب پانی ابلنے لگا تو ماں سماوار کمرے میں لے آئی۔ مہمان میز کے گرد ایک تنگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ نتاشا ایک کونے میں چراغ کے نیچے ایک کتاب کھولے بیٹھی تھی۔

''یہ سمجھنے کے لئے کہ لوگوں کی زندگی اتنی کٹھور اور سخت کیوں ہے...'' نتاشا نے کہا۔

''اور خود وہ اتنے کٹھور اور سخت کیوں ہیں...'' خوخول نے لقمہ دیا۔

''...یہ دیکھنا ضروری ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی شروع کیسے کی...''

''دیکھو میرے پیارو، اچھی طرح دیکھ لو'' ماں نے چائے تیار کرتے ہوئے زیر لب کہا۔

ہر شخص خاموش ہو گیا۔

''کیا بات کیا ہے ماں؟'' پاویل نے تیوریل پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''بات؟'' اس نے اوپر سر اٹھا کر دیکھا اور اسے اندازہ ہوا کہ ہر شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

''ارے۔ میں تو اپنے آپ ہی آپ باتیں کر رہی تھی'' اس نے گھبرا کر منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔ ''سوچ رہی تھی کہ واقعی اگر تم لوگ دیکھنا چاہتے ہو تو کیوں نہ دیکھو۔''

نتاشا کھل کر ہنسی اور پاویل منہ بند کر کے۔

''چائے کے لئے شکریہ ننکو!'' خوخول نے کہا۔

''پہلے چائے پی تو لو پھر شکریہ ادا کرنا'' اس نے کہا۔ پھر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ''شاید میں مخل ہو رہی ہوں؟''

''میز بان اپنے مہمانوں کی باتوں میں کہیں مخل ہو سکتا ہے؟'' نتاشا نے جواب دیا۔ ''لیکن ذرا مجھے جلدی سے چائے دیدہ نا! سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہوں اور پاؤں بالکل ٹھنڈے برف ہو رہے ہیں!'' اس کا لہجہ کچھ فریادی اور شکایتی سا تھا، بالکل بچوں کے لہجے کی طرح۔

''ابھی ابھی دیتی ہوں!'' ماں نے جلد سے کہا۔

جب نتاشا چائے پی چکی تو اس نے بڑے زور سے سانس لیا، اپنی چوٹی کو جھٹکا دے کر کندھے کے پیچھے ڈال دیا اور زرد جلد والی مصور کتاب میں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ ماں چائے بناتی گئی اور کتاب سنتی گئی۔ اور اس وقت اس نے کوشش کی کہ برتنوں سے شور نہ ہو۔ نتاشا کی کھنک دار آواز سماوار کی مفکرانہ سنسناہٹ کے ساتھ مل گئی اور کمرے میں وحشی انسانوں کے متعلق کہانیوں کے تانے بانے بکھرنے لگے جو کبھی گپھاؤں میں رہتے اور پتھروں سے شکار کرتے تھے۔ ساری باتیں پریوں کی کہانی کی طرح معلوم ہو رہی تھیں کہ اس نے مہمانوں کا مطالعہ شروع کر دیا، لیکن چوری چوری، تاکہ نہ تو اس کا بیٹا اور نہ ہی دوسرے لوگ اس بات کو محسوس کر سکیں۔

پاویل نتاشا کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ ان میں سب سے زیادہ خوب صورت تھا۔ نتاشا کتاب پر جھکی ہوئی تھی اس لیے اسے اپنے بالوں کو بار بار ٹھیک کرنا پڑ رہا تھا جو اڑ اڑ کر اسکی کنپٹیوں پر آ رہے تھے۔ کبھی کبھی کتاب کی طرف دیکھے بغیر چاروں طرف کے لوگوں پر محبت نظریں ڈالتے ہوئے وہ سر کی ایک جنبش کے ساتھ آواز نیچی کر کے اپنی رائے کا اظہار بھی کرتی۔ خوخول میز کے دوسرے سرے پر بڑی بے تکلفی سے پاؤں پسارے بیٹھا ہوا تھا اور کنکھیوں سے اپنی ناک کے نیچے مونچھوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور انہیں بل دے رہا تھا، وہ ہتھیلیوں کو گھٹنوں پر جمائے ہوئے تھا اور اس کا چیچک زدہ بغیر بھوؤں اور پتلے پتلے ہونٹوں والا چہرہ بالکل ایک بے جان مورتی کی طرح جذبات سے عاری تھا۔ وہ پیتل کے چمکتے ہوئے سماوار میں اپنے چہرے کے عکس پر بغیر پلک جھپکائے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گاڑے ہوئے تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ سانس بھی نہ لے رہا ہو۔ مختصر فیدور کتاب کو سنتے ہوئے اپنے ہونٹ ہلاتا جا رہا تھا جیسے وہ انہیں الفاظ کو دھرا رہا ہو اور اس کا دوست بالکل جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کی کہنیاں گھٹنوں پر تھیں، وہ تھیلیوں سے گالوں کو سہارا دئے ہوئے تھا اور اس کے ہونٹوں پر فکر میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ پاویل کے ساتھ جو لڑکے آئے تھے ان میں سے ایک کے سرخی مائل اور گھنگریالے بال تھے اور مسکراتے ہوئی سبزی

مائل آنکھیں۔ وہ بڑی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ دوسرا لڑکا جس کے بال سنہرے اور چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے تھے، اپنے ہاتھ سے سر کو بار بار چھور رہا تھا اور اس طرح فرش کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب وغریب، آرام دہ فضا پیدا ہوگئی تھی جس میں میں کچھ بیگانہ پن بھی تھا۔ نتاشا کی آواز کے پس منظر میں ماں کو خود اپنی جوانی کی پرشور شامیں یاد آئیں، لڑکوں کو بھونڈی زبان اور بھدے مذاق، جن کے سانسوں سے ہمیشہ ووڈکا کی بو آیا کرتی تھی اور جبا سے یہ سب یاد آیا تو اپنے لئے توحم اور دردمندی کے جذبے نے اس کا دل مسوس دیا۔

اسے یاد آیا کہ اس کے شوہر سے اس کی شادی کس طرح طے پائی تھی۔ اس قسم کی ایک دعوت میں اس نے ایک تاریک ڈیوڑھی میں اسے پکڑ کر دیوار سے لگا کر اسے دبا دیا تھا۔

''شادی کروگی مجھ سے؟'' اس نے کرختگی اور روکھے پن سے پوچھا تھا۔ اسے تکلیف بھی ہوئی اور اس کے جذبات بھی مجروح ہوئے تھے۔ لیکن وہ اسی تکلیف دہ انداز سے اس کے سینے کو مسلتا رہا اور اس کے منہ پر اپنے گرم ونم سانس چھوڑتا رہا تھا۔ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے وہ ایک طرف کو کھسک گئی تھی۔

''جا کہاں رہی ہو؟'' وہ چلایا تھا۔ ''سنتی ہو۔ مجھے جواب دے کر جاؤ۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تکلیف اور شرم کے مارے اس کے لئے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کسی نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا اور اس نے آہستہ آہستہ اپنی گرفت ڈھیلی کر دی تھی۔

''اتوار کے دن میں مشاطہ کو بھیجدوں گا'' اس نے کہا تھا۔

اور وہی ہوا۔

ماں نے آنکھیں بن کرلیں اور گہرا سانس لیا۔

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ لوگوں کو کس طرح رہنا چاہئے نہ یہ کہ وہ کیسے رہا کرتے تھے'' وسوف شیکوف کی پراحتجاج آواز آئی۔

''بالکل صحیح ہے'' سرخ بالوں والے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے تم سے اتفاق نہیں ہے!'' فیدور نے زور سے کہا۔

اس بات پر بحث ہونے لگی۔ الفاظ شعلوں کی طرح لپک رہے تھے۔ ماں کی سمجھ میں نہیں آرہا

تھا کہ یہ لوگ کس چیز کے متعلق شور مچا رہے ہیں۔سب کے چہرے شدت جوش سے تمتما رہے تھے۔لیکن کسی کو غصہ نہ آیا اور نہ کسی نے وہ گندے الفاظ استعمال کیئے جن کو سننے کی وہ عادی ہو چکی تھی۔

''شاید انہیں لڑکی کے سامنے گندے الفاظ استعمال کرتے شرم آرہی ہے'' اس نے فیصلہ کر لیا۔

نتاشا کے چہرے کا سنجیدہ انداز ماں کو پسند آیا جو ہر شخص کو غور سے دیکھ رہی تھی، جیسے وہ ان سب لوگوں کو بچہ سمجھ رہی ہو۔

''یہ لوگ بالکل صحیح ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں ہر چیز کا علم ہونا چاہیئے،ہمیں اپنے ذہنوں کو ادراک اور عقل و دانش کی روشنی سے منور کرنا چاہیئے اور ان لوگوں کو روشنی دکھانا چاہیئے جن کی ذہنوں پر لاعلمی کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہمارے پاس ہر چیز کا ایماندارانہ اور سچا جواب ہونا چاہیئے۔ہمیں مکمل صداقت اور مکمل جھوٹ کا علم ہونا چاہیئے...''

خوخول اس کے الفاظ سن رہا تھا اور اس کی تائید میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔وسوف شیکوف اور سرخ بالوں والا لڑکا اور ایک وہ لڑکا جو پاویل کے ساتھ آیا تھا اور کارخانے میں کام کرتا تھا،ایک الگ گروپ میں تھے اور کسی وجہ سے ماں کو وہ لوگ پسند نہ آئے۔

جب نتاشا نے اپنی بات ختم کر لی تو پاویل کھڑا ہوا۔

''کیا ہمیں صرف پیٹ بھر روٹی ہی چاہیئے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے!'' اس نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے سکون سے کہا۔''ان لوگوں کو جو ہماری پیٹھ پر سوار ہین اور جنہوں نے ہماری آنکھیں بند کر رکھی ہیں،ہمیں یہ بتا دینا چاہیئے کہ ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ نہ تو ہم بیوقوف ہیں اور نہ جانور کہ ہمیں اپنا پیٹ بھرنے کے علاوہ اور کچھ چاہیئے ہی نہیں۔ہم ایسی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں جو انسانوں کے شایان شان ہو،ہمیں اپنے دشمنوں پر یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ غلامی کی زندگی جو انہوں نے ہم پر مسلط کر رکھی ہے،ہمیں ذہنی اعتبار سے ان کے برابر ہی نہیں بلکہ ان سے ارفع و اعلی ہونے سے بھی نہیں روک سکتی...''

اس کے الفاظ سنتے ہوئے ماں کے سینے میں غرور انگڑائی لینے لگا وہ کتنی اچھی طرح بول رہا تھا!

''بہت سے لوگ ہیں جنہیں کھانے کو کافی مل جاتا ہے،مگر ایسے لوگ کم ہیں جو ایماندار ہوں''

خوخول نے کہا۔ ’’اس غلیظ زندگی کی دلدل کے اوپر ہمیں ایک ایسا پل تعمیر کرنا ہے جو ہمیں اس مستقبل کی طرف لے جائے جہاں انسانی برادری کا راج ہوگا۔ ہمارے سامنے یہی فریضہ ہے، ساتھیو!‘‘

’’جب ایک بار لڑنے کا وقت آ گیا تو پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ؟‘‘ وسوف شیکوف نے چڑ چڑے انداز میں اعتراض جڑ دیا۔

یہ محفل آدھی رات کے بعد برخاست ہوئی۔ وسوشیکوف اور سرخ بالوں والا لڑکا سب سے پہلے گئے، اور یہ بات ماں کو پھر نا گوار گذری۔

’’انہیں جلدی کس چیز کی ہے‘‘ اس نے ان کو نے دلی سے رخصت کرتے ہوئے سوچا۔

’’مجھے گھر تک چھوڑ آؤ گے نخودکا؟‘‘ نتاشا نے دریافت کیا۔

’’ضرور‘‘ خوخول نے جواب دیا۔

’’ایسے موسم کے لئے تمہارے موزے بہت باریک ہیں‘‘ ماں نے نتاشا سے کہا جب کہ وہ باورچی خانے میں کوٹ وغیرہ پہن رہی تھی۔ ’’میں تمہارے لئے اونی موزے بن دوں؟‘‘

’’شکریہ پلاگیا نلوونا۔ لیکن اونی موزے چبھتے ہیں‘‘ نتاشا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

’’تمہارے لئے ایسے بن دوں گی جو کبھی نہ چبھیں گے‘‘ ماں نے کہا۔

نتاشا نے ادھ کھلی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا۔ اس کے اس طرح غور سے، نظر جما کر دیکھنے سے ماں کچھ پریشان سی ہوگئی۔

’’میری بے وقوفی کا برا نہ ماننا، میں نے جو کچھ کہا دل سے کہا تھا‘‘ ماں نے بہت نرمی اور آہستگی سے کہا۔

’’تم کتنی اچھی ہو!‘‘ نتاشا نے بھی اسی قدر نرمی اور آہستگی سے بے اختیارانہ ماں کا ہاتھ دباتے ہوئے ہوئے کہا۔

’’خدا حافظ ننکو‘‘ نتاشا کے پیچھے جاتے ہوئے خوخول نے جھک کر دروازے میں سے نکلتے ہوئے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ماں نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

’’کیوں مسکرا رہے ہو؟‘‘ ماں نے کچھ گھبرا کر پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔بس اچھا معلوم ہو رہا ہے۔''

''میں بوڑھی اور کم سمجھ سہی لیکن اچھی چیز تو میں بھی سمجھ لیتی ہوں'' اس نے ذرا خفا ہو کر جواب دیا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے'' اس نے کہا۔''لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اب تم جا کر سو جاؤ، بہت وقت ہو گیا۔''

''میں جا ہی رہی ہوں۔''

وہ اضطرار کے عالم میں میز پر سے برتن اٹھانے لگی۔آج وہ بے انتہا مسرور تھی۔اتنی مسرور کہ سچ مچ وہ پسینے سے تر بتر ہو گئی۔وہ خوش تھی کہ ہر چیز خوش سلیقگی سے ہوئی اور بخیر خوبی ختم ہو گئی۔

''تم نے یہ بہت اچھا کیا پاشا'' ماں نے کہا۔''خوخول بہت اچھا ہے۔اور وہ لڑکی۔کتنی پھرتیلی ننھی سی گڑیا ہے! کون ہے وہ؟''

''استانی ہے'' پاویل نے ٹہلتے ہوئے بہت مختصر سا جواب دیا۔

''بہت غریب ہوگی۔کتنے خراب کپڑے تھے، ایسے میں سردی لگتے کیا دیر لگتی ہے! اس کے والدین کہاں ہیں؟''

''ماسکو میں'' پاویل نے جواب دیا اور اس کے بعد اپنی ماں کے سامنے رکتے ہوئے نرمی اور بہت سنجیدگی سے بولا۔''اس کا باپ امیر آدمی ہے، لوہے کی تجارت کرتا ہے اور اس کے کئی مکانات ہیں ۔لیکن باپ نے اسے عاق کر دیا کیوں کہ اس نے اپنی زندگی کا یہ راستہ اختیار کر لیا تھا۔وہ آرام آسائش میں پلی بڑھی، جو بھی چاہتی اسے مل جاتا تھا۔لیکن اب وہ رات کو تن تنہا چار پانچ میل پیدل چلتی ہے...''

ماں کو یہ سن کر ایک دھکا سا لگا۔وہ کمرے کے درمیان بے حس و حرکت کھڑی ہو گئی۔بھوؤں کو سکیڑتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔پھر پوچھا:

''اب شہر گئی ہے؟''

''ہاں۔''

''چہ۔چہ۔ڈر بھی نہیں لگتا؟''

''تم خود ہی دیکھ لو نا کہ اسے ڈر نہیں لگتا'' پاویل ہنسا۔

''لیکن کیوں؟ رات کو یہیں رہ سکتی تھی۔ میرے ساتھ سو جاتی۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ممکن ہے اسے صبح کو کوئی دیکھ لیتا اور یہ ہم نہیں چاہتے۔'' ماں خیالات میں محو کھڑکی سے باہر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں خطرناک اور ممنوع کون سی بات ہے، پاویل'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم کوئی غلط بات تو نہیں کرتے۔ کیوں ہے نا؟''

یہی خیال اسے پریشان کر رہا تھا اور اسی لئے وہ اپنا اطمینان کرنا چاہتی تھی۔

''ہم کوئی غلط بات نہیں کرتے'' اس نے پورے یقین سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''لیکن اس کے باوجود ایک نہ ایک دن ہم سب لوگ جیل میں نظر آئیں گے۔ یہ بات سن رکھو۔''

ماں کے ہاتھ کانپنے لگے۔

''خدا نے چاہا تو تم لوگ کسی نہ کسی طرح بچ جاؤ گے نا؟'' اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''نہیں'' اس کے بیٹے نے نرمی سے کہا۔ ''میں تمہیں دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ ہم بچ نہیں سکتے۔''

وہ مسکرایا۔

''جاؤ سو جاؤ۔ تم تھک گئی ہو۔ خدا حافظ۔''

جب وہ تنہا رہ گئی تو کھڑکی کے پاس گئی اور کھڑی ہو کر باہر کی طرف دیکھتی رہی۔ باہر فضا سرد اور ابر آلود تھی۔ چھوٹے چھوٹے سوئے سوئے سے مکانوں کی چھتوں پر سے ہوا برف کے گالوں کو اڑائے لئے جا رہی تھی۔ کبھی دیواروں سے ٹکراتی، کبھی جھنجھلائے ہوئے انداز میں سرگوشیاں کرتی، پھر زمین پر پھیل جاتی اور خشک برف کے گالوں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیروں کا دور تک تعاقب کرتی ان سڑک پر بکھیرتی چلی جاتی۔

''یسوع ہم پر رحم کرو'' ماں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اس کے سینے میں آنسوؤں کا طوفان امنڈنے لگا اور آنے والے سانحے کا خوف جس کے متعلق اس کے بیٹے نے اس پرسکون تیقن سے کہا تھا، اس کے سینے میں اسی بے بسی سے پھڑ پھڑانے لگا جس طرح رات میں پروانہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا برف پوش میدان پھر گیا جس میں تیز و تند ہوا چیختی اور سر ٹکراتی پھر رہی تھی۔ میدان کے بیچ میں ایک لڑکی کا مختصر سا سیاہ سایہ بھٹکتا

ہوا پھر رہا تھا۔ ہوا اس کے پیروں کا چکر لگاتی، اس کے لباس کو اڑاتی، اس چہرے پر چبھتے ہوئے برف کے گالے مار رہی تھی۔ وہ بڑی دقت سے آگے بڑھ رہی تھی، اسکے ننھے ننھے پاؤں برف میں دھنسے جا رہے تھے، غضب کی سردی اور بھیانک سناٹا تھا۔ اس کا جسم آگے کی طرف جھک گیا تھا جیسے ایک ننھا نازک سا پودا خزاں کی تیز و تند ہوا سے جھک گیا ہو۔ اس کے دائیں طرف دلدل میں جنگل دیوار بنا کھڑا تھا جہاں برچ کے پتلے اور سفیدے کے بے برگ و بار درخت لاچاری سے سسکیاں بھر رہے تھے۔ سامنے بہت دور شہر کی روشنیاں چمک رہی تھیں...

''یسوع، ہمارے نجات دہندہ، رحم کر!'' ماں نے خوف سے کانپ کر آہستہ سے کہا۔

7

دن، تسبیح کے دانوں کی طرح ایک کے بعد ایک آتے رہے اور ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ ہر سنیچر کو پاویل کے دوست اس کے گھر پر جمع ہوتے اور ہر اجتماع اس اونچی سیڑھی پر ایک قدم اور اوپر کی طرف ہوتا جس پر لوگ کسی دور کی منزل کی طرف جانے کے لئے آہستہ آہستہ چڑھ رہے تھے۔

پرانوں کے ساتھ نئے لوگ شامل ہو گئے۔ وہ لاسوف خاندان کے گھر کا چھوٹا کمرہ لوگوں سے بھر جاتا۔ نتاشا تھکی ہاری سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی آتی لیکن وہ خوش و خرم ہوتی تھی۔ پاویل کی ماں نے اس کے لئے ایک جوڑی موزہ بن دیا اور اس کے چھوٹے سے پیروں میں اپنے ہاتھ سے پہنا بھی دیا۔ پہلے تو نتاشا ہنسی لیکن دفعتاً خاموش اور سنجیدہ ہوگئی۔

''میری ایک انا تھی وہ بھی اتنی ہی غیر معمولی شفیق اور نرم دل تھی'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کتنی عجیب سی بات ہے پلاگیا نلووونا۔ محنت کش لوگوں کی زندگی سخت اور کٹھن ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ محبت والے ہوتے ہیں...'' اس نے بہت دور کے، اپنے سے بہت ہی دور کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

''تم بھی خوب ہو!'' پلاگیا نے کہا۔ ''اپنے ماں باپ، گھر بار، سب سے جدا...'' اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لئے الفاظ نہ ملنے پر خاموش ہوگئی۔ لیکن نتاشا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر کسی مبہم سی چیز کے لئے اس کے دل میں جذبہ تشکر پیدا ہا۔ وہ اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ لڑکی آگے کی طرف سے جھکائے کچھ سوچ کی مسکراتی رہی۔

''ماں باپ سے جدا ہو کر؟'' اس نے دھرایا۔ ''یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے۔ میرا باپ سخت گیر انسان ہے اور میرا بھائی بھی ویسا ہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ شرابی بھی ہے۔ میری بڑی بہن بہت دکھی ہے...اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی ہے جو عمر میں اس سے کئی برس بڑا ہے....بہت امیر لیکن بہت کمینہ اور کنجوس ہے۔ مجھے اپنی ماں کا البتہ خیال آتا ہے۔ وہ سیدھی سادی سی عورت ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔ایک چھوٹی سی گلہری کی مانند۔ تیزی سے چلتی بھی گلہری کی طرح ہے اور ہر چیز سے اسی طرح ڈرتی بھی ہے۔کبھی کبھی ماں سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ بہت بری طرح!''

''بیچاری بچی!'' ماں نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔لڑکی نے فوراً سر اوپر اٹھایا اور اپنا ہاتھ آگے کی طرف بڑھایا جیسے کسی چیز کو سامنے ہٹا رہی ہو۔

''ارے نہیں! کبھی کبھی تو میں اتنی خوش ہوتی ہوں کہ کچھ حد نہیں! انتہائی مسرور!''

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کی نیلگوں آنکھیں چمکنے لگیں۔اس نے اپنے ہاتھ ماں کے کاندھے پر رکھ دئے۔

''اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کی نیلگوں آنکھیں چمکنے لگیں۔اس نے اپنے ہاتھ ماں کے کاندھے پر رکھ دئے۔

''کاش تمہیں معلوم ہوتا...کاش تم سمجھ سکتیں کہ ہم کتنا عظیم الشان کام کر رہے ہیں!'' اس نے نرمی اور اعتماد سے کہا۔

پلا گیا ولاسودا کے دل میں ایک عجیب سا جذبہ ابھرا جس میں کچھ رشک کی ملاوٹ تھی۔

''یہ سب سمجھنے کے لئے میں بہت بوڑھی ہو چکی ہوں اور ان پڑھ بھی'' اس نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے دکھ بھرے انداز میں کہا...

... پاویل اب اکثر و بیشتر مباحث میں حصہ لیتا اور پہلے سے زیادہ دیر تک اور زیادہ شدت اور گہرائی سے بولتا تھا۔ وہ برابر دبلا ہوتا رہا۔اس کی ماں کو ایسا محسوس ہوتا کہ جب وہ نتاشا کی طرف دیکھتا اور اس سے باتیں کرتا ہے تو اس کی نگاہوں کی سختی نرم پڑ جاتی، اس کی آواز میں زیادہ شگفتگی پیدا ہو جاتی اور اسکے انداز میں زیادہ ملائمت آجاتی تھی۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو جائے'' اس نے سوچا اور مسکرائی۔

جب بھی ان کے اجتماع میں بحث تیزی اور شدت اختیار کر جاتی تو خوخول کھڑا ہو جاتا اور گھنٹی کی موگری کی طرح آگے پیچھے جھومتا اور کچھ ایسے نرم اور سیدھے سادے جملے کہتا کہ ہر شخص ٹھنڈا پڑ جاتا۔ چڑ چڑا وسوف شیکوف ہمیشہ دوسروں کو کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے اکسایا کرتا۔ وہ اور سرخ بالوں والا شخص جسے وہ لوگ سموئلوف کہتے تھے ہمیشہ بحث شروع کرتے تھے۔ ان کی تائید گول سر والا ایوان بوکن کرتا جو ایسا نظر آتا جیسے سجی دار پانی سے نہلا کر نکالا گیا ہے۔ یاکوف سوموف جو ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا بہت کم بولتا لیکن بہت سنجیدگی سے باتیں کرتا، وہ اور کشادہ پیشانی والا فیدور مازن بحث میں ہمیشہ پاویل اور خوخول کی تائید کرتے۔

بعض اوقات نتاشا کے بجائے ایک دوسرا شخص آتا جس کا نام تھا نکولائی ایوانووچ۔ وہ عینک لگاتا تھا۔ اور اس کی چگی ڈاڑھی بھورے رنگ کی تھی۔ وہ کسی دور دراز علاقے میں پیدا ہوا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ''و'' کو ذرا عجیب انداز سے کھینچ کر بولا کرتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ کچھ ''مختلف'' تھا۔ وہ روزمرہ کی سیدھی سادی چیزوں کی باتیں کرتا: خاندانوں کی نجی زندگی اور بچوں کے متعلق اور تجارت اور پولس اور روٹی اور گوشت کی قیمت کے متعلق۔ غرض ان ساری چیزوں کے متعلق جن کا تعلق لوگوں کی روزانہ کی زندگی سے تھا۔ لیکن وہ اس انداز سے باتیں کرتا کہ ان ساری جھوٹی اور غیر عقلی، ساری واہیات اور مضحکہ خیز چیزوں کی قلعی کھل جاتی جو عوام کے لئے نقصان دہ ہوتیں۔ ماں کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ بہت دور سے، کسی دور دراز ملک سے آیا ہے بلکہ ایسی جگہ سے جہاں ہر شخص آرام اور ایمانداری سے زندگی بسر کرتا ہے۔ یہاں کی ہر چیز اس کے لئے عجیب و غریب تھی اور وہ اس زندگی کا عادی نہ ہو سکا اور اسے ایک ناگزیر حقیقت سمجھ کر قبول نہ کر سکا۔ وہ اس زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق بدلنے کا ایک بھرپور اور پرسکون جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ کچھ زردی مائل تھا اور اس کی آنکھوں کے گرد باریک باریک جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی آواز بڑی نرم تھی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ گرم رہتے تھے۔ جب کبھی وہ پلاگیا ولاسووا سے مصافحہ کرتا تو وہ اس کا پورا ہاتھ اپنی انگلیوں میں لے لیتا اور ماں کو ہمیشہ اس سے سکون اور آرام سا ملتا تھا۔

ان محفلوں میں شہر کے دوسرے لوگ بھی شامل ہونے لگے۔ عموماً ایک لمبی دبلی سی لڑکی آیا کرتی جس کے زرد چہرے پر بہت ہی بڑی بڑی آنکھیں تھیں اور جس کا نام تھا ساشا۔ اس کی چال اور اس کی حرکات و سکنات میں کچھ مردانہ پن سا تھا۔ وہ اپنی گھنی سیاہ بھوؤں کو بڑے تیکھے انداز میں سکیڑ لیتی اور

جب بات کرتی تو تو اس کی ستواں ناک کے باریک نتھنے پھڑکنے لگتے۔

سب سے پہلے اسی نے ایک تیز اور بلند آواز میں اعلان کیا تھا:

''ہم۔سوشلسٹ ہیں...''

جب ماں نے یہ سنا تو وہ لڑکی کی طرف خاموشی سے خوفزدہ انداز میں دیکھتی رہی۔ پلاگیا نے سن رکھا تھا کہ سوشلسٹوں نے زار کو قتل کیا تھا۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ جوان تھی۔اس زمانے میں یہ قصہ مشہور تھا کہ نوابوں اور زمین داروں نے زار سے جس نے ان کے زرعی غلام آزاد کر دیئے تھے، انتقام لینے کے لئے یہ قسم کھائی تھی کہ وہ اس وقت تک اپنے بال نہ منڈوائیں گے جب تک زار کو قتل نہ کر دیں اسی لئے انہیں سوشلسٹ کہا جانے لگا۔ پلاگیا کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کا بیٹا اور اس کے دوست اپنے آپ کو سوشلسٹ کیوں کہتے ہیں۔

جب سب لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے تو وہ پاویل کے پاس گئی۔

''پاشا تم سوشلسٹ ہو کیا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ہاں!'' اس نے کہا، وہ ہمیشہ کی طرح سیدھا اور طاقت ور ماں کے سامنے کھڑا تھا۔''کیوں پوچھ رہی ہو؟''

اس کی ماں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور نظریں جھکا لیں۔

''واقعی، پاویل؟ لیکن وہ لوگ تو۔زار کے خلاف ہیں۔انہوں نے ایک زار کو تو قتل بھی کر دیا تھا۔''

پاویل کمرے میں ٹہلنے لگا اور اپنے گالوں کو ہاتھوں سے سہلانے لگا۔

''ہمیں اس قسم کی حرکتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے'' اس نے ایک مختصر سی ہنسی ہنس کر کہا۔

پھر وہ بڑی دیر تک بڑی نرمی اور سنجیدگی سے اسے سمجھاتا رہا۔ ماں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے خیال آیا:

''یہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گا! کبھی نہ کرے گا!''

اس کے بعد وہ خوفناک لفظ بار بار دھرایا گیا یہاں تک کہ اس کی تیز دھار کند پڑ گئی۔اور ماں کے کان اس لفظ سے اسی طرح آشنا ہو گئے جیسے دوسرے درجنوں الفاظ سے جنہیں وہ لوگ استعمال کرتے تھے۔لیکن اس ساشا پسند نہ آئی اور اس کی موجودگی میں وہ کچھ بے چین اور گھبرائی ہوئی سی رہتی تھی۔

ایک دن اس نے اس لڑکی کے متعلق خوخول سے بات کی اور اپنے ہونٹ اس طرح بھینچ لئے جیسے وہ اسے انتہا ناپسند ہو۔

''اوفوہ، کس قدر سخت گیر لڑکی ہے! ہر شخص کو حکم دیا کرتی ہے۔ یہ کرو، وہ کرو!''

''کیسی صحیح بات کہی ہے، بالکل صحیح ننکو! پاویل تمہارا کیا خیال ہے؟'' ماں کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''یہ ہے طبقہ اشرافیہ!''

''وہ بہت اچھی لڑکی ہے'' پاویل نے خشک انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے'' خوخول نے جواب دیا۔ ''لیکن وہ ایک بات نہیں سمجھتی: وہ کہتے ہے، کرنا چاہئے، ہم کہتے ہیں 'کر سکتے ہیں، اور 'چاہتے ہیں۔''

اور وہ کسی ایسی چیز کے متعلق بحث کرنے لگے جو ماں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

ماں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ساشا پاویل کے ساتھ سب سے زیادہ سختی سے پیش آتی تھی، اور کبھی کبھی اس پر خفا بھی ہوتی تھی۔ ایسے وقت پاویل کچھ نہ کہتا، وہ صرف ہنس دیتا اور اس نرم و پر محبت انداز سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا جس طرح وہ کبھی نتاشا کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ ماں کو یہ بات بھی اچھی نہ لگتی تھی۔

پلاگیا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ بعض اوقات ایک دم سب لوگوں پر بے انتہا خوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ عموماً انہیں دنوں میں ہوتا جب وہ دوسرے ملکوں کی مزدور تحریک کے متعلق اخباروں سے خبریں پڑھتے۔ اس وقت ان سب کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں اور وہ لوگ کچھ عجیب انداز سے بچوں کی طرح خوش ہوتے اور ان کی ہنسی صاف شفاف اور معصوم ہوتی، اور وہ ایک دوسرے کی پیٹھ کو بڑے پیار سے تھپتھپاتے۔

''ہمارے جرم ساتھی زندہ باد!'' کوئی چیختا جیسے خود اپنی خوشی کے نشے میں مست ہو۔

''اٹلی کے مزدور زندہ باد!'' دوسرے وقت انہوں نے نعرہ لگایا۔

جب وہ اپنے دور دراز رفیقوں کے نام، جو نہ تو انہیں جانتے تھے اور نہ ہی ان کی زبان سمجھ سکتے تھے، یہ نعرے بلند کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ انہیں یقین ہے کہ ان نامعلوم لوگوں نے ان کی آوازیں سن لیں اور انکی مسرت کو سمجھ لیا ہے۔

''کتنا اچھا ہو اگر ہم انہیں خط لکھ سکیں!'' خوخول نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بے پایاں محبت کی چمک تھی۔ ''تا کہ انہیں معلوم ہو سکے کہ یہاں روس میں بھی ان کے دوست رہتے ہیں جو اسی مذہب میں یقین رکھتے ہیں اور اسی کا پرچار کرتے ہیں جو ان کا مذہب ہے اور جن کی زندگی کا مقصد بھی وہی ہے جو ان کا ہے اور جو انہیں فتوحات اور کامیابیوں سے خوش ہوتے ہیں جن سے وہ ہوتے ہیں!''

جب وہ فرانسیسی اور انگریز اور سویڈ لوگوں کا ذکر کرتے تو ان کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ اور چمک ہوتی جیسے وہ اپنے دوستوں کا ذکر کر رہے ہوں، ایسے لوگوں کا جو انہیں عزیز ہیں، جن کی وہ عزت کرتے ہیں اور جن کے رنج ومسرت میں وہ شریک ہیں۔

اس چھوٹے سے دم گھٹنے والے کمرے میں ساری دنیا کے مزدوروں کے ساتھ ایک روحانی رشتے کے احساس نے جنم لیا تھا۔ اس احساس نے ماں کو بھی متاثر کیا اور سب کو ایک عظیم جذبے کے رشتے میں منسلک کر دیا تھا۔ اور حالانکہ اس احساس کے پورے معنی اس کے لئے ناقابل فہم رہے لیکن اس اس احساس کی بھرپور طاقت کا اندازہ تھا، جو بے انتہا پرمسرت اور پرامید اور مخمور کن تھی۔

''کیسی عجیب سی بات ہے!'' اس نے ایک دن خوخول سے کہا۔ ''تمام لوگ تمہارے رفیق ہیں۔ یہودی اور آرمینی اور آسٹرین۔ تم سب کے لئے خوش ہوتے اور سب کے لئے افسوس کرتے ہو!''

''سب کے لئے میری ننکو، سب کے لئے!'' خوخول نے جواب دیا۔ ''ہمیں کوئی قبیلہ نہیں چاہئے، کوئی قوم نہیں چاہئے۔ لوگ یا تو ہمارے رفیق ہیں یا دشمن۔ سارے محنت کش ہمارے رفیق ہیں، سارے امیر لوگ اور ساری حکومتیں ہماری دشمن ہیں۔ تم ساری دھرتی پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ ہم مزدور کتنی تعداد میں ہیں اور ہم کتنے طاقتور ہیں تو پھر تمہارے دل میں مسرت اور شادمانی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی! فرانسیسی اور جرمن بھی جب زندگی کو دیکھتا ہے تو اسے بھی یہی محسوس ہوتا ہے ننکو، اور اطالوی بھی یہی محسوس کرتا ہے۔ ہم سب ایک ہی ماں کے بچے ہیں، اور ساری دنیا کے مزدوروں کی برادری کا ناقابل شکست عقیدہ ہماری زندگیوں کو سوز وساز بخشتا ہے یہی عقیدہ ہمارے دلوں کو گرماتا ہے۔ یہ عدل وانصاف کے آسمان کا چمکتا ہوا سورج ہے اور وہ آسمان ہے مزدور کے دل میں۔ وہ کوئی بھی ہو اور اس کا نام کچھ ہی ہو ایک سوشلسٹ تمام عمر کے لئے ہمارا روحانی بھائی رہے گا۔ کل اور آج اور ہمیشہ کے لئے!''

یہ معصومانہ لیکن راسخ عقیدہ ان کے درمیان بار بار ظاہر ہونے لگا، وہ زیادہ اونچی سطح پر ابھر کر آنے

لگا اور رفتہ رفتہ بڑھ کر ایک عظیم قوت میں تبدیل ہونے لگا اور جب ماں نے اس قوت کو دیکھا تو اسے غیر شعوری طور پر محسوس ہوا کہ بلاشبہ دنیا نے کسی ایسی چیز کو جنم دیا ہے جو سورج کی طرح عظیم اور سچی اور اچھی ہے، جسے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکی ہے۔

کبھی کبھی وہ لوگ گاتے۔ وہ اونچی مسرور آوازوں میں سیدھے سادے گانے گاتے، جن سے ہر شخص واقف تھا لیکن کبھی ترنم ہوتا لیکن جن کی دھن کچھ غیر معمولی سی ہوتی تھی ان گیتوں کو وہ دھیمے سروں میں گرجا کے گانوں کی طرح گاتے۔ گانے والے کے چہرے عرق آلود اور سرخ ہو جاتے اور گونجتے ہوئے الفاظ بھرپور قوت کا اظہار کرتے تھے۔

ماں خاص طور پر ایک نئے گانے سے بہت متاثر ہوئی۔ اس گیت میں کسی زخم خوردہ روح کے کرب ناک تفکر کا اظہر نہ تھا جو شبہات اور تذبذب کی بھول بھلیاں میں تن تنہا بھٹکتی پھر رہی ہو۔ اور نہ اس میں ان لوگوں پر نوحہ و ماتم تھا جنہیں ضرورتوں نے کچل دیا تھا، خوف نے دیوانہ بنا دیا تھا اور جن سے ان کا رنگ روپ اور کردار چھین لیا گیا تھا۔ اور اس میں ایسی قوت کی ماتمی سرد آہیں بھی نہ تھیں جو آنکھیں بند کئے فضائے بسیط میں متلاشی اور سرگرداں پھر رہی ہو، اور نہ ہی اس میں ناعاقبت اندیش جوش کی مبارز طلب چیخ پکار تھی جو اچھے برے دونوں پر ایک ہی طرح برس جانے کے لئے تیار ہو۔ اس گیت میں تکلیف اور انتقام کا وہ ناشناسانہ احساس بھی نہ تھا جو ہر چیز کو تباہ تو کر سکتا ہے لیکن تعمیر کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ غرض اس گیت میں پرانی غلامانہ دنیا کی کسی چیز کا شائبہ تک نہ تھا۔

ماں کو اس گیت کے سخت الفاظ اور کھردری سی دھن پسند نہ آئی۔ لیکن الفاظ اور دھن کے پیچھے کوئی اور عظیم تر چیز تھی جس نے الفاظ اور دھن کو پس پشت ڈال دیا اور دل میں کسی ایسی چیز کا احساس ابھار دیا تھا جو اپنی عظمت اور بے پایانی کی وجہ سے خیال کی گرفت میں آ ہی نہیں سکتی۔ اس نے اسی چیز کو ان نوجوانوں کی آنکھوں اور چہروں میں دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ چیز ان کے سینوں کے اندر رہتی ہے اور اس نے ایسی چیز کا احساس ابھار دیا تھا جو اپنی عظمت اور بے پایانی کی وجہ سے خیال کی گرفت میں آ ہی نہیں سکتی۔ اس نے اس چیز کو ان نوجوانوں کی آنکھوں اور چہروں میں دیکھا اور اسے نے ایسی قوت کے آگے سے جھکا دیا جس کا احاطہ نہ الفاظ کر سکتے ہیں نہ کوئی دھن۔ وہ دوسرے گیتوں کے مقابلے میں اس گیت کو زیادہ توجہ اور شدید تر جوش و ہیجان کے ساتھ سنتی۔

وہ لوگ اس گیت کو دوسرے گیتوں کے مقابلے میں کومل سروں میں گاتے لیکن اس کا تاثر زیادہ بھر پور ہوتا اور وہ تاثر تمام میں گاتے لیکن اس کا تاثر زیادہ بھر پور ہوتا اور وہ تاثر تمام لوگوں کو مارچ کے ایک خوبصورت دن کی، آتی ہوئی بہار کے پہلے دن کی، ہوا کی طرح لپیٹ لیتا۔

''اب تو وہ وقت ہے کہ ہم اس گیت کو سڑکوں پر گائیں!'' وسوف شیکوف جھنجھلا کر کہتا۔

جب اس کا باپ دوبارہ چوری کے جرم میں جیل بھیج دیا گیا تو وسوف شیکوف نے اپنے ساتھیوں سے آہستگی سے کہا:

''اب آپ لوگ میرے گھر جمع ہو سکتے ہیں۔''

تقریباً ہر روز شام میں پاویل کا کوئی نہ کوئی دوست کام کے بعد اس کے ساتھ گھر آتا اور وہ لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر پڑھتے اور نوٹ لیتے جاتے تھے۔ انہیں اتنی جلدی ہوتی اور وہ اپنے کام میں اتنے مصروف ہوتے کہ منہ ہاتھ دھونے کا وقت بھی نہ ملتا۔ کتابیں ہاتھ میں لئے ہی لئے وہ لوگ کھانا کھاتے اور چائے پیتے اور ماں کے لئے یہ سمجھنا روز بروز مشکل ہوتا گیا کہ یہ لوگ کس چیز کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔

''ہمیں ایک اخبار نکالنا چاہئے'' پاویل اکثر کہتا۔

زندگی زیادہ تیز رفتار اور گرم گرم ہوگ ئی اور لوگ بڑی تیزی سے ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب پڑھنے لگے جیسے شہد کی مکھیاں ایک پھول سے دوسرے پھول پر جا بیٹھتی ہوں۔

''ہمارے متعلق باتیں شروع ہو گئی ہیں'' ایک دن وسوف شیکوف نے کہا۔ ''جلد ہی ہماری گرفتاریوں کا آغاز ہونے والا ہے۔''

''مچھلی تو پیدا ہی جال کے لئے ہوئی ہے'' خوخول نے جواب دیا۔

ماں روز بروز اس سے نزدیک ہوتی گئی۔ جب وہ اسے ننکو کہہ کر پکارتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی ننھا بچہ اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔ اگر پاویل اتوار کو مصروف ہوتا تو خوخول لکڑیاں چیرتا۔ ایک دن وہ ایک تختہ اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے آیا اور کلہاڑی اٹھا کر تیزی کی مہارت سے دہلیز کے لئے ایک تختہ بنا دیا اور اسے اس تختے کی جگہ لگا دیا جو بالکل گل چکا تھا۔ دوسری بار اس نے بہت ہی خاموشی سے حصار کو ٹھیک کر دیا۔ کام کرتے وقت وہ ہمیشہ کوئی یاس انگیز اور خوب صورت دھن سیٹی میں بجایا کرتا۔

''خوخول کو اپنے گھر میں کرایہ دار کی حیثیت سے کیوں نہ رکھ لیں'' ایک دن اس نے اپنے بیٹے سے کہا۔''تم دونوں کے لئے اچھا رہے گا، تم لوگوں کو ایک دوسرے کے گھر نہیں بھاگنا پڑے گا۔''

''اپنے لئے زیادہ مصیبت کیوں مال لیتی ہو؟'' پاویل نے کاندھے کا جھٹکا دیتے ہوئے جواب دیا۔

''بلاوجہ کی بات مت کرو'' اس نے کہا۔''میری ساری زندگی مصیبت میں گذری ہے اور وہ بھی بغیر کسی اچھے سبب کے۔ اگر اس جیسے شخص کی خاطر کچھ تھوڑی مصیبت بھی اٹھانی پڑے تو کیا ہوا۔''

''تم جیسا کہو'' اس کے بیٹے نے کہا۔''اگر وہ یہاں آ گیا تو مجھے خوشی ہو گئی...''

اور اس طرح خوخول اس گھر میں منتقل ہو گیا۔

8

بستی کے کنارے یہ چھوٹا سا مکان لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ درجنوں شبہ آمیز، سراغرساں آنکھیں نظروں ہی نظروں میں اس کے در و دیوار میں سوراخ ڈالے دے رہی تھیں۔ افواہوں کے داغدار بال و پر اس مکان کے اوپر ہیجان انداز میں پھڑ پھڑانے لگے۔ لوگ اس نالے کے کنارے والے گھر سے اس پراسرار چیز کو خوف زدہ کر کے نکالنے کی کوشش کرنے لگے جو انہیں اس کے اندر چھپی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ راتوں کو وہ کھڑکیوں میں سے اندر جھانکتے اور کبھی کبھی تو شیشوں پر دستک بھی دے دیتے اور ڈر کر فوراً بھاگ کھڑے ہوتے۔

ایک دن پلاگیا کو شراب خانے کے مالک بیگنتسوف نے سڑک پر روک لیا۔ وہ اچھی صورت شکل کا بوڑھا تھا جو ہر وقت ارغوانی رنگ کے مخمل کی صدری پہنے رہتا اور اپنی تھل تھلی سی سرخ گردن میں ایک سیاہ ریشم کا رومال لپیٹے رہتا تھا۔ اس کی باریک چمکیلی ناک پر کچھوے کے خول کی عینک رکھی رہتی تھی جس کی وجہ سے لوگوں نے اس کا نام رکھ دیا تھا ''ہڈی کی آنکھیں۔''

جواب کا انتظار کئے بغیر ایک ہی سانس میں اس نے ماں پر خشک اور سخت الفاظ کی بوچھار کر دی۔

''کیسا مزاج ہے پلاگیا نلوونا؟ اور تمہارا بیٹا؟ شادی تو نہیں کرنے والا وہ، یا ارادہ ہے؟ میں تو کہوں گا یہی مناسب عمر ہے۔ بیٹوں کی جتنی جلد شادی ہو جائے والدین کے لئے اتنا ہی اچھا ہے۔ ایک

انسان خاندان میں رہ کر جسمانی اور روحانی دونوں طرح زیادہ بہتر حالت میں رہ سکتا ہے۔ جیسے سر کے میں ٹکر متے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس کی شادی اب تک کر چکا ہوتا۔ وقت کا تقاضہ تو یہی ہے کہ غور سے دیکھا جائے کہ ہر شخص ان دنوں کرتا کیا ہے۔ اب لوگوں نے اپنی من مانی زندگی گزارنی شروع کر دی ہے۔ افعال اور خیالات دونوں ہی ضرورت سے زیادہ بے لگام ہو گئے ہیں۔ نوجوان لوگ آج کل عبادت کرنے جاتے ہی نہیں اور عام جگہوں سے دور رہتے ہیں، تاریک کونوں میں چھپ کر اپنے راز بیان کرتے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر یہ لوگ کھس پھس کیوں کرتے ہیں؟ یہ لوگ دوسرے لوگوں سے دور کیوں رہتے ہیں؟ وہ کیا بات ہے جو کوئی شخص دوسروں کے سامنے کہنے سے، مثلاً شراب خانے میں کہنے سے، ڈرتا ہے؟ راز! راز کی واحد جگہ تو ہمارا حواری کلیسا ہے! دوسرے تمام راز جو کونوں کھدروں میں کہے جاتے ہیں ذہنوں کے انتشار کی پیداوار ہیں۔ خدا کرے تمہاری صحت اچھی رہے پلا گیا نلوونا!''

اس نے تعظیماً اپنی ٹوپی اتاری، اسے ہلا کر بڑے انداز سے سلام کیا اور ماں کو حیران پریشان چھوڑ کر چلا گیا۔

ایک دوسری مرتبہ ولاسوف کی پڑوسن ماریا کارسونووا، جو ایک لوہار کی بیوہ تھی اور کارخانے کے پھاٹک پر کھانے کی چیزیں فروخت کیا کرتی تھی ماں سے بازار میں ملی اور بولی:

''ذرا اپنے بیٹے پر نظر رکھو پلا گیا!''

''تمہارا مطلب کیا ہے؟'' ماں نے دریافت کیا۔

''افواہیں پھیل رہی ہیں'' ماریا نے رازدارانہ میں کہا۔ ''بہت بری افواہیں میری ماں۔ سنا ہے کہ وہ ایک خفیہ انجمن بنا رہا ہے، خلستی ☆ کی طرح۔ ایک دوسرے کی خلستی کی طرح مرمت کرنے کا ارادہ ہے ان کا...''

''بالکل حماقت اور بکواس ہے یہ، ماریا!''

''جہاں دھواں ہوتا ہے وہاں آگ بھی ضرور ہوتی ہے'' خوانچے والی نے کہا۔

ماں نے ساری باتیں اپنے بیٹے سے کہیں لیکن اس نے صرف اپنے کاندھے جھٹک دیئے اور خوخول اپنے مخصوص انداز میں نرم اور گہری ہنسی ہنسا۔

''لڑکیاں بھی بہت ناراض ہیں'' ماں نے کہا۔ ''تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ کسی بھی لڑکی کے لئے

اچھے جوڑے ہو۔ محنتی ہو اور شرابی نہیں ہو۔ لیکن ان بیچاریوں کی طرح ایک نظر بھی اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ وہ کہتی ہیں کہ مشتبہ کردار کی لڑکیاں شہر سے تمہارے پاس آتی ہیں۔"

"ہاں اور کیا!" پاویل نے تیوری پر بل ڈال کی نفرت سے کہا۔

"کیچڑ میں ہر چیز سے بدبو آتی ہے" خوخول نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "بہتر ہوتا کہ ان پگلیوں کو تم سمجھا سکتیں کہ شادی کی زندگی کے کیا معنی ہیں ننکو۔ شاید اس وقت یہ لوگ اپنی کمبختی بلانے کے لئے اتنی جلد بازی سے کام نہ لیتیں..."

☆ خلستی۔ خلست روس میں چابک کو کہتے ہیں اور یہ نام ایک جنوبی مذہبی گروہ کو دیا گیا تھا۔ (مترجم۔)

"اچھا، اچھا!" ماں نے کہا۔ "سب اچھی طرح جانتی ہیں اور سب سمجھتی بھی ہیں لیکن ان کی قسمت میں اور لکھا کیا ہے؟"

"اگر وہ سمجھ جائیں تو انہیں راستہ نظر آ جائے گا" پاویل بولا۔

اس کی ماں نے اس کے سخت چہرے کی طرف دیکھا۔

"تم انہیں پڑھاتے کیوں نہیں؟ تیز قسم کی لڑکیوں کو یہاں بلا سکتے ہو۔"

"اس سے کام نہیں چلے گا" اس کے بیٹے نے خشک لہجے میں کہا۔

"لیکن کوشش کرنے میں جاتا کیا ہے؟" خوخول نے دریافت کیا۔

جواب دینے سے پہلے پاویل خاموش رہا۔

"سب لوگ جوڑوں میں بٹ جائیں گے، کچھ کی شادی ہو جائے گی اور سارا معاملہ ختم ہو جائے گا۔"

اس کی ماں میں پڑ گئی۔ وہ پاویل کی راہبانہ سخت گیری سے کچھ پریشان سی ہو گئی۔ وہ یہ تو دیکھ رہی تھی کہ تمام لوگ، یہاں تک کہ خوخول جیسے پختہ کار ساتھی بھی اس سے مشورہ کرتے تھے لیکن اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس کے بیٹے سے خوف کھاتے تھے اور اس کی سختی کی وجہ سے کوئی بھی اس سے محبت نہ کرتا تھا۔

ایک رات جب وہ سونے کے لئے چلی گئی اور اس کا بیٹا اور خوخول اس وقت تک پڑھ رہے تھے تو

باریک پردے کے پیچھے سے ان لوگوں کی گفتگو کی مدہم آواز اس تک پہنچی۔

''مجھے وہ نتاشا پسند ہے'' خوخول دفعتاً بول اٹھا۔

''مجھے معلوم ہے'' پاویل نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔

اس نے سنا کہ خوخول آہستہ سے اٹھا اور ننگے پاؤں فرش پر ٹہلنے لگا اور دھیمے دھیمے افسردہ انداز میں سیٹی بجانے لگا۔ ایک بار پھر اس نے کہا:

''معلوم نہیں اس نے محسوس کیا بھی یا نہیں؟''

پاویل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' خوخول نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''اس نے محسوس کرلیا ہے'' پاویل نے جواب دیا۔ ''اسی لئے اس نے یہاں آنا چھوڑ دیا۔''

خوخول نے زور سے اپنا پاؤں فرش پر رگڑا اور ایک بار پھر اس کی دھیمی سیٹی کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

''اگر میں اس سے کہہ دوں تو کیا ہو'' اس نے دریافت کیا۔

''کیا کہو گے؟''

''کہوں گا کہ۔ میں۔'' خوخول نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''ضرورت ہی کیا ہے'' پاویل نے بات کاٹی۔

ماں نے سنا خوخول ٹہلتے ٹہلتے رک گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ اگر کسی لڑکی سے محبت ہو جائے تو اس سے کہہ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ اس کا کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلتا۔''

پاویل نے زور سے اپنی کتاب بند کی۔

''تمہیں کس نتیجہ کی امید ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

دونوں دیر تک خاموش رہے۔

''تو پھر؟'' خوخول نے پوچھا۔

''تمہیں پہلے خود اپنے آپ پر واضح کر لینا چاہئے کہ تم چاہتے کیا ہو آندری؟'' پاویل نے آہستہ

سے کہا۔ ''فرض کرو کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ مجھے اس میں شبہہ ہے مگر فرض کر لو۔ اور تم دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ کیا اچھا جوڑا رہے گا! وہ ہے اہل دانش اور تم مزدور۔ بچے پیدا ہوں گے جن کی پیٹ بھرنے کے لئے تمہیں دن رات خون پسینہ ایک کرنا ہوگا۔ ساری زندگی روٹی کی اور بچوں کے اور کرایہ کے لئے ایک چکی بن کر رہ جائے گی۔ ہمارے عظیم مقصد کے لئے تم بے کار ہو جاؤ گے۔ تم دونوں۔''

کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد پاویل پھر بولا اور اس بار اس آواز میں اتنی کرختگی نہیں تھی۔

''اس خیال کو ترک کر دینا بھی بہتر رہے گا، آندری۔ اسے کیوں مصیبت میں گرفتار کرتے ہو۔''

خاموشی۔ سکنڈ بجاتے وقت دیواری گھنٹے کے لنگر کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''میرا آدھا دل محبت کرتا ہے، آدھا دل نفرت کرتا ہے، اسی کو دل کہتے ہیں!'' خوخول نے کہا۔

کتاب کے ورق الٹنے کی آواز آئی۔ پاویل نے پھر کتاب پڑھنا شروع کر دیا ہوگا۔ اس کی ماں آنکھیں بند کئے لیٹی تھی اور سانس لیتے ہوئے بھی ڈر رہی تھی۔ اسے خوخول پر رحم آ رہا تھا لیکن اپنے بیٹے پر اس سے بھی زیادہ۔

''بیچارہ غریب...'' اس نے سوچا۔

''تو تمہارا خیال ہے کہ مجھے نہ کہنا چاہئے؟'' خوخول دفعتاً بول پڑا۔

''ایمانداری کا تقاضہ تو یہی ہے'' پاویل نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا ایسا ہی کروں گا'' خوخول نے کہا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے آہستہ سے غمگین انداز میں کہا:
''اگر تم پر بھی ایسی ہی گزری تو سوچو کتنا کٹھن وقت ہوگا۔''

''میرے لئے وہ کٹھن وقت آ گیا ہے۔''

ہوا گھر کی دیواروں سے ٹکرائی۔ گھنٹے کا لنگر پابندی کے ساتھ وقت گذرنے کا اعلان کر رہا تھا۔

''ہنسی کھیل نہیں۔ یہ'' خوخول نے آہستہ سے کہا۔

ماں نے تکئے میں منہ دھنسا دیا اور خاموشی سے روتی رہی۔

صبح کو اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ آندری کچھ چھوٹا سا ہو گیا ہے اور اس کی شخصیت پہلے سے بھی زیادہ پسندیدہ ہو گئی ہے۔ اس کا بیٹا ہمیشہ کی طرح سیدھا دبلا اور خاموش تھا۔ اب تک وہ خوخول کو ہمیشہ

آندری اندری انی سیموو چ کہا کرتی تھی لیکن آج غیر ارادی طور پر اس نے کہا:

آندر یوشا اپنے جوتوں کی مرمت کرالو ورنہ تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

''اگلی تنخواہ پر نیا جوڑا خرید لوں گا۔'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس نے اپنا لمبا بازو ماں کی گردن میں ڈال دیا اور بولا:

''کون جانے شاید تم ہی میری اصلی ماں ہو۔ ہاں بات صرف اتنی ہے کہ تم خود اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتیں کیوں مہ میں اتنا بدصورت جو ہوں۔ کیوں ہے نا؟''

اس نے کوئی جواب دیئے بغیر اس کے ہاتھ کو تھپکا۔ وہ بہت سے پیار کے الفاظ کہنا چاہتی تھی لیکن اس وقت اس کے دل میں فرط ترحم سے کچھ مسوس سی ہو رہی تھی اور الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکل ہی نہ رہے تھے۔

9

بستی میں لوگ اشترا کیوں کو تذکرہ کرنے لگے جو نیلی روشنائی میں لکھے ہوئے پرچے تقسیم کر رہے تھے۔ ان پرچوں میں کارخانے کے انتظام وانصرام پر سخت تنقید ہوتی، ان میں پیٹرز برگ اور جنوبی روس کی ہڑتالوں کا تذکرہ ہوتا اور مزدوروں سے کہا جاتا کہ وہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے متحد ہو جائیں۔

ادھیڑ عمر کے لوگ جو کارخانے میں کافی پیسہ کما رہے تھے غضبناک ہو گئے۔

''ہنگامہ باز!'' انہوں نے کہا۔ ''اس بات پر تو ان لوگوں کے سر توڑ دیئے جائیں۔''

اور وہ لوگ ان پرچوں کو اپنے مالکوں کے پاس لے گئے۔

نوجوانوں نے پرچوں کو بڑے جوش وخروش سے پڑھا۔

''بالکل صحیح لکھا ہے'' انہوں نے کہا۔

مزدوروں کی اکثریت نے جو دن بھر کی محنت کے بعد بالکل تھک کر چور ہو گئے تھے بڑی بے اعتنائی دکھائی۔

''اس سے کچھ نہ ہوگا۔ ان چیزوں سے بھی کوئی کام نکل سکتا ہے!''

لیکن اشتہاروں سے کھلبلی مچ گئی اور اگر ایک ہفتے بھی کوئی نیا پرچہ نہ نکلتا تو مزدور ایک دوسرے

سے کہنے لگتے ''معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے پرچے چھاپنا بند کر دیا۔''

لیکن اسی کے بعد ہی پیر کو نیا پرچہ تقسیم کیا جاتا اور ایک بار پھر مزدور آپس میں باتیں کرنے لگتے۔

کارخانے اور شراب خانے میں ایسے لوگ نظر آنے لگے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ یہ لوگ ہر طرف مارے مارے پھرتے اور طرح طرح کے سوال کرتے، ہر شخص کے معاملات میں دخل دیتے اور اپنی انتہائی احتیاط یا اپنے آپ کو دوسروں پر مسلط کرنے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں شبہہ پیدا کرتے تھے۔

ماں نے محسوس کیا اس ساری ہل چل کی وجہ اس کے بیٹے کی سرگرمیاں ہیں اس نے دیکھا کہ لوگ کس طرح کے چاروں طرف کھینچتے آرہے ہیں اور ماں کے دل میں اپنے بیٹے کے لئے فخر اور اس کی سلامتی کی فکر دونوں قسم کے جذبات کی آمیزش تھی۔

ایک شام ماریا کارسونووا نے ولاسوف کی کھڑکی پر آکر کھٹکھٹایا اور جب ماں نے کھڑکی تو اس نے سرگوشی کے انداز مگر اونچی آواز میں کہا:

''ذرا ہوشیار رہو پلاگیا! ان لوگوں نے مصیبت مول لے ہی لی۔ آج رات تمہارے گھر کی اور مازن کے اور وسوف شیکوف کے گھروں کی بھی تلاشی ہوگی۔''

ماریا کے موٹے موٹے ہونٹ جلدی بند ہو گئے۔ اپنی موٹی سی ناک سے اس نے کچھ سوں سوں کیا اور آنکھیں جھپکا کر دونوں طرف دیکھا جیسے وہ سڑک پر کسی کو تاک رہی ہو۔''

''اور یاد رکھو کہ نہ میں کچھ جانتی ہوں، نہ میں نے تم سے کچھ کہا اور نہ آج میں یہاں تم سے ملی!''

اس کے بعد وہ چلی گئی۔

کھڑکی بند کرنے کے بعد ماں آہستہ سے کرسی میں دھنس گئی۔ لیکن یہ محسوس کر کے کہ اس کے بیٹے کو خطرہ درپیش ہے وہ فوراً ہی کھڑی ہوگئی۔ جلدی سے کپڑے بدلے، سر پر شال ڈالی اور فیدور مازن کے گھر کی طرف چل پڑی۔ وہ بیمار تھا اور اسی لئے کارخانے نہیں گیا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور اپنے سیدھے ہاتھ کو سہلا رہا تھا جس کا انگوٹھا غیر فطری طور پر آگے کو نکلا ہوا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی وہ زرد پڑ گیا اور کھڑا ہو گیا۔

''یہ اچھی مصیبت آئی!'' وہ بڑبڑایا۔

''کرنا کیا چاہئے؟'' پلا گیا نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے دریافت کیا۔

''ذرا ٹھیرو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں!'' فیدور نے اپنے اچھے ہاتھ سے اپنے گھنگھریالے بال ماتھے پر سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔

''تم تو خود ہی گھبرائے ہوئے ہو'' ماں نے کہا۔

''میں؟'' وہ شرم سے سرخ ہو گیا اور جھینپ کر مسکرایا۔ ''ہوں... لعنت ہو اس قصہ پر... پاویل کو مطلع کر دینا چاہئے، میں کسی کو بھیجوں گا۔ لیکن تم گھر جاؤ اور پریشان مت ہو۔ وہ لوگ ہمیں ماریں گے نہیں۔ کیوں ہے نا؟''

گھر پہنچ کر اس نے ساری کتابیں اکٹھا کر لیں اور انہیں اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے فرش پر ٹہلنے لگی وہ کبھی چولھے کے اوپر دیکھتی کبھی چولہے کے نیچے دیکھتی اور کبھی پانی کے مٹکے میں۔ اس خیال تھا کہ پاویل فوراً کارخانے سے بھاگ کر آ جائے گا مگر وہ نہیں آیا۔ آخر وہ تھک کر باورچی خانے میں کتابوں کو اپنے نیچے دبا کر بنچ پر بیٹھ گئی اور پاویل اور خوخول کے گھر آنے تک وہیں بیٹھی رہی کیونکہ اسے اٹھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہو رہا تھا۔

''تمہیں معلوم ہو گیا؟'' ان لوگوں کو دیکھ کر وہ چلائی۔

''ہاں معلوم ہے'' پاویل مسکرایا۔ تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟''

''بے انتہا...''

''ڈرنا نہیں چاہئے'' خوخول نے کہا۔ ''اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

''ابھی سماوار میں آگ بھی نہیں جلائی'' پاویل بولا۔

''ان کی وجہ سے...'' ماں نے اٹھ کر کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ مجرمانہ انداز میں کہا۔ اس کا بیٹا اور خوخول قہقہہ مار کر ہنسنے لگے اور اس سے اس کی حالت ذرا بہتر ہوئی۔ پاویل نے کچھ کتاب چھانٹ لیں اور انہیں باہر احاطے میں چھپانے کے لئے لے گیا۔

''اس میں ڈرنے کی کوئی بھی تو بات نہیں ہے ننکو'' خوخول نے سماوار میں آگ جلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں شرمناک بات ان کے لئے ہے جو ایسی حماقتوں پر وقت صرف کرتے ہیں۔ معمر لوگ اپنی کمر میں

تلواریں لٹکائے اور بوٹوں میں مہمیز باندھے یہاں آئیں گے اور ہر چیز الٹ پلٹ دیں گے۔ بستر کے نیچے اور چولہے کے نیچے جھانکیں گے۔ اگر کوئی تہہ خانہ ہے تو وہاں بھی جائیں گے اور سب سے اوپر کے کمرے تک جھانک آئیں گے۔ ان کے منہ پر جالے لگ جائیں گے اووہ کراہیت سے نتھنے پھلائیں گے، اور وہ جھنجھلائیں گے، شرمندہ ہوں گے اور اسی وجہ سے ظاہر یہ کریں گے کہ وہ بڑے سخت گیر اور غصہ ور ہیں۔ انہیں اچھی طرح احساس ہے کہ ان کا کام کتنا قابل نفرت ہے۔ ایک مرتبہ تو میرا سامان الٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ کچھ اس قدر الجھن میں پڑ گئے کہ تلاشی کو بیچ میں چھوڑ کر چپ چاپ واپس چلے گئے۔ ایک اور مرتبہ مجھے اپنے ساتھ لیتے گئے اور جیل میں ڈال دیا۔ اور تقریباً چار مہینے تک وہیں رکھا۔ جیل میں سوائے بیٹھے رہنے کے اور انتظار کرنے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر اس کے بعد عدالت میں بلایا جاتا ہے۔ سپاہی سڑکوں پر نگرانی کرتے ہوئے لے جاتے ہیں۔ کوئی بڑا افسر سوال کرتا ہے۔ یہ افسر لوگ کچھ زیادہ تیز نہیں ہوتے۔ بڑی بے تکی باتیں کرتے ہیں، اس کے بعد سپاہیوں کو حکم دیتے ہیں کہ قیدی کو دوبارہ جیل لے جاؤ۔ آخر وہ لوگ جو تنخواہ پاتے ہیں اس کے بدلے میں انہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ اور آخر کار قیدی رہا کر دیا جاتا ہے۔ اور بس۔''

''کیسا انداز ہے تمہارا باتیں کرنے کا آندریوشا!'' ماں نے کہا۔

سماوار کو پھونکنے کے بعد اس نے اپنا لال بھبھوکا چہرہ اٹھایا اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا:

''کیسا انداز؟''

''جیسے تمہیں آج تک کسی نے تکلیف ہی نہیں پہنچائی۔''

''کیا دنیا میں کوئی ایک ذی روح بھی ایسا ہے جسے کوئی تکلیف نہ پہونچی ہو؟'' اس نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے اتنی تکلیف پہونچائی گئی ہے کہ اب میں اس کا خیال ہی نہیں کرتا۔ جب لوگ اس قسم کے ہیں تو پھر کوئی کر ہی کیا سکتا ہے؟ اگر اس کا خیال کرو تو کام میں خلل پڑتا ہے۔ اور پھر تکلیف پر دل کڑھانے سے وقت ضائع کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہی ہے زندگی کا عالم! میں تو لوگوں کی حرکتوں پر پاگل ہو جایا کرتا تھا لیکن پھر لگا ہوا ہے کہ اس کا پڑوسی اس کی مرمت کرنے والا ہے اس لئے وہ پہلے ہی اس کی گردن میں ہاتھ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی ایسی ہی گذرتی ہے میری ننکو!''

اس کے الفاظ نرم روی کے ساتھ بہتے رہے اور ہونے والی تلاشی کے متعلق ماں کا خوف دور ہوتا گیا۔اس کی بڑی بڑی آنکھیں مسکرائیں اور ماں نے محسوس کیا کہ اپنے بھدے پن کے باوجود وہ کتنا پھرتیلا ہے۔

ماں نے سرد آہ بھری۔

''خدا تجھے خوشی سے مالا مال کرے،آندریوشا!''اس نے بڑے خلوص سے کہا۔

خوخول سماوار کے پاس چلا گیا اور پھر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

''اگر مجھے ذرا سی خوشی پیش کی جائے تو میں اس سے انکار نہیں کروں گا'' وہ بڑبڑایا۔''لیکن اس کے لئے بھیک کبھی نہ مانگوں گا۔''

پاویل احاطے سے واپس آیا۔

''وہ لوگ انہیں کبھی نہیں پا سکیں گے'' اس نے اعتماد سے کہا اور ہاتھ دھونے لگا۔ ہاتھ پونچھتے ہوئے وہ اپنی ماں کی طرف مخاطب ہوا:

''اگر تم نے یہ محسوس کرا دیا کہ تم خائف ہو تو وہ لوگ سوچیں گے،اس گھر میں یقیناً کچھ نہ کچھ ضرور ہے تب ہی یہ کانپ رہی ہے۔تم جانتی ہو ہم لوگ کوئی غلط حرکت نہیں کرتے۔انصاف ہماری طرف ہے اور ہم اپنی زندگیاں اسی کے لئے وقف کر دیں گے۔یہی ہمارا جرم ہے تو پھر ہم خائف کیوں ہوں؟''

''میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی پاشا!'' اس نے وعدہ کیا۔لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک دم بڑے دکھی انداز میں بول اٹھی'' کاش وہ لوگ جلدی سے آ کر سب دیکھ لیتے اور فرصت ہو جاتی۔''

وہ لوگ اس رات نہیں آئے اور دوسرے دن سویرے ماں بھانپ گئی کہ لڑکے اس پر فقرے کسیں گے اور اس لئے وہ پیش بندی کے طور پر خود اپنا مذاق اڑانے لگی۔

''خطرے سے قبل ہی خوفزدہ ہو گئی''اس نے کہا۔

10

اس پریشان کن شام کے تقریباً ایک مہینے کے بعد پولیس والے آپہونچے۔نکولائی وسوف شیکوف پاویل اور آندری سے ملنے آیا تھا۔اور تینوں اخبار کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔کافی دیر ہو گئی تھی۔تقریباً

آدھی رات کا وقت تھا۔ ماں سونے کے لئے جا چکی تھی اور ہلکی سی غنودگی کے عالم میں اس کے کان میں کچھ ان کی دھیمی دھیمی، فکرمند آوازیں آئیں۔ اور اس کے بعد آندری پنجوں کے بل چلتا ہوا باورچی خانے سے ہو کر گیا اور دروازہ بند کرتا گیا۔ ایک گھڑا گرنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھل گیا اور خوخول باورچی خانے میں داخل ہوا۔

''مہمیزوں کی آوازیں آرہی ہیں'' اس نے سرگوشی کے انداز میں زور سے کہا۔

ماں بستر پر سے اچھل کر کھڑی ہوگئی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کپڑے پہننے لگی لیکن پاویل دروازے میں نمودار ہوا اور آہستہ سے بولا:

''جاؤ۔ سو جاؤ۔ تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے۔''

ڈیوڑھی میں سرسراہٹ سنائی دی۔ پاویل دروازے کے پاس پہونچا اور اسے کھولتا ہوا بولا:

''کون ہے...''

فوراً ہی ایک طویل قامت بھورے لباس میں ملبوس شخص نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص تھا اور دو خفیہ پولیس کے سپاہی پاویل کو الگ دھکیل کر اس کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔

''ہم وہ نہیں ہیں جن کا انتظار کر رہے تھے۔ کیوں؟'' ایک بھاری مذاق اڑاتی ہوئی آواز آئی۔

جس شخص نے یہ بات کہی وہ ایک دبلا سوکھا سا افسر تھا، جس کی مونچھیں چھدری اور سیاہ تھیں۔ ایک مقامی سپاہی جس کا نام فیدیاکن تھا، ماں کے بستر کے پاس پہنچا۔

''حضور، یہ اس کی ماں ہے'' ایک ہاتھ سے اس نے افسر کو سلام کیا اور دوسرے سے پلاگیا کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ وہ خود ہے'' پاویل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''پاویل ولاسوف'' افسر نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے دریافت کیا۔

پاویل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے تمہارے مکان کی تلاشی لینی ہے'' افسر نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بات جاری رکھی۔

''اے عورت اٹھ، اور وہاں کون ہے؟'' دروازے سے جھانکنے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

''تمہارے نام'' اس کی آواز آئی۔

ڈیوڑھی کے دروازے میں دو گواہ نظر آئے ایک تو صفار خانے کا پرانا مزدور توریاکوف تھا، اور دوسرا

بھئی جھونکنے والا ربین تھا۔ وہ بھاری بھرکم سیاہ سا انسان تھا اور توریا کوف کے مکان میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رہتا تھا۔

''آداب نلوونا!'' اس نے ماں سے بڑی روکھی اور بھاری آواز میں کہا۔

ماں کپڑے پہنتے ہوئے خود اپنی ہمت بندھانے کے لئے اپنے آپ ہی آپ زیر لب باتیں کئے جا رہی تھی:

''آج تک کبھی ایسا نہیں سنا تھا! آدھی رات کو اس طرح درانہ گھسے چلے آرہے ہیں! لوگ سو رہے ہیں اور یہ ہیں کہ اندر چلے آرہے ہیں، بھلا کوئی بات بھی ہے!''

کمرے میں لوگ بھرے ہوئے تھے اور کسی وجہ سے جوتوں کی پالش کی بو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔ دو خفیہ پولیس والوں اور مقامی پولیس کے عہدہ دار نے آہستہ آہستہ الماری سے کتابیں نکالیں اور بڑے افسر کے سامنے میز پر ڈھیر کر دیں۔ دوسرے دو آدمیوں نے دیوار پر زور زور سے گھونسے مارے، کرسیوں کے نیچے جھانک کر دیکھا اور ان میں سے ایک تو بھدے پن سے چولھے کے اوپر بھی چڑھ گیا۔ خوخول اور نکولائی وسوف شیکوف ایک کونے میں ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ چیچک رو نکولائی سرخ پڑ گیا اور اس نے اپنی چھوٹی بھوری آنکھیں افسر کی طرف سے ایک منٹ کو بھی ہٹائیں۔ خوخول کھڑا اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا اور جب ماں کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی ہمت بندھانے کے لئے تھوڑا ہنسا اور اسے اشارہ کیا۔

اپنے خوف پر قابو پانے کے لئے وہ عام انداز کے مطابق آڑی نہ چلی بلکہ سینہ تانے ہوئے سیدھی چلتی رہی۔ اس بات نے اس کے جسم کو دلچسپ خود پسندانہ انداز دیدیا تھا۔ وہ اپنے پرشور قدموں سے ہمت کا اعلان کرتی چلی جارہی تھی لیکن اسکی بھویں پھڑک رہی تھیں۔

افسر نے کتابوں کو اپنے سفید ہاتھوں کی پتلی پتلی انگلیوں سے پکڑا۔ جلدی جلدی ان کے ورق الٹے اور پھر سبک دستی سے انہیں ایک طرف پٹک دیا ان میں سے چند کتابیں فرش پر گر پڑیں۔ کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ پسینے سے شرابور خفیہ پولیس والے زور زور سے ہانپ رہے تھے اور اپنے مہمیزیں بجا رہے تھے، اور کبھی کبھی وہ یہ سوال پوچھ لیتے تھے:

''یہاں بھی دیکھ لیا؟''

ماں پاویل کے نزدیک دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو بیٹے کی طرح باندھے ہوئے تھی اوراس کی نظریں افسر کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اسے اپنے گھٹنے جواب دیتے ہوئے محسوس ہوئے اور خشک آنسوؤں نے اس کی آنکھوں پر پردہ سا ڈال دیا تھا۔

''کتابیں زمین پر کیوں پھینک رہے ہو؟'' دفعتاً خاموشی کو چیرتی ہوئی نکولائی کی کرخت آواز سنائی دی۔

ماں چونک پڑی۔ توریاکوف نے اپنے سر کو جھٹکا دیا جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہو، ریبن نے ایک ناراضگی کی آواز نکالی اوراس نے نکولائی پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔

افسر نے آنکھیں سکیٹریں اورنکولائی کے جامد اور سخت چیچک زدہ چہرے کی طرف خشم آگئیں نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے اور تیزی سے کتابوں کے ورق الٹنے شروع کر دیئے۔ بعض وقت افسر اپنی بڑی بڑی بھوری آنکھیں اس طرح پوری پوری کھول دیتا جیسے وہ شدید درد میں مبتلا ہو اور کسی بھی لمحے مجبوراحتجاج کے تحت چیخ پڑنے والا ہو۔

''اے سپاہی!'' وسوف شیکوف نے دوبارہ کہا۔ ''کتابیں اٹھاؤ!''

سارے خفیہ پولیس والوں نے مڑ کر اس کی طرف اور پھر بڑے افسر کی طرف دیکھا۔ افسر نے سر اٹھایا اورنکولائی کے چوڑے چکلے جسم پر ایک حقارت آمیز نظر دوڑائی۔

''ہوں'' وہ ناک میں سے بولنا۔ ہوا منمنایا۔ ''اٹھالو کتابیں۔'' ایک سپاہی نے جھک کر بکھری ہوئی کتابیں اٹھانی شروع کیں۔

''نکولائی ذرا زبان کو قابو میں رکھے تو بہتر ہے'' ماں نے پاویل کے کان میں کہا۔

اس نے اپنے کاندھے جھٹک دئے۔ خوخول نے اپنا سر جھکا لیا۔

''یہ بائبل کون پڑھتا ہے؟''

''میں پڑھتا ہوں'' پاویل نے جواب دیا۔

''یہ ساری کتابیں کس کی ہیں؟''

''میری'' پاویل نے کہا۔

''اچھا'' افسر نے کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے نازک سے ہاتھوں کی انگلیاں

چٹخائیں، میز کے نیچے اپنے پاؤں پھیلائے، مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور نکولائی سے کہا:

''تم آندری نخودکا ہو؟''

''ہاں'' نکولائی نے آگے آتے ہوئے کہا۔ خوخول نے اس کا کاندھا پکڑتے ہوئے اس پیچھے گھسیٹ لیا۔

''یہ غلط کہتا ہے، میں ہوں آندری...'' افسر نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور وسوف شیکوف کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

''حد سے آگے مت بڑھو!''

اس کے بعد وہ کاغذات ٹٹولنے لگا۔

چاندنی میں نہائی ہوئی رات، سرد اور بے نیاز کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی۔ کوئی آہستہ آہستہ گھر کے پاس سے گذرا اور برف اس کے پیروں تلے چرمرائی۔

''ہاں ایک بار رستوف میں اور دوسری بار ساراتوف میں۔ ایک فرق ضرور ہے کہ وہاں کے خفیہ پولیس والے زیادہ شائستہ تھے۔''

افسر نے اپنی سیدھی آنکھی بن کی اور اسے ملا۔ پھر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے دانت دکھاتے ہوئے کہا:

''تم ان ذلیل لوگوں کو جانتے ہو جو کارخانے میں مجرمانہ پرچے تقسیم کر رہے ہیں؟''

خوخول حقارت سے ہنسا، انگوٹھوں کے بل کھڑا ہو گیا اور جواب دینے ہی والا تھا کہ نکولائی کی آواز ایک بار پرھ گونجی:

''ذلیل لوگوں کو تو ہم آج پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔''

گہری خاموشی چھا گئی۔ ایک لمحے کے لئے کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

ماں کے چہرے کا زخم سفید پڑ گیا اور اس کی سیدھی بھوں اوپر چڑھ گئی۔ ریبن کی سیاہ ڈاڑھی عجیب طرح سے پھڑکنے لگی۔ اس نے ڈاڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کر دی اور نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

''اس کتے کو یہاں سے لے جاؤ'' افسر نے چلا کر کہا۔

دو خفیہ پولیس کے سپاہیوں نے نکولائی کو بازوؤں سے پکڑ لیا اور اسے دھکا دیتے ہوئے باورچی خانے تک لے گئے۔ جہاں اس نے اپنے پیر فرش پر گاڑ کر ان دونوں کو رکنے پر مجبور کر دیا۔

''ٹھیرو'' وہ چلایا۔ ''مجھے کوٹ پہننا ہے۔''

پولیس کا عہدہ دار احاطے میں سے اندر داخل ہوا۔

''وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ہم نے ہر چیز دیکھ لی۔''

''ظاہر ہے'' افسر نے طنز سے کہا۔ ''ہمارا سابقہ ایک تجربہ کار آدمی سے پڑا ہے!''

ماں نے اس کی کمزور، بے لوچ آواز سنی اور خوفزدہ ہو کر اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔اس نے محسوس کر لیا کہ وہ بڑا بے رحم اور کٹھور دشمن ہے، جس کے دل میں عام انسانوں کے لئے ایک رئیسانہ، پر نخوت حقارت کے سوا کچھ نہیں۔اس قسم کے لوگوں سے ماں کو بہت کم سابقہ پڑا تھا اور اس نے ان کی ہستی کو تقریباً بھلا بھی دیا تھا۔

''اچھا تو یہی لوگ ہیں جو پرچوں سے پریشان ہو جاتے ہیں'' اس نے سوچا۔

''آندری انی سیموف، نطفہ حرام، جو نخودکا کے نام سے مشہور ہو، تم گرفتار کئے جاتے ہو!''

''کس لئے؟'' خوخول نے پرسکون لہجے میں دریافت کیا۔

''یہ تمہیں بعد میں معلوم ہو جائے گا'' افسر نے چکنی چپڑی کمینگی سے جواب دیا۔ ''اور تم خواندہ ہو، پڑھنا لکھنا جانتی ہو؟'' اس نے پلاگیا کی طرف پلٹ کر پوچھا۔

''نہیں، یہ ناخواندہ ہے'' پاویل نے جواب دیا۔

''میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں'' افسر نے ترشی سے جواب دیا۔ ''عورت جواب کیوں نہیں دیتی؟''

ماں کے دل میں اس شخص کے لئے بے انتہا نفرت ابھر آئی۔ دفعتاً وہ تھر تھر کانپنے لگی جیسے ٹھنڈے پانی میں کود پڑی ہو۔ پھر سیدھی تن کر کھڑی ہو گئی۔اس کا زخم سرمئی رنگ اختیار کر گیا اور اور اس کی بھویں اس کی آنکھوں پر جھک آئیں۔

''چلانے کی ضرورت نہیں'' اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی کم عمر ہو اور نہیں سمجھ سکتے کہ مشکلات کہتے کسے ہیں؟''

''غصہ تھوک دو ماں'' پاویل نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیرو پاویل!'' وہ چلائی اور میز کی طرف دوڑی۔ ''تم ان لوگوں کو آ کر کیوں لے جا رہے ہو؟''

''اس بات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ خاموش!'' افسر نے کھڑے ہوتے ہوئے چلا کر کہا۔ ''وسوف شیکوف کو اندر لاؤ۔ وہ بھی حراست میں ہے!''

پھر اس نے کاغذات پڑھنے شروع کئے جو وہ اپنی ناک کے پاس پکڑے ہوئے تھا۔

نکولائی کو اندر لایا گیا۔ افسر پڑھتے پڑھتے رک کر چیخا:

''اپنی ٹوپی اتارو!''

ریبن پلاگیا کے پاس آیا اور کہنی سے اسے اشارہ کیا:

''پریشان مت ہو ماں۔''

''میں ٹوپی اتاروں کیسے جب کہ یہ لوگ میرے ہاتھ پکڑتے ہوئے ہیں؟'' نکولائی نے کارروائی کے کاغذات پڑھے جانے کی آواز کو اپنی آواز میں ڈبو دیا۔

''اس پر دستخط کرو!'' افسر نے کاغذ میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

ماں نے ان لوگوں کو دستخط کرتے ہوئے دیکھا تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا اور بے انصافی کے احساس اور مجبوری و بیچارگی سے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ اس نے اپنی شادی شدہ زندگی کے بیس سال تک اسی قسم کے آنسو بہائے تھے۔ لیکن گذشتہ چند برسوں میں وہ ایسے آنسوؤں کی تیز چھبن کو تقریباً بھول سی گئی تھی۔ افسر نے اس کی طرف دیکھا اور مصنوعی مسکراہٹ سے کہا:

''ابھی اپنے آنسوؤں کو اٹھا رکھو، اے عورت، ورنہ آیندہ کے استعمال کے لئے باقی نہیں رہیں گے۔''

اس کے دل میں غصہ کی دوسری لہر امنڈنے لگی۔

''ماں کے پاس ہمیشہ ہر چیز کے لئے کافی آنسو ہوتے ہیں۔ ہر چیز کے لئے۔ اگر تمہاری کوئی ماں ہے تو وہ بھی یہ بات ضرور جانتی ہوگی۔''

افسر نے جلدی جلدی اپنے کاغذات ایک نئے تھیلے میں رکھے جس کا تالا چمک رہا تھا۔

''چلو!'' اس نے حکم دیا۔

''خدا حافظ آندری، خدا حافظ نکولائی!'' پاویل نے ہاتھ ملاتے ہوئے نرم و بے آواز گرم جوشی سے

کہا۔

''تم لوگوں کی غالباً جلد ہی ملاقات ہوگی'' افسر نے کچھ ہنس کر کہا۔

وسوف شیکوف نے بھاری سانس لیا۔ خون کھنچ کر اس کی موٹی گردن تک پہونچ گیا اور اس کی آنکھوں میں شدید غصہ کی چمک پیدا ہوگئی۔ خوخول نے مسکراہٹ کی بجلی چمکائی، اپنا سر ہلایا اور ماں سے آہستہ سے کچھ کہا۔ ماں نے اس پر صلیب کا نشان بنایا اور بولی:

''اللہ خوب جانتا ہے کہ کون حق پر ہے!...''

آخر کار خاکی وردی پہنے تمام لوگ ڈیوڑھی میں جمع ہو گئے اور پھر مہمیزوں سے شور کرتے ہوئے غائب ہوگئے۔ سب سے آخر میں ریبن گیا۔ وہ پاویل کی طرف بڑی حسرت سے دیکھتا گیا۔

''اچ... چھا... خدا حافظ'' اس نے متفکرانہ لہجے میں کہا اور کھانستا ہوا دروازے کے باہر چلا گیا۔

پاویل نے پیٹھ پر ہاتھ باندھ کر فرش پر ٹہلنا شروع کیا۔ وہ زمین پر بکھری ہوئی کتابوں اور کپڑوں پر سے گزر رہا تھا۔

''دیکھا، اس طرح کرتے ہیں یہ لوگ'' جیسے یقین ہی نہ آرہا ہو۔

اس کی ماں نے اس سارے انتشار کو اس طرح دیکھا جیسے یقین ہی نہ آرہا ہو۔

''نکولائی کو اتنا تیز بننے کی کیا ضرورت تھی؟'' اس نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ شاید وہ ڈر گیا تھا'' پاویل نے جواب دیا۔

''اندر گھس آئے، لوگوں کو پکڑا، اور چل دیئے... آناً فاناً میں سب کچھ ہو گیا!'' وہ ہاتھ ملتی ہوئی بڑبڑائی۔

اس کا بیٹا گرفتار نہیں کیا گیا تھا اس لئے اس کے دل کو ذرا اطمینان تھا لیکن ان ناقابل فہم واقعات سے جنہیں اس نے دیکھا تھا اس کا ذہن مفلوج سا ہو گیا۔

''اس زرد چہرے والے نے ہماری طرف حقارت سے دیکھا، ہمیں خوفزدہ کرنے کوشش کی...''

''اچھا خیر اماں'' پاویل نے ایک دفعتاً عزم کے ساتھ کہا۔ ''آؤ ذرا اسے صاف کر دیں۔''

اس نے اسے ''اماں'' کہا اور اس کے لہجے میں ہوا انداز تھا جو اس وقت پیدا ہوتا جب وہ ماں سے بڑی نزدیکی محسوس کرتا تھا۔ وہ اس کے پاس تک گئی اور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''تمہیں ان لوگوں نے تکلیف پہونچائی؟'' ماں نے آہستہ سے دریافت کیا۔

''ہاں!'' اس نے جواب دیا۔ ''بہت تکلیف۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ دوسروں کے ساتھ مجھے بھی لے جاتے۔''

ماں کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کی تکلیف کو کم کرنے کی امید میں ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا:

''زیادہ دن کی بات نہیں وہ لوگ تمہیں بھی لے جائیں گے۔''

''یہ تو ہونے ہی والا ہے'' اس نے جواب دیا۔

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

''تم کتنے سخت آدمی ہو پاویل'' آخر کار اس نے کہا۔ ''کاش تم اپنی ماں کو کبھی تو تسکین دے دیا کرو! میرا ہی ایسی بدفالیاں کرنا کون سا کم تھا جو تم اور بھی زیادہ بری باتیں کہہ رہے ہو!''

پاویل نے نظر اٹھا کر دیکھا اور اس کے نزدیک آکر آہستہ سے کہا:

''کیا کروں ماں، مجھے تسلی دینی آتی ہی نہیں۔ تمہیں اس کا عادی ہونا پڑے گا۔''

اس نے سرد آہ بھری اور اپنی آواز کو بھرانے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے تھوڑے وقفے کے بعد بولی:

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ لوگ اذیت بھی دیتے ہیں؟ کھال ادھیڑ دیتے ہیں؟ ہڈیاں توڑ دیتے ہیں؟ جب بھی میں اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔ اف میرے لال۔ کیسی ہیبت ناک چیز ہے!...''

''یہ لوگ روح کو اذیت دیتے ہیں۔ اس سے اور بھی زیادہ تکلیف ہوتی ہے جب وہ لوگ انسانوں کی روح پر اپنے گندے ہاتھ ڈالتے ہیں...''

11

دوسرے دن یہ معلوم ہوا کہ بوکن، سموئلوف، سوموف اور پانچ دوسرے لوگ بھی گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ شام کو فیدور مازن آ گیا۔ اس کے گھر کی بھی تلاش ہوئی تھی اور اسے بڑی خوشی تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو بڑا سورما سمجھ رہا تھا۔

''تم کچھ ڈر گئے تھے فیدور؟'' ماں نے دریافت کیا۔

وہ زرد پڑ گیا۔ اس کے خط و خال نمایاں ہو گئے اور نتھنے پھڑکنے لگے۔

''مجھے ڈر تھا کہ افسر مجھے مارے گا۔ بہت موٹا تھا، ڈاڑھی سیاہ تھی اور انگلیوں پر بال ہی بال تھا۔ ناک پر سیاہ چشمہ رکھا ہوا تھا جیسے اندھا ہو۔ اتنا چیخا اور پاؤں پٹکے کہ کچھ حد نہیں! 'میں تمہیں جیل میں ڈال دوں گا!' اس نے چیخ کر کہا۔ کسی نے آج تک مجھے نہیں مارا۔ یہاں تک کہ میرے ماں باپ نے بھی نہیں مارا تھا۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ لوگ مجھے بہت چاہتے تھے۔''

تھوڑی دیر کے لئے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹ بھینچ لئے اور دونوں ہاتھوں سے اپنے سیاہ بالوں کو ماتھے پر سے ہٹایا۔ پھر اس نے اپنی سرخ آنکھوں جسے پاویل کو دیکھتے ہوئے کہا:

''اگر کبھی کسی نے مجھے پر ہاتھ اٹھایا تو میں اس پر تلوار کی طرح ٹوٹ پڑوں گا۔ اپنے دانتوں سے اس کی بوٹیاں نوچ لوں گا! حد سے حد مجھے مار ہی تو ڈالیں گے۔ چلو قصہ تمام ہو جائے گا!''

''اتنے تو دھان پان ہو تم!'' ماں بول پڑی۔ ''میں کہتی ہوں تم کیا لڑ سکو گے!''

''لڑوں گا تو ضرور'' فیڈور نے زیر لب کہا۔

جب فیدور چلا گیا تو ماں نے پاویل سے کہا۔ ''سب سے پہلے یہی ہار مان جائے گا۔''

پاویل خاموش رہا۔

چند لمحوں کے بعد باورچی خانے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور ریبن داخل ہوا۔

''یہ لو'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں پھر آ گیا۔ کل رات وہ لوگ مجھے لائے تھے اور آج میں خود ہی آ گیا۔'' اس نے بڑی گرمجوشی سے پاویل سے مصافحہ کیا اور پلاگیا کو کاندھوں سے پکڑ لیا۔

''ایک گلاس چائے مل جائے تو بہت اچھا ہو'' اس نے کہا۔

پاویل نے خاموشی سے اس کے چوڑے بھرے بھرے چہرے کو غور سے دیکھا جس پر گھنی سیاہ ڈاڑھی اور سیاہ آنکھیں تھیں۔ اس کی جمی جمی نظروں میں کوئی اہم بات تھی۔

ماں باورچی خانے میں سماوار کو روشن کرنے چلی گئی۔ ریبن کہنیاں میز پر ٹکا کر بیٹھ گیا اور پاویل کی طرف دیکھنے لگا۔

''تو پھر'' اس نے کہا جیسے گفتگو کا سلسلہ پھر سے جاری کرنا چاہتا ہو۔ ''مجھے تم صاف صاف باتیں

کرنی ہیں۔ چند دنوں سے تمہارے کام پر نظر رکھ رہا تھا۔ تمہارے پڑوس ہی میں رہتا ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تمہارے گھر پر بہت سے لوگ آتے ہیں لیکن نہ تو شراب پیتے ہیں اور نہ ہنگامے کرتے ہیں۔ یہ تو پہلی بات ہے۔ ایسے لوگوں پر نظر پڑنا تو ضروری ہے جو ذرا شرافت سے رہتے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ آخر بات کیا ہے۔ میں خود لوگوں کی نظروں میں کھٹکتا ہوں کیونکہ ذرا میں لئے دئے رہتا ہوں۔''

وہ اپنی سیاہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا اور پاویل کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا اور اس کی باتوں میں روانی اور تندی جاری رہی۔

''لوگوں نے تمہارے بارے میں باتیں شروع کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر میرے مالک مکان نے۔ وہ تمہیں بدعتی کہتا ہے کیونکہ تم گرجا نہیں جاتے۔ گرجا تو میں بھی نہیں جاتا۔ پھر ان پرچوں کی بات بھی ہے۔ تمہارا ہی کام ہے نا وہ؟''

''ہاں!'' پاویل نے کہا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ماں نے باورچی خانے سے سر نکال کر خوفزدہ انداز میں کہا۔ ''تم ہی تنہا تو نہیں ہو!''

پاویل ہنسا اور ریبن بھی۔

''اچھا ٹھیک ہے'' ریبن نے کہا۔

ماں نے ناک بھوں چڑھائی اور چلی گئی۔ جس طرح ان لوگوں نے اسے نظر انداز کیا تھا اس سے اسے کچھ صدمہ سا پہنچا۔

''یہ پرچوں کا خیال اچھا ہے، لوگوں میں جوش آتا ہے۔ انیس تھے نا؟''

''ہاں!'' پاویل نے جواب دیا۔

''اس کے معنی یہ ہیں کہ میں سب پڑھ لئے۔ کچھ چیزیں ان میں صاف نہیں تھیں اور کچھ غیر ضروری تھیں۔ لیکن جب کوئی شخص بہت سی باتیں کہنا چاہتا ہے تو دو چار ضرورت سے زیادہ الفاظ نہ بڑھانا ذرا مشکل ہی ہے۔''

ریبن مسکرایا۔ اس کے مضبوط سفید دانت نظر آرہے تھے۔

''اس کے بعد تلاشی ہوئی۔ اس نے مجھے بالکل تمہاری طرف کر دیا۔ تم نے اور خوخول اور نکولائی۔ تم

سب نے بتا دیا...''

مناسب الفاظ کی تلاشی میں وہ خاموش ہو گیا۔ وہ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے میز کو انگلیوں سے بجا رہا تھا۔

''...بتا دیا کہ تمہارا مقصد کیا ہے۔ یعنی کہ 'عینی کہ' حضور والا آپ اپنا کام کیئے جائے اور ہم اپنا کام کیئے جائیں گے،۔ خوخول بھی بہت اچھا آدمی ہے۔ کبھی کبھی میں جب اسے کارخانے میں باتیں کرتے ہوئے سنتا ہوں تو سوچتا ہوں 'اسے شکست نہیں دی جا سکتی صرف موت ہی اسے نیچا دکھا سکتی ہے بالکل پتھر کا بنا ہوا ہے،۔ تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے پاویل؟''

''ہاں مجھے بھروسہ ہے'' پاویل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک۔ میری طرف دیکھو۔ چالیس برس کی عمر۔ تم سے دو گنا بڑا سے بیس گنا زیادہ دنیا دیکھے ہوئے۔ تین سال سے زیادہ فوج میں رہا۔ دو مرتبہ شادی کی۔ پہلی بیوی مر گئی۔ دوسری کو میں نے نکال دیا۔ میں کاکیشیا بھی گیا اور میں نے دخوبورٹسی ☆ کو بھی دیکھا۔ وہ لوگ زندگی کے ساتھ قدم قدم ملا کر چلنا نہیں جانتے بھائی۔ بالکل نہیں۔☆

ماں اس کی بھونڈی سی آواز کو بڑے شوق سے سنتی رہی۔ اسے بڑے خوشی تھی کہ ایک ادھیڑ عمر کا انسان اس کے بیٹے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ رہا تھا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ پاویل کا انداز بڑا خشک تھا اور اس نے اس کی کمی پوری کرنے کے لئے نوازی شروع کی۔

''میرا خیال ہے تم کچھ کھا پی لو میخائل ایوانووچ؟'' اس نے کہا۔

''شکریہ ماں میں کھانا کھا چکا۔ تو پاویل تمہارا خیال ہے کہ زندگی ایسی نہیں ہے جیسی ہونی چاہیئے؟''

پاویل کھڑا ہو گیا اور ہاتھ پیچھے باندھ کر اس نے فرش پر ٹہلنا شروع کیا۔

''زندگی صحیح راستہ اختیار کر رہی ہے'' اس نے جواب دیا۔ ''تم ہی کو میرے پاس کھلے دل سے لے آئی نا؟ آہستہ آہستہ وہ ہم محنت کشوں کو متحد کر رہی ہے۔ اور ایک وقت آئے گا جب وہ سب کو متحد کر دے گی! زندگی ہمارے لئے سخت، کٹھور اور غیر منصفانہ ہے لیکن خود زندگی ہی اپنی تلخ حقیقت کو ہم پر واضح کرتی جا رہی ہے اور ہمیں یہ بھی بتا رہی ہے کہ اس کے مسائل کو جلد از جلد کیسے حل کیا جائے؟''

''بالکل صحیح!'' ربین نے لقمہ دیا۔ ''لوگوں میں مکمل تبدیل کی ضرورت ہے۔ اگر کسی شخص کے سر

سے پاؤں تک جوئیں

☆ دخوبورٹسی۔ایک مذہبی فرقہ۔(مترجم۔)

بڑ گئی ہوں تو اسے حمام لے جاؤ، خوب مل مل کے نہلاؤ اور صاف کپڑے پہنا دو، پھر دیکھو کیسا خوش وضع نکل آتا ہے۔ ہے نا ٹھیک؟ لیکن کسی کے باطن کو کس طرح صاف کیا جا سکتا ہے؟ اصل بات تو یہی ہے!''

پاویل کارخانے اور مالکوں اور دوسرے ملکوں میں اپنے حقوق کے لئے مزدوروں کی جدوجہد کے متعلق بڑے جوش میں بولتا گیا۔ بعض وقت ریبن میز پر گھونسا مارتا جیسے پاویل کی تقریر کی اہمیت کو واضح کر رہا ہو۔ بار بار وہ کہہ اٹھتا:

''اصل بات تو یہی ہے!''

اور ایک بار وہ ہنسا اور آہستہ سے بولا:

''تم ابھی بچے ہو! لوگوں کو سمجھنا نہیں سیکھا۔''

''بوڑھے اور بچے کی بات چھوڑ دو'' پاویل نے سنجیدگی سے کہا اور ریبن کے سامنے آ کر رک گیا۔ ''دیکھنا یہ چاہئے کہ کس کے خیالات صحیح ہیں۔''

''تو تمہارا خیال ہے کہ خدا کے متعلق بھی ہمیں بیوقوف بنایا گیا ہے؟ میرا بھی خیال ہے کہ ہمارا مذہب کسی کام کا نہیں۔''

اب تو ماں بھی بول پڑی۔ جب کبھی اس کا بیٹا خدا کے متعلق کچھ کہتا یا ایسی کسی چیز کے متعلق بات کرتا جس کا تعلق ماں کے ایمان واعتقاد سے ہوتا تھا، جو ماں کے لئے بڑا مقدس اور عزیز تھا، تو وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہتی اور خاموشی سے اس سے التجا کرتی کہ اپنی لامذہبیت کے تیز الفاظ سے اس کے دل کو مجروح نہ کرے۔ لیکن اس کی لادینی کے پیچھے اسے ایک اعتقاد کی جھلک نظر آتی تھی اور اس کی وجہ سے اسے تسکین ہو جاتی تھی۔

''میں اس کے خیالات کو کیسے سمجھ سکتی ہوں؟'' وہ دل ہی دل میں سوچتی۔

اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس ادھیڑ عمر کے انسان کو بھی اس کے بیٹے کے الفاظ سے اسی قسم کی تکلیف ہوئی ہوگی۔ لیکن جب ریبن نے بڑے اطمینان سے پاویل سے وہ سوال کیا تو ماں ضبط نہ کر سکیں:

''جب خدا کا ذکر ہو تو کہنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو!'' اس نے گہرا سانس لیا اور کچھ زیادہ

جوش سے کہنا شروع کیا۔ ''تم چاہے جو بھی سوچو لیکن تم ایک بار خدا کو ہٹا دو گے تو مجھ جیسی بوڑھی عورت دکھ درد میں کس کا سہارا ڈھونڈے گی؟''

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور برتن دھوتے ہوئے اس انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

''تم نے ہمیں سمجھا نہیں!'' پاویل نے نرمی سے کہا۔

''برا مت مانو ماں!'' ریبن نے اپنی گہری دھیمی آواز میں کہا۔ اس نے کچھ ہنس کر پاویل کی طرف دیکھا۔ ''میں بھول گیا کہ تم اتنی بوڑھی ہو چکی ہو کہ کوئی تبدیلی ذرا مشکل ہی ہے!''

''میں اس مہربان اور رحیم خدا کا ذکر نہیں کر رہا تھا جس پر تمہیں اعتقاد ہے'' پاویل نے بات جاری رکھی۔ ''بلکہ اس خدا کی بات کر رہا تھا جس سے پادری ہمیں اس طرح ڈراتے ہیں گویا وہ کوئی ڈنڈا ہو، وہ خدا جس کے نام پر وہ تمام لوگوں کو چند افراد کی مجرمانہ خواہش کے سامنے سجدے کرانا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک بات ہے!'' ریبن نے میز کو بجاتے ہوئے لقمہ دیا۔ ''انہوں نے نے تو ہم پر ایک جھوٹے خدا کو مسلط کر دیا ہے! ہم سے ہر اس چیز کے ذریعہ لڑتے ہیں جو ان کے ہاتھ لگ جائے! ذرا ایک لمحے کے لئے سوچو ماں! خدا نے انسان کو اپنا ہی سا بنایا جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر انسان اس کی طرح ہے تو وہ انسان سے مشابہہ ہے۔ لیکن ہم دیوتاؤں سے زیادہ وحشی درندوں سے مشابہ ہیں۔ کلیسا اور کلیسا والے ہمارے سامنے ایک ہوا لے کر آتے ہیں۔ اپنا خدا تو ہمیں بدلنا ہی ہوگا ماں۔ اسے ذرا مانجھ کر صاف بھی کرنا ہوگا! ان لوگوں نے اسے جھوٹ اور بہتان میں ملبوس کر دیا ہے۔ ہماری روحوں کو کچلنے کیلئے خدا کا چہرہ مسخ کر دیا ہے!...''

وہ نرمی سے بول رہا تھا لیکن اس کا ہر لفظ ماں کو چکرائے دے رہا تھا اور وہ اس کی سیاہ ڈاڑھی کے حلقے میں بڑے سے ماتمی چہرے سے خوفزدہ ہوگئی۔ وہ اس کی آنکھوں کی سیاہ چمک کو برداشت نہ کر سکی جس نے اس کے دل میں ایک درد آمیز خوف بیدار کر دیا۔

''میں چلی جاؤں گی'' اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''ایسی باتیں سننے کی مجھ میں تاب نہیں۔''

جلدی سے وہ باورچی خانے میں چلی گئی جب کہ ریبن پاویل سے کہہ رہا تھا:

''دیکھا پاویل؟ دماغ نہیں بلکہ دل ہے دراصل ہر چیز کا مرکز۔ انسانی روح میں دل کی ایک بہت

اہم حیثیت ہے، اور دل کی جگہ کوئی اور چیز نہ پیدا ہوگی۔''

''صرف عقل ہی انسان کو آزاد کر سکتی ہے'' پاویل نے مضبوطی سے کہا۔

''عقل کسی کو طاقت نہیں بخشتی!'' ریبن نے اصرار کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔''طاقت دل عطا کرتا ہے، دماغ نہیں!''

ماں نے کپڑے بدلے اور بغیر دعا پڑھے بستر پر لیٹ گئی۔ ایک سرد اور ناپسندیدہ سا احساس اسے اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ ریبن پہلے تو اسے بہت تیز اور ذہین معلوم ہوا لیکن اب اس کی طرف سے مخاصمت کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔

''بدعتی! باغی!'' اس کی آواز سنتے ہوئے ماں نے سوچا۔''یہ یہاں آیا ہی کیوں؟''

''لیکن وہ اسی اعتماد کے ساتھ بولتا گیا:

''مقدس جگہ کو خالی نہیں چھوڑ سکتے۔ انسانی دل میں خدا کے لئے جو جگہ ہے وہ سب سے زیادہ نازک مقام ہے۔ اگر خدا کا خیال دل سے کاٹ کر پھینک دیا جائے تو بہت بڑا سا زخم پڑ جائے گا۔ ایک نئے اعتقاد کی ضرورت ہے پاویل! اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا خدا پیدا کیا جائے جو انسان کا دوست ہو!''

''عیسی مسیح ہی ایسے تھے!'' پاویل بولا۔

''یسوع میں روحانی جرات کا فقدان تھا۔ انہوں نے کہا تھا 'پیالہ میرے آگے سے بڑھا دو، اور انہوں نے سیزر کو بھی تسلیم کیا۔ خدا اپنے بندوں پر کسی انسانی اقتدار کو کس طرح تسلیم کیا اور شادی کو تسلیم کیا۔ لیکن عیسی نے تجارت کو تسلیم کیا اور شادی کو تسلیم کیا۔ اور انہوں نے انجیر کے درخت کو بددعا کے درخت پر تھی؟ بالکل اسی طرح جیسے اگر انسانی روح نیکی اور خوبی کو وجود میں نہ لا سکے تو وہ قصوروار نہیں ہے۔ کیا یہ برائی میں نے اپنی روح میں بوئی ہے؟''

کمرے میں دونوں آوازیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتی رہیں اور جوشیلے انداز میں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں۔ پاویل کے ٹہلنے سے فرش چرمر کر رہا تھا۔ جب پاویل بولتا تو تمام دوسری آوازیں ڈوب جاتیں لیکن جب ریبن اپنی سنجیدہ، گہری آواز میں بولتا تو ماں گھڑی کے لنگر اور پالے کی آواز تک سن سکتی تھی جو مکان کی دیواروں کو کھسوٹ رہا تھا۔

''میں اسے ذرا اپنے الفاظ میں کہتا ہوں یعنی بھٹی جھونکنے والے کے الفاظ میں: خدا ایک شعلہ ہے۔اور وہ دل میں رہتا ہے۔انجیل میں آیا ہے: ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا تھا۔تو کلام روح ہے۔''

''کلام عقل ہے!'' پاویل نے اصرار کیا۔

اچھا ٹھیک ہے تو پھر خدا دل میں ہے اور عقل میں ہے۔لیکن کلیسا میں نہیں ہے۔کلیسا خدا کا مدفن ہے۔''

ماں سوگئی اور اسے نہیں خبر کہ ریبن کب اٹھ کر گیا۔

لیکن اس کے بعد سے وہ اکثر آنے لگا۔اگر اس وقت پاویل کا کوئی ساتھی موجود ہوتا تو ریبن کونے میں بیٹھ جاتا اور ایک لفظ بھی نہ بولتا، سوائے اس کے کہ کبھی کبھی کہہ دیتا: ''بالکل ٹھیک!''

ایک دن اس نے ساری محفل کو اپنی سیاہ آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور جھنجھلائے ہوئے انداز میں بولا:

''ان چیزوں کے بارے میں بات کرنی چاہئے جو کہ ہیں نہ کہ جیسی ہوں گی۔مستقبل کے متعلق کیسے معلوم؟ ایک بار لوگ آزاد ہو گئے تو وہ خود فیصلہ کر لیں گے کہ ان کے لئے سب سے بہتر کیا ہے؟ لوگوں کے دماغوں میں ان کے کہے بغیر پہلے ہی بہت کچھ بھر دیا گیا ہے۔وقت آ گیا ہے کہ انہیں اپنے آپ سوچنے دیا جائے۔ہوسکتا ہے کہ وہ ہر چیز مسترد کر دیں۔ساری زندگی اور ساری تعلیم۔ممکن ہے کہ وہ سمجھیں کہ کلیسا کے خدا کی طرح یہ سب چیزیں بھی ان کی دشمن ہیں۔ان کے ہاتھوں میں کتابیں دیدو اور لوگ خود ہی جواب تلاش کریں گے۔بات دراصل یہی ہے!''

جب پاویل اور وہ اکیلے ہوتے تو دونوں طول طویل بحث چھیڑ دیتے جس کے دوران میں کسی کو غصہ نہ آتا۔ماں ان کی باتوں کو بڑے غور سے سنتی، ایک ایک لفظ پر دھیان دیتی اور سمجھنے کی کوشش کرتی کہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔بعض اوقات اسے محسوس ہوتا کہ چوڑے شانوں اور سیاہ ڈاڑھی والا شخص اور اس کی طاقتور بلند قامت بیٹا دونوں اندھے ہو گئے ہیں۔راستے کی تلاش میں وہ ایک سمت بڑھتے، پھر دوسری سمت، ہر چیز کو اپنی مضبوط لیکن سے محروم انگلیوں میں پکڑتے، ہلاتے، ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے، چیزوں کو فرش پر پٹک دیتے اور انہیں پیروں تلے مسل دیتے۔وہ چیزوں سے ٹکراتے، انہیں محسوس کرتے اور پھر اپنے اعتقاد اور اپنی امید کا دامن چھوڑے بغیر انہیں سامنے سے ہٹا دیتے۔

انہوں نے اس میں ایسے الفاظ سننے کی صلاحیت پیدا کر دی جو اپنی صاف گوئی اور جرات کی وجہ سے اس کو خوف زدہ کر دیتے تھے لیکن اب یہ الفاظ اس کو اتنی شدت سے نہیں جھنوڑتے تھے جس شدت سے پہلی بات انہوں نے جھنجھوڑا تھا۔ وہ ان کا مقابلہ کرنا سیکھ گئی تھی۔ بعض اوقات ان خدا سے انکار کرنے والے الفاظ کے پیچھے اسے خدا میں راسخ اعتقا کا جذبہ محسوس ہوتا تھا۔ اس وقت وہ اس اطمینان سے مسکراتی جیسے سب کو معاف کر رہی ہو اور حالانکہ اسے ریبن پسند نہیں تھا لیکن اس کے خلاف عداوت کا جذبہ بھی نہیں ابھرتا تھا۔

ہر ہفتہ وہ خوخول کتابیں اور صاف کپڑے جیل لے جاتی۔ ایک بار اسے ملنے کی اجازت بھی دیدی گئی۔

''ذرا سا بھی تو نہیں بدلا'' واپس آنے کے بعد اس نے بڑے مفقانہ انداز میں کہا۔ ''ہر شخص کے ساتھ اچھی طرح برتاؤ ہے اور ہر شخص اس سے مذاق کرتا ہے۔ وہ بڑی تکلیف میں ہے بے انتہا تکلیف میں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا۔''

''بالکل صحیح ہے'' ریبن نے اپنے رائے ظاہر کی۔ ''دکھ ایک پردہ ہے اور ہم لوگ اس کے اندر رہتے ہیں۔ ہم لوگ ایسے لباس کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس میں فخر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہر شخص کی آنکھوں پر پٹیاں تھوڑا ہی بندھی ہوئی ہیں۔ کچھ لوگ اپنی آنکھیں خود ہی بند کر لیتے ہیں، بات دراصل یہی ہے۔ تو اگر ہم لوگ احمق ہیں تو اسے ہنس کر برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں!''

12

ولاسوف خاندان کا چھوٹا سا مٹیالا مکان بستی کے لوگوں کی اور زیادہ توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس توجہ میں کچھ شبہہ اور غیر شعوری عداوت کا جذبہ بھی شامل تھا۔ لیکن ایک پر اعتقاد تجسس کا جذبہ بھی بیدار ہو رہا تھا۔ بعض اوقات پاویل کے پاس کوئی اجنبی آتا اور اپنے چاروں طرف کنکھیوں سے دیکھنے کے بعد کہتا:

''سنو بھائی، تم کتابیں پڑھتے ہو اور تمہیں قانون سے واقفیت ہے، تم مجھے سمجھا نہیں سکتے کہ...''

اور پھر درخواست گذار پولیس یا کارخانے کے منتظمین کی کسی ناانصافی کا قصہ بیان کرنا شروع کرتا۔ الجھے ہوئے معاملوں میں پاویل شہر کے کسی ملاقاتی وکیل کے نام خط دیدیتا۔ لیکن جب بھی ممکن ہوتا وہ و

وہ مسئلہ کو خود ہی سمجھا تا۔

آہستہ آہستہ لوگ اس سنجیدہ نوجوان کی عزت کرنے لگے جو اتنی سادگی اور جرات سے بات کرتا، جو اپنی آنکھیں کھلی رکھتا اور ہر چیز کو توجہ سے سنتا، جو بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ ہر تنازع کی جڑ تک پہونچ جاتا اور ہر وقت اور ہر جگہ اس مشترک رشتے کو ڈھونڈھ لیتا جس میں تمام لوگ منسلک ہیں۔

پاویل کی عزت خاص طور پر ''دلدل کے کوپک''* کے واقعہ سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔

ایک بڑی سی دلدل جس میں سرو اور برچ کے درخت اگ آئے تھے، کارخانے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی، بلکہ ایک زخم کی طرح اسے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی۔ گرمیوں میں اس دلدل سے گہرے زرد ابخرات نکلتے اور دل کے دل مچھر پیدا ہو جاتے جو ساری بستی میں بخار پھیلا دیتے تھے۔ دلدل پر کارخانے کا قبضہ تھا اور نئے ڈائرکٹر نے فیصلہ کیا کہ اسے خشک کر دیا جائے تاکہ دلدل کا کوئلہ دستیاب ہو اور زمین سے منافع ملے۔ یہ بہانہ کرکے کہ مزدوروں کی زندگی کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے یہ کام کیا جارہا ہے ڈائرکٹر نے حکم دے دیا کہ مزدوروں کی تنخواہ میں سے ہر روبل پر ایک کوپک کاٹ لیا جائے تاکہ دلدل کو خشک کیا جا سکے۔

مزدوروں میں غصہ پھیل گیا۔ انہیں زیادہ اعتراض اس بات پر تھا کہ دفتری کام کرنے والے ملازمین کی تنخواہ میں کٹوتی نہیں کی گئی۔

سنیچر کو ڈائرکٹر نے کوپک کاٹنے والا اعلان چپکایا۔ اس دن پاویل بیماری کی وجہ سے کارخانے نہیں آیا تھا، اس لئے اسے اس بات کا علم ہی نہ تھا۔ دوسرے دن صفار خانہ میں کام کرنے والا پرانا مزدور سیزوف جو ایک معقول آدمی تھا اور لمبے قد والا میکنک مخوتین اس سے ملنے آئے اور انہوں نے اسے ڈائرکٹر کا فیصلہ سنایا۔

کوپک۔ روسی سکہ۔ ایک روبل میں سو کوپک ہوتے ہیں۔ (مترجم۔)

''ہم میں سے پرانے لوگ جمع ہوئے'' سیزوف نے موثر انداز میں کہا۔ ''اور اس کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ ساتھیوں نے فیصلہ کرکے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے۔ شاید تمہیں معلوم ہو کہ کوئی ایسا قانون ہے یا نہیں جس کے تحت ڈائرکٹر کو ہمارے کوپکوں سے مچھروں کے خلاف لڑنے کا حق ہے۔''

''ذرا سوچو تو!'' مخوتین نے کہا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''چار برس ہوئے

ان کنجوسوں نے حمام بنانے کے لئے ہم سے رقم اینٹھ لی تھی۔ تین ہزار آتھ سو روبل جمع کئے تھے! اور وہ ہے کہاں؟ ہم نے تو کبھی حمام دیکھا نہیں!''

پاویل نے سمجھایا کہ کٹوتی کس طرح غیر منصفانہ ہے اور یہ کہ دلدل خشک کرنے سے کارخانے کو منافع کتنا ہوگا۔ دونوں آدمی تیوری پر بل ڈالے واپس چلے گئے۔ جب ماں نے انہیں باہر تک پہنچا دیا تو ہنس کر کہا:

''پاویل نے سمجھایا کہ کٹوتی کس طرح غیر منصفانہ ہے اور یہ کہ دلدل خشک کرنے سے کارخانے کو منافع کتنا ہوگا۔ دونوں آدمی تیوری پر بل ڈالے واپس چلے گئے۔ جب ماں نے انہیں باہر تک پہنچا دیا تو ہنس کر کہا:

''بوڑھے تک تم سے عقل سیکھنے آتے ہیں۔''

اس کا جواب دیئے بغیر پاویل بیٹھ گیا اور اس نے لکھنا شروع کیا۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا:

''ماں مجھے تم سے ایک درخواست کرنی ہے۔ شہر جا کر یہ چٹھی پہونچا دو۔''

''خطرناک ہے کیا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ہاں میں تمہیں ایسی جگہ بھیج رہا ہوں جہاں ہمارا اخبار چھاپا جاتا ہے۔ بہت ضروری ہے کہ آئندہ اشاعت میں دلدل کے کوپک کی کہانی کسی نہ کسی طرح شائع ہو ہی جائے۔''

''اچھا!'' اس نے کہا۔ ''تو ٹھیک ہ۔''

یہ پہلا کام تھا جو اس کے بیٹے نے اس کے حوالے کیا تھا۔ وہ اس بات سے خوش تھی کہ اس نے بلا جھجک ہر چیز سمجھا دی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں پاشا!'' اس نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ سچ مچ ہمیں لوٹ رہے ہیں! اس آدمی کا نام کیا ہے۔ یگور ایوانووچ؟''

وہ رات کو دیر میں تھکی ہوئی سی گھر واپس آئی مگر مسرور تھی۔

''میں ساشا سے ملی تھی'' اس نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''اس نے تمہیں سلام کہا ہے۔ وہ یگور ایوانووچ تو بہت سادہ اور بہت ہنس مکھ قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ بڑے گھریلو انداز سے باتیں کرتا ہے۔''

''بڑی خوشی ہے کہ تمہیں وہ لوگ پسند آئے'' پاویل نے نرمی سے کہا۔

''بڑے سیدھے سادے لوگ ہیں پاشا۔ کتنا اچھا لگتا ہے جب لوگ تصنع نہیں برتتے۔ اور وہ سب لوگ تمہارے لئے بہت اچھی رائے رکھتے ہیں...''

پیر کو بھی پاویل گھر ہی پر رہا کیوں کہ ابھی اس کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی لیکن کھانے کے وقت فیدور مازن دوڑتا ہوا آیا۔ وہ خوش تھا اور جوش میں بھی۔

''چلو آؤ'' وہ چلایا۔ ''پورا کارخانہ بگڑا ہوا ہے۔ مزدوروں نے تمہیں لینے کے لئے بھیجا ہے۔ سیزوف اور مخوتین کا کہنا ہے کہ تم دوسروں سے زیادہ اچھی طرح سے ہر بات سمجھا سکو گے۔ ذرا دیکھو تو ہو کیا رہا ہے!''

ایک لفظ کہے بغیر پاویل نے کپڑے پہننے شروع کر دیئے۔

''عورتیں بھی آ گئی ہیں اور انہوں نے بھی چیں چیں شروع کر دی ہے۔''

''میں بھی چل رہی ہوں'' ماں نے کہا۔ ''آخر کر کیا رہے ہیں یہ لوگ؟ میں بھی چلتی ہوں!''

''اچھا، چلو'' پاویل نے کہا۔

تیزی اور خاموشی سے وہ لوگ سڑک پر چلتے رہے۔ ماں جوش و ہیجان کی وجہ سے مشکل سے سانس لے پا رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بہت ہی اہم بات ہونے والی ہے۔ کارخانے کے دروازے پر عورتوں کا مجمع لگا ہوا تھا جو چیخ رہی تھیں اور لڑ رہی تھیں۔ جب یہ تینوں آہستہ سے احاطے کے اندر پہنچے تو انہوں نے خود کو ایک برہم ہجوم کے درمیان پایا جو غصے سے ابل رہا تھا۔ ماں نے دیکھا کہ ہر شخص صفار خانے کی دیوار کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں سیزوف، مخوتین ویالوف اور پانچ چھ دوسرے ادھیڑ عمر کے بااثر مزدور پرانے لوہے کے ڈھیر پر کھڑے ہوئے تھے جس کے پیچھے اینٹوں کی دیوار تھی۔

''یہ لو، ولاسوف آ گیا!'' کوئی چلایا۔

''ولاسوف؟ اسے یہاں آنے دو!''

''خاموش!'' کئی جگہوں سے لوگ چیخے۔

کہیں نزدیک ہی سے ریبن کی متوازن آواز آئی:

''ہمیں کوپک کیلئے نہیں لڑنا ہے بلکہ انصاف کے لئے۔ بات تو دراصل یہی ہے۔ ہمیں اپنے کوپک عزیز نہیں ہیں وہ کسی دوسرے کوپک سے زیادہ گول تو نہیں ہیں۔ حالانکہ بھاری ضرور ہیں۔ لیکن ان

میں ڈائرکٹر کے روبل سے زیادہ انسانی خون شامل ہے! قیمت کوپک کی نہیں بلکہ خون کی، انصاف کی ہے۔ بات تو دراصل یہی ہے!''

اس کے الفاظ مجمع پر برس رہے تھے اور داد حاصل کر رہے تھے:

''بالکل صحیح کہتے ہو ریبن!''

''بڑی اچھی بات کہی اسٹوکر!''

یہ لووولاسوف آ گیا!''

انسانی آوازیں ایک طوفانی شور میں بدل گئیں جس نے مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ، بھاپ کی سنسناہٹ اور بجلی کے تاروں کے بھنبھناہٹ کو غرق کر دیا۔ لوگ ہر طرف سے دوڑتے، ہاتھوں سے اشارے کرتے، ایک دوسرے کو تیز و تند الفاظ سے اکساتے ہوئے آ رہے تھے۔ بے اطمینانی جو ہمیشہ تھکے ہوئے سینوں میں چھپی رہتی ہے جاگ پڑی تھی اور باہر نکلنے کا راستہ مانگ رہی تھی۔ وہ اس وقت فاتحانہ انداز سے فضا کی بلندیوں پر لہرا رہی تھی، اپنے سیاہ پروں کو زیادہ سے زیادہ پھیلاتے ہوئے وہ لوگوں پر اپنے اثر کو اور زیادہ مضبوط بنا رہی تھی اور اپنے ساتھ انہیں کھینچے لئے آ رہی تھی۔ وہ اپنی قلب ماہیت کر کے ایک انتقامی شعلہ بن کر لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا رہی تھی۔ مجمع کے سر پر دھول اور کالک کے بادل چھا رہے تھے، پسینے سے شرابور چہروں پر جوش کی تمتماہٹ تھی، رخساروں پر سیاہ آنسوؤں کے دھبے پڑے ہوئے تھے اور آنکھیں اور دانت کلونس سے بھرے ہوئے چہروں میں چمک رہے تھے۔

پاویل لوہے کے ڈھیر پر نمودار ہوا جہاں سیزوف اور مخوتین کھڑے ہوئے تھے۔

''ساتھیو!'' اس نے زور سے کہا۔

ماں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ کتنا زرد تھا اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ غیر ارادی طور مجمع کو چیرتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی۔

''کون دھکے دے رہا ہے؟'' وہ لوگ جھنجھلا کر اس پر چلائے۔

اسے بھی دھکے دئے گئے لیکن وہ اس سے رکی نہیں۔ اپنے بیٹے کے نزدیک کھڑے ہونے کے خواہش کے زیر اثر وہ کاندھوں اور کہنیوں سے راستہ بناتی ہوئی آگے پہونچ گئی۔

جب پاویل نے اپنے سینے کو اس لفظ سے خالی کر دیا جو اس کے لئے ایک عمیق اہمیت کا حامل تھا تو

اسے محسوس ہوا جیسے اس کا حلق شدت مسرت سے خشک سا ہو گیا ہے۔ اس میں ایک زبردست جذبہ بیدار ہوا کہ ان لوگوں کی طرف اپنا دل کھول کر پھینک دے، وہ شعلہ بداماں دل جو عدل وانصاف کے خوابوں سے معمور تھا۔

''ساتھیو!'' اس لفظ سے قوت اور انبساط حاصل کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ہم وہ لوگ ہیں جو کلیسا اور کارخانے بناتے ہیں، جو زنجیریں اور روپئے ڈھالتے ہیں۔ ہم وہ زندہ قوت ہیں جس کی وجہ سے پالنے سے قبر تک تمام لوگ پیٹ بھرتے اور زندہ رہتے ہیں!''

''بالکل صحیح!'' ریبن چیخا۔

''ہمیشہ اور ہر جگہ ہم ہی محنت کرنے والوں میں سب سے پہلے ہوتے ہیں اور ہمارا ہی خیال سب سے آخر میں کیا جاتا ہے۔ ہماری پرواہ کون کرتا ہے؟ ہماری بھلائی کے لئے کبھی کسی نے ذرہ برابر بھی کوئی کام کیا؟ کوئی ہمیں انسان بھی سمجھتا ہے؟ کوئی نہیں!''

''کوئی نہیں!''

جب تقریر چل نکلی تو پاویل نے اور زیادہ سادگی اور آہستگی سے بولنا شروع کیا اور مجمع آہستہ آہستہ اس کے نزدیک آکر ایک واحد ہزار سرے جسم میں تبدیل ہو گیا جو اپنی ہزار تھا متوجہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے ایک ایک لفظ کو پی رہا تھا۔

''ہم اس وقت تک اپنے لئے بہتر حالات حاصل نہ کرسکیں گے جب تک ہم یہ محسوس نہ کریں کہ ہم سب رفیق ہیں، دوستوں کا ایک ایسا خاندان ہیں جو اپنے حقوق کیلئے جدوجہد کی واحد خواہش کے رشتے میں بندھا ہوا ہے۔''

''اصل مسئلے کی طرف آؤ!'' ماں کے پاس کھڑے ہوئے کیسی شخص نے بھدی آواز میں پکار کر کہا۔

''گڑبڑ مت کرو!'' مختلف سمتوں سے دو آوازیں آئیں۔

کلونس سے بھرے ہوئے چہروں پر شکوک وشبہات کی جھنجھلاہٹ تھی لیکن بہت سی آنکھیں بڑے غور وفکر کے ساتھ پاویل کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

''ہے سوشلسٹ مگر احمق نہیں'' کسی نے رائے ظاہر کی۔

''بول تو بڑی ہمت سے رہا ہے'' ماں کو ٹھوکا دیتے ہوئے ایک کانے لمبے سے مزدور نے کہا۔

''وقت آ گیا ہے ساتھیو کہ ہم محسوس کرلیں کہ اپنی مدد صرف ہم ہی کرسکیں گے۔ایک کے لئے سب اور سب کے لئے ہر ایک۔اگر ہم دشمنوں کو شکست دینا چاہتے ہیں تو یہ ہمارا اصول ہونا چاہئے۔''

''بالکل صحیح بات کہہ رہا ہے یارو!'' مخو تین نے ہوا میں گھونسہ لہراتے ہوئے زور سے کہا۔

''ڈائرکٹر کو بلاؤ!'' پاویل نے تقریر جاری رکھی۔

''ایسا معلوم ہوا جیسے دفعتاً ہوا کا زور دار جھونکا مجمع کو لے اڑا۔ پورے مجمع میں جنبش ہوئی اور درجنوں آوازیں آئیں:

''ڈائرکٹر کو بلاؤ!''

''اس کو بلانے کے لئے ایک وفد بھیجو!''

ماں اور بھی آگے بڑھ گئی اور اس نے اپنے بیٹے پر نظریں جما دیں۔اس وقت اس کا چہرہ فخر سے تمتما ہوا تھا۔اس کا پاویل یہاں پرانے باعزت مزدوروں کے درمیان کھڑا ہوا تھا اور ہر شخص اس کی بات سن رہا تھا اور اس سے اتفاق کر رہا تھا۔اس بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ اسے نہ تو غصہ آیا اور نہ دوسروں کی طرح اس نے گالیاں دیں۔

گالیوں، چیخوں اور تیز وتند لفظوں کی بھر مار اس طرح شروع ہوئی جیسے ٹین کی چھت پر اولے پڑتے ہیں۔ پاویل نے لوگوں کی طرف دیکھا اور ایسا معلوم ہوا جیسے اپنی بڑی بڑی سی آنکھوں سے کوئی چیزیں تلاش کر رہا ہو۔

''نمایندے!''

''سیزوف!''

''ولاسوف!''

''ریبن! اس کے دانت بہت تیز ہیں!''

دفعتاً مجمع میں کانا پھوسی شروع ہوگئی۔

''وہ تو اپنے آپ ہی آرہا ہے۔''

ڈائرکٹر!''

مجمع نے ایک لمبے قد والے شخص کے لئے راستہ بنایا جس کی ڈاڑھی نکیلی اور چہرہ لمبا تھا۔

''ذرا جانے دو مجھے!'' اس نے ایک ایسی خفیف سی جنبش سے مزدوروں کو اپنے راستے سے ہٹاتے ہوئے کہا کہ اسے ان کو چھونا نہ پڑے۔ اسکی بھویں سکڑی ہوئی تھیں اور وہ انسانوں کے آقا کی تجربہ کار نگاہوں سے مزدوروں کے چہروں کا جایزہ لے رہا تھا۔ لوگوں نے جلدی جلدی ٹوپیاں اتار لیں اور اس کے آگے سلام کے لئے جھکنے لگے لیکن وہ ان کے سلام کا جواب دئے بغیر چلتا رہا اور لوگوں کے درمیان خاموشی اور پریشانی کے بیج بوتا گیا جو گھبرا کر مسکرا رہے تھے اور سرگوشیاں کر رہے تھے، جیسے بچوں کو شرارت کرتے ہوئے دیکھ لیا جائے تو وہ نادم ہو جاتے ہیں۔

وہ ماں کے سامنے سے گذرا اور اس کی سخت نگاہیں اس کے چہرے پر بھی پڑیں اور آخر میں وہ لوہے کے ڈھیر کے سامنے جا کر رک گیا۔ کسی نے امداد اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ اوپر چڑھ گیا اور پاویل اور سیزوف کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''یہ کس قسم کا مجمع ہے؟ تم لوگوں نے کام کیوں بند کر دیا؟''

چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری رہی۔ لوگوں کے سر اناج کی بالیوں کی طرح جھومتے رہے۔ سیزوف نے اپنی ٹوپی ہوا میں لہرائی، کاندھے جھٹکے اور سر جھکا لیا۔

''میرے سوال کا جواب دو!'' ڈائرکٹر نے چیخ کر کہا۔

پاویل اس کے نزدیک آیا اور اونچی آواز سے سیزوف اور ریبن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا:

''ہمارے ساتھیوں نے ہم تین کو یہ اختیار دیا ہے کہ آپ سے مطالبہ کریں کہ کوپک کی کٹوتی کا فیصلہ تبدیل کر دیا جائے۔''

''کیوں؟'' ڈائرکٹر نے پاویل کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''کیونکہ ہم ایسے ٹیکس کو غیر منصفانہ سمجھتے ہیں!'' پاویل نے اونچی آواز میں کہا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ دلدل کو خشک کرنے میں مزدوروں کی زندگی کی حالت سدھارنے کے بجائے انہیں لوٹنے کا جذبہ کارفرما ہے؟ یہی بات ہے؟''

''ہاں'' پاویل نے جواب دیا۔

''اور تم بھی یہی سمجھتے ہو؟'' ڈائرکٹر نے ریبن کی طرف مڑتے ہوئے دریافت کیا۔

''ہم سب کا یہی خیال ہے!''

''اور تمہارا کیا خیال ہے، بھلے مانس؟'' سیزوف کی طرف مڑ کر دے دئے جاتے۔''

سیزوف نے ایک بار پھر اپنا سر جھکا لیا اور خطاوارانہ انداز میں مسکرایا۔

ڈائرکٹر نے آہستہ آہستہ تمام مجمع پر نگاہ دوڑائی اور اپنے کاندھے جھٹکے۔ اس کے بعد وہ پاویل کی طرف مڑا اور غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم کچھ تعلیم یافتہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کیا واقعی تم بھی اس کام کے فوائد محسوس کر سکتے؟''

''اگر کارخانہ اپنے خرچ سے دلدل کو خشک کرا دے تو ہر شخص فایدہ محسوس کرے گا'' پاویل نے اپنی اونچی آواز میں جواب دیا کہ سب لوگ سن سکیں۔

''کارخانہ کائی خیراتی انجمن نہیں ہے'' ڈائرکٹر نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں حکم دیتا ہوں کہ تم لوگ سب اپنے کام پر واپس جاؤ!''

اس نے نیچے اترنا شروع کیا۔ وہ لوہے کے ڈھیر پر بہت پھونک پھونک کے قدم رکھتا ہوا کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر جا رہا تھا۔

مجمع سے بے اطمینانی کی آوازیں آنے لگیں۔

''کیا بات ہے؟'' ڈائرکٹر نے اپنی جگہ پر رکتے ہوئے پوچھا۔

سب لوگ خاموش ہو گئے، صرف ایک آواز نے خاموشی توڑی:

''تم خود ہی جا کر کام کرو!''

''اگر تم لوگ پندرہ منٹ کے اندر کام پر واپس نہیں آتے تو میں سب پر جرمانہ کا حکم دے دوں گا!'' ڈائرکٹر نے روکھے لہجے میں اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر وہ مجمع میں راستہ بنانے لگا۔ اس کے پیچھے بھنبھناتا ہوا شور اٹھ رہا تھا اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھا شور میں اضافہ ہوتا گیا۔

''بھلا اس سے بات کرنا کوئی آسان کام ہے!''

''یہ ہے انصاف! کیا زندگی ہے!''

وہ لوگ پاویل کی طرف مڑے اور چیخ کر بولے:

''اب ہم لوگ کیا کریں، پروفیسر؟''

''بڑی اچھی تقریر کی لیکن جب مالک آیا تو اس سے فائدہ کیا ہوا؟''

''ولاسوف بتاؤ ہم کیا کریں؟''

جب شور بہت زیادہ بڑھ گیا تو پاویل نے کہا:

''ساتھیو، میری تجویز ہے کہ جب تک وہ کوپک کی کٹوتی روکنے کا وعدہ نہ کرے اور اس وقت تک کام پر نہ جایا جائے۔''

پرجوش رائے زنی فوراً شروع ہوگئی۔

''ہمیں بیوقوف سمجھا ہے کیا؟''

''اس کے معنی ہیں ہڑتال!''

''صرف چند کوپک کے لئے؟''

''ہڑتال کیوں نہیں؟''

''سب نکال دیئے جائیں گے!''

''پھر کام کون کرے گا؟''

''اسے بہت سے مل جائیں گے جو کام کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔''

''کونسے؟ ہڑتال توڑنے والے؟''

پاویل نیچے اتر آیا اور اپنی ماں کے پاس کھڑا ہوگیا۔

مجمع میں اشتعال تھا۔ ہر شخص بحث کر رہا تھا اور غصے سے چیخ رہا تھا۔

''انہیں ہڑتال کے لئے کبھی تیار نہ کرسکو گے'' ریبن نے پاویل کے قریب آتے ہوئے کہا۔''یہ لوگ ہیں لالچی لیکن کم ہمت۔ کیا سمجھے! تمہارے ساتھ تین سو سے زیادہ نہیں آئیں گے۔ اتنا بڑا گوبر کا ڈھیر ہے کہ ایک ہی بار میں اسے اٹھانا مشکل ہے...''

پاویل خاموش رہا۔ مجمع کا بہت بڑا برہم چہرہ اس کے سامنے جھول رہا تھا اور اس سے ایک بے آواز، پراصرار مطالبہ کر رہا تھا۔ اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے الفاظ پیاس دھرتی کے سینے پر بارش کے چند قطروں کی طرح کوئی نشان چھوڑے بغیر گم ہوگئے تھے۔

وہ تھکا ہوا اور دل شکستہ گھر واپس ہوا۔ ماں اور سیزوف پیچھے آ رہے تھے اور ریبن اس کے ساتھ چل رہا تھا اور اس کے کان میں اس کی آواز گونج رہی تھی:

''تم تقریر اچھی کرتے ہو لیکن دل پر اثر نہیں ہوتا۔ بات دراصل یہی ہے! تم کو ان کے دلوں سے خطاب کرنا چاہئے۔ چنگاری کو عین مرکز میں پھینکنا چاہئے۔ تم لوگوں کو دلیلوں سے قائل نہیں کر سکتے۔ جوتا پاؤں میں آتا ہی نہیں۔ بہت پتلا اور بہت چھوٹا ہے!''

''ہم بوڑھوں کے لئے تو اپنی قبر تلاش کرنے کا وقت آ گیا ہے پلاگیا!'' سیزوف کہہ رہا تھا۔ ''اب نئے قسم لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ ہم لوگ کس طرح رہتے تھے۔ ہم اور تم ہمیشہ گھٹنوں کے بل گھسٹتے رہے، سر زمین سے ٹکراتے رہے اور اپنے سے بہتر لوگوں کے سامنے جھکتے رہے۔ لیکن آج کل؟ معلوم نہیں، ممکن ہے لوگوں کو عقل آ گئی ہو، یا ممکن ہے وہ اور بھی شدید غلطیاں کر رہے ہوں۔ لیکن جو بھی ہو یہ لوگ ہماری طرح نہیں ہیں۔ نوجوانوں کو ہی لو۔ ڈائرکٹر سے ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے وہ ان کے برابر کا ہو... اچھا پھر ملیں گے پاویل میخائلووچ۔ بڑا اچھا ہے بھائی کہ تم لوگوں کی طرفداری میں کھڑے ہو جاتے ہو۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ ممکن ہے تم کوئی راستہ نکال سکو۔ خدا تم پر اپنی رحمت کرے!''

''جاؤ اور جا کر مر جاؤ'' ریبن بڑبڑایا۔ ''ایسے لوگ تو انسان بھی نہیں ہیں، صرف گارا ہیں، جن سے درزیں بند کر دی جائیں۔ تم نے دیکھا تھا پاویل کہ تمہیں نمائندہ بنانے کے لئے کون چیخا تھا؟ وہی لوگ جو یہ افواہ پھیلاتے ہیں کہ تم سوشلسٹ ہو اور ہنگامہ پسند ہو۔ وہی لوگ ہیں! دل میں سوچتے ہیں: 'نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ اس کے لئے یہی ٹھیک ہے،'۔''

''اپنے نقطۂ نظر سے انہوں نے ٹھیک ہی کیا!'' پاویل نے کہا۔

''اور بھیڑئے جب اپنے ہی بھائی بندوں کو چیر ڈالتے ہیں تو وہ بھی ٹھیک ہی کرتے ہیں۔''

ریبن کے چہرے پر فکر کے بادل چھائے ہوئے تھے اور اس کی آواز میں خلاف معمول تناؤ سا تھا۔

''لوگ خالی خولی الفاظ کو نہیں سنتے۔ تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ اپنے الفاظ کو خون میں نہلانا پڑتا ہے...''

دن بھر پاویل تھکا تھکا سا افسردہ گھومتا رہا۔ اس پر کچھ عجیب اضطرابی کیفیت طاری تھی اور اس کی جل رہی تھیں اور معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی چیز کی متلاشی ہوں۔ ماں نے اسے محسوس کر لیا۔

’’کیا بات کیا ہے پاشا؟‘‘ اس نے ذرا احتیاط طریقے سے دریافت کیا۔

’’سر میں درد ہے‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’تم لیٹ جاؤ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔‘‘

’’نہیں پریشان مت ہو!‘‘ اس نے جلدی سے جواب دیا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا ’’میں بہت کم عمر اور کمزور ہوں۔ مشکل یہی ہے! انہیں مجھ پر یقین نہیں آیا۔ انہوں نے نے میرے مقصد کو نہیں اپنایا جس کے معنی یہ ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ بات کس طرح کی جائے۔ مجھے بڑا برا سا معلوم ہو رہا ہے۔ اپنے آپ سے نفرت ہو رہی ہے۔‘‘

ماں نے اس کے فکرمند چہرے کی طرف دیکھا اور اسے تسکین دینے کی کوشش کی۔

’’تھوڑا انتظار کرو!‘‘ اس نے نرمی سے کہا۔ ’’جو بات آج نہیں سمجھے وہ کل سمجھ جائیں گے۔‘‘

’’میں تک محسوس کر رہی ہوں کہ تم صحیح کہتے ہو۔‘‘

پاویل اس کے پاس گیا۔

’’تم بڑی اچھی ہو ماں‘‘ اس نے کہا اور پھر مڑ گیا۔ ماں چونک سی پڑی جیسے اس کے نرم الفاظ سے مرجھا سی گئی ہو۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے دل کو دبایا اور اس کی محبت کے مزے لینے لگی۔ پھر وہ اس کے پاس سے چلی گئی۔

اس رات جب وہ سو گئی تھی اور پاویل بستر پر لیٹا پڑھ رہا تھا تو خفیہ پولیس والے آئے اور کمرے میں گھس کر ہنگامہ مچانا شروع کیا۔ وہ اوپر کے کمرے میں بھی پہنچ گئے اور باہر احاطے میں بھی۔ زرد چہرے والے افسر کا رویہ اب بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا پہلے تھا۔ اس کا ناگوار حد تک طنزیہ انداز تھا اور وہ ان سے دل دکھانے والے مذاق کر کے مزے لے رہا تھا۔ ماں ایک کونے میں بیٹھی مستقل اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے جذبات کی غمازی نہ ہونے پائے۔ لیکن جب افسر ہنسا تو اس کی انگلیوں میں تشنج سا پیدا ہوا۔ ماں نے محسوس کر لیا کہ بڑی مشکل سے وہ اپنے آپ کو منہ توڑ جواب دینے سے روک رہا تھا اور پولیس والوں کی پھبتیوں کو برداشت کرنا اور اس کے لئے بے حد تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ پہلی بار ماں کو جتنا ڈر معلوم ہوا تھا اب کی بار اتنا نہیں تھا۔ ان خاکی وردی والے رات کے مہمانوں کے خلاف اس کی نفرت میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس نفرت نے اس کے خوف کو جلا کر بھسم کر دیا تھا۔

''یہ لوگ مجھے گرفتار کر کے لے جائیں گے'' پاویل اس سے آہستہ سے کہنے میں کامیاب ہو گیا۔

''میں جانتی ہوں'' اس نے اپنا سر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔

ماں کو احساس ہوا کہ اس دن صبح اس کے بیٹے نے مزدوروں سے جو کچھ کہا تھا اس کی وجہ سے یہ لوگ اسے جیل میں ڈال دیں گے۔ لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا اس سے ہر شخص نے اتفاق کیا تھا۔ اس لئے ان سب لوگوں کو اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہونا چاہئے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زیادہ دن تک قید میں نہیں رہے گا۔

وہ چاہتی تھی کہ اسے اپنے بازوؤں میں لے کر روئے لیکن افسر بالکل اس کے برابر ہی کھڑا ہوا اسے آنکھیں سکیڑ کے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ اور اس کی مونچھیں پھڑک رہی تھیں اور پلاگیا کو ایسا محسوس ہوا کہ یہ شخص اس کے آنسوؤں اور شکایتوں اور التجاؤں جا انتظار کر رہا تھا۔ اپنی ساری قوت کو مجتمع کر کیا اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ تھام لیا اور آہستگی اور نرمی سے، تقریباً سانس روکے ہوئے بولی:

''خدا حافظ پاشا۔ تم نے اپنی ضرورت کی ہر چیز لے لی ہے؟''

''ہاں۔ ہمت نہ ہارنا۔''

''خدا تمہاری حفاظت کرے...''

جب وہ لوگ اسے لے کر چلے گئے تو وہ ایک بنچ پر گر پڑی اور دھیرے دھیرے سسکیاں بھرنے لگی ۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی جیسے اس کا شوہر اکثر و بیشتر بیٹھا کرتا تھا۔ اس وقت وہ غم اور اپنی بے بسی کے تکلیف دہ احساس میں ڈوبی ہوئی تھی ۔ اپنے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیتے ہوئے اس نے لمبی دھیمی آہ بھری جس میں اس اپنے زخمی دل کے سارے درد کو سمو دیا اور اس کے ذہن پر وہ بے حس و حرکت زدہ چہرہ چھایا رہا جس کی مونچھیں باریک تھیں ۔ اور جس کی سکڑی ہوئی آنکھوں میں مسرت چمک رہی تھی ۔ اس کے سینے میں ان لوگوں کے لئے تلخی اور نفرت کے سیاہ بادل چھانے لگے جو ماؤں کی آغوش کو ان کے بیٹوں سے محض اس بنا پر محروم کر دیتے ہیں کہ بیٹے عدل و انصاف کے متلاشی ہیں۔

رات سرد تھی اور بارش کے قطرے کھڑکیوں پر بج رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے بغیر آنکھوں ، سرخ چہروں اور لمبے ہاتھوں والے خاکی اجسام رات میں مہمیز کی دھیمی آواز پیدا کرتے ہوئے اس کے گھر کے چاروں طرف پہرہ داروں کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔

''کاش وہ مجھے بھی لے جاتے!'' اس نے سوچا۔

کارخانے کی سیٹی لوگوں کو کام کے لئے بلا رہی تھی۔ آج صبح اس کی آواز دھیمی، پھٹی ہوئی اور غیر یقینی سی معلوم ہوئی۔ دروازہ کھلا اور ریبن اندر داخل ہوا۔ وہ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ڈاڑھی سے بارش کے قطروں کو پونچھتے ہوئے اس نے پوچھا:

''اسے لے گئے کیا؟''

''ہاں لے گئے۔ پھٹکار ہو ان پر!'' اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اس کی تو توقع کرنی ہی چاہئے تھی'' وہ کچھ ہنسا۔

میرے گھر کی بھی تلاشی لی۔ ہر چیز کو اٹھا اٹھا کر دیکھا۔ بے انتہا گالیاں بکتے رہے۔ لیکن نقصان کم پہنچایا۔ تو پاویل کو لے گئے! ڈائرکٹر نے اشارہ کیا، پولیس نے سر ہلایا اور۔ ایک اور شخص چلا گیا! یہ لوگ ملکر اچھا خاصا کام کرتے ہیں، ایک لوگوں کو پکڑ لیتا ہے اور دوسرا ان کی جیبیں خالی کر دیتا ہے۔''

''تم لوگوں کو پاویل کی تائید کرنی چاہئے!'' ماں نے اٹھتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''اس نے جو کچھ کیا تمام لوگوں کی خاطر کیا۔''

''کس کو چاہئے؟''

''سب کو!''

ہونہہ! اچھا تو یہ سمجھتی ہو تم! مگر یہ تو کبھی نہیں ہو گا!''

ہنستے ہوئے وہ باہر چلا گیا اور اس کے مایوس کن الفاظ نے ماں کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ دل شکستہ کر دیا۔

''کون جانے وہ اسے ماریں۔ اذیت دیں...''

اس نے تصور کیا کہ اس کا بیٹا زخمی ہونے اور مار کھانے کے بعد خون سے لت پت ہے اور اس کے دل پر ایک وحشتناک خوف چھا گیا۔ اس کی آنکھوں میں خلش ہونے لگی۔

اس دن اس نے نہ چولہا جلایا، نہ کھانا کھایا اور نہ چائے پی۔ کہیں شام کو جا کر اس نے روٹی کا ٹکڑا کھایا۔ جب اس رات وہ سونے کے لئے لیٹی تو اسے محسوس ہوا کہ زندگی اس سے پہلے کبھی اتنی خالی اور سنسان نہ تھی۔ گذشتہ چند برس سے وہ کسی اچھی اور اہم چیز کی مستقل امید میں زندگی گذارنے کی عادی ہو

گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف نو جوان لوگوں کی مسرت آ گیں، پر شور سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کا سنجیدہ اور آرزو مند چہرہ دیکھنے کی عادی ہو گئی تھی جو اس اچھی لیکن خطرناک زندگی کا محرک تھا۔ اور اب وہ جا چکا تھا اور۔ ہر چیز چلی گئی تھی۔

وہ دن اور وہ بے خوف رات کاٹے نہ کٹی لیکن اس کے بعد کا دوسرا دن تو اور بھی لمبا ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ کوئی آئے گا لیکن کوئی بھی نہ آیا۔ شام ہو گئی اور۔ پھر رات۔ سرد بارش نے آہ بھری اور دیوار سے ٹکرا کر سرسرائی، ہوا چمنی سے چیختی ہوئی نکلی اور فرش کے نیچے کوئی چیز دوڑ گئی۔ چھت سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور ان کی آواز گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ عجیب طرح سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا جیسے سارا گھر آہستہ آہستہ پینگ لے رہا ہو۔ غم نے جانے پہچانے سے ماحول کو غیر مانوس اور بے جان سا بنا دیا تھا۔ کھڑکی پر دستک ہوئی۔ ایک، دو...وہ ایسی دستک کی عادی ہو گئی تھی اور اسے ڈر بالکل لگتا تھی۔ لیکن اس وقت وہ خوشی سے ذرا چونک سی پڑی۔ مبہم امیدوں نے اسے فوراً پیروں پر کھڑا کر دیا۔ اپنے کاندھوں پر شال ڈالتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔

سموئلوف اندر آیا۔ اس کے پیچھے ایک دوسرا شخص تھا جس کا چہرہ کوٹ کے الٹے ہوئے کالر اور بھوؤں تک کھنچی ہوئی ٹوپی کی وجہ سے ڈھکا ہوا تھا۔

''کیا ہم نے تمہیں جگا دیا؟'' سموئلوف نے سلام کئے بغیر پوچھا۔ اس کے خاص انداز کے برخلاف اس وقت اس کی آواز میں پریشانی اور افسردگی تھی۔

''میں سوئی نہیں تھی'' اس نے جواب دیا اور انہیں پر امید نگاہوں سے کھڑی تاکتی رہی۔

سموئلوف کے ساتھی نے ٹوپی اتارتے ہوئے زور کا سانس لیا اور اپنا چھوٹا لیکن بھرا بھرا سا ہاتھ آگے کی طرف بڑھا دیا۔

''ارے ماں! مجھے نہیں پہچانا؟'' اس نے پرانے دوست کی طرح پوچھا۔

''تم ہو!'' پلاگیا نے کسی وجہ سے دفعتاً خوش ہو کر کہا۔'' یگور ایوانووچ؟''

''بالکل وہی!'' اس نے اپنے بڑے سے سر کو جھکا کر جواب دیا۔ اس کے سر کے بال کسی مناجات خواں کی طرح لمبے تھے، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور چھوٹی بھوری آنکھیں نرمی اور شفقت سے ماں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ بالکل سماوار کی طرح تھا۔ گول اور پستہ قد گردن موٹی اور ہاتھ چھوٹے چھوٹے

۔اس کے چہرے پر چمک تھی اور وہ زور سے سانس لیتا تھا اور اس کے سینے کی گہرائی میں کوئی چیز خرخر کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

''تم لوگ دوسرے کمرے میں جاؤ تب تک میں کپڑے بدل لوں'' ماں نے کہا۔

''ہمیں تم سے کچھ دریافت کرنا ہے'' سموئلوف نے اسے ابروؤں کے نیچے سے دیکھتے ہوئے بڑی بے صبری کے ساتھ کہا۔

یگور ایوانووچ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور وہیں باتیں کرنے لگا۔

''آج صبح کو نکولائی ایوانووچ جیل سے آ گیا ماں۔شاید تم جانتی ہو اسے؟'' اس نے بات شروع کی

۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ بھی جیل میں ہے'' ماں نے ٹوکا۔

''دو مہینے گیارہ دن کے لئے۔ وہاں خوخول سے ملاقات ہوئی تھی اس نے تمہیں سلام کہا ہے اور پاویل نے بھی۔اور اس نے کہا کہ تم گھبرانا نہیں۔اس نے یہ بھی کہلایا ہے کہ اس کے اختیار کئے ہوئے راستے کو جو بھی اختیار کرے گا اس پر جیل میں چند دن کی چھٹیاں گذارنے کی عنائتیں اکثر و بیشتر کی جائیں گی۔ ہمارے آقاؤں کی مہربانی سے اتنی بات تو پکی ہو گئی ہے۔ اور اب ذرا کام کی بات کرنا ہے ماں ۔تمہیں معلوم ہے کہ کل کتنے لوگ گرفتار ہوئے؟''

''کیوں۔کوئی اور بھی تھا پاویل کے علاوہ؟'' ماں نے دریافت کیا۔

''وہ تو انچاسواں تھا'' یگور ایوانووچ نے آہستہ سے کہا۔

''اور منتظمین غالباً ایک درجن کو اور گرفتار کرا دیں گے۔مثال کے طور پر یہ نوجوان۔''

''ہاں، مجھے بھی'' سموئلوف نے پژمردہ انداز میں کہا۔

پلا گیا کو محسوس ہوا کہ کسی وجہ سے اس کے لئے سانس لینا آسان ہو گیا ہے۔

''کم سے کم وہ تنہا تو نہیں ہے'' اس کے ذہن میں یہ بات آئی۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ مہمانوں کے پاس آئی۔اس وقت وہ بہت ہشاش بشاش تھی اور ان لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''اتنے لوگوں کو پکڑا ہے تو میرا خیال ہے بہت دنوں تک نہیں رکھیں گے۔''

''تمہارا خیال صحیح ہے!'' یگور ایوانووچ نے کہا۔''اور اگر ہم ان کا یہ تماشہ ختم کر سکیں تو انہیں دم دبا کر بھاگنا پڑے گا۔ نکتہ یہ ہے کہ اگر کارخانے میں ہم پرچے تقسیم کرنا بند کر دیں تو پولیس والوں کے ہاتھ ایک موقع آئے گا اور وہ اسے پاویل اور دوسرے ساتھیوں کے خلاف استعمال کریں گے جو قید کی تنگی اور تکلیف اٹھا رہے ہیں''

''تمہارا مطلب کیا ہے؟'' ماں نے خوفزدہ ہو کر دریافت کیا۔

''بہت سیدھی سی بات ہے'' یگور ایوانووچ نے آہستہ سے کہا۔''کبھی کبھی پولیس والے بھی منطقی انداز میں سوچتے ہیں۔ تم خود ہی سوچو: پاویل آزاد تھا تو اخبار اور پرچے تقسیم ہوتے تھے۔ پاویل گرفتار ہو گیا تو نہ اخبار ہیں نہ پرچے۔ صاف بات ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ اخباروں اور پرچوں کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ ہے نا یہی بات؟ اور لوگ ان سب کو ہڑپ کرنے کی کوشش کریں گے۔ خفیہ پولیس والوں کی عادت ہے کہ لوگوں کو اس طرح نگلتے ہیں کہ سوائے ریزے بھوروں کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔''

''میں سمجھی'' ماں نے افسردگی سے کہا۔''افوہ! لیکن ہم اس کے متعلق کیا کر سکتے ہیں؟''

''تقریباً ہر شخص کو تو پکڑ لے گئے، خدا انہیں غارت کرے!'' سموئلوف کی آواز باروچی خانے میں سے آئی۔''اب ہمیں کام کو نہ صرف اپنے مقصد کے لئے بلکہ بہت سے ساتھیوں کو بچانے کے لئے بھی جاری رکھنا ہے۔''

''اور کام کرنے والا کوئی بھی نہیں ہے'' یگور نے مختصر سی ہنسی ہنس کر کہا۔''ہمارے پاس کچھ بہت ہی اچھے پرچے اور اشتہار وغیرہ ہیں، سب میرا ہی کیا ہوا ہے، لیکن اسے کارخانے سے کس طرح بھیجا جائے۔ یہ سوال اب تک حل نہ ہو سکا!''

''پہلے ہی پھاٹک پر ہر شخص کی تلاشی لی جانے لگی ہے'' سموئلوف نے کہا۔

ماں نے بھانپ لیا کہ یہ لوگ اس سے کسی بات کی توقع کر رہے ہیں۔

''کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کس طرح؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

سموئلوف دروازے میں نمودار ہوا۔

''تم خوانچے والی کارسونووا سے واقف ہو، پلاگیا نلوونا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ہاں۔ لیکن اس سے کیا؟''

''ذرااس سے بات کرو،ممکن ہے وہ ان چیزوں کو لے جائے۔''

ماں نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلایا۔

''ارے نہیں! وہ بڑی باتونی ہے! ان لوگوں کو فوراً ہی خبر ہو جائے گی کہ اسے یہ سب کچھ مجھ سے ملا ہے، یہ سب چیزیں اس گھر سے آئی ہیں۔''

پھر اس نے دفعتاً جھنجھلا کر کہا:

''مجھے دیدو وہ ساری چیزیں۔ مجھے! میں انتظار کروں گی۔ کوئی طریقہ نکال لوں گی! میں ماریا سے کہوں گی کہ مجھے اپنی مدد کے لئے رکھ لے۔ مجھے اپنی روزی تو کسی نہ کسی طرح کمانا ہی ہے، تو کھانا بیچنے کیلئے کارخانے جایا کروں گی۔ سب ٹھیک کرلوں گی!''

سینے پر اپنے ہاتھوں کو دباتے ہوئے اس نے جلدی جلدی ان لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ ہر چیز بہت اچھی طرح کرے گی اور لوگوں کی توجہ کا مرکز نہیں بنے گی۔ آخر میں اس نے بڑے وجد وانبساط کے عالم میں کہا:

''انہیں معلوم ہو جانا چاہئے کہ پاویل کے ہاتھ جیل سے یہاں پہونچ جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہو جانا چاہئے!''

تینوں خوش ہو گئے۔ یگور نے ہاتھ ملے اور مسکراتے ہوئے کہا:

''بہت خوب ماں! تمہیں نہیں معلوم کہ کتنی بہتریں بات ہوئی ہے یہ۔ ایک دم الشان!''

''اگر یہ تجویز کارگر ہوئی تو میں تو جیل ایسے جاؤں گا جیسے بستر پر سونے جاتا ہوں'' سموئلوف نے بھی اپنے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''تم تو دنیا کی حسین ترین خاتون ہو!'' یگور بیٹھی ہوئی آواز میں چلایا۔

ماں مسکرائی، اس پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر کارخانے میں پرچے تقسیم ہوتے رہے تو منتظمین اس کی ذمہ داری اس کے بیٹے پر نہ ڈال سکیں گے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کام کو پورا کرنے کے قابل ہے، اور خوشی سے اس کی بوٹی بوٹی پھڑکنے لگی۔

''جب تم پاویل سے ملنے جیل جاؤ تو کہہ دینا کہ تمہاری ماں بہت اچھی ہے'' یگور نے کہا۔

''پہلے میں ہی جاؤں گا'' سموئلوف ہنسا۔

''اس سے کہنا کہ جو کام کرنے کے ہیں میں وہ سب کروں گی۔ اسے یہ ضرور بتا دینا!

''اور اگر سموئلوف کو ان لوگوں نے جیل نہ بھیجا تو؟'' یگور نے پوچھا۔

''تو مجبوری ہے'' اسنے کہا۔

دونوں مرد ہنس پڑے اور جب اس نے اپنی غلطی محسوس کی تو وہ بھی کچھ ندامت اور کچھ چالاکی سے ہنسنے لگی۔

''اپنے غم کے آگے دوسروں کا غم ذرا مشکل سے نظر آتا ہے'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''بالکل فطری بات ہے'' یگور بولا۔ ''اور دیکھو، پاویل کی وجہ سے افسردہ اور فکرمند مت ہو۔ وہ جیل سے کچھ بہتر ہی حالت میں واپس آئے گا۔ وہاں اچھا خاصا آرام اور پڑھنے کا وقت ملتا ہے اور ہم جیسے لوگ جب باہر رہتے ہیں تو ان میں سے ایک چیز کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ میں تین بار جیل جا چکا ہوں اور گو یہ بات میرے لیئے کوئی خاص باعث مسرت نہ تھی مگر ہر بار میرے دل و دماغ کو کافی فایدہ پہونچا۔''

''تمہیں سانس لینے میں تکلیف ہوتی ہے'' ماں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی ایک خاص وجہ ہے'' اس نے ایک انگلی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تو پھر میں سمجھوں کہ ہر چیز طے ہو گئی ایک دفعہ چلنے لگے گی اور صدیوں کی تاریکی کو پیس کر رکھ دے گی۔ آزادئ تقریر زندہ باد اور ماں کا دل پائندہ باد! اچھا رخصت، سلام۔''

''خدا حافظ'' سموئلوف نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''میں تو ایسی تجویز اپنی ماں کے آگے نہیں پیش کر سکتا تھا۔''

سب لوگ ایک دن سمجھ جائیں گے'' پلاگیا نے اس کا دل بڑھانے کے لئے کہا۔

جب وہ لوگ چلے گئے تو اس نے دروازہ بند کیا اور کمرے کے وسط میں گھٹنوں کے بل جھک گئی اور اس نے اپنی دعا کو بارش کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔ بغیر الفاظ کے وہ دعا مانگتی رہی۔ اس وقت اس کے دل میں ان لوگوں کے متعلق مجتمع تشویش تھی جنہیں پاویل نے اس کی زندگی میں داخل کر دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے یہ لوگ اس کے اور سادے انسان جو ایک دوسرے سے بے انتہا نزدیک تھے اور پھر بھی اتنے تنہا۔

صبح سویرے ہی وہ ماریا کاریا کارسونووا سے ملنے چلی گئی۔ خوانچے والی نے جو ہمیشہ کی طرح چکنائی

میں غرق اور بکواسی تھی، اس کی ہمدردی سے استقبال کیا۔

''بہت افسردہ ہو'' اس نے ماں کے کاندھے پر اپنا چکنا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ہمت نہ ہارو! پکڑ کر لے گئے نا؟ تو پھر کیا ہوا! اس میں کوئی شرمانے کی بات نہیں۔ پہلے تو لوگوں کو چوری کی وجہ سے جیل میں ڈالا جاتا تھا لیکن آج کل لوگوں کو اپنے حق پر اڑنے کی وجہ سے جیل بھیج دیتے ہیں۔ ممکن ہے پاویل نے بالکل وہ نہیں کہا جو اسے کہنا چاہئے تھا، لیکن اس نے جو بھی کہا وہ سب کے لئے کہا اور ہر شخص اس بات کو جانتا بھی ہے۔ تو پھر تم کو پریشان نہ ہونا چاہئے ہوگ منہ سے نہ کہیں تب بھی ہر شخص اچھے برے کی تمیز تو رکھتا ہی ہے۔ میں تم سے ملنے آنا چاہتی تھی لیکن وقت ہی نہیں ملتا۔ بس سارا دن پکاؤ اور پھیری کرو۔ لیکن تم لکھ رکھو کہ مروں گی میں فقیر کی موت! مجھے تو یہ عاشق کھائے جاتے ہیں۔ بے انتہا بری طرح! کبھی یہاں دانت مارا کبھی وہاں دانت مارا۔ جیسے کاکروچ روٹی کو کھاتے ہیں! جب بھی دس ایک روبل میں نے جمع کر لئے تو کوئی حرامزدہ آدھمکتا ہے اور ساری رقم ہضم کر جاتا ہے۔ عورت ہونا بھی کیا مصیبت ہے! خدا کسی کو بھی عورت نہ بنائے! تنہا رہو۔ مگر کس لئے؟ مرد کرو۔ چلو قصہ تمام!''

''تم سے یہ کہنے آئی ہوں کہ مجھے اپنی مددگار کی حیثیت سے رکھ لو'' پلاگیا نے اس کی بک بک میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''مطلب کیا ہے؟'' ماریا نے پوچھا۔ جب پلاگیا نے سمجھایا تو ماریا راضی ہوگئی۔

''ضرور'' اس نے کہا۔ ''یاد ہے نا جب تم مجھے میرے مرد سے چھپایا کرتی تھیں؟ اب میں تمہیں بھوک سے پناہ دوں گی۔ ہر شخص کو تمہاری مدد کرنا چاہئے کیونکہ تمہارا بیٹا لوگوں کی بھلائی کے لئے پکڑا گیا ہے۔ ہے بڑا اچھا لڑکا، ہر شخص یہی کہتا ہے، اور ہر دخص کو اس کا افسوس ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ مالکوں کو ان گرفتاریوں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ دیکھو کارخانے کی حالت کیا ہے، بہت ہی بری حالت ہے۔ یہ مالک سمجھتے ہیں کہ کسی کے ٹھوکر ماریں گے تو وہ دوڑنا چھوڑ دے گا۔ لیکن ہوتا کیا ہے کہ ایک درجن کو مارتے ہیں تو سو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں!''

اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن دوپہر میں ماں ماریا کے کھانے کے خوانچے اٹھائے کارخانے پہونچ گئی اور خوانچے والی خود کھانا بیچنے بازار چلی گئی۔

مزدوروں نے فوراً ہی نئی خوانچے والی کو پہچان لیا۔

''یہ دھندا شروع کر دیا پلا گیا؟'' انہوں نے اپنے سر کی جنبش سے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

چند لوگوں نے اسے یہ یقین دلانا ضروری سمجھا کہ پاویل بہت جلد ہی چھوٹ جائے گا۔ دوسروں نے اپنی ہمدردی کے اس دل موہ لیا اور کچھ دوسرے لوگوں نے ڈائرکٹر اور پولیس والوں کو بری بری گالیاں دیں اور یہ گویا اسی کے دل کی بات تھی۔ ایسے بھی لوگ تھے جو اس کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ اس کی حالت سے بہت خوش اور مطمئن ہوں اور ٹائم کیپر ایسائی گوربوف نے دانت بھینچ کر دھیرے سے کہا:

''اگر میں گورنر ہوتا تو تمہارے بیٹے کو پھانسی پر لٹکا دیتا! لوگوں کو بہکانے کی یہی سزا ہے!''

اس خوفناک دھمکی نے اس کے جسم میں جھرجھری پیدا کر دی۔ اس نے ایسائی کو کوئی جواب نہیں دیا صرف اس کے چھوٹے، چھائیوں والے چہرے پر نگاہ ڈالی اور ٹھیڈا اسانس بھر کر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

کارخانے میں بے اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ مزدور چھوٹے چھوٹے حلقوں میں جمع ہو گئی اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ گھبرائے ہوئے فورمین ہر طرف دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ گالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور تمسخر آمیز قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ دو پولیس والے سموئلوف کو پکڑ کر ماں کے نزدیک سے گئے۔ وہ ایک ہاتھ جیب ڈالے ہوئے دوسرے سے اپنے سرخ بال پیچھے کرتے ہوئے چل رہا تھا۔

تقریباً سو مزدور ان کے پیچھے پیچھے پولیس والوں کو گالیاں دیتے اور فقرہ بازی کرتے ہوئے ساتھ ہو لئے۔

''چھٹی پر جا رہے ہو سموئلوف؟'' کسی نے پکار کر کہا۔

آج کل یہ لوگ ہمارے ساتھیوں کی بڑی عزت افزائی کر رہے ہیں'' کسی دوسرے نے کہا۔ ''ہم ٹہلنے جاتے ہیں تو سنتریوں کو ہمارے ساتھ کر دیتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے ایک بری سی گالی دی۔

''معلوم ہوتا ہے آج کل چوروں کو پکڑنے میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا'' ایک لمبے کانے مزدور نے فقرہ کسا۔ ''اسی لئے ایماندار لوگوں کو پکڑنا شروع کر دیا ہے!''

''ہم سمجھتے تھے کہ ان میں اتنی شرافت تو ہے کہ لوگوں کو کم سے کم رات میں پکڑیں گے'' مجمع میں سے ایک آواز آئی۔ ''لیکن دن دھاڑے لئے جا رہے ہیں، حرامزادے!''

پولیس والوں نے تیوریاں چڑھائیں لیکن تیزی سے چلتے رہے گویا کسی چیز کو دیکھ ہی نہیں رہے اور نہ وہ فقرے سن رہے تھے جو ان پر چست کئے جا رہے تھے۔ تین مزدور لوہے کی ایک بڑی سی چادر اٹھائے ہوئے ان کے راستے میں آ گئے۔

''راستہ دو مچھیرو!'' وہ چلائے۔

گذرتے ہوئے سموئلوف نے ماں کو سر سے اشارہ کیا۔

''جا رہے ہیں ہم!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی سے اس کے سامنے جھکی۔ اس کا دل ایماندار سنجیدہ نوجوانوں کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا تھا جو جیل جاتے ہیں لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے، اور اس کا دل ایک ماں کی محبت اور رحم سے معمور ہو گیا۔ کارخانے سے واپسی پر اس نے دن کا باقی وقت ماریا کے ساتھ گذارا، اس کے کام میں مدد کرتی رہی اور اس بک بک سنتی رہی۔ شام کو بڑی دیر میں وہ اپنے سرد، ویران، اداس مکان میں واپس آئی۔ بہت دیر تک ایک جگہ سے دوسری جگہ چکر لگاتی رہی لیکن اسے سکون نہ ملا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ وہ اس بات سے پریشان تھی کہ تقریباً رات ہو گئی تھی اور یگور ایوانووچ وہ چیزیں نہیں لایا تھا جن کا وعدہ کیا تھا۔

کھڑکی کے باہر خزاں کے زمانے کی برف کے بھورے بھورے گالے گر رہے تھے، وہ کسی شیشے پر آہستہ سے چپک جاتے اور پھر پگھل کر اپنے پیچھے پانی کی لکیر چھوڑتے ہوئے بہ جاتے۔ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں سوچنے لگی...

دروازے پر بہت احتیاط سے کسی نے دستک دی۔ ماں نے جلدی سے جا کر کنڈی کھولی۔ ساشا داخل ہوئی۔ ماں نے ایک مدت سے اسے نہ دیکھا تھا اور اس کا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ غیر فطری طور پر کچھ موٹی ہو گئی ہے۔

''آداب'' اس نے کہا۔ وہ خوش تھی کہ کوئی تو آیا اور کم سے کم رات کو تھوڑی دیر تک وہ تنہا نہ رہے گی۔ ''بہت زمانے سے تمہیں دیکھا ہی نہیں، کہیں باہر گئی تھیں۔''

''نہیں، میں جیل میں تھی'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نکولائی ایوانووچ کے ساتھ۔ یاد ہے ناوہ؟''

''ہاں ہاں یاد کیوں نہیں!'' ماں نے کہا۔ ''یگورایوانووچ نے کل مجھے بتایا کہ اسے چھوڑ دیا گیا ہے لیکن مجھے تمہارے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی... کسی نے نہیں بتایا کہ تم بھی وہیں تھیں...''

''کوئی بات نہیں۔ ہاں، یگورایوانووچ کے آنے سے پہلے مجھے لباس تبدیل کرنا ہے'' اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''تم بالکل بھیگی ہوئی ہو...''

''میں اخبار اور پرچے لائی ہوں...''

''لاؤ مجھے دو، مجھے دو!'' ماں نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

لڑکی نے اپنا کوٹ ڈھیلا کر کے اپنے جسم کو جھکولے سے دئے اور درخت کے پتوں کی طرح اخبار اور پرچے نیچے ڈھیر ہو گئے۔ ماں انہیں سمیٹتے ہوئے ہنسی۔

''میں نے تمہیں دیکھا تو سوچ رہی تھی کہ اتنی موٹی کیسے ہو گئی ہو۔ میں سمجھی تم نے شادی کر لی ہے اور تمہارے بچہ ہونے والا ہے۔ باپ رے! کتنے بہت سے پرچے لائی ہو! پیدل چل کر آ رہی ہو؟''

''ہاں'' ساشا نے کہا۔ وہ ایک بار پھر بلند قامت اور نازک اندام نظر آنے لگی۔ ماں نے دیکھا کہ اس چہرہ کھنچا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ بڑی معلوم ہو رہی تھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔

''قید سے چھوٹنے کے بعد تمہیں آرام کی ضرورت تھی۔ لیکن اس کے بجائے تم یہ کر رہی ہو!'' ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر سر کو ہلاتے ہوئے کہا۔

''کرنا ہی پڑتا ہے''۔ لڑکی نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔ ''پاویل میخائلووچ کے بارے میں سناؤ۔ گرفتاری کے وقت بہت پریشان تھا کیا؟''

یہ سوال کرتے وقت ساشا نے ماں کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ سر جھکائے کانپتی ہوئی انگلیوں سے اپنے بال ٹھیک کر رہی تھی۔

''کچھ زیادہ نہیں'' ماں نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے والا آدمی نہیں ہے۔''

''صحت تو اچھی ہے؟'' لڑکی نے آہستہ سے دریافت کیا۔

''زندگی میں کبھی بیمار نہیں ہوا'' ماں نے جواب دیا۔

''لیکن تم تو سر پاؤں تک کانپ رہی ہو! ٹھیرو میں تمہارے لئے چائے اور رس بھری کا جام لاتی ہوں۔''

یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن تمہیں تکلیف بہت ہوگی۔ اتنی دیر ہوگئی ہے۔ ٹھیرو میں خود ہی کرتی ہوں۔''

''اتنی تھکن کے بعد بھی؟'' ماں نے سماوار چڑھاتے ہوئے سرزنش کے انداز میں جواب دیا۔ ساشا بھی باورچی خانے میں چلی گئی اور دونوں ہاتھ سر نے پیچھے رکھ کر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔

''جیل واقعی آدمی کو تھکا ڈالتا ہے'' اس نے کہا۔ ''کمبخت بیکاری! اس سے بدتر اور چیز ہو سکتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ کتنا کام کرنے کو پڑا ہے جانوروں کی طرح پنجرے میں بند بیٹھے رہنا...''

''تمہیں اس کا صلہ بھی کبھی کوئی دے سکے گا؟'' ماں نے دریافت کیا۔

پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کر اس نے خود ہی جواب دیا:

''سوائے خدا کے اور کوئی نہیں! لیکن شاید تم خدا پر بھی یقین نہیں رکھتیں؟''

''نہیں'' لڑکی نے سر ہلاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

'' مجھے تمھاری باتوں کا یقین نہیں آتا'' ماں نے جذباتی انداز میں کہا۔ پھر اپنے پیش بند سے ہاتھوں کی کوئلے کی کالک صاف کرتے ہوئے بولی: ''تم خود اپنے اعتقاد سے واقف نہیں۔ اگر خدا پر یقین نہ ہوتا تو پھر ایسی زندگی تم لوگ کیسے گذار سکتے تھے؟''

دفعتاً کوئی شخص ڈیوڑھی میں کچھ بڑبڑاتا ہوا داخل ہوا۔ ماں اچھل پڑی اور لڑکی ایک دم سے کھڑی ہوگئی۔

''دروازہ مت کھولنا'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اگر پولیس والے ہوں کہ تم مجھے نہیں جانتیں۔ میں اندھیرے میں مکان بھول گئی تھی اور دروازے پر بے ہوش ہو کر گر گئی تھی تم نے میرے کپڑے بدلے اور یہ پرچے تمہیں ملے۔ سمجھیں؟''

''ہائے رے معصوم سی جان! میں یہ سب کیوں کہوں؟'' ماں نے متاثر ہو کر دریافت کیا۔

''ذرا ٹھیرو'' ساشا نے دروازے پر کان لگا کر سنتے ہوئے کہا۔ ''غالباً یگور ہے...''

وہ یگور ہی تھا، سر سے پاؤں تک بھیگا اور تھکن سے ہانپتا ہوا۔

''آہا! تو سماوار چڑھا ہوا ہے! تازہ دم کرنے کے لئے سماوار سے اچھی کوئی چیز نہیں ماں! تم آ گئیں ساشا؟''

اپنا بھاری کوٹ آہستہ آہستہ اتارتے ہوئے وہ بغیر رکے بات کرتا رہا۔ باورچی خانے میں اس کے زور زور سے سانس لینے کی آواز بھری ہوئی تھی۔

''سرکاری عہدہ داران محترمہ کو پسند نہیں کرتے ماں۔ جب جیلر نے انہیں پریشان کرنا چاہا تو انہوں نے بھوک ہڑتال کر دی اور اس سے معافی کا مطالبہ کیا۔ آٹھ دن تک انہوں نے کچھ کھایا ہی نہیں جس کی وجہ سے بس مرتے مرتے بچی ہیں۔ چلو ٹھیک ہی ہوا کیوں؟ لیکن میری طرح بھی کسی کا پیٹ دیکھا ہے؟

دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے وہ اپنے مضحکہ خیز قسم سے نکلے ہوئے پیٹ کو تھامے رہا اور دروازہ بند کرنے کے بعد بھی باتیں کرتا گیا۔

''کیا سچ مچ تم نے آٹھ دن تک کھانا نہیں کھایا؟'' ماں نے تعجب سے پوچھا۔

''اس سے معافی منگوانے کے لئے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا'' لڑکی نے کانپتے ہوئے کہا۔ لڑکی کے لہجے کی سختی اور سکون میں ماں کو ملامت کا شائبہ نظر آیا۔

''کیا لڑکی ہے!'' اسنے دل میں سوچا، پھر بہ آواز بلند پوچھا ''اور اگر تم مر جاتیں تو؟''

''تو کیا کیا جاسکتا تھا؟'' لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔

''لیکن اس نے معافی مانگ لی۔ لوگوں کو یہ تو اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ ہمارے حقوق کو پامال کر کے ہم پر قابو پائیں۔''

''ہوں۔ ہونہ!..'' ماں نے آہستہ آہستہ کہا۔ ''مرد تو بس یہی کرتے ہیں۔ ساری عمر یہ لوگ ہم عورتوں کے حقوق کو پامال کر کے ہم پر قابو حاصل کرتے ہیں۔''

''میں نے اپنا بار ہلکا کر دیا'' یگور نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''سماوار تیار ہو گیا؟ ٹھیرو میں اٹھاتا ہوں۔''

دوسرے کمرے میں سماوار کو لے جاتے ہوئے اس نے کہا:

''میرے پیارے وہ تہتر برس کی عمر تک بڑی آرام سے رہی اور صحت اچھی رہی، وزن پورے دوسو اٹھاسی پاؤنڈ تھا اور واسکری سینسک کے قصبے میں نائب پادری کے فرائض انجام دیا کرتے تھے...''

''تم فادر ایوان کے بیٹے ہو؟'' ماں نے دریافت کیا۔

''ہاں میں ان ہی کا بیٹا ہوں! اور تم میرے والد بزرگوار سے کس طرح واقف ہو؟''.

''میں بھی واسکری سینسک کی رہنے والی ہوں!...''

''میرے وطن کی؟ کس کی بیٹی ہو تم؟''

''تمہارے پڑوسی سریوگین کی!''

''لنگڑے نیل کی بیٹی؟ میں تو انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان سے تو ایک سے زیادہ بار مجھے گوشمالی کرانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے!''

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنےکھڑے ہنس رہے تھے اور ہزاروں سوال کر رہے تھے۔ چائے بناتے ہوئے ساشا مسکرائی۔ پیالیوں کی آواز ماں کو پھر اس ماحول میں لے آئی۔

''ارے معاف کرنا! میرے دماغ سے تو ایک ایک بات نکل گئی۔ اپنے کسی ہم وطن سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے!''

''معافی تو مجھے مانگنی چاہئے کہ میں نے ہر چیز پر قبضہ جما لیا ہے لیکن اس وقت گیارہ بج چکے ہیں اور مجھے بہت دور جانا ہے۔''

''کہاں جا رہی ہو؟ بہت اندھیرا اور نمی ہے اور تم اس قدر تھکی ہوئی ہو۔ رات یہیں رہ جاؤ یگور ایوانو وچ باورچی خانے میں سو سکتے ہیں اور ہم تم یہاں۔''

''نہیں، مجھے جانا ہی چاہئے'' لڑکی نے سادگی سے کہا۔

''بدقسمتی سے ان نوجوان خاتون کو جانا ہی ہوگا۔ وہ لوگ انہیں پہچانتے ہیں۔ کل سڑکوں پر انہیں نظر نہ آنا چاہئے'' یگور نے کہا۔

''لیکن کیسے؟ تن تنہا؟''

''ہاں، تن تنہا'' یگور نے ہنس کر کہا۔

لڑکی نے اپنے لئے ایک پیالی چائے بنائی اور سیاہ روٹی کے ایک ٹکڑے پر نمک لگا کر ماں کی طرف

متفکرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے اس نے کھانا شروع کیا۔

''تم لوگ کیسے کرلیتی ہو یہ۔تم اور نتاشا۔ میں تو کبھی نہیں کرسکتی، مجھے تو ڈر لگے'' پلاگیا نے کہا۔

''ڈر تو انہیں بھی لگتا ہے'' یگور نے کہا۔''تمہیں ڈر لگتا ہے نہ ساشا؟''

''یقیناً لگتا ہے''لڑکی نے جواب دیا۔

ماں نے اس کی طرف اور یگور کی طرف دیکھا۔

''کتنے...سخت ہو تم لوگ!''اس نے کہا۔

چائے ختم کر کے ساشا نے خاموشی سے یگور سے مصافحہ کیا اور باورچی خانے میں چلی گئی، ماں اسے باہر سلام کہہ دینا'' ساشا نے کہا۔''بھول مت جانا!''

وہ دروازے کے کنڈے پر ہاتھ رکھ چکی تھی کہ دفعتاً مڑی اور بولی:

''تمہیں پیار کرسکتی ہوں؟''

ماں نے خاموشی سے اسے سینے سے لگالیا اور محبت سے پیار کیا۔

''شکریہ''لڑکی نے کہا اور سر کو جنبش دیتے ہوئے وہ باہر چلی گئی۔

ماں جب کمرے میں واپس آئی تو اس نے تشویش کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھا۔تاریکی میں برف کے نم گالے گر رہے تھے۔

''پروزوروف کا خاندان یاد ہے؟'' یگور نے دریافت کیا۔

وہ پاؤں پھیلائے بیٹھا اپنی چائے کو زور زور سے پھونک رہا تھا،اس کا چہرہ سرخ اور نم اور مطمئن تھا

۔

''ہاں مجھے یاد ہے'' ماں نے میز کی طرف آڑا آڑا چل کر آتے ہوئے کچھ سوچ کر کہا۔ وہ بیٹھ گئی اور اس نے یگور کی طرف دکھ بھرے انداز میں دیکھا۔

''چہ۔چہ۔چہ! بیچاری ساشا! کیسے پہنچے گی شہر وہ؟''

''تھک جائے گی'' یگور نے اتفاق کیا۔''جیل نے اسے کافی کمزور کردیا۔ پہلے بہت اچھی صحت تھی ۔بڑے آرام وآسائش سے پلی ہے...معلوم ہوتا ہے اس کے پھیپھڑوں پر ایک دھبہ تو آ گیا ہے...''

''کون ہے یہ؟'' ماں نے آہستہ سے دریافت کیا۔

''ایک صاحب جائداد کی بیٹی ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کا باپ بالکل سور ہے۔ تمہیں معلوم ہے وہ لوگ شادی کرنا چاہتے تھے؟''

''وہ اور پاویل... لیکن کچھ ہو ہی نہیں چکتا۔ جب وہ باہر ہوتا ہے تو یہ جیل میں اور جب یہ باہر تو وہ جیل میں۔''

''مجھے یہ نہیں معلوم تھا'' ماں نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔ ''پاویل کبھی اپنے بارے میں بات ہی نہیں کرتا...''

اب لڑکی کے لئے اس کا دل اور بھی دکھنے لگا اور غیر ارادی ناپسندیدگی کے ساتھ وہ اپنے مہمان کی طرف مڑی۔

''تم نے اسے گھر تک کیوں نہیں پہنچا دیا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''نہیں پہنچا سکتا تھا'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے یہاں بستی میں بہت سے کام کرنے ہیں۔ صبح سویرے سے دن بھر مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہے اور مجھ جیسے آدمی کے لئے جس کا اتنی جلدی سانس پھول جاتا ہے یہ آسان کام نہیں ہے۔''

''بڑی اچھی لڑکی ہے'' ماں نے کہا۔ اس کے ذہن میں اب تک وہی بات گھوم رہی تھی جو یگور نے اسے ابھی بتائی تھی اپنے بیٹے کے بجائے ایک غیر سے یہ بات سن کر اسے تکلیف ہوئی اور اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔

''یقیناً اچھی لڑکی ہے'' یگور نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''میں جانتا ہوں اس کے لئے تمہارا دل دکھ رہا ہے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ہم باغیوں پر یوں دل دکھاتی رہیں تو تمہارا دل کہیں کا نہ رہے گا۔ سچ پوچھو تو ہم میں سے کسی کی زندگی بھی آرام سے نہیں کٹتی۔ میرا ایک ساتھی جلاوطنی سے ابھی واپس آیا ہے۔ جب وہ نیژنی نووگرود پہونچا تو اس کی بیوی اور بچہ سمولینسک میں اس کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب وہ سولینسک پہونچا تو وہ لوگ ماسکو جیل میں پہونچ چکے تھے۔ اب اس کی بیوی کے سائبیریا جانے کی باری ہے۔ میری بھی بیوی تھی۔ بے حد ہی اچھی عورت۔ اس قسم کی پانچ برس کی زندگی نے اسے قبر میں پہونچا دیا۔''

اس نے ایک گھونٹ میں چائے ختم کر دی اور اپنی کہانی جاری رکھی۔ اس نے اپنی جیل اور جلاوطنی کی سزا کے سال اور مہینے گنائے۔ مختلف مصیبتوں مثلاً جیل میں مار کھانے اور سائبیریا میں فاقے کرنے

کے واقعات سنائے۔ ماں اس کی طرف دیکھتی رہی اور جس پرسکون سادگی کے ساتھ وہ اپنی مصیبتوں اور اذیتوں کی زندگی کی کہانی کو سنا رہا تھا اس پر تعجب کرتی رہی۔

''لیکن اب کام کی باتیں کریں۔''

اس کا لہجہ تبدیل ہو گیا اور چہرے پر زیادہ سنجیدگی آ گئی۔ اس نے دریافت کرنا شروع کیا کہ وہ کارخانے میں پرچے وغیرہ کیسے لے جائے گی اور ماں کو اس کے تفصیلات کے علم پر سخت حیرت ہوئی۔

اس موضوع پر بات ختم کرنے کے بعد ایک بار پھر انہوں نے اپنے وطن کی باتیں شروع کیں۔ اس کا لہجہ مذاحیہ تھا لیکن ماں ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کا ماضی غیر معمولی طور پر ایک دلدل سے مشابہت رکھتا تھا جہاں ننھے ننھے سرو اور سفید برچ اور نازک اندام لرزتے ہوئے آسپین کے درخت بھی اگتے تھے۔ برچ کے پودے آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے اور اس گندی زمین میں پانچ برس تک رہنے کے بعد وہ گر کر سڑ گئے۔ اس نے یہ سارا منظر دیکھا اور اس کے دل میں ترحم کا ایک اتھاہ جذبہ بیدار ہو گیا۔ پھر اسے ایک نوجوان لڑکی کی شکل نظر آئی، ایک لڑکی جس کے خدوخال نمایاں اور چہرہ سخت تھا۔ وہ لڑکی برف کے گیلے ڈھیر میں راستہ بناتی ہوئی تھکی ماندی تنہا چلی جا رہی تھی... اور ماں کا بیٹا جیل میں تھا۔ ممکن ہے ابھی تک سویا بھی نہ ہو بلکہ لیٹا کچھ سوچ رہا ہو... لیکن وہ اس کے بارے میں، اپنی ماں کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوگا۔ اب تو اس کے پاس ایک اور زیادہ عزیز ہستی تھی۔ بادلوں کے پھٹے ہوئے ٹکڑوں کی طرح یہ تکلیف دہ خیالات اس کے ذہن میں آتے رہے اور اس کی روح پر تاریکی سی چھا گئی...

''ماں، تم تھک گئی ہو۔ چلو سو جائیں'' یگور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے خدا حافظ کہا اور آہستہ سے باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس کے دل میں بلا کی تیز تلخی بھری ہوئی تھی۔

دوسرے دن ناشتے پر یگور نے کہا:

''اگر ان لوگوں نے تمہیں پکڑ لیا اور پوچھا کہ یہ خطرناک پرچے کہاں سے ملے تو کیا کہو گی؟''

''میں کہوں گی اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تم سے اتفاق نہ کریں گے'' یگور نے اعتراض کیا۔ ''انہیں پورا یقین ہے

کہ اس کا ان سے تعلق ہے۔ وہ لوگ تم سے کرید کرید کر پوچھتے رہیں گے۔''

''لیکن میں انہیں بتاؤ ں گی نہیں۔''

''وہ تمہیں جیل میں ڈال دیں گے۔''

''تو کیا ہوگا؟ میں تو خدا کا شکر ادا کروں گی کہ میں اس قابل تو ہوگئی!'' اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ''میری ضرورت کسی کو ہے؟ کسی کو نہیں، اور پھر وہ لوگ مجھے اذیت بھی نہ دیں گے وہ کہتے ہیں...''

''ہونہہ!'' یگور نے اس کی طرف نظریں جما کر کہا۔ ''نہیں وہ تمہیں اذیت نہ دیں گے لیکن اچھے آدمیوں کو اپنا خیال رکھنا چاہئے!''

''تمہیں بھلا یہ کہنے کا کیا حق ہے!'' ماں نے کچھ ہنس کر جواب دیا۔

یگور بغیر کچھ جواب دئے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر وہ ماں کے پاس گیا اور بولا:

''بہت مشکل ہے ماں۔ مجھے معلوم ہے تمہارے لئے کتنا مشکل ہے۔''

''ہر شخص کے لئے مشکل ہے'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے جو لوگ سمجھتے ہوں ان کے لئے اتنا مشکل نہ ہو۔ لیکن آہستہ آہستہ میں نے سمجھنا شروع کر دیا ہے کہ اچھے لوگ کس چیز کی تلاش میں ہیں۔''

''ایک بار یہ سمجھ گئیں تو پھر ہر شخص کو تمہاری ضرورت ہوگی ماں۔ ہر شخص کو!'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

ماں نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر مسکرائی۔

دوپہر کو اس نے کارخانے جانے کی تیاری شروع کی۔ اپنے کپڑوں کے نیچے اس نے پرچے وغیرہ اس ہوشیاری سے باندھے کہ جب یگور نے دیکھا تو بڑے اطمینان اور مزے سے چٹخارہ لیتے ہوئے بولا:

''زیر گٹ!' جیسے تمام بھلے جرمن بیر کا پہلا گھڑا ڈکار جانے کے بعد کہتے ہیں۔ ان پرچوں وغیرہ نے تم میں ذراسی بھی تو تبدیلی نہیں پیدا کی، ماں۔ تم وہی شفیق، ادھیڑ عمر کی عورت ہو، لمبی اور کچھ مٹاپے کی طرف مائل۔ تمہاری اس معمولی سی ابتدا پر سارے دیوتاؤں کا سایہ رہے!''

آدھے گھنٹے کے بعد وہ کارخانے کے پھاٹک پر بڑے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کھانے کے خوانچوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ جو بھی احاطے میں داخل ہوتا دو سنتری بڑے بھدے انداز

میں اس کی جامہ تلاشی لیتے جس کے بدلے میں انہیں مزدوروں کی گالیاں اور فقرے بازیاں سننی پڑتیں۔
ایک طرف ایک پولیس والا اور لمبی ٹانگوں، سرخ چہرے اور چھوٹی تیز آنکھوں والا ایک دوسرا شخص کھڑا تھا
ماں نے اپنی بہنگی ایک کاندھے سے دوسرے کاندھے پر رکھی اور لمبی ٹانگوں والے شخص کو کنکھیوں سے دیکھا کیوں کہ وہ سمجھ گئی یہ شخص خفیہ کا ہے۔

''بے ہودہ کہیں کے! ارے ہمارے سر کی تلاشی لو، جیبوں میں کیا دیکھتے ہو؟'' ایک بلند قامت گھنگھریالے بال والے نوجوان مزدور نے سنتریوں سے کہا جو اس کی جیبوں کی تلاشی لے رہے تھے۔

''تمہارے سر میں جوؤں کے سوا ہے ہی کیا'' ایک سنتری نے کہا۔

''تو جاؤ جوئیں مارو اور ہم سے دور ہی رہو'' مزدور نے فقرہ چست کیا۔

خفیہ کے آدمی نے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور حقارت سے تھوکا۔

''ذرا مجھے جانے دو'' ماں نے کہا۔ ''دیکھتے نہیں۔ ایسے بوجھ کے نیچے کسی کی بھی کمر ٹوٹ جائے گی!''

''جاؤ، جاؤ!'' سنتری نے چڑھ کر کہا۔ ''تمہارا بولنا بھی ضروری ہے کیا؟''

ماں جب اپنی جگہ پہونچ گئی تو اس نے خوانچے زمین پر رکھ دیئے، چہرے سے پسینہ پونچھا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

دونوں گوسیف بھائیوں نے، جو فٹر تھے، ماں کو دیکھا اور اس کی طرف چلے آئے۔

''پروگی ہے؟'' واسیلی نے جو دونوں میں بڑا تھا تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔

''کل لاؤں گی'' اس نے جواب دیا۔ یہ شناختی الفاظ تھے۔ بھائیوں کے چہرے کھل گئے۔

''ماں تم کتنی اچھی ہو!...'' ایوان چیخ پڑا۔

واسیلی خوانچوں میں جھانکنے کے لئے زمین پر بیٹھ گیا اور اسی وقت پرچوں کا ایک بنڈل اس کے کوٹ کے اندر پہونچ گیا۔

''آج گھر نہیں جائیں گے ایوان'' اس نے اونچی آواز میں کہا۔ ''آج ان ہی سے کھانا خرید لیں گے۔'' یہ کہتے کہتے اس نے ایک اور بنڈل لانبے جوتوں میں ڈال لیا۔ ''اس نئی خوانچے والی کا دل بڑھانا چاہئے۔''

''بالکل ٹھیک ہے'' ایوان نے ہنس کر کہا۔

ماں نے بڑی احتیاط سے ادھر ادھر دیکھا۔

''شوربا! گرم سیوئیں! اس نے آواز لگائی۔

جلدی جلدی اس نے پرچوں کے بنڈل نکال نکال کر بھائیوں کے دینے شروع کئے۔ ہر بار جب ایک بنڈل اس کے ہاتھ سے غائب ہوتا تو پولیس کے افسر کا زرد چہرہ دیا سلائی کی چمک کی طرح اس کی نظروں میں لہرا جاتا اور وہ آپ ہی آپ مزے لے کر کہتی:

''یہ لو مغرور آدمی!''

پھر دوسرا بنڈل:

''اور یہ بھی!'' مزدور ہاتھوں میں پیالے لئے ہوئے آئے۔ جب بھی کوئی نزدیک آنے لگتا ایوان گوسیف زور سے ہنستا اور ماں پرچے دینا روک دیتی اور کھانے کی طرف مڑ جاتی۔

''تم ہو بڑی ہوشیار پلاگیا نلوونا!'' دونوں بھائی ہنسے۔

''ضرورت سب کچھ کرواتی ہے'' نزدیک کھڑے ہوئے ایک اسٹوکر نے ترشی سے کہا۔ ''اس کے روٹی کمانے والے کو تو لے گئے، حرامزادے! یہ لو ہمیں تین کوپک کی سویاں دو۔ کوئی بات نہیں ماں، تم کسی نہ کسی طرح کام چلا ہی ہوگی!''

''ہمدردی کا شکریہ!'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمدردی کے چند لفظ کہنے میں کیا جاتا ہے'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور ایک کونے میں چلا گیا۔

''گرم شوربا! سویاں! دلیا! پلاگیا نے آورز لگائی۔

وہ سوچتی رہی کہ پرچوں کے متعلق اپنے پہلے تجربے کے بارے میں اپنے بیٹے سے کیا کہے گی لیکن اس کے ذہن کے کسی گوشے میں افسر کا پریشان، غصے والا زرد چہرہ لہراتا رہا۔ اس کی سیاہ مونچھیں فکر سے پھڑک رہی تھیں اور اس کے بھنچے ہوئے دانت سکڑے ہوئے ہونٹوں میں سے سفید سفید چمک رہے تھے۔ ماں کے سینے میں خوشی کسی پرند کی طرح چہچہائی۔ اپنی بھوؤں کو بڑے انداز سے اوپر چڑھاتے اور کام کرتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہتی رہی:

''یہ لو، یہ بھی لے جاؤ!''

اس شام کو جب وہ چائے پی رہی تھی تو کیچڑ میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور پھر ایک جانی پہچانی سی آواز آئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور باورچی خانے سے ہوتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔ ڈیوڑھی میں جلدی جلدی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم تاریکی سی چھا گئی اور اس نے کھمبے کا سہارا لیتے ہوئے پاؤں سے دروازہ کھولا۔

''آداب ننکو!'' جانی پہچانی آواز آئی اور لمبے پتلے بازوؤں نے اسے اپنے حلقے میں لے لیا۔

پہلے اس کے میں مایوسی کی وجہ سے ایک ٹیس سی اٹھی اور... پھر آندری کو دیکھنے کی خوشی کی وجہ سے۔ دونوں احساسات ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک عظیم و بسیط جذبے میں تبدیل ہو گئے جس نے اس کے سارے جسم میں ایک گرم لہر سی دوڑا دی اور اسے انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا یہاں تک کہ وہ آندری کے کاندھے پر منہ رکھ کر مضبوطی سے تھام لیا۔ ماں دھیرے دھیرے رو رہی تھی اور وہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا کہہ رہا تھا:

''روؤ مت ننکو، دل تھوڑا مت کرو۔ میں سچ کہتا ہوں وہ جلدی ہی چھوٹ جائے گا۔ وہ لوگ کوئی جرم بھی تو ثابت نہ کر سکے۔ ہمارے سب لوگ بالکل خاموش ہیں جیسے گم سم کے لڈو کھا گئے ہیں...''

ماں کو کاندھے سے سہارا دیتے ہوئے وہ اسے دوسرے کمرے میں لے آیا۔ ماں اسکے بالکل نزدیک اس سے لگی ہوئی بیٹھی رہی اور گلہری کی سی پھرتی کے ساتھ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ایک ایک لفظ کو بغور سنتی رہی۔

''پاویل نے سلام کہا ہے۔ بالکل اچھا اور بہت خوش ہے۔ وہاں لوگ بہت زیادہ ہو گئے ہیں! تقریباً سو آدمیوں کو بھر دیا ہے۔ کچھ شہر کے لوگ ہیں، کچھ ہمارے ساتھی۔ اور ایک ایک کوٹھڑی میں تین تین چار چار کو بند کر دیا ہے۔ جیل کے عہدیدار اچھے خاصے ہیں اور ان بے ہودہ خفیہ پولیس والوں نے انہیں جتنا کام دیدیا ہے اس سے بے چارے پس گئے ہیں۔ عہدہ دار زیادہ سخت نہیں ہیں۔ وہ لوگ تو کہتے ہیں 'بس کوئی ھنگامہ نہ کرو یارو تا کہ ہم پر کوئی مصیبت نہ آئے!'، اور ہر چیز مزے سے ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے ساتھی ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں، ایک دوسرے کو کتابیں دیتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتے ہیں۔ جیل اچھا ہے۔ پرانا اور گندا تو ہے لیکن زیادہ تکلیف

نہیں ہوتی۔ مجرم قیدی بھی اچھے لوگ ہیں اور ہماری کافی مدد کرتے ہیں۔ بوکن کو، مجھے اور چار دوسرے آدمیوں کو رہا کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پاویل کا نمبر البتہ سب سے آخر میں آئیگا۔

وہ جس طرح گالیاں دیتا ہے اس کی وجہ سے سب لوگ اس کے مخالف ہو گئے ہیں۔ خفیہ پولیس والے پولیس والیتیو اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یا تو اس پر مقدمہ چلا دیا جائے گا یا کسی دن مار پڑے گی۔ پاویل کہا کرتا ہے: 'یہ باتیں چھوڑو، نکولائی! تمہاری گالیوں سے یہ لوگ سدھرنے سے رہے۔' لیکن بس وہ چلاتا ہی رہتا ہے: 'میں انہیں روئے زمین سے پھوڑے کی پپڑی کی طرح نکال کر پھینک دوں گا!' پاویل کا طور طریقہ بہت اچھا ہے۔ وہ اپنے کو ثابت قدم اور مضبوط بتائے ہوئے ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ اسے جلد ہی رہا کر دیں گے۔''

''جلدی!'' ماں نے شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دہرایا۔ اسے کچھ تسکین ہو گئی تھی۔ ''مجھے یقین ہے کہ جلدی ہی ہوگا۔''

''تو اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا! اچھا ایک پیالی چائے کے بارے میں کیا خیال ہے اور ذرا یہ بھی سناؤ کہ تمہارے حال چال کیا ہیں؟''

اس نے مسکراتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔ کتنی نرمی اور اتنی ہمدردی تھی اس میں۔ اور اس کی غمزدہ آنکھوں میں محبت کا شعلہ رقصاں تھا۔

''مجھے کتنے اچھے لگتے ہو تم آندریوشا!'' ماں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اس کے چہرے کا مطالعہ کرنے لگی جس پر سیاہ ڈاڑھی بڑھ کر عجیب مضحکہ خیز سی ہو گئی تھی۔

''بس تھوڑی سی محبت مجھے خوش کرنے کے لئے کافی ہے''

اس نے کرسی پر جھولتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے چاہتی ہو۔ تمہارا دل تو اتنا بڑا ہے کہ اس میں سب کی محبت سما سکتی ہے۔''

''لیکن میں تمہیں خاص طور پر چاہتی ہوں'' اس نے اصرار کیا۔ ''اگر تمہاری ماں ہوتی تو ہر شخص اس پر رشک کرتا کہ اتنا اچھا بیٹا پایا ہے۔''

خوخول نے اپنا سر ہلایا اور دونوں ہاتھوں سے تیزی کے ساتھ اسے سہلایا۔

''میری ماں ہے لیکن نہ جانے کہاں'' اس کی آواز مدہم تھی۔

''جانتے ہو آج میں نے کیا کیا؟'' اس نے پوچھا اور پھر بڑے جذباتی انداز میں اس نے بیان کرنا شروع کیا کہ وہ پرچوں کو کارخانے کس طرح لے گئی۔ اپنے جوش وخروش کی وجہ سے اس نے پورے قصے کو کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ پہلے تو خوخول نے آنکھیں پھاڑ کر اسے تعجب سے دیکھا اور پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

''اوہو!'' وہ خوشی سے چلایا۔''یہ بات بہت اچھی ہوئی! بالکل ٹھیک! پاویل کے تو بے حد ہی خوش ہوگا! بہت ہی اچھا ہوا ننکو، پاویل کے لئے اور تمام دوسرے لوگوں کے لئے!''

وہ سارے جسم سے ہل رہا تھا۔ پھر اس نے انگلیاں چٹخائیں اور بڑے وجد میں آکر سیٹی بجانی شروع کی۔ اس کے روئیں روئیں سے مسرت ٹپک رہی تھی اور ماں سے اس کا بھرپور جواب مانگ رہی تھی۔

''کتنے اچھے ہو تم آندریوشا!'' اس نے اس طرح کہا جیسے اس کے دل کے دروازے کھل گئے ہوں اور الفاظ کا دھارا تیزی سے بہتا ہوا خاموش مسرت میں چمکتا دمکتا چلا جارہا ہو۔''جب میں خود اپنی زندگی کے متعلق سوچتی ہوں۔ یا میرے یسوع! میں زندہ ہی کیوں تھی... سوائے خوف کے اور کسی چیز سے واقف نہیں تھی! مجھے معلوم کہ جب میرا شوہر زندہ تھا تو میں نے اس سے محبت بھی کرتی تھی یا نہیں۔ میرے سارے خیالات اور میری ساری فکریں ایک ہی چیز کے بارے میں تھیں۔ اپنے اس جنگلی کے پیٹ کا دوزخ اچھے کھانوں سے بھرنا اور بغیر انتظار کرائے اس کی خواہشات کو پورا کرنا تاکہ اسے غصہ نہ آئے اور مجھے مار کی دھمکیاں نہ ملیں، تاکہ اسے کبھی ایک بار تو مجھ پر رحم آجائے! لیکن مجھے تو یاد نہیں کہ اس نے مجھ پر ایک بار بھی رحم کھایا ہو۔ مجھے تو اس طرح مارتا تھا جیسے اپنی بیوی کو نہ مار رہا ہو بلکہ ہر اس آدمی کو جس کے خلاف اسے کوئی شکایت تھی۔ بس برس تک اسی طرح زندگی گذارتی رہی اور اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ شادی سے پہلے زندگی کیسی تھی۔ میں جب بھی پچھلی باتیں سوچتی ہوں تو مجھے اپنے سامنے ایک خلا سا نظر آتا ہے۔ یگورایوانووچ یہاں کی آیا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی قصبے کے ہیں۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا لیکن میں۔ مجھے مکان بھی یاد آیا اور لوگ بھی یاد آئے لیکن یہ یاد نہیں آیا کہ لوگ رہتے کس طرح تھے اور کہتے کیا تھے، اور مختلف لوگوں کا کیا ہوگیا۔ مجھے ایک آگ لگنے کا واقعہ یاد ہے۔ دو واقعے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے اندر سے ہر چیز مار مار کر نکال لی گئی ہو اور میری روح پر پردہ پڑ گیا ہو۔ نہ کچھ سنائی دیتا ہے نہ دکھائی

دیتا ہے۔''

اس نے اس طرح سانس لیا جیسے کوئی مچھلی سانس لیتی ہو جسے پانی سے باہر نکال لیا گیا ہو۔ آگے کی طرف جھک کر اور دھیمے لہجے میں اس نے اپنا قصہ جاری رکھا:

''میرا شوہر مر گیا۔ میں نے بیٹے سے آس لگائی۔ لیکن وہ اس زندگی میں مصروف ہو گیا۔ میرے لئے یہ سب کچھ برداشت کرنا مشکل تھا اور اپنے بیٹے کے لئے میرا دل خوف وہشت سے پر تھا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں زندہ کیسے رہوں گی؟ کتنا ڈرتی اور کانپتی رہتی تھی میں۔ جب کبھی میں نے سوچا کہ اسے کہیں کچھ ہو نہ جائے تو میرا دل پھٹنے سا لگا۔''

ایک لمحے کے لئے وہ خاموش ہو گئی اور پھر اپنے سر کی جنبش کے ساتھ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں کہنا شروع کیا:

''ہم عورتوں کی محبت خالص محبت نہیں ہوتی۔ ہمیں ان ہی چیزوں سے محبت ہوتی ہے جن کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے، لیکن میں تمہیں دیکھتی ہوں کہ اپنی ماں کے لئے اتنا کڑھتے ہو۔ بھلا تمہارے لئے اسکی اہمیت کیا ہے؟ اور یہ دوسرے لوگ دوسرے لوگوں کی لئے مصیبتیں اٹھا رہے ہیں، جیل جا رہے ہیں کیچڑ، پانی اور برفباری میں شہر سے چار پانچ میل چل کر راتوں کو تن تنہا ہمارے گھر آ ہی ہیں! ان سے کون کہتا ہے؟ ایسا کیوں کرتے ہیں یہ لوگ؟ اس لئے کہ ان کے پاس بے پناہ خالص محبت ہے اور ان کے پاس اعتقاد ہے۔ گہرا اعتقاد ہے آندریوشا! لیکن میں اس طرح محبت نہیں کر سکتی! مجھے تو صرف اپنوں سے محبت ہے، جو چیزیں میرے نزدیک ہی!''

''نہیں، تم کر سکتی ہو'' خوخول نے کہا۔ وہ مڑ گیا اور حسب عادت اس نے اپنے سر، گالوں اور آنکھوں کو تیزی سے سہلایا۔ ''ہر شخص اسی کو چاہتا ہے جو اس کے نزدیک ہو، لیکن ایک وسیع دل دور کی چیزوں کو بھی اپنا لیتا ہے۔ تم بہت بڑی بڑی چیزیں کر سکتی ہو کیونکہ تم میں ماں کی بے پناہ مامتا ہے!''

''خدا ایسا ہی کرے!'' اس نے زیر لب کہا۔ ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ رہنے کا یہ طریقہ اچھا ہے۔ میں اب تم سے محبت کرتی ہوں آندری۔ شاید پاشا سے بھی زیادہ۔ وہ اتنا خاموش اور تنہائی پسند ہے۔ ذرا دیکھو تو کہ ساشا سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن مجھ سے، اپنی ماں سے اس نے ایک لفظ بھی نہ کہا...''

''یہ صحیح نہیں ہے'' خوخول نے اعتراض کیا۔ ''مجھے پورا علم ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ ساشا سے محبت

کرتا ہے اور ساشا اس سے۔ یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن وہ لوگ شادی کبھی نہیں کریں گے، وہ تو چاہتی ہے لیکن پاویل شادی کرنا نہیں چاہتا۔''

''اچھا تو یہ بات ہے'' ماں نے کچھ سوچتے ہوئے اور اپنی دکھ بھری نظریں خوخول کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو ایسی بات ہے۔ لوگ اپنی مسرت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔''

''پاویل بڑا غیر معمولی آدمی ہے'' خوخول کی آواز میں نرمی تھی۔ ''آہنی ارادے کا انسان ہے...''

''اور اب وہ جیل میں پڑا ہوا ہے'' ماں نے سوچتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''اس بات سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن بہت زیادہ نہیں... زندگی اب مختلف ہے اور میرے خوف بھی مختلف ہیں۔ اب میں ہر شخص کے لئے خوف زدہ ہوں۔ اور میرا دل بھی مختلف ہے کیونکہ میری روح نے میرے دل کی آنکھیں کھول دی ہیں اور یہ اسے سب کچھ دیکھ کر وہ رنجیدہ ہے لیکن خوش بھی ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جنہیں میں نہیں سمجھتی اور مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے کہ تم لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ لیکن میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ تم لوگ صحیح معنوں میں اچھے لوگ ہو، عوام کی خاطر تم نے ایک سخت اور کٹھن زندگی اختیار کی ہے اور صداقت کی خاطر مشکل زندگی گزار رہے ہو۔ اور اب میں تمہاری صداقت کو سمجھنے لگی ہوں: جب تک امیر لوگ باقی ہیں اس وقت تک عام لوگوں کو کچھ بھی نہیں مل سکتا، نہ خوشی نہ انصاف۔ کچھ بھی نہیں۔ اب جب کہ میں تم لوگوں کے ساتھ رہ رہی ہوں تو کبھی کبھی راتوں کو اپنے ماضی کے متعلق سوچتی ہوں، اپنی جوانی کی امنگوں کے بارے میں سوچتی ہوں، جو پیروں تلے مسل دی گئیں اور میرا جوان دل گھونسوں سے زخمی کر دیا گیا اور خود اپنے لئے میرے دل میں ترحم اور تلخی کے جذبات بے دار ہوتے ہیں۔ لیکن اب میرے لئے زندہ رہنا آسان ہو گیا ہے۔ رفتہ رفتہ میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی ہوں کہ میں کیا ہوں...''

خوخول کھڑا ہو گیا۔ بلند قامت، دبلا اور متفکر۔ اور اس نے فرش پر ٹہلنا شروع کر دیا اور یہ کوشش کرتا رہا کہ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔

''تم نے کس خوبی سے سب باتیں کہی ہیں'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''کتنی اچھی طرح سے! کیرچ شہر میں ایک نوجوان یہودی رہتا تھا جو شعر لکھتا تھا اور ایک دن اس نے یہ لکھا:

اور نہیں جو بے گناہ قتل کئے گئے
صداقت کی قوت پھر سے زندہ کر دیگی!...

کیرچ ہی میں پولیس کے ہاتھوں وہ خود قتل ہو گیا۔لیکن یہ اتنی اہم بات نہیں ہے۔ وہ صداقت کو سمجھ گیا تھا اراس نے لوگوں میں اس کے بیج بو دئے تھے۔تم بھی ان میں سے ایک ہو جنھوں ُ بے گناہ قتل کیا گیا،۔''

''لیکن اب میں کھل کر بات کرتی ہوں'' ماں نے بات جاری رکھی۔''میں کھل کر بات کہتی ہوں اور اپنے الفاظ کو خود ہی سنتی ہوں اور اپنے کانوں پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ساری عمر میں نے صرف ایک ہی بات کے متعلق سوچا۔ ہر نئے دن سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے، کس طرح سب کی نظریں بچا کر رہا جائے تاکہ کوئی مجھے ہاتھ نہ لگا سکے۔لیکن اب میرا ذہن دوسرے لوگوں کے متعلق خیالات سے بھرا رہتا ہے۔ممکن ہے میں تم لوگوں کے مقصد کو پوری طرح نہ سمجھتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم سب خوش رہو اور خاص طور پر تم آندریوشا!''

وہ اس کے نزدیک آیا۔

''شکریہ'' اس نے کہا۔ ماں کا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھ میں لیا اور زور سے دبایا اور اس کے بعد تیزی سے منہ موڑ لیا۔شدت جذبات سے نڈھال سی ہو کر ماں نے دھیرے دھیرے خاموشی کے ساتھ پیالیاں دھوتی رہی اور اپنے دل میں خاموش محبت کے مزے لیتی رہی۔

خوخول نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتے ہوئے اس سے کہا:

''وسوف شیکوف سے بھی تھوڑی شفقت کا اظہار کرو، ننکو۔اس کا باپ جیل میں ہے۔ بوڑھا شرابی دو کوڑی کا بھی نہیں ہے! نکولائی جب کبھی کھڑکی میں اس کی جھلک دیکھ پاتا ہے گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے۔ یہ بہت بری بات ہے! نکولائی فطرتاً نیک ہے۔ کتوں، چوہوں اور ہر قسم کے جانوروں سے محبت کرتا ہے لیکن اسے لوگوں سے نفرت ہے! ذرا غور تو کرو ایک انسان کا کیا حشر ہو سکتا ہے!''

''اس کی ماں ختم ہو چکی... باپ چور اور شرابی ہے'' ماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

جب آندری سونے کے لئے چلا گیا تو ماں نے خاموشی سے اس کے اوپر صلیب کا نشان بنایا اور جب بستر پر لیٹے ہوئے آدھ گھنٹہ ہو گیا تو ماں نے آہستہ سے پوچھا:

''سو گئے آندریوشا؟''

''نہیں، کیوں؟''

''خدا حافظ۔''

''شکریہ ننکو۔شکریہ''اس نے احسان مندانداز میں کہا۔

17

دوسرے دن جب پلا گیا کارخانے کے دروازے پر آئی تو چوکیداروں نے اسے روک دیا اور اپنے خوانچے اتارنے کا حکم دیا تا کہ وہ ان کی تلاشی لے سکیں۔

''ساری چیزیں ٹھنڈی ہو جائیں گی''اس نے احتجاج کی جب کہ وہ لوگ سختی سے اس کے کپڑے ٹٹول رہے تھے۔

''زبان بند کرو!''سنتری نے جھنجھلا کر کہا۔

''میں تم سے کہہ رہا ہوں یہ لوگ جنگلے کے اوپر سے پرچے پھینکتے ہیں''دوسرے سنتری نے ماں کے کاندھے کو آہستہ سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

وہ احاطے کے اندر پہونچی تو سب سے پہلے اس کے پاس بوڑھا سیزوف آیا۔

''تم نے کچھ سنا ماں؟''اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے دریافت کیا۔

''کیا؟''

وہی پرچے۔پھر نظر آنے لگے۔ہر طرف بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں،جیسے روٹی پر نمک چھڑکا ہوا ہو۔ان ساری تلاشیوں اور گرفتاریوں کا کیا نتیجہ ہوا!میرے بھتیجے مازن کو بھی جیل میں ڈال دیا ہے۔آخر کیوں؟تمہارے بیٹے کو بھی لے گئے لیکن اب ہر شخص محسوس کرنے لگا ہے کہ اس میں ان لوگوں کا ہاتھ نہیں تھا۔''

اس نے اپنی ڈاڑھی کو پکڑ کر عجیب طرح اس کی طرف دیکھا اور کہا:

''میرے یہاں آجایا کرو،کبھی کبھی۔آج کل تو بہت تنہائی محسوس کرتی ہوں گی۔''

ماں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی چیزوں کی آواز لگانا شروع کی وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ کارخانے میں آج غیر معمولی ھنگامہ ہے۔ہر شخص کچھ جوش میں ہے،لوگ ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور پھر جدا ہو جاتے تھے۔وہ ایک کھاتے سے دوسرے کھاتے کی طرف جا رہے تھے۔دھوئیں سی بھری ہوئی فضا میں اسے جرات اور بہادری کی سی خوشبو محسوس ہوئی۔طنزیہ جملے اور ہمت افزا کلمات ہر طرف سنائی دے رہے

تھے۔ بوڑھے مزدور زیرلب مسکرا رہے تھے، حکام پریشان پریشان سے ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ پولیس والے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور جب مزدوروں کے گروہ انہیں دیکھ لیتے تو یا تو وہ خاموشی سے ادھر ادھر ہو جاتے یا باتیں ختم کر کے ان جھینپتھلائے ہوئے، برہم چہروں پر نظریں گاڑ دیتے۔

مزدور کچھ صاف ستھرے، دھلے دھلائے معلوم ہو رہے تھے۔ ماں کو دراز قد بڑے گوسیف کی ایک جھلک نظر آئی اور اس کا ہنستا ہوا بھائی اس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔

بڑھئی کھاتے کا فورمین واویلوف اور ٹائم کیپر ایسائی دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ادھر سے گذرے۔ منحنی ٹائم کیپر کا سر ایک ترچھی سی جنبش کے ساتھ کبھی اونچا اٹھتا تھا اور کبھی ایک طرف مڑتا تھا تاکہ فورمین کے مہیب، مرعوب کن چہرے کو دیکھ سکے، اور وہ اپنی چگی ڈاڑھی کو ہلا ہلا کر باتیں کئے جا رہا تھا:

''یہ لوگ اس بات کا مذاق اڑاتے ہیں ایوان ایوانووچ۔

انہیں اس میں لطف آتا ہے حالانکہ اس میں ریاست کی تباہی ہے جیسا کہ ڈائرکٹر صاحب نے بتایا تھا۔ یہاں گھاس پات صاف کرنے سے کام نہیں چلے گا، اس زمین پر تو ہل ہی چلانا ہوگا...''

واویوف کمر پر ہاتھ رکھے اپنی انگلیوں کو مضبوطی سے بھینچے ہوئے چلا جا رہا تھا...

''جاؤ اور تمہارا جو جی چاہے چھاپو، سور کے بچو'' اس نے زور سے کہا۔ ''لیکن میرے بارے میں ایک لفظ بھی آیا تو خیریت نہیں!''

واسیلی گوسیف ماں کے پاس آیا۔

''تمہارے کھانے کی کوئی دوسری چیز کیوں نہ چکھی جائے ماں! تمہارا کھانا ہے اچھا!'' اس نے کہا۔ اور پھر نیچی آواز میں اور آنکھیں سکیڑ کر اس نے کہا ''ہمیں عین میں اسی کی ضرورت تھی۔ بہت اچھا کام ہے ماں!''

ماں نے اس کی طرف شفقت سے سر کا اشارہ کیا۔ وہ اس بات سے خوش تھی کہ یہ شخص جو ساری بستی میں شورش پسند مشہور تھا اس سے بڑی بڑی عزت سے بات کر رہا تھا۔ وہ کارخانے میں جوش وخروش کے مظاہرے سے بھی خوش تھی اور دل ہی دل میں سوچ رہی تھی:

''اگر میں نہ ہوتی...''

تین غیر ہنر مند مزدور اس کے نزدیک آ کر رک گئے۔

''کہیں بھی نہ مل سکے...'' ان میں سے ایک نے دھیرے سے افسوس کے لہجے میں کہا۔

''جی چاہتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ ان میں لکھا کیا ہے! میں خود پڑھنا نہیں جانتا، لیکن یہ بات تو صاف ہے کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے...'' دوسرے نے کہا۔

تیسرے نے چاروں طرف دیکھا اور بہت آہستہ سے کہا:

''چلو بائکر کے کمرے میں چلیں...'' گوسیف نے ماں کی طرف دیکھا اور آنکھ ماری۔

''دیکھا کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے کہا۔

پلا گیا نشاط و مسرت کے عالم میں گھر واپس آئی۔

''لوگوں کو افسوس اس بات کا ہے کہ انہیں پڑھنا نہیں آتا'' اس نے آندری سے کہا۔ ''جب میں جوان تھی تو میں پڑھنا جانتی تھی لیکن اب بالکل بھول گئی۔''

''لیکن سیکھ کیوں نہیں لیتیں'' خوخول نے تجویز پیش کی۔

''اس عمر میں؟ لوگ سنیں گے تو ہنسیں گے نہیں؟...''

لیکن آندری نے الماری میں سے ایک کتاب نکالی اور سرورق پر ایک حرف کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ر'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اور یہ؟''

''الف...''

وہ جھینپ گئی اور کچھ شرما سی گئی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آندری کی آنکھیں اندر ہی اندر اس پر ہنس رہی ہیں اور اس نے اس سے نظریں نہیں ملائیں۔ لیکن آندری کی آواز میں نرمی اور شفقت اور اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

''تم سچ مچ مجھے پڑھانے کی سوچ رہے ہو آندریوشا؟'' اس نے ایک مختصر، غیر ارادی ہنسی ہنستے ہوئے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں؟'' اس نے جواب دیا۔ ''اگر تم پڑھنا جانتی تھیں تو بڑی آسانی سے سیکھ جاؤ گی۔ 'لگ گیا تو تیر نہیں تو تکا'۔''

''لیکن ایک دوسری کہاوت بھی ہے! 'دیوتاؤں کی مورتیوں کو دیکھ دیکھ کر کوئی دیوتا نہیں بن سکتا'!''

''ہونہ!'' خوخول نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''کہاوتیں تو بہت سی ہیں، مثلاً 'علم جتنا کم ہو نیند اتنی ہی اچھی آئے گی'۔ لیکن صرف پیٹ ہی ایسی باتیں سوچتا ہے اور روح کو ایسی کہاوتوں میں جکڑ دیتا ہے تاکہ اس کو آسانی سے قابو میں رکھا جا سکے یہ کیا حرف ہے؟''

''ل'' ماں نے کہا۔

''ٹھیک! اور یہ کیا ہے؟''

اس نے بھولے ہوئے حرف کو یاد کرنے کے لئے آنکھوں پر زور دیا، تیوریوں پر بل ڈالا اور ہر چیز سے بے خبر سی ہو گئی لیکن بہت جلد ہی اس کی آنکھیں تھک گئیں۔ پہلے وہ تھکن کے آنسو روتی رہی اور پھر ناامیدی کے۔

''پڑھنا سیکھ رہی ہوں!'' اس نے سسکی لے کر کہا۔

''چالیس برس کی عمر ہو گئی اور اب الف، بے، تے سیکھنے بیٹھی ہوں!''

''روؤ مت!'' خوخول نے تسکین دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اپنی زندگی خود تو پسند نہیں کی تھی لیکن کم سے کم تمہیں اتنا تو احساس ہے کہ یہ زندگی کتنی خراب تھی۔ اگر چاہتے تو ہزاروں انسان بہتر زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن وہ جنگلیوں کی طرح زندگی گذارتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ یہ کون سی بڑی بات ہے کہ آج انسان نے کام کیا اور کھانا کھا لیا، اور کل کام کیا اور کھانا کھا لیا اور ساری زندگی یہی کرتا رہا۔ کام کرنا اور کھانا۔ ان دونوں سے وقت ملا تو بچے پیدا کر لئے جن سے پہلے تو دل بہلاتے رہے لیکن جب بڑے ہو کر کھانے کا مطالبہ زیادہ بڑھا تو ان پر غصہ اتارا اور گالیاں دیں۔ جلدی سے بڑے ہو جاؤ سورو، جلدی سے نوکری کرو! ایسے لوگ اپنے بچوں کو خانگی جانور بنا دینا چاہتے ہیں لیکن بچے خود اپنے پیٹ کے لئے کام کرنے لگتے ہیں۔ بس اپنی زندگیوں کو گھسیٹتے رہتے ہیں۔ انسان کہلانے کے قابل تو صرف وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی انسانی ذہن کو زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے واقف کر دیتے ہیں۔ اور تم نے بھی اپنی صلاحیت کے مطابق یہی کام اپنے سر لیا ہے۔''

''میں نے؟'' اس نے ناپسندیدگی سے کہا۔ ''میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''ایسا کیوں کہتی ہو؟ ہم سب بارش کی طرح ہیں جس کا ہر قطرہ زمین کو سیراب کرتا ہے اور جب تم پڑھنا شروع کردو گی...''

وہ کہتے کہتے ہنس پڑا اور پھر اٹھ کر اس نے ٹہلنا شروع کر دیا۔

''تمہیں پڑھنا تو ضرور چاہیئے۔ جلد ہی پاویل گھر آجائے گا اور تب۔ اوھو!''

''آہ آندریوشا!'' ماں نے کہا۔ ''جوانی مین ہر چیز آسان نظر آتی ہے لیکن بعد میں۔ اتنی زیادہ پریشانیاں، اتنی کم طاقت اور پھر دماغ ندارد...''

18

اس شام جب خوخول باہر چلا گیا تو ماں نے چراغ جلا کر موزہ بننا شروع کیا لیکن وہ جلدی ہی اٹھ کھڑی ہوئی، کچھ تذبذب کے عالم میں کمرے میں ادھر ادھر ٹہلی، پھر باورچی خانے میں گئی، دروازہ بند کیا اور واپس آئی تو اس کے ابرو پھڑک رہے تھے۔ کھڑکیوں پر پردے کھینچ دینے کے بعد اس نے الماری میں سے ایک کتاب نکالی اور میز پر دوبارہ بیٹھ گئی۔ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے باوجود وہ چوکنی ہو کر ادھر ادھر دیکھے بغیر نہ رہ سکی اور پھر وہ کتاب پر جھک گئی اور اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ سڑک کی طرف سے کوئی آواز آتی تو وہ چونک پڑتی، کتاب کو ہاتھ سے ڈھانک لیتی اور غور سے سننے لگتی۔ پھر اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں اور منہ ہی منہ میں بدبدانے لگی: ''الف، ب، ج...''

کسی نے دروازے پر دستک دی اور ماں اچھل کر کھڑی ہو گئی، کتاب کو جلدی سے الماری میں رکھ دیا اور گھبرا کر پوچھا:

''کون ہے؟''

''میں...''

ریبن اپنی ڈاڑھی سہلاتے ہوئے اندر آیا۔

''پہلے تو نہیں پوچھا کرتی تھیں 'کون ہے؟''' اس نے کہا۔

''تنہا ہو؟ سوچا کہ شاید خوخول گھر ہی پر ہوگا۔ میں نے آج ہی اسے دیکھا تھا۔ جیل سے اسے کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔''

بیٹھ کر وہ ماں کی طرف مخاطب ہوا:

''آؤ کچھ باتیں کریں...''

اس نے ماں پر ایک معنی خیز، پراسرار نظر ڈالی، جس سے اسے کچھ مبہم سا خطرہ محسوس ہوا

''ہر چیز کے لئے روپیہ چاہئے'' اس نے اپنی بھاری آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''پیدا ہونے کے لئے روپیہ چاہئے، مرنے کے لئے روپیہ چاہئے۔ کتابوں اور پرچوں کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے ان کتابوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟''

''نہیں، مجھے نہیں معلوم'' ماں نے آہستہ سے کہا، اس نے محسوس کرلیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

''مجھے بھی نہیں معلوم۔ اور پھر دوسرا سوال۔ انہیں لکھتا کون ہے؟''

''کتابی علم رکھنے والے لوگ...''

''رئیس لوگ'' ریبن نے کہا۔ اس کا ڈاڑھی والا چہرہ عنابی ہوگیا۔ ''یعنی دوسرے الفاظ میں پیسے والے ان کتابوں کو لکھتے ہیں اور دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اب ذرا تم ہی مجھے سمجھاؤ کہ اپنے خلاف عام لوگوں کو بھڑ کانے پر روپیہ خرچ کر کے انہیں کیا فائدہ ہوتا ہے۔ کیوں؟''

ماں کے منہ سے ایک خوفزدہ سی ہچکی نکلی اور اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''آہا'' ریبن نے ریچھ کی طرح پلٹتے ہوئے کہا۔ ''یہی تو بات ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جیسے ہی یہ خیال میرے ذھن میں آیا تو مجھے ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔''

''تمہیں کچھ معلوم ہوا ہے کیا؟''

''''بے وقوف بنایا گیا!'' ریبن نے جواب دیا۔ ''مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کو احمق بنایا گیا۔ میرے پاس واقعات نہیں ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس میں دھوکہ بازی ضرور ہے! یہ رئیس لوگ بڑی چالاک ہوتے ہیں۔ میں صداقت کو ڈھونڈ ھتا ہوں۔ اور اب میں صداقت کو سمجھنے لگا ہوں اور اب ان پیسے والوں کا ساتھ ہرگز نہ دوں گا۔ جب بھی ان کا دل چاہے گا تو مجھے ٹھکرا کر گرا دین گے اور میری ہڈیوں پر سے ایسے گزریں گے جیسے پل پر سے گزرتے ہوں...

اس کے الفاظ نے شکنجے کی طرح ماں کے جدل کو اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔

''میرے یسوع!'' وہ افسردہ ہو کر چلائی۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ پاشا یہ کچھ نہیں سمجھتا؟ اور تمام لوگ

جو...''

اس کی نظروں کے سامنے یگور، نکولائی ایوانووچ اور ساشا کے سنجیدہ پرخلوص چہرے پھرنے لگے۔ اس کی نبض کی رفتار تیز ہوگئی۔

''نہیں، نہیں'' اس نے سر ہلا کر کہا۔ ''میں یقین نہیں کرسکتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ضمیر رکھتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' ریبن نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''سب کے سب ان میں سب ایک ایک آدمی۔ میں نے یہ خوب دیکھ لیا ہے!''

''جہاں دیکھنا چاہئے وہاں نہیں دیکھ رہی ہو ماں۔ ذرا اور دیکھو'' ریبن سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''وہ لوگ جو ہمارے ساتھ مل گئے ہیں، ممکن ہے وہ خود بھی کچھ نہ جانتے ہوں وہ اعتقاد رکھتے ہیں، اور یہ اچھی بات ہے۔ لیکن ممکن ہے ان کے پیچھے اور لوگ ہوں۔ ایسے لوگ جنہیں صرف اپنا فایدہ عزیز ہے۔ کوئی شخص بغیر کسی وجہ کے اپنے خلاف نہیں ہو جاتا۔''

پھر اس نے ایک کسان کے اڑیل تیقن کے ساتھ کہا:

''رئیسوں سےکبھی کسی کو کوئی فلاح نہیں مل سکتی۔''

''تم کیا کرنے کی سوچ رہے ہو؟'' ماں نے دریافت کیا۔ وہ ایک بار پھر شک میں پڑ گئی۔

''میں؟'' ریبن نے اس کی طرف دیکھا، تھوڑی دیر رکا اور پھر کہا ''رئیسوں سے جتنا دور رہا جائے بہتر ہے۔ بات دراصل یہی ہے۔''

وہ پھر افسردہ اور خاموش ہوگیا۔

''میں ان رفیقوں کے ساتھ شامل ہو جانا چاہتا تھا اور ان کے ساتھ چلنا چاہتا تھا۔ میں ایسے کام کے لئے بہت مناسب ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ لوگوں سے کس طرح بات کرنی چاہئے۔ لیکن اب میں جا رہا ہوں، میرا اعتقاد ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے اب مجھے چلے جانا چاہئے۔''

اس نے سر جھکایا اور کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

''میں تن تنہا گاؤں میں اور دیہاتی علاقوں میں جاؤں گا اور عام لوگوں کو بیدار کروں گا۔ انہیں ساری چیزیں اپنے ہاتھ میں لینی ہیں۔ ایک بار وہ سب کچھ سمجھ لیں تو پھر اپنا راستہ خود ہی بنا لیں گے۔ میرا کام انہیں سمجھانا ہوگا کہ ان کی واحد امید وہ خود ہی ہیں، ان کا واحد دماغ خود ان کا اپنا دماغ ہے۔ بات

دراصل یہی ہے۔''

ماں کو اس شخص پر ترس آنے لگا اور اس سے کچھ خوف بھی محسوس ہونے لگا۔ وہ جو اسے ہمیشہ ناپسند رہا تھا، اب کسی وجہ سے اسے بہت عزیز معلوم ہونے لگا اور اس نے بڑی نرمی سے کہا:

''تمہیں پکڑ لیں گے...''

ریبن نے اس کی طرف دیکھا۔

''یقیناً پکڑ لیں گے، لیکن پھر رہا بھی کر دیں گے اور مین پھر وہی سب شروع کروں گا۔''

''کسان خود تمہیں باندھا دیں گے۔ وہ تمہیں جیل میں ڈال دیں گے۔''

''سزا بھگت لوں گا۔ اور پھر باہر آ جاؤں گا۔ اور پھر سے کام شروع کروں گا۔ رہ گیا کسانوں کا سوال تو وہ لوگ ایک بار، تین بار باندھیں گے اور پھر خود ہی محسوس کرنے لگیں گے کہ اسے باندھنے سے بہتر ہے کہ اس کی بات سن جائے۔ میں کہوں گا: 'مجھ پر یقین مت کرو۔ صرف سنو!'' اور ایک بار سن لیں گے تو پھر مجھ پر یقین بھی کر لیں گے۔''

وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا جیسے کہنے سے پہلے ایک ایک لفظ تول رہا ہو۔

''میں نے پچھلے دنوں بہت کچھ دیکھا اور سنا ہے اور میں نے کافی کچھ سیکھ لیا ہے۔''

''تم بالکل ختم ہو جاؤ گے، میخائل ایوانووچ!'' اس نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اپنی سیاہ، حلقے والی آنکھوں سے وہ ماں کو متوقفانہ انداز میں کچھ عجیب سی طرح دیکھنے لگا۔ اس کا مضبوط جسم آگے کی طرف جھکا، اس نے ہاتھوں سے کرسی کے تختے کو پکڑا اور سیاہ ڈاڑھی میں سے اس کا سیاہی مائل چہرہ زرد سا نظر آنے لگا۔

''یاد ہے نا یسوع نے بیج کے متعلق کیا کہا تھا؟ پھر سے زندہ ہونے کے لئے اسے مرنا پڑتا ہے۔ لیکن موت مجھے جلدی نہیں آئے گی۔ میں لومڑی کی طرح چالاک ہوں۔''

وہ کرسی میں کسمسایا اور آہستہ سے اٹھا۔

''اب شراب خانے جاؤں گا اور تھوڑی دیر لوگوں کے ساتھ بیٹھوں گا۔ خوخول تو آ ہی نہیں چکتا۔ پھر اسی کام میں لگ گیا؟''

''ہاں'' ماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بہت خوب، میرے بارے میں اس سے کہہ دینا...''

وہ آہستہ آہستہ کاندھے سے کاندھا جوڑھا، ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر کچھ جملے کہتے ہوئے باورچی خانے تک پہونچے۔

''اچھا، خدا حافظ!''

''خدا حافظ۔ کارخانے میں کام چھوڑنے کی اطلاع کب دے رہے ہو؟''

''دے بھی چکا۔''

''اور جا کب رہے ہو؟''

''کل۔ صبح سویرے۔ خدا حافظ!''

بادل ناخواستہ اور بھدے پن سے ریبن جھک کر دروازے سے نکلا اور ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ ایک لمحے کے لئے ماں اس کے بھاری قدموں کی چاپ اور خود اپنے سینے میں اٹھتے ہوئے شبہات کی آواز کو سنتی رہی۔ پھر وہ خاموشی سے مڑی، دوسرے کمرے میں گئی اور اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ باہر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

''میں تاریکی میں جی رہی ہوں'' اس نے سوچا۔

اس باوقار کسان پر اسے رحم آیا جو اس قدر طاقتور اور صحت مند تھا۔

آندری بہت خوشی اور انبساط کے عالم میں گھر واپس آیا۔

جب اس نے ریبن کے متعلق بتایا تو وہ بولا:

''جانے دو اسے گاؤں میں۔ چکر لگائے گا، عدل وانصاف کا مطالبہ کرے گا اور لوگوں کو جگائے گا۔ ہم لوگوں کے ساتھ چلنا اس کے لئے مشکل ہے۔ اس کے دماغ میں کسانوں کے خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے خیالات کے لئے وہاں کوئی جگہ نہیں ہے...''

''وہ رئیسوں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا اس میں کچھ جان تو ہے'' ماں نے محتاط طریقے سے کہا۔ ''خیال رکھو کہ وہ لوگ تمہیں احمق نہ بنا دیں!''

''وہ تمہیں ناپسند ہیں نا؟'' خوخول ہنسا۔ ''ارے ننکو روپیہ! اگر ہمارے پاس روپیہ ہی ہوتا تو کیا تھا! ہم اب بھی دوسروں کے سہارے کام چلا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر نکولائی ایوانووچ کو پچھتر روبل مہینہ

ملتے ہیں۔ وہ ہمیں پچاس دے دیتا ہے۔ دوسرے بھی یہی کرتے ہیں۔ بعض اوقات یونیورسٹی کے نیم فاقہ کش طلبا ایک ایک پیسہ جمع کر کے ہمیں چندہ بھیجتے ہیں۔ رئیس بھی الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، کچھ دھوکا دے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے سب سے اچھے ہمارے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں...''

اس نے دونوں ہاتھ باندھ لئے اور تیقن سے باتیں کرتا گیا:

''ہماری آخری فتح تو دور ہے۔ حد نظر سے بہت دور لیکن یکم مئی کے تہوار کے دن ہم مظاہرہ ضرور کریں گے۔ اور وہ بہت شاندار ہوگا۔''

ربین کے پیدا کئے ہوئے شبہات خوخول کے جوشیلے پن کی وجہ سے ختم ہو گئے۔ خوخول اپنے بالوں کو الجھاتا فرش پر نظریں جمائے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

''کبھی کبھی وفور جذبات سے دل کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ مشکل ہی سے برداشت ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں بھی جاؤ ہر شخص رفیق ہے، سب کے سینوں میں ایک ہی شعلہ فروزاں ہے، سب اچھے، ہمدرد اور ہنس مکھ ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے بات کرنا بھی ضروری نہیں۔ سب مل کر ایک واحد عظیم کورس بن جاتے ہیں جس میں ہر دل خود اپنا گیت گا رہا ہو اور سارے گیت چشموں کی طرح ہوں جو ایک ہی دریا میں گرتے ہیں اور دریا آزادی کے ساتھ پھیلتا بڑھتا نئی زندگی کے پر مسرت ساگر کی طرف چلا جا رہا ہو۔''

ماں بے حس و حرکت بیٹھی رہی کیوں کہ اسے خطرہ تھا کہ کہیں اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ نہ جائے اور اس کی بات کٹ نہ جائے۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ اس کی بات ہمیشہ بہت غور سے سنتی تھی۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ سادگی سے باتیں کرتا تھا اور اس کے الفاظ دل میں اتر جاتے تھے۔ پاویل مستقبل کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ لیکن خوخول کے وجود کا ایک حصہ ہمیشہ اسی مستقبل میں رہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی باتوں میں ان مسرتوں کا ذکر ہوتا جو دھرتی کے تمام باسیوں کے لئے آئیں گی۔ اور ماں کے لئے اسی خواب نے زندگی میں، اور اس کے بیٹے اور بیٹے کے تمام رفیقوں کے کام میں معنویت پیدا کر دی تھی۔

''پھر ایک دم سے ہوش آ جاتا ہے'' خوخول نے سر کو جھٹکتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''چاروں طرف

نظر دوڑاؤ تو ہر چیز سرد مہر اور غلیظ نظر آتی ہے ہر شخص تھکا ہوا اور چڑ چڑ سرد مہر اور غلیظ نظر آتی ہے ہر شخص تھکا ہوا اور چڑ چڑا ہو رہا ہے...''

وہ بڑے دکھ سے کہتا رہا:

''انسانوں پر اعتماد مت کرو، مجھے معلوم ہے اس سے تکلیف ہوتی ہے لیکن ان سے ڈرنا چاہئے بلکہ۔نفرت بھی کرنا چاہئے۔انسان کے دو پہلو ہوتے ہیں۔اگر یہ چاہو کہ اس سے صرف محبت کی جائے تو یہ کیسے ممکن ہے؟ ایسے آدمی کو کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے جو تم پر جنگلی جانوروں کی طرح جھپٹے، جو تمہاری زندہ روح کو نہ دیکھ سکے اور تمہارے انسانی چہرے کو کچل کر رکھ دے؟ اسے تو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا! اپنی وجہ سے نہیں۔خود تو ہر چیز برداشت ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ہم انہیں یہ سمجھنے کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہم اس چیز کو پسند کرتے ہیں۔ہم انہیں دوسروں کو مارنے کی مشق کرنے کیلئے اپنی پیٹھ تو پیش نہیں کر سکتے۔''

اس کی آنکھوں میں ایک سرد شعلہ لپک رہا تھا، اس کا سر ہٹیلے انداز سے نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا اور وہ زیادہ مضبوطی سے بول رہا تھا:

''مجھے کسی غلطی کو معاف کر دینے کا حق نہیں خواہ اس سے مجھے تکلیف نہ بھی پہونچی ہو۔اس دھرتی پر میں ہی اکیلا تو نہیں ہوں! آج میں کسی کو اپنے ساتھ ناانصافی کرنے کی اجازت دے دوں بلکہ اس پر ہنس بھی دوں کیونکہ اس کی اہمیت ہی کیا ہے۔لیکن میرے اوپر اپنی قوت آزمانے کے بعد ممکن ہے کل وہ کسی اور کو ڈرانے دھمکانے لگے۔ ہر شخص کو ایک ہی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بہت ہی ٹھنڈے دل سے ہر ایک کو پرکھنا چننا ہوگا: یہ میری طرح ہے اور یہ نہیں ہے۔ یہ کچھ بہت تسکین بخش باتیں نہیں ہیں، لیکن یہ صحیح ہیں۔''

کسی وجہ سے ماں کو ساشا کا خیال آیا اور پھر افسر کا۔

''بغیر چھانے ہوئے آٹے کی روٹی اور کیسی پک سکتی ہے؟'' ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''یہی تو اصل مشکل ہے'' خوخول نے کہا۔

''ہاں'' ماں نے کہا۔اس کے ذہن میں اپنے شوہر کی تصویر پھر گئی، ایک بڑے پتھر کی طرح، جس پر کائی جم گئی ہو، بھاری اور ٹھس۔اس نے تصور کیا کہ اگر خوخول نے نتاشا سے اور اس کے بیٹے نے ساشا

سے شادی کر لی تو کیسا رہے گا۔

''اور ایسا کیوں ہے؟'' خوخول نے اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے کہا، جس کے لئے اس میں اور زیادہ دل چسپی اور جوش پیدا ہو گیا تھا۔ ''یہ اتنی ہی واضح بات ہے جیسے میرے چہرے پر یہ ناک۔ یہ سب اس لئے ہی کہ لوگ ایک ہی سطح پر نہیں ہیں۔ انہیں ایک ہی سطح پر لانا ہمارا کام ہے۔ دماغ نے جو کچھ سوچا اور ہاتھ نے جو کچھ بنایا ہے اس سب کو تقسیم کر دیں، لوگوں کو خوف اور حسد کا غلام نہ ہونے دیں، انہیں لالچ اور حماقت کا شکار نہ بننے دیں!...''

اس کے بعد ان لوگوں میں اس قسم کی باتیں کئی بار ہوئیں۔

نخودکا کو کارخانے میں پھر سے کام مل گیا۔ وہ اپنی ساری تنخواہ ماں کو دے دیتا تھا، اور وہ اس کے پیسے اسی سادگی سے قبول کر لیتی تھی جیسے پاویل سے لیا کرتی تھی۔

بعض اوقات آندری آنکھوں میں شرارت کی چمک لا کر اس سے کہتا:

''تھوڑی سی پڑھائی ہو جائے ننکو؟''

وہ ہنس دیتی لیکن سختی سے انکار کرتی۔ اس کی آنکھوں کی شرارت سے اس تکلیف پہونچتی۔

''اگر تمہیں یہ بات مذاق معلوم ہوتی ہے تو پھر فکر ہی کیوں کرتے ہو؟'' وہ اپنے دل ہی دل میں سوچتی۔

لیکن اب اکثر و بیشتر وہ اس سے کسی نہ کسی لفظ کے معنے پوچھنے لگی اور اس وقت وہ اس سے نظریں نہیں ملاتی تھی اور اپنے لہجے میں بے نیازی پیدا کر لیتی تھی۔ وہ تاڑ گیا کہ ماں چوری چھپے پڑھ رہی ہے اور اس کی شرم کا خیال کر کے اس نے پڑھنے کے متعلق کہنا چھوڑ دیا۔

''میری آنکھیں کمزور ہو رہی ہیں آندریوشا، مجھے عینک کی ضرورت ہے'' ایک دن اس نے کہا۔

''یہ کون بڑی بات ہے!'' اس نے جواب دیا۔ ''اتوار کو تمہیں شہر کے ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا اور عینک دلا دوں گا۔''

19

وہ تین مرتبہ دریافت کرنے گئی کہ پاویل سے مل سکتی ہے یا نہیں لیکن ہر بات پولیس کے جنرل نے

جس کے بال سفید ہو گئے تھے اور جس کے گال سرخ اور ناک بڑی سی تھی، نرمی کے ساتھ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

''کم سے کم ایک ہفتے اور انتظار کرنا ہوگا ماں۔ایک ہفتے کے بعد دیکھیں گے۔لیکن فی الحالتو ناممکن ہے!''

وہ گول مٹول اور موٹا سا تھا اور اسے دیکھ کر ماں کو ایک پکے ہوئے آلو چھلکے کا خیال آتا جس پر بہت دیر تک رکھے رہنے کی وجہ سے روئیں دار پھپھوندی جم گئی ہو۔ وہ اپنے چھوٹے تیز سفید دانتوں کو ہر وقت ایک زرد خلال سے کریدتا رہتا تھا۔اس کی چھوٹی چھوٹی سبز آنکھیں شفقت سے مسکراتی تھیں اور اس کی آواز سے ہمیشہ دوستی اور مروت ٹپکتی تھی۔

''بڑا شائستہ ہے''اس نے خوخول سے کہا۔''ہمیشہ مسکرایا کرتا ہے...''

''کیا کہنے'' خوخول نے جواب دیا۔''بڑے اچھے لوگ ہیں، مسکراتے ہوئے اور مرنجاں مرنج۔ ان سے کہا جاتا ہے: یہ آدمی ہوشیار اور ایماندار ہے اور اسے ہم لوگ ذرا خطرناک سمجھتے ہیں۔اسے پھانسی پر تو لٹکا دو، ۔اور وہ مسکراتے ہیں اور پھانسی پر لٹکا دیتے ہیں اور اس کے بعد۔وہ مسکرایا ہی کرتے ہیں۔''

''اس شخص سے تو مختلف تھا جو یہاں تلاشی لینے آیا تھا'' ماں نے کہا۔''اسے تو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ بڑا اسور ہے...''

''ان میں کوئی بھی انسان کہلانے کے قابل نہیں۔ یہ سب لوگ ہتھوڑے ہیں جن سے لوگوں کو کچل دیا جاتا ہے۔ ایسے اوزار کی طرح ہیں جن سے ہم ایسے لوگوں کی مرمت کرائی جاتی ہے تاکہ جس طرح چاہیں ہم سے برتاؤ کریں۔اور خود انہیں ان کے آقاؤں نے اپنے مقصد کے لئے ایک خاص ڈھانچے میں ڈال لیا ہے۔انہیں جو بھی حکم دیا جائے گا اسے بغیر سوچے اور بلا چون و چرا کئے بجا لائیں گے۔''

آخر کار اسے پاویل سے ملنے کی اجازت دی گئی اور ایک اتوار کو وہ جیل کے دفتر کے ایک کونے میں خاموشی سے آکر بیٹھ گئی۔اس چھوٹے سے گندے نیچے چھت والے کمرے میں بہت سے لوگ تھے جو قیدیوں سے ملنے کا انتظار کر رہے تھے۔صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ لوگ آج پہلی بار یہاں نہیں آئے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے سے واقف تھے اور آپس میں دبی زبان سے آہستہ آہستہ باتوں کا جال سا پھیلا رہے تھے جیسے مکڑی جالا بن رہی ہو۔

''تم نے سنا؟'' ایک موٹی سی عورت نے جس کا چہرہ بھرا بھرا سا تھا اور جس کے ہاتھ میں سفری تھیلا تھا دریافت کیا۔ ''آج صبح نماز کے وقت گرجا کے منتظم نے دعا پڑھنے والے لڑکوں میں سے ایک کا کان کاٹ لیا...''

''دعا پڑھنے والے لڑکے سارے کے سارے غنڈے ہوتے ہیں'' ایک بوڑھے شخص نے کہا جو پنشن یافتہ افسر کی وردی پہنے ہوئے تھا۔

ایک پستہ قد گنجا سا شخص دفتر میں بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا اور پھٹی پھٹی پر ہیجان آواز میں بول رہا تھا۔ اس کی ٹانگیں چھوٹی اور ہاتھ لمبے تھے اور ٹھوڑی آگے کی طرف نکلی ہوئی تھی۔

''قیمتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور اس کی وجہ سے لوگ بے ہودہ ہوتے جا رہے ہیں۔ گھٹیا قسم کے گائے کے گوشت کی قیمت چودہ کوپک فی پاؤنڈ اور روٹی تو پھر ڈھائی کوپک تک پہونچ گئی...''

کبھی کبھی قیدی آجاتے۔ سب کے سب بھورے رنگ کی وردیاں اور چمڑے کے بھاری جوتے پہنے ایک ہی سے معلوم ہوتے تھے۔ نیم روشن کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ان کی آنکھیں جھپک جاتیں۔ ان میں سے ایک کے پیروں میں بیڑیاں تھیں۔

جیل کی ہر چیز میں عجیب وغریب خاموشی اور ناخوش گوار سی سادگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب لوگ بہت عرصے سے اس کے عادی ہو چکے تھے اور اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر تسلیم کر چکے تھے۔ ان میں سے چند بڑی مستقل مزاجی سے اپنی سزا کاٹ رہے تھے، کچھ دوسرے کاہلانہ طریقے سے پہرہ دے رہے تھے اور چند دوسرے لوگ ایک تھکی ہوئی باقاعدگی کے ساتھ قیدیوں سے ملنے آتے تھے۔ ماں کا دل بے صبری سے دھڑکنے لگا، ہر چیز کی یاس انگیز سادگی سے حیران ہو کر وہ اپنے چاروں طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اس کی سمجھ ہی میں کچھ نہ آتا ہو۔

اس کی نزدیک ایک مختصر سی بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ چھوارے کی طرح سوکھا ہوا تھا لیکن آنکھوں میں ایک دلکش تھی۔ وہ اپنی پتلی سی گردن کو گھما کر ساری باتوں کو سن رہی تھی اور ہر شخص کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتی جن میں شوخی کی جھلک تھی۔

''تم کس سے ملنے آئی ہو؟'' پلاگیا نے اس سے آہستہ سے دریافت کیا۔

''اپنے بیٹے سے، یونیورسٹی کا طالب علم ہے'' بوڑھی عورت نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ ''اور

تم؟''

''میں بھی اپنے بیٹے سے ملنے آئی ہوں۔ وہ مزدور ہے۔''

''نام کیا ہے؟''

''ولاسوف۔''

''کبھی سنا نہیں۔ بہت دنوں سے جیل میں ہے؟''

''تقریباً سات ہفتے ہو گئے۔''

''میرا بیٹا تو تقریباً دس مہینے سے ہے!'' بوڑھی عورت نے کہا۔ اس کے لہجے میں فخر کی جھلک تھی۔

''ہاں، ہاں'' بوڑھے گنجے شخص نے بچوں کے انداز میں کہا۔ ''کسی میں صبر وقناعت نہیں ہے... ہر شخص چڑ چڑا جاتا ہے، ہر شخص شور مچاتا ہے اور قیمتیں بڑھتی جا رہی ہیں، اور اسی لحاظ سے لوگوں کی قیمت گرتی جا رہی ہے۔ کوئی بھی ان حالات کو روکنے کے لئے آواز نہیں اٹھاتا۔''

''ٹھیک کہتے ہو!'' افسر نے کہا۔ ''حد ہو گئی! اب تو وقت آ گیا ہے کہ کوئی شخص گھن گرج کے ساتھ کہے۔ خاموش!، بالکل اسی چیز کی ضرورت ہے ہم لوگوں کو۔ رعب دار آواز...''

تمام لوگ گفتگو میں شریک ہو گئے اور بات چیت میں جان پڑ گئی۔ ہر شخص زندگی کے متعلق اپنی رائے دینا چاہتا تھا لیکن سب کے سب دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے اور ماں کو ان کی باتوں سے اختلاف تھا۔ اسکے گھر میں بات چیت مختلف قسم کی ہوتی تھی، زیادہ اور سادہ اور اونچی آواز میں۔

ایک موٹے جیلر نے جس کی سرخ ڈاڑھی چوکور سی تھی اس کا نام پکارا۔ پھر اسے سر سے پیر تک دیکھا اور یہ کہہ کر لنگڑاتا ہوا باہر چلا گیا:

''میرے پیچھے پیچھے آؤ...''

چلتے چلتے ماں کا جی چاہا کہ پیچھے سے دھکا دے کر اسے جلدی چلنے پر مجبور کرے

پاویل ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑا تھا اور مسکراتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ اس کی ماں نے مختصر سی ہنسی ہنس کر ہاتھ ملایا اور جلدی جلدی پلکیں جھپکانے لگی۔

''اچھا... اچھا...'' الفاظ نہ پا کر اس نے کہا۔

''دل پر قابو حاصل کرو، ماں'' پاویل نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہوں میں۔''

''آخر کو تو یہ تمہاری ماں ہے''، جیلر نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ''لیکن ذرا دور دور کھڑے رہو تا کہ تم دونوں کے درمیان فاصلہ رہے...'' اس نے با آواز بلند ایک جمائی لیتے ہوئے کہا۔

پاویل نے اس کی صحت اور گھر کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ کچھ دوسرے سوالات کی توقع کر رہی تھی۔ ان سوالوں کے لئے اس نے اپنے بیٹے کی آنکھوں کا جائزہ لیا لیکن بیکار۔ وہ ہمیشہ کی طرح پر سکون تھا گو اس کا رنگ زرد سا پڑ گیا تھا اور آنکھیں کچھ پہلے سے بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔

''ساشا نے تمہیں پوچھا ہے'' ماں نے کہا۔

پاویل کے پپوٹے لرزنے لگے، چہرے پر نرمی سی آ گئی اور وہ مسکرایا۔ ماں کو اپنے دل میں ایک چبھتا ہوا سا درد محسوس ہوا۔

''کیا خیال ہے تمہیں جلدی چھوڑ دیں گے؟'' اس نے پوچھا۔ وہ کچھ ناراض اور رنجیدہ تھی۔ ''آخر ان لوگوں نے تمہیں گرفتار ہی کیوں کیا؟ وہ پرچے تو کارخانے میں پھر نظر آنے لگے۔''

پاویل کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

''سچ؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''ایسی چیزوں کے بارے میں بات کرنا منع ہے'' جیلر نے سوئی سوئی سی آواز میں کہا۔ ''صرف گھریلو معاملات کے متعلق باتیں کر سکتے ہو...''

''یہ گھریلو بات نہیں ہے کیا؟'' ماں نے احتجاج کیا۔

''میں اس کا جواب نہیں دے سکتا... لیکن۔ یہ باتیں منع ہیں'' جیلر نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''اچھا خیر، تو گھر کی باتیں بتاؤ'' پاویل نے کہا۔ ''تم اس زمانے میں کرتی کیا رہیں؟''

آنکھوں میں ایک شرارت آمیز چمک کے ساتھ اس نے جواب دیا:

''ارے، میں وہ ساری چیزیں کارخانے لے جاتی رہی ہوں...''

وہ رکی اور پھر مسکرا کر اس نے بات جاری رکھی:

''وہی گوبھی کا سالن اور دلیا اور ماریا کا پکایا ہوا کھانے کا دوسرا سامان۔ اور دوسری چیزیں...''

پاویل سمجھ گیا۔ اس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم نے اپنے لئے کوئی نہ کوئی مصروفیت نکال ہی لی۔ اس طرح تنہائی محسوس کرنے کا وقت نہیں ہوگا'' اس نے بڑی محبت سے ایسی آواز میں کہا جیسی ماں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

''جب وہ پرچے نظر آئے تو میری بھی تلاشی لی گئی'' اس نے کچھ فخر کے انداز میں اعلان کیا۔

''پھر وہی باتیں'' جیلر نے بگڑ کر کہا۔ ''ایک دفعہ کہہ چکا کہ یہ باتیں منع ہیں! لوگوں کو بند ہی اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ باہر کیا ہورہا ہے اور تم عجیب ہو! بہتر ہے کہ جو چیزیں منع ہیں انہیں سمجھ لو۔''

''بس کافی ہے ماں'' پاویل نے کہا۔ ''ماتوی ایوانووچ بڑا بھلا آدمی ہے اور اسے ناراض کرنے سے کوئی فایدہ نہیں۔ ہم لوگ بڑے اچھے دوست ہیں۔ بالکل اتفاقی بات ہے کہ آج تمہارے آنے کے دن اسے یہاں رہنا پڑ رہا ہے۔ عموماً تو نائب افسر یہ کام کرتا ہے۔''

''وقت ختم ہوگیا'' جیلر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''شکریہ پیاری ماں'' پاویل نے کہا۔ ''پریشان مت ہونا، مجھے جلدی ہی رہا کردیا جائے گا۔''

وہ ماں سے گرم جوشی سے بغلگیر ہوا اور اسے بوسہ دی اور وہ اتنی متاثر اور خوش ہوئی کہ رونے لگی۔

''چلو، چلو'' جیلر نے کہا۔ پھر اسے لے جاتے ہوئے اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''روؤ مت! اسے جلدی ہی چھوڑ دیں گے، سارے لوگوں کو چھوڑ دیں گے... بہت لوگ جمع ہوگئے یہاں۔''

گھر پہونچ کر اس نے ساری باتیں خوخول کو بتائیں، وہ بڑے شگفتہ انداز میں مسکرا رہی تھی اور اس کے ابرو پھڑک رہے تھے۔

''جس انداز سے میں نے اسے بتایا وہ تو بہت ہی دلچسپ تھا۔ وہ سمجھ گیا، سمجھ ہی گیا ہوگیا'' اس نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ اتنی محبت سے رخصت نہ کرتا، وہ کبھی ایسا نہیں کرتا!''

''تم بھی خوب ہو!'' خوخول ہنسا۔ ''لوگ طرح طرح کی چیزیں چاہتے ہیں لیکن ماں صرف محبت چاہتی ہے۔''

''ایسا نہیں ہے آندریوشا! ان لوگوں کو دیکھتے تو معلوم ہوتا!'' اس نے دفعتاً جوشیلے انداز میں کہا۔ ''وہ لوگ عجیب طرح ان چیزوں کے عادی ہوگئے ہیں! ان کے بچوں کو چھین کر جیل میں ڈال دیا گیا اور وہ

اس طرح چلتے پھرتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہاں آتے ہیں، بیٹھتے ہیں، انتظار کرتے ہیں اور خبروں کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ کیوں؟ اگر پڑھے لکھے لوگ اس کے عادی ہو سکتے ہیں تو ہم جاہل لوگوں سے کیا امید کی جاسکتی ہے؟''

''بات صاف ہے'' خوخول نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔ ''قانون ہمارے مقابلے میں ان کے ساتھ بہرحال رعایت کرتا ہے اور ان لوگوں کو ہمارے مقابلے میں قانون کی ضرورت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اگر زندگی میں ایک آدھ بار ان کے سر پر اس قانون کی مار پڑتی ہے تو کچھ منہ بنا لیتے ہیں لیکن زیادہ نہیں۔ دوسروں کی لاٹھی کے مقابلے میں اپنی ہی لاٹھی سے مار کھانا آسان ہوتا ہے...''

ایک دن شام کو جب ماں بیٹھی موزہ بن رہی تھی اور خوخول قدیم روما میں غلاموں کی بغاوت کے متعلق اسے کتاب پڑھ کر سنا رہا تھا تو کسی نے دروازے پر زور سے دستک دی اور جب خوخول نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو وسوف شیکوف ایک بنڈل دبائے ہوئے اندر آیا۔ اس کی ٹوپی سر پر پیچھے کی طرف سرکی ہوئی تھی اور ٹانگیں گھٹنوں تک کیچڑ میں لت پت ہو رہی تھیں۔

''ادھر سے جا رہا تھا کہ روشنی دیکھی، میں نے سوچا کہ ملتا چلوں، سیدھا جیل سے آ رہا ہوں'' اس نے کچھ غیر مانوس سی آواز میں اعلان کیا۔ پلاگیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس نے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور بولا:

''پاویل نے بہت بہت سلام کہا اور بولا:

وہ کچھ بے چین سا بیٹھا رہا اور افسردہ اور مشکوک نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔

ماں کو وہ اچھا نہ لگتا تھا۔ اس کے چوکور اور گھٹے ہوئے سر اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں کوئی خوفناک چیز محسوس ہوتی تھی۔ لیکن آج کی رات اسے دیکھ کر ماں کو خوشی ہوئی اور اس سے باتیں کرتے وقت وہ محبت سے مسکراتی رہی۔

''کتنے دبلے ہو گئے ہو تم! آندریوشا انہیں ایک پیالہ چائے کیوں نہ پلائی جائے؟''

''میں تو خود ہی سماوار چڑھا رہا ہوں'' خوخول نے باورچی خانے میں سے کہا۔

''اچھا تو پاویل کیسا ہے؟ تمہارے سوا اور کسی کو بھی چھوڑا؟''

نکولائی نے اپنا سر جھکا لیا۔

''پاویل وہاں بڑے صبر سے انتظار کر رہا ہے۔صرف مجھے رہا کیا گیا ہے۔''
اس نے سر اٹھا کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ دانت بھینچ کر کہتا رہا:
''میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا 'اب برداشت نہیں کر سکتا، مجھے جانے دو! اگر نہیں چھوڑتے تو میں کسی کو قتل کر دوں گا اور خود بھی ہلاک ہو جاؤں گا'۔تو اس طرح مجھے رہا کر دیا گیا۔''
''اوہ!'' ماں کو جیسے دھکا سا لگا، اس کی تیز گھورتی ہوئی نظروں سے نظریں ملتے ہی غیر ارادی طور پر ماں کی آنکھیں جھپک گئیں۔
''ہاں، میری تو سمجھ میں نہیں آتا'' نکولائی نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔''اپنے آپ کو نہ جانے سمجھتا کیا ہے، کوئی خوش گلو پرند؟ پنجرے میں ڈالا کہ اس نے گانا شروع کیا۔لیکن ایک چیز تو میں جانتا ہوں ۔کہ میں گھر واپس جانا نہیں چاہتا...''
''گھر میں رکھا بھی کیا ہے کہ واپس جاؤ؟'' ماں نے غور کرتے ہوئے کہا۔خالی گھر، چولہے میں آگ نہیں، ہر چیز سرد...''
اس نے کچھ نہ کہا بس کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔پھر اپنی جیب سے سگریٹ کی ایک ڈبیا نکالی، ایک سگریٹ جلائی اور تحلیل ہوتے ہوئے دھویں پر نظریں جما دیں پھر جھنجھلا کر کتے کی طرح غرایا۔
''ہاں غالباً ہر چیز سرد پڑ چکی ہے۔فرش پر یخ بستہ کاکروچ اور یخ بستہ چوہے ہوں گے۔ پلا گیا نلوونا مجھے یہاں رات بسر کرنے کی اجازت دوگی؟'' اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے پھٹی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔
''ہاں ہاں کیوں نہیں!'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔نہ معلوم کیوں وہ اس کی موجودگی میں کچھ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔
''آج کل تو لوگوں کو خود اپنے ماں باپ پر شرم آتی ہے...''
''کیا؟'' ماں نے چونک کر دریافت کیا۔
اس نے ماں کی طرف دیکھا پھر آنکھیں بند کر لیں جس کی وجہ سے اس کے چیچک زدہ چہرے پر اندھے پن کا شبہ ہونے لگا۔
''میں نے کہا کہ زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے ماں باپ پر شرم آتی ہے''

اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے دہرایا۔

پاویل کوتمہاری وجہ سے شرم کبھی نہیں آئی۔لیکن مجھے اپنے بڑے میاں پر شرم آتی ہے۔اس گھر میں اب کبھی قدم نہ رکھوں گا۔میرا کوئی باپ نہیں اور نہ کوئی گھر...اگر میں پولیس کی نگرانی میں نہ ہوتا تو سائبریا چلا جاتا۔وہاں جلاوطن لوگوں کوآزاد کراتا،انہیں قید سے بھاگنے میں مدد دیتا...''

اپنے حساس دل کی وجہ سے ماں نے محسوس کرلیا کہ اس لڑکے کو بڑا صدمہ ہورہا ہےلیکن اس کی تکلیف ماں کی ہمدردی کو بیدار نہ کرسکی۔

''اگر ایسا محسوس کرتے ہوتو بہتر ہے کہ چلے جاؤ...''

اس نے یہ سوچ کر کہا کہ اگر کچھ نہ بولی تو بھی اسے برا معلوم ہوگا۔

آندری باورچی خانے سے باہر آیا۔

''تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ ہنسا۔

''میں جاکر کچھ کھانے کے لئے لاتی ہوں...'' ماں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

خوخول پرتھوڑی دیرتک بہت پرغور نظریں جمانے کے بعد نکولائی نے دفعتاً زور سے کہا:

''میرا خیال ہے کہ چند لوگوں کوقتل کردینا چاہئے!''

''اوہو!کس لئے؟'' خوخول نے دریافت کیا۔

''ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے...''

لمبا، دبلا پتلا خوخول کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا اپنی ایڑیوں پر جھکولے سے لیتا اور نکولائی کو دیکھتا رہا جوسگریٹ کے دھوئیں میں لپٹا ہوا کرسی پر جما بیٹھا تھا۔اس کے چہرے پر سرخ دھبے نظر آنے لگے۔

''میں ایسائی گوربوف کا سر اڑادوں گا۔نہ اڑادیا ہوتو کہنا!''

''کیوں؟''

''جاسوس اور دغاباز ہے۔اسی نے میرے باپ کوتباہ کیا،اسے غدار بنادیا۔'' وسوف شیکوف نے آندری کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے اس سے لڑ رہا ہو۔

''اچھا تو یہ بات ہے!'' خوخول نے کہا۔''لیکن کوئی بے وقوف ہی ہوگا جوتمہارے باپ کی وجہ سے تمہیں الزام دے گا یا برا کہے گا۔''

''ہوشیار اور بے وقوف سب ایک ہی سے ہوتے ہیں'' نکولائی نے ہٹیلے پن سے کہا۔ ''اب تم اپنے کو اور پاویل ہی کو لے لو، تم دونوں ہوشیار ہو لیکن کیا تمہاری نظروں میں میں بھی ویسا ہی ہوں جیسا فیدر مارن اور سمیئلوف یا ایک دوسرے کے لئے تم دونوں؟... جھوٹ نہ بولنا۔ بہر حال مجھے تم پر یقین نہ آئے گا۔ تم سب لوگ مجھے ایک طرف کر دیتے ہو، میرے ساتھ ایک خاص طریقے کا رویہ اختیار کرتے ہو...''

''تمہاری روح کو کچھ روگ لگ گیا ہے، نکولائی'' خوخول نے اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے آہستگی اور نرمی سے کہا۔

''یقیناً روح کو کچھ روگ لگ گیا ہے لیکن تمہاری روح کو بھی روگ لگ گیا ہے... فرق صرف یہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ جو بیماری تمہیں ہے وہ میری بیماری کے مقابلے میں بلند ہے۔ میں تو صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ہم سب ایک دوسرے کے نزدیک بدمعاش ہیں۔ کیا کہتے ہو؟ بولو۔''

اس نے اپنی تیز نگاہیں آندری کے چہرے پر گاڑ دیں اور انتظار کرنے لگا۔ اس وقت اس کے دانت نظر آ رہے تھے۔ اس کے دھبوں دار چہرے کی کیفیت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، لیکن اس کے موٹے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا!'' خوخول نے وسوف شیکوف کی معاندانہ نظروں کا جواب اپنی نیلگوں آنکھوں کی محبت آمیز مسکراہٹ سے دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ جس شخص کے دل کے سارے زخموں سے خون رس رہا ہو اس سے بحث کرنا محض اس کا دل دکھانا ہے۔ مجھے معلوم ہے میرے بھائی!''

''میں اور تم بحث نہیں کر سکتے۔ میں بحث کرنا نہیں جانتا'' وسوف شیکوف نے نظریں جھکاتے ہوئے زیر لب کہا۔

''مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے'' خوخول نے بات جاری رکھی۔ ''کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی مصیبت کی گھڑی میں تمہاری طرح تکلیف سے کراہ چکا...''

''مجھے تم کچھ بھی نہیں بتا سکتے'' وسوف شیکوف نے آہستہ سے کہا۔ ''میری روح بھیڑئے کی طرح چیخ رہی ہے۔''

''میں تمہیں کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا، ہاں اتنا مجھے معلوم ہے کہ یہ حالت گذر جائے گی۔ ممکن ہے پوری طرح نہ ختم ہو مگر ختم ضرور ہو گی۔''

وہ ایک مختصر ہنسی ہنسا اور نکولائی کے کاندھوں کو تھپتھپاتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی:

''یہ تو کھسرا کی طرح ایک بچوں کی بیماری ہے۔ہم میں سے ہر شخص کبھی نہ کبھی اس کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ یہ تندرستوں کو معمولی طور پر اور کمزوروں کو بری طرح سے ہوتی ہے۔اور ایسے وقت پر ہم کو آ دبوچتی ہے جب کہ ہم نے اپنی ذات کو سمجھنا شروع ہی کیا ہو لیکن زندگی کو پوری گہرائی کے ساتھ نہ تو دیکھ پائے ہوں اور نہ اس میں اپنا موزوں مقام حاصل کر سکے ہوں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں بس ہم ہی ہم ہیں اوور ہر شخص ہمیں ختم کرنے کی فکر میں ہے۔لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ہم دیکھ لیتے ہیں کہ دوسروں کے سینے میں بھی دل ہے جو ہم سے کسی صورت میں برا نہیں اور یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوتا ہے۔پھر اس کے بعد کچھ شرمندگی سی محسوس ہونے لگتی ہے کہ اپنی چھوٹی سی حقیر گھنٹی لے کر گرجا کے گھنٹہ گھر پر چڑھنے کی ضرورت ہی تھی، جس کی آواز میں اس چھوٹی سی گھنٹی کی آواز سنائی بھی نہیں دیتی۔لیکن پھر یہ پتہ چلتا ہے کہ ہماری گھنٹی دوسری گھنٹیوں کے کورس میں مل کر اس میں خوبصورتی پیدا کر دیتی ہے۔حالانکہ الگ بجاؤ تو شاید بڑی گھنٹیاں اس کی آواز کو تیل میں مکھی کی طرح ڈبو ہی ڈالیں۔جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ سمجھے؟''

''ہوسکتا ہے کہ میری سمجھ میں آ گیا ہو'' نکولائی نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔''لیکن مجھے ان پر یقین نہیں ہے۔''

خوخول ہنستا ہوا اچھل کر کھڑا ہو گیا اور زور زور سے ٹہلنے لگا۔

''ارے او اینٹوں کے پرانے ڈھیر، میں بھی یقین نہیں کیا کرتا تھا۔''

''اینٹوں کا پرانا ڈھیر کیوں کہتے ہو مجھے؟'' نکولائی نے کھسیاتی ہنسی ہنستے ہوئے خوخول سے پوچھا۔

''اس لئے کہ تم وہی معلوم ہوتے ہو۔''

دفعتاً نکولائی زور نے قہقہہ مار کر ہنسا، اس کا پورا منہ کھلا ہوا تھا۔

''بات کیا ہے؟'' خوخول نے اس کے سامنے آ کر ٹھہرتے ہوئے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''ابھی ابھی میں نے سوچا۔ کہ تمہارے جذبات کو تکلیف پہونچانے والا بھی کیسا گدھا ہوگا'' نکولائی نے جواب دیا۔

''کوئی میرے جذبات کو تکلیف کیسے پہونچا سکتا ہے؟'' خوخول نے اپنے کاندھوں کو جھٹکا دیا۔

''مجھے نہیں معلوم'' وسوف شیکوف نے خوش مزاجی کے ساتھ مسکراتے کہا۔

''میرے کہنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ اگر کسی نے کبھی تمہیں تکلیف پہونچائی تو اسے بڑا برا معلوم ہوگا۔''

''اچھا تم یہ سوچ رہے تھے'' خوخول ہنسا۔

''آندریوشا!'' ماں نے باورچی خانے میں سے آواز دی۔

آندری باہر چلا گیا۔

اکیلے رہ جانے کے بعد وسوف شیکوف نے چاروں طرف دیکھا پھر ایک ٹانگ پھیلا کر اپنے بھدے سے جوتے کو غور سے دیکھا۔

اور اپنی موٹی پنڈلی کو ہاتھ سے چھوا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اپنی دبیز ھتھیلی اور موٹی موٹی انگلیوں کی پشت کو دیکھنے لگا جو زرد زرد بالوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا جیسے ان سب چیزوں سے متنفر ہو۔

جب آندری سماوار لایا تو وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''ایک مدت کے بعد میں نے اپنے بے ہنگم چہرے کو دیکھا ہے'' اس نے کہا۔ پھر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''کیا چہرہ ہے، واہ وا!''

''اپنے چہرے مہرے کی پرواہ کیوں کرتے ہو؟'' آندری نے اس کی طرف تجسس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''ساشا کا کہنا ہے کہ چہرہ روح کا آئینہ دار ہوتا ہے۔''

''مہمل!'' خوخول نے زور سے کہا۔ ''خود اس کی ناک تو ہے مچھلی پکڑنے کی طرح لیکن اس کی روح ستارے کی مانند ہے۔''

نکولائی اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

وہ لوگ چائے پینے کے لئے بیٹھ گئے۔

نکولائی نے ایک بڑا سا آلو لیا۔ روٹی کے ٹکڑے پر بہت سا نمک چھڑکا اور بیل کی طرح مسلسل، آہستہ آہستہ چبانا شروع کیا۔

''یہاں کے کیا حال چال ہیں؟'' منہ میں نوالہ لئے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

جب آندری اسے خوش خبری کے انداز میں سنا چکا کہ کارخانے میں پرچار کس طرح بڑھ رہا ہے تو وہ پھر افسردہ ہو گیا۔

''کتنا وقت لگ رہا ہے۔ کتنا زیادہ وقت! زیادہ تیزی سے کام کرنا ہوگا۔''

ماں نے اس کی طرف دیکھا اور اس کے دل میں ایک معاندانہ جذبہ پیدا ہوا

''زندگی کوئی گھوڑا تو ہے نہیں کہ چابک لگا کر اسے چلایا جائے'' آندری نے کہا۔

نکولائی نے ہٹیلے پن سے سر ہلایا۔

''بہت دیر لگ رہی ہے، میں اس طرح تو انتظار نہیں کر سکتا۔ میں کروں کیا؟''

جواب کی امید میں اس نے خوخول کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور بے بسی سے اپنے شانوں کو جھٹکا دیا۔

''ہم سب کو پڑھنا اور دوسروں کو پڑھانا ہوگا، یہی کام ہے ہمارا!'' آندری نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''اور لڑنا کب شروع کریں گے؟'' وسوف شیکوف نے دریافت کیا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ لڑنا کب شروع کریں گے، میں اتنا جانتا ہوں کہ لڑنے سے پہلے کئی بار ہماری مرمت ہو چکی ہوگی'' خوخول نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''کم از کم مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہاتھوں سے پہلے دماغوں کو مسلح کرنا ضروری ہے۔''

نکولائی نے پھر کھانا کھانا شروع کر دیا اور ماں نظریں بچا کر اس کے چوڑے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور وہاں کسی ایسی چیز کی متلاشی تھی جس کی وجہ سے وہ اس کے چوڑے چکلے بھاری جسم کو پسند کرنے پر تیار ہو سکے۔

اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی چھبتی ہوئی نظروں سے ماں کی نظریں لڑ گئیں اور اس کی وجہ سے اس کے ابرو پھڑکنے لگے۔ آندری کچھ بے چین سا ہونے لگا۔ اس نے دفعتاً ہنسنا اور باتیں کرنا شروع کیا اور پھر کچھ کہتے کہتے رک کر سیٹی بجانی شروع کر دی۔

ماں کا خیال تھا کہ وہ اس کی پریشانی کی وجہ سمجھ گئی ہے۔ نکولائی وہیں خاموش بیٹھا ہوا تھا اور خوخول جو بات بھی کہتا اس کا رکھائی اور بے دلی سے جواب دے رہا تھا۔

ماں اور آندری کو اس چھوٹے بیٹھا ہوا تھا اور خوخول جو بات بھی کہتا اس کا رکھائی اور بے دلی سے جواب دے رہا تھا۔

ماں اور آندری کو اس چھوٹے سے کمرے میں گھٹن اور بے چینی سی محسوس ہونے لگی اور وہ دونوں اپنے مہمان کی طرف مضطرب نظریں ڈالنے لگے۔

آخر کار وہ کھڑا ہو گیا اور بولا:

''میرا خیال ہے کہ اب سو جانا چاہیئے۔جیل میں مسلسل بیٹھا رہا اور پھر دفعتاً مجھے چھوڑ دیا گیا اور میں یہاں چلا آیا۔ بہت تھک گیا ہوں۔''

وہ بے ہنگم طریقے سے باورچی خانے میں گیا اور تھوڑی دیر ادھر چلنے پھرنے کے بعد ایک دم بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ ماں نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی لیکن مکمل سکوت تھا۔اس نے آندری سے آہستہ سے کہا:

''یہ تو بڑی پیچیدہ آدمی ہے'' خوخول نے سر ہلاتے ہوئے ماں سے اتفاق کیا۔ ''لیکن یہ کیفیت دور ہو جائے گی۔ مجھ پر بھی ایک زمانے میں ایسی ہی حالت طاری ہوئی تھی۔ دل میں شعلہ بن کر چمکنے سے پہلے آگ سے بہت دھواں اٹھتا ہے۔تم سو جاؤ ننکو۔ابھی میں بیٹھ کر کچھ پڑھوں گا۔''

وہ ایک کونے میں چلی گئی جہاں سوتی پردوں کے پیچھے ایک بستر بچھا ہوا تھا اور بہت دیر تک آندری اس کی سرد آہوں اور دعاؤں کی آواز کو سنتا رہا۔اس نے جلدی سے کتاب کا ورق الٹا، ماتھا رگڑا، اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے مونچھوں پر تاؤ دیا اور پیروں کو جنبش سی دی۔ گھنٹہ ٹک ٹک کر رہا تھا اور ہوا درختوں کے درمیان سائیں سائیں کر رہی تھی۔

''میرے اللہ'' ماں کی نرم آواز آئی۔ ''دنیا میں اتنے لوگ ہیں اور ہر شخص پریشان۔ وہ کون لوگ ہیں جو خوش ہیں؟...''

''ایسے لوگ بھی ہیں ننکو!'' خوخول نے جواب دیا۔''اور بہت جلد ہی ان کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔ بے انتہا اضافہ!''

ایک دوسرے سے مختلف لیکن واقعات سے معمور دن گذرتے گئے اور زندگی کا دھارا تیزی سے بہتا رہا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی چیز لے کر آتا اور اب ماں کو اس سے کوئی گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ اس کے گھر پر اجنبی قسم کے لوگ زیادہ آنے لگے۔ یہ لوگ شام کو آ کر آندری سیکچھ فکر مندانہ انداز میں دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں کرتے اور اس کے بعد اپنے کوٹوں کے کالر اٹھا کر اور ٹوپیوں کو آنکھوں تک منڈھ کر تاریکی میں بڑی نرم خرامی سے غائب ہو جاتے۔ اسے احساس تھا کہ ان میں سے ہر شخص دبا دبا سا جوش محسوس کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ سب لوگ گانا چاہتے ہیں اور ہنسنا چاہتے ہیں لیکن انہیں وقت کی تنگی کا احساس ہے، وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتے تھے۔ کچھ کا انداز ہ سنجیدہ اور طنزیہ تھا اور بعض چونچال اور شباب کی بھرپور توانائی سے تابندہ تھے اور بعض بہت خاموش اور فکرمنہ سے رہتے تھے۔ ماں نے دیکھ لیا کہ وہ سب پر اعتماد اور مستقل مزاج تھے اور حالانکہ شکل وصورت میں ہر شخص ایک دوسرے سے بہت مختلف تھا لیکن ماں کی نظروں میں سارے چہرے مل کر ایک واحد چہرہ بن جاتے تھے جو ایماس جاتے وقت مسیح کے چہرے سے بہت مشابہت رکھتا تھا: ایک پتلا پرسکون، باعزم چہرہ جس کی آنکھیں گہری، شفاف اور سیاہ تھیں اور ان کی آنکھیں گہری، شفاف اور سیاہ تھیں اور ان کی نظروں میں بہ یک وقت نرمی اور سختی تھی۔

ماں نے ان کی گنتی بھی کر لی اور اپنے ذہن میں ان سب کو پاویل کے گرد جمع بھی کر دیا جن کے درمیان وہ دشمن کی نظروں سے چھپا رہے گا۔

ایک دن ایک تیز طرار سی گھنگھریالے بالوں والی لڑکی شہر سے ایک بنڈل لے کر آندری کے پاس آئی۔ جاتے وقت اس نے پلٹ کر ماں کو اپنی ہنستی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور کہا:

''خدا حافظ کامریڈ!''

''خدا حافظ'' ماں نے اپنی مسکراہٹ کو روکتے ہوئے کہا۔

لڑکی کو باہر تک پہونچانے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس گئی اور مسکراہٹ سے اپنی اس کامریڈ کو سڑک پر چھوٹے چھوٹے تیز قدم بڑھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ ایسی تر وتازہ معلوم ہو رہی تھی جیسے بہار کا پھول اور اتنی سبک جیسے تتلی۔

''کامریڈ!'' ماں نے زیرلب کہا۔ ''میری ننھی سی گڑیا! خدا کرے تمہین سچ مچ کوئی اچھا سا کامریڈ مل جائے جو ساری عمر تمہارا ساتھ دے!''

شہر سے آنے والے ان تمام لوگوں میں اسے کوئی طفلانہ سی چیز محسوس ہوتی اور وہ آپ ہی آپ بڑی شفقت سے مسکرا دیتی۔ لیکن ان کا اعتقاد دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوتی تھی اور اسے ایک خوشگوار حیرت بھی ہوتی تھی۔ اس پر اس اعتقاد کا خلوص دن بدن زیادہ واضح اور نمایاں ہوتا چلا گیا۔ عدل وانصاف کی فتح کے متعلق ان کے خواب اس کے دل کو گرمی اور تسکین پہونچاتے لیکن نہ معلوم کیوں ان کی باتوں کو سنتے ہوئے وہ کسی ناقابل فہم دکھ سے سرد آہیں بھرنے لگیں۔ ان کی مکمل سادگی اور اپنی ذات کی بہبودی کی طرف سے انکی دلکش اور ہمہ گیر لاپرواہی نے خاص طور پر اس کا دل موہ لیا۔

زندگی کے متعلق وہ جو کچھ بھی کہتے اس میں سے اب وہ بہت کچھ سمجھنے لگی تھی اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے انسانی دکھ درد کے اصل سبب کا پتہ چلا لیا ہے اور وہ ان کے زیادہ تر نظریوں کو تسلیم کرنے لگی تھی۔ لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ اس بات پر یقین نہیں رکھتی تھی کہ یہ لوگ زندگی کی تعمیر نو کر سکیں گے یا یہ کہ سارے محنت کشوں کو اپنے فروزاں کئے ہوئے شعلے کے اردگرد مجتمع کر سکیں گے۔ ہر شخص آج ہی اپنا پیٹ بھرنے کی فکر میں ہے، کون ہے جو زیادہ نہیں صرف کل ہی کے لئے اپنی روٹی سے ہاتھ اٹھا لے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو اس طویل اور مشکل راستے پر چلنے کے لئے تیار ہوں، بہت کم آنکھیں ہوں گی جو اس راستے کے خاتمے پر انسانی برادری کے راج کے طرفہ، تعجب خیز منظر کی جھلک دیکھ سکیں۔ اس وجہ سے یہ تمام بھلے لوگ اسے بچے معلوم ہوتے حالانکہ ان کے چہروں پر ڈاڑھیاں تھیں اور پختگی تھی اور اکثر ان پر تھکن کے آثار ہوتے تھے۔

''بیچارے!'' اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے اس نے سوچا۔

لیکن یہ تمام لوگ ایک سنجیدگی سمجھداری اور ایمانداری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ ہمیشہ بھلائی کرنے کی بات کرتے اور جو کچھ خود جانتے تھے اسے دوسروں تک پہونچانے میں کوئی کسر نہ رکھتے۔ اس نے محسوس کیا کہ تمام خطرات کے باوجود ایسی زندگی سے محبت کی جا سکتی ہے اور ایک سرد آہ کے ساتھ اس نے اپنی ماضی کے تنگ وتاریک تانوں بانوں پر نظر ڈالی۔ دھیرے دھیرے اس کے دل میں یہ پرسکون احساس پیدا ہونے لگا کہ اس نئی زندگی کے لئے خود اس کی ہستی بھی اہم ہے۔ پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ کسی کو اس کی ضرورت ہے اور یہ بالکل نئی اور خوشگوار سی چیز تھی جس نے اسکے سر کو بلند کر دیا...

اپنا فریضہ سمجھ کر وہ روز کارخانے پرچے لے جاتی۔ خفیہ کے لوگ اسے دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ وہ

اسکی طرف توجہ بھی نہ کرتے۔ کئی بار اس کی تلاشی لی گئی لیکن ہمیشہ پرچے تقسیم ہونے کے دوسرے دن۔ جب اسکے پاس کچھ بھی نہ ہوتا تو وہ کوشش کر کے سنتریوں کے دلوں میں شبہہ پیدا کرتی۔ وہ لوگ اسے پکڑ کر تلاشی لیتے، وہ ان سے حجت کرتی اور ایسا ظاہر کرتی کہ اسکی توہین کی گئی ہے۔ اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور انہیں شرمندہ کرنے کے بعد اپنی اپج اور خوش تدبیری پر نازان چلی جاتی تھی۔ اس کھیل میں اسے بڑا مزا آتا تھا۔

وسوف شیکوف کو کارخانے میں واپس نہیں لیا گیا۔ اس نے لکڑی کے ایک تاجر کے یہاں نوکری کر لی جہاں اسے بانس، تختے اور جلانے کی لکڑی ڈھونی پڑتی۔ تقریباً ہر روز ماں اسے سامان کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا کرتی۔ پہلے مریل سے سیاہ گھوڑوں کی ایک جوڑی نظر آتی جن کے پاؤں بوجھ گھسیٹنے سے کانپتے ہوتے اور جو اپنی بے رونق مظلوم سی آنکھوں کو جھپکاتے، تھکن سے سر ہلاتے جاتے، انکے پیچھے ایک لمبا سا بھیگا ہوا لٹھا یا تختوں کا ایک گٹھا گھسٹتا ہوتا، تختے ایک دوسرے سے لگ لگ کر شور کرتے جاتے، انکے ساتھ نکولائی لگام کو ڈھیلے ہاتھوں سے تھامے چلتا رہتا۔ کپڑے گندے اور پھٹے ہوئے، بھاری بھاری جوتے، ٹوپی سر کے پیچھے کے حصے پر رکھی ہوئی، یہ حلیہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی ٹھنٹھ کو زمین پر سے اکھاڑ لیا گیا ہو۔ وہ بھی زمین پر نظریں گاڑ کر چلتا اور اس کا سر ہلتا رہتا۔ گھوڑے اپنی طرف آتی ہوئی گاڑیوں اور لوگوں سے اندھا دھند ٹکرا جاتے۔ نکولائی پر لوگ چیختے چلاتے اور گالیاں بھڑوں کے دل کی طرح اس کا پیچھا کرتیں۔ وہ نہ تو کوئی جواب دیتا اور نہ اپنا سر اٹھاتا۔ صرف ایک تیز سی سیٹی بجاتا اور اپنے گھوڑوں سے کہتا:

''چلو، آگے بڑھو!''

جب کبھی آندری کوئی غیر ملکی اخبار یا کتابچہ پڑھنے کے لئے اپنے ساتھیوں کو دعوت دیتا تو نکولائی آ کر ایک کونے میں بیٹھ جاتا اور ایک یا دو گھنٹے خاموشی سے بیٹھا سنا کرتا۔ اخبار وغیرہ پڑھنے کے بعد نوجوان گرما گرم بحث کرنے لگتے جس میں وسوف شیکوف کبھی حصہ نہ لیتا، لیکن سبلوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی وہ ٹھہرا رہتا اور آندری سے تنہائی میں بات کرتا:

''سب سے زیادہ موردالزام کون ہے؟''

''وہ شخص موردالزام ہے جس نے سب سے پہلے کہا تھا: 'یہ میرا ہے'۔ اور وہ شخص کئی ہزار برس

ہوئے مر گیا اس لئے اب اس کے پیچھے پڑنے سے تو کوئی فایدہ ہے نہیں'' خوخول نے مذاقاً کہا، لیکن اس کی آنکھوں میں بے اطمینانی سی تھی۔

''امیروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اور وہ جوان کی پشتی پر ہیں؟''

زندگی کے اور لوگوں کے متعلق جو کچھ وہ جانتا تھا اسے بتانے کے لئے آسان الفاظ کی تلاش میں خوخول اپنے بالوں سے کھیلتا اور مونچھوں کو مروڑتا رہا۔ اس کہنے کے مطابق عام طور پر سب لوگ موردالزام تھے اور اس سے نکولائی کو تسکین نہ ہوتی۔ اپنے موٹے ہونٹوں کو دباتے ہوئے وہ سر کو جھٹکا دیتا اور بڑبڑاتا کہ ایسا نہیں ہے۔ آخر وہ افسردگی اور بے اطمینانی کے ساتھ رخصت ہو جاتا۔

ایک دن اس نے کہا:

''نہیں، کچھ لوگ تو ایسے ہوں گے جو موردالزام گردانے جا سکتے ہیں اور وہ لوگ یہاں ہی موجود ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ جس طرح زمین سے گھاس پھوس اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اسی طرح اپنی ساری زندگی میں ہل چلا دینا پڑے گا۔ ذرہ برابر رحم کئے بغیر!''

''یہی بات تو ٹائم کیپر ایسائی نے ایک دن تمہارے بارے میں کہی تھی'' ماں نے اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے کہا۔

''ایسائی؟'' وسوف شیکوف نے کچھ وقفے کے بعد پوچھا۔

''ہاں! بڑا کمینہ آدمی ہے! ہر شخص پر نگاہ رکھتا ہے اور طرح طرح کے سوالات کرتا ہے۔ اب ہماری سڑک پر بھی آنے لگا ہے اور کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا بھی ہے۔''

''کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا ہے؟'' نکولائی نے دہرایا۔

ماں بستر پر لیٹ چکی تھی اس لئے اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی لیکن خوخول نے جس انداز سے بات کاٹ دی اس سے اسے محسوس ہوا کہ یہ بات نہ کہنی چاہئے تھی۔ خوخول بولا:

''اگر اس کے پاس وقت بہت ہے تو جھانکنے دو...''

''ہرگز نہیں!'' نکولائی نے کہا۔ ''جو لوگ موردالزام ہیں ان میں سے ایک یہ شخص بھی ہے۔''

''اس کا کیا قصور؟'' خوخول نے جلدی سے پوچھا۔ ''بے وقوف ہے اس لئے؟''

وسوف شیکوف جواب بغیر چلا گیا۔

خوخول اپنی لمبی لمبی مکڑی کی طرح کی ٹانگوں سے ایک سرسراہٹ کی آواز پیدا کرتا ہوا آہستہ آہستہ تھکے ہوئے انداز میں ٹہلنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے جوتے اتار دئے تھے تاکہ پلا گیا کہ نیند میں خلل نہ پڑتے لیکن وہ سونہیں رہی تھی۔ جب نکولائی چلا گیا تو اس نے پریشانی کے انداز میں کہا:

''مجھے اس سے ڈر لگتا ہے!''

''ہونہ'' خوخول چبا چبا کر بولنے لگا۔'' وہ سنجیدگی سے اپنے جی میں کچھ ٹھانے ہوئے ہے۔آئندہ اس کے سامنے ایسائی کا ذکر مت کرنا ننکو۔ایسائی واقعی جاسوس ہے۔''

''اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں'' ماں نے جواب دیا۔''اس کے بیٹے کا دینی باپ خفیہ پولیس میں تھا۔'' '' کچھ تعجب نہیں کہ نکولائی اسے مار بیٹھے'' خوخول نے مضطربانہ انداز میں بات جاری رکھی۔'' دیکھتی ہوان صاحب اقتدار حضرات نے عام لوگوں کے دلوں میں کیسا جذبہ پیدا کر دیا ہے؟ جس دن نکولائی جیسے لوگ محسوس کر لیں گے کہ ان کے ساتھ کس طرح ظلم اور زیادتی ہوئی ہے اور ان کا پیمانہ صبر چھلک اٹھے گا تو کیا ہوگا؟ اس دن زمین اور آسمان خون کے سیلاب میں غرق ہو جائیں گے۔''

''کتنی خوفناک بات ہے آندریوشا!'' ماں نے کہا۔

''نہ مکھی نگلو، نہ قے کرو'' آندری نے ایک منٹ کے بعد کہا۔'' لیکن مالکوں کا ہر قطرہ خون ان آنسوؤں کے ساگر میں ڈوب جائے گا جو عام لوگوں نے ان کے ظلم کی وجہ سے بہائے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد وہ ہنسا اور بولا:

''بہت تسکین بخش بات نہ ہو، مگر ہے سچی بات۔''

22

اتوار کو ماں اسٹور سے واپس آئی، دروازہ کھولا اور فرط مسرت سے مبہوت سی ہو کر دھلیز میں کھڑی ہو گئی۔ اندر کے کمرے سے پاویل کی آواز سنائی دی۔

''وہ آگئیں'' خوخول چلایا۔

ماں نے پاویل کو جلدی سے مڑتے ہوئے دیکھا اور اس کے چہرے پر ایک ایسی چمک پیدا ہو گئی جو ماں کے لئے وجہ امید تھی۔

''آ گئے۔آخر گھر آ گئے!''اس غیر متوقع آمد کی خوشی سے مغلوم ہو کر اس کی زبان میں لکنت سی آ گئی اور وہ بیٹھ گئی۔

پاویل نے اپنا زرد چہرہ ماں پر جھکایا۔اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ایک لمحے کے لئے وہ کچھ نہ بول سکا اور ماں بھی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

خوخول انہیں چھوڑ کر سیٹی بجاتا ہوا باہر احاطے میں چلا گیا۔

''شکریہ ماں!''اس کا ہاتھ کانپتی ہوئی انگلیوں سے دباتے ہوئے پاویل نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میری اچھی ماں بہت بہت شکریہ!''

اس کے چہرے پر یہ کیفیت اور تاثر دیکھ کر اور اس کی آواز میں اتنی محبت اور نرمی پا کر ماں خوشی کے جذبے سے مغلوب ہو گئی اور اس نے بیٹے کے سر کو تھپتھپانا شروع کیا اور خود اپنے دل کی دھڑکن کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''ارے،لیکن کس لئے؟''اس نے پوچھا۔

''ہمارے عظیم کام میں مدد کرنے کے لئے ،شکریہ''اس نے دہرایا۔''بہت کم ایسی خوشی کسی کو نصیب ہوتی ہے کہ کوئی کہہ سکے:میں اور میری ماں بالکل ایک جان دو قالب ہیں۔''

وہ خاموش تھی اور بڑی آرزو اور اشتیاق سے اپنے بیٹے کے الفاظ کو امرت کے گھونٹوں کی طرح پی رہی تھی اور اس کو توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔کتنا اچھا،کتنا پیارا۔

''میں جانتا ہوں ماں کہ تمہارے لئے کتنا مشکل تھا یہ سب کچھ۔اس میں کتنی باتیں تمہیں پسند نہ تھیں اور میں سوچتا تھا کہ تم ہم لوگوں کو کبھی قبول نہ کر سکو گی ، ہمارے خیالات کو کبھی اپنا نہ سکو گی ،اور یہ کہ تم صرف خاموشی سے ہم لوگوں کو برداشت کرتی رہو گی جیسے تم ساری زندگی کرتی آئی ہو۔میرے لئے بہت سخت تھی یہ بات!...''

''آندریوشا نے مجھے بہت سی باتیں سمجھنے میں بڑی مدد دی''اس نے کہا۔

''اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا ہے''پاویل ہنسا۔

''یگور نے بھی۔وہ اور میں دونوں ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہیں۔آندریوشا تو مجھے پڑھانا بھی چاہتا تھا...''

''اور تمہیں شرم آنے لگی اور تم نے اپنے آپ چھپا کر پڑھنا شروع کر دیا۔''

''اچھا تو وہ سمجھ گیا!'' ماں نے کہا۔

اپنے دل میں بے پناہ محبت کے طوفان سے بے چین سی ہو کر اس نے پاویل سے کہا:

''اسے اندر بلا لو، جان بوجھ کر باہر چلا گیا تا کہ ہمارے درمیان مخل نہ ہو۔ اس کی اپنی ماں تھیں ہے...''

''آندری!'' پاویل نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولتے ہوئے آواز دی۔ ''کہا ہو؟''

''یہاں ہوں، ذرا لکڑی کاٹ رہا ہوں۔''

''یہاں آؤ۔''

وہ فوراً ہی نہ آیا اور جب آخر کار وہ باورچی خانے میں آیا تو گھریلو چیزوں کے بارے میں باتیں کرنے لگا:

''نکولائی سے کچھ لکڑیاں لانے کے لئے کہنا ہے، بہت تھوڑی رہ گئی ہیں...اپنے پاویل کو تو دیکھو ننکو۔ معلوم ہوتا ہے باغیوں کو سزا دینے کے بجائے مالکوں نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھلایا ہے۔''

ماں ہنسی، وہ اب تک خوشی سے مست تھی اور اس کا دل میٹھے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ لیکن اپنی مصلحت اندیشی اور احتیاط کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کو پھر ہمیشہ کی طرح پر سکون دیکھنے کی مضطربانہ طور پر خواہش مند تھی۔ اسوقت ہر چیز بے حد خوبصورت تھی اور وہ چاہتی تھی کہ اپنی زندگی کی اس پہلی بیش بہا مسرت کو اسی بھرپور اور توانا کیفیت میں اپنے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لے جیسی کہ وہ اس لمحے میں ہے۔ اس خوف سے کہ یہ مسرت اب ختم ہونے والی ہے اس نے جلدی جلدی کسی پرندے پکڑنے والے کی طرح اسے مقید کرنے کی کوشش کی جس کے ہاتھ غیر متوقع طور پر کوئی نایاب پرند آ گیا ہو۔

''چلو کھانا کھائیں، میرا خیال ہے ابھی تم نے کھانا نہیں کھایا ہو گا پاشا؟'' اس نے ادھر ادھر پھرتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ کل جیلر نے مجھے بتایا کہ مجھے چھوڑ دینے کا فیصلہ ہو گیا ہے تو میں نہ کچھ کھا سکا نہ پی سکا...''

''باہر آنے کے بعد پہلا شخص جس سے میں ملا وہ بوڑھا سیزوف تھا'' پاویل نے بات جاری رکھی۔

''مجھے دیکھ کر وہ سڑک پار کر کے ملنے کے لئے آیا۔

میں نے کہہ دیا کہ ذرا احتیاط سے کام لو۔ آج کل میں خطرناک سمجھا جانے لگا ہوں۔ پولیس والوں کی ہر وقت نگرانی رہتی ہے۔ اس نے کہا' کوئی بات نہیں'۔ اور جس طرح اپنے بھتیجے کے متعلق پوچھا وہ تو سننے سے تعلق رکھتا تھا' فیدور رہتا تو ٹھیک طرح سے ہے؟' اس نے دریافت کیا۔ میں نے کہا' جیل میں اچھے طریقہ سے رہا کیسے جا سکتا ہے'۔ وہ بولا لیکن اپنے کسی ساتھی کے ساتھ غداری تو نہیں کی نا'۔ جب میں نے بتایا کہ فیدور بڑا اچھا آدمی ہے، ایماندار اور ہوشیار، اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فخریہ انداز میں بولا ہم سیزوف لوگوں میں دغا باز کوئی بھی نہیں ہے'۔''

''بوڑھا خاصا عقل والا آدمی ہے'' خوخول نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میری بھی اس سے بہت سی باتیں رہیں، اچھا خاصا آدمی ہے، فیدور کو بھی جلد ہی چھوڑنے کا ارادہ ہے ان لوگوں کا؟''

میرا خیال ہے کہ سب ہی لوگ چھوٹ جائیں گے، ان لوگوں کے خلاف کوئی الزام ہی نہیں ہے سوائے ان باتوں کے جو ایسائی نے کہی ہیں لیکن ان میں بھی کیا دم ہو سکتا ہے؟''

اپنے بیٹے پر مسلسل نظریں جمائے ہوئے ماں ادھر ادھر پھرتی رہی۔ آندری پیٹھ پر ہاتھ باندھے کھڑکی کے پاس کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ پاویل فرش پر ٹہل رہا تھا۔ اس نے ڈاڑھی چھوڑ رکھی تھی اور اس کے گالوں پر نرم سیاہ بالوں کے چھوٹے چھوٹے حلقوں نے مل کر اس کی سانولی رنگت میں کچھ نرمی سی پیدا کر دی تھی۔

''بیٹھ جاؤ'' ماں نے کھانا لاتے ہوئے کہا۔

کھانا کھاتے وقت آندری نے ربین کے متعلق بتایا۔ جب وہ اپنی کہانی ختم کر چکا تو پاویل نے متاسفانہ لہجے میں کہا:

''اگر میں گھر پر ہوتا تو اسے کبھی نہ جانے دیتا۔ اپنے ساتھ لے جانے کے لئے اس کے پاس تھا ہی کیا؟ الجھے ہوئے دماغ اور اپنی تنفرت کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔''

''جب کوئی شخص چالیس کی عمر کو پہونچ گیا ہو اور اس کی عمر کا زیادہ حصہ اپنی روح کے اندر درندوں سے لڑتے گذرا ہو تو اس کی سیرت کی نئے سرے سے تشکیل کرنا آسان کام نہیں...'' خوخول نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس کے بعد اس قسم کی ایک بحث پھر چھڑ گئی جس کے زیادہ الفاظ ماں کی سمجھ ہی میں نہ آتے تھے۔ کھانا ختم ہو چکا۔ لیکن وہ لوگ ایک دوسرے پر موٹے موٹے الفاظ کی بارش کرتے رہے۔ کبھی کبھی وہ آسان انداز میں بولتے:

''ایک بھی قدم پیچھے ہٹائے بغیر ہمیں آگے بڑھتے رہنا ہے'' پاویل نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''اور لاکھوں کروڑوں انسانوں سے ٹکرا جانا ہے جو ہمیں اپنا دشمن سمجھنے لگیں...''

ان کی بحث کو سن کر ماں کی سمجھ میں یہ آیا کہ پاویل کی نظر میں کسانوں کی کوئی اہمیت نہ تھی اور خوخول کسانوں کی حمایت کر رہا تھا۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسانوں کو بھی یہ دکھانا ضروری ہے کہ صحیح راستہ کیا ہے۔ آندری کی بات اس کی سمجھ میں آئی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ صداقت سے زیادہ نزدیک ہے۔ لیکن جب بھی وہ پاویل سے کوئی بات کہتا تو ماں سانس روک کر کچھ چوکنا سی ہو جاتی اور یہ سمجھنے کے لئے اپنے بیٹے کے جواب کا انتظار کرتی کہ کہیں خوخول نے اسے ناراض تو نہیں کر دیا۔ لیکن ناراض ہوئے بغیر وہ دونوں ایک دوسرے پر الفاظ کی بارش کرتے رہے۔

کبھی کبھی ماں اپنے بیٹے سے کہتی:

''کیا سچ مچ ایسا ہی ہے پاویل؟''

اور وہ مسکرا کر جواب دیتا:

''ہاں۔ ایسا ہی ہے۔''

''اچھا میرے بھائی'' خوخول نے دوستانہ طنز کے ساتھ کہا۔

''تم نے اچھا خاصا کھانا کھایا لیکن شاید ٹھیک سے چبایا نہیں۔ تمہارے حلق میں کوئی چیز اٹکی ہوئی ہے۔ ایک چسکی لگاؤ تو ٹھیک رہے گا۔''

''تم بھی کیا دل لگی باز آدمی ہو!'' پاویل نے کہا۔

''فاتحہ کے کھانے جتنا زندہ دل اور دل لگی باز۔''

ماں نے آہستہ سے ہنس کر اپنا سر ہلایا...

بہار آئی، برف پگھلی اور اس کے نیچے سے کیچڑ اور مٹی نظر آنے لگی۔ کیچڑ روز بروز زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ بستی اور زیادہ شکستہ حال اور گندی نظر آنے لگی جیسے چیتھڑوں میں ملبوس ہو۔ دن کے وقت چھتوں سے پانی ٹپکتا اور گھروں کے مٹیالی دیواروں سے سیلن پسینے کی طرح رستی تھی لیکن رات کے وقت برف کی قلمیں اب بھی سفید چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ سورج اب آسمان پر زیادہ دیر تک ٹھہرنے لگا تھا اور دلوں کی طرف بہہ کر جاتے ہوئے چشموں کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔

یوم مئی منانے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

کارخانے اور بستی میں پرچے تقسیم کئے گئے جن میں اس دن کی اہمیت واضح کی گئی تھی۔ کم عمر لوگوں نے بھی جن پر پروپگنڈے کا اثر نہ ہوا تھا، پرچے پڑھ کر کہنا شروع کیا:

''کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا!''

''بہت ضروری ہے'' وسوف شیکوف نے کچھ جھلائے انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''آنکھ مچولی بہت کھیل چکے۔''

فیدور مازن جوش میں تھا، وہ دبلا ہو گیا تھا اور اس کی بول چال، حرکات وسکنات میں ایسی اعصابی لرزش پیدا ہو گئی تھی کہ وہ ایک پنجرے میں مقید چنڈول کی مانند ہوتا تھا جو اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ یاکوف کو شہر میں ملازمت مل گئی تھی۔ سموئلوف (جس کے بال جیل کے زمانے میں اور بھی زیادہ سرخ ہو گئے تھے) اور واسلی گوسیف، بوکین، دراگونوف اور چند دوسرے لوگوں کا اصرار تھا کہ اس دن مسلح مظاہرہ کرنا چاہئے، لیکن پاویل، خوخول، سوموف اور چند اور لوگوں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔

یگور، ہمیشہ تھکا ہوا، ہانپتا ہوا اور پسینے شرابور، ان لوگوں کی بحث کو مذاق میں ٹال دیتا تھا۔ ''ہماری موجودہ سماجی نظام کو بدلنے کی کوششیں یقیناً بہت عظیم الشان اور بلند میں ساتھیو، لیکن اس کوشش کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ میں اپنے لئے ایک لیا جوڑ جوتا خریدوں'' اس نے اپنے گیلے پھٹے ہوئے جوتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''میرے ربر کے جوتے بھی اس منزل پر پہونچ گئے ہیں جہاں ان کی تعمیر نو ممکن نہیں رہی ہے اس لئے میرے پیر ہر روز بھیگ جاتے ہیں۔ جب تک ہم پرانے نظام کو کھلم کھلا اور غیر مصالحتی انداز سے مسترد نہ کر دیں اس وقت تک میں زمین کی گود میں سونے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں اور اس لئے میں کامریڈ سموئلوف کی اس تجویز کی مخالفت کرتا ہوں کہ مسلح مظاہرہ کیا جائے اور اس کی

جگہ میں خود اپنی تجویز پیش کرتا ہوں کہ مجھے ایک نئے جوڑ جوتے سے لیس کر دیا جائے کیونکہ مجھے یقین کامل ہے کہ یہ اقوام اشتراکیت کی فتح کو قریب سے قریب تر لانے میں ایک بڑھیا قسم کی لڑائی سے بھی زیادہ مفید و معاون ثابت ہوگا۔''

اسی موضع انداز میں اس نے مزدوروں کو بتایا کہ دوسرے ملکوں میں مزدور ابھی زندگی کے بوجھ کو ہلکا کرنے کیلئے کس طرح جدوجہد کر رہے ہیں۔ ماں اس کی تقریروں کو بڑی دلچسپی سے سنا کرتی تھی اور ان تقریروں سے وہ ایک عجیب سا تاثر حاصل کرتی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے محنت کش عوام کے بدترین دشمن، جوان کو زیادہ سے زیادہ دھوکہ دیتے اور ان پر سخت سے سخت مظالم کرتے ہیں، فربہ اندام، پستہ قد توندل، لال لال چہروں کے لوگ ہیں جو انتہائی کمینے، لالچی، دغا باز اور ظالم ہیں۔ جب ان کے ملک کے زار نے ان پر زیادہ سختی کی تو انہوں نے عام لوگوں کو اس کے مقابلے میں کھڑا کر دیا اور جب عوام نے حکومت کا تختہ الٹ دیا تو ان چھوٹے، کم مایہ لوگوں نے بڑی مکاری سے اقتدار پر خود قبضہ کر لیا اور عوام کو نکال باہر کیا اور ان کی پہلی کال کوٹھڑیوں میں پہنچا دیا اور اگر لوگوں نے مقابلہ کیا تو ہزاروں لاکھوں کو قتل کر دیا۔

ایک دن ہمت کر کے ماں ان ے یگور سے بیان کر دیا کہ اس کی تقریریں سن کر اس نے اپنے ذہن میں کیسی تصویر بنائی ہے۔

''ایسا ہی ہے نا یگور ایوانووچ؟'' اس نے کچھ جھینپتے ہوئے کہا۔

اس نے ہنسنا شروع کیا اور ہنستا ہی گیا۔ آنکھیں گھما گھما کر سینہ ملتے ہوئے اس نے سانس لینے کی کوشش کی۔

''بالکل صحیح ہے ماں! تاریخی حقیقت کا کتنا اچھا نقشہ تخیل کی ملاوٹ اور کچھ رنگ آمیزی بھی ہے لیکن واقعات سب اپنی اپنی جگہ پر ہیں! یہی موٹے موٹے پستہ قد سے انسان ہی تو ہیں جو سب سے بڑے گنہگار ہیں۔ سب سے زیادہ زہریلے کیڑے ہیں جو لوگوں کا خون چوس رہے ہیں۔ فرانسیسیوں نے انہیں ٹھیک ہی نام دیا تھا 'بورژوا'۔ یہ نام یاد رکھنا ماں۔ 'بور۔ژوا'۔ کیونکہ سچ مچ یہ لوگ بڑے ناشائستہ اور اجڈ ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی لاعلمی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ان پر دھونس جمائیں گے اور ان کا خون بھی چوسیں گے...''

''تمہارا مطلب ہے وہ لوگ جو امیر ہیں؟'' ماں نے دریافت کیا۔

''بالکل! ان کا امیر ہونا ان کی بدقسمتی ہے۔ اگر بچے کی غذا میں تانبہ ملا دیا جائے تو اس کی ہڈیوں کی نشو ونما رک جائے گی اور وہ بونا ہو کر رہ جائے گا، لیکن اگر کسی کو سونے کا زہر کھلایا جائے تو اس کی روح کو نشو ونما رک جائے گی اور وہ اتنی ہی حقیر اور بے رنگ اور بے جان سی ہو جائے گی جیسی وہ ربر کی گیند جو بچے پانچ کوپک میں خریدتے ہیں۔''

ایک دن جب یگور کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں تو پاویل نے کہا:

''بات یہ ہے آندری کہ ایسے لوگ جو ہر وقت ہنستے اور مذاق کرتے رہتے ہیں ان کے دل عموماً بڑے دکھی ہوتے ہیں۔''

خوخول جواب دینے سے قبل کچھ رکا، اور اس نے آنکھوں کو کچھ میچ لیا۔

''اگر تمہاری بات صحیح ہے تو پھر سارے روس کو ہنس ہنس کر دیوانہ ہو جانا چاہئے...''

نتاشا پھر نمودار ہوئی، کسی اور شہر میں وہ بھی جیل میں تھی۔ یہ تجربہ اس میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کر سکا تھا۔ ماں نے محسوس کیا کہ اس کی موجودگی میں خوخول بڑا بشاش ہو گیا، وہ مذاق کر رہا تھا اور ہر شخص پر فقرے کس رہا تھا جس کی وجہ سے وہ دل کھول کر ہنس رہی تھی۔ لیکن جب وہ چلی گئی تو تھکے تھکے انداز میں پاؤں اٹھا کر کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس نے کچھ غمگین سی دھنیں سیٹی میں بجانی شروع کر دیں۔

ساشا کبھی کبھی ایک لمحے کے لئے آ جاتی، اس کی تیوری پر ہمیشہ بل پڑے ہوتے تھے اور وہ جلدی میں ہوتی تھی۔ نہ جانے کس وجہ سے اس میں زیادہ درشتی اور بے ربطی سی آ گئی تھی۔

ایک بار جب پاویل اسے ڈیوڑھی تک پہونچانے گیا تو کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا اور ماں نے ان کی جلدی جلدی کی ہوئی گفتگو سن لی:

''جھنڈا لیکر تم ہی چلنے والے ہو'' لڑکی نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''بالکل طے ہو چکا ہے؟''

''ہاں، یہ میرا حق ہے۔''

''تو پھر واپس جیل کی رہی؟''

پاویل نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ...''اس نے بات شروع کی لیکن پھر خود ہی چپ ہوگئی۔

''کیا؟''

''کسی اور کو جھنڈا نہیں دے سکتے؟''

''نہیں!''اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''پھر سوچ لو، تمہارا اتنا اثر ہے، ہر شخص تمہیں پسند کرتا ہے!...تم اور آندری سب سے زیادہ ہردلعزیز ہو۔ سوچو تم لوگ یہاں کتنا کام کر سکتے ہو! لیکن صرف جھنڈا لے چلنے کی وجہ سے جلاوطن کر دئے جاؤ گے، بہت دور۔ اور بہت دنوں کے لئے!''

لڑکی کی آواز میں خوف اور محبت کے جانے پہچانے جذبات کو ماں نے محسوس کرلیا۔ ساشا کے الفاظ اس کے دل پر برفیلے پانی کے قطروں کی طرح ٹپک رہے تھے۔

''نہیں، میں نے فیصلہ کرلیا ہے'' پاویل نے کہا۔ ''کوئی چیز اس فیصلے کو تبدیل نہیں کرا سکتی۔''

''اگر میں کہوں تب بھی نہیں؟''

دفعتاً پاویل کی آواز میں تیزی اور سختی آ گئی:

''اس طرح بات کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے، کوئی حق نہیں!''

''میں بھی تو انسان ہوں'' لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

''اور بہت ہی عمدہ انسان ہو'' اس نے بھی آہستہ سے جواب دیا لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ ''وہ جو مجھے بہت عزیز ہے اور اسی لئے۔ اسی وجہ سے۔ تمہیں ایسی بات نہ کہنی چاہئے...''

''خدا حافظ!'' لڑکی نے کہا۔

اس کے جوتوں کی ایڑیوں کی آواز سے ماں نے محسوس کیا کہ وہ بہت تیزی سے چلی گئی۔ پاویل اس کے پیچھے احاطے میں گیا۔

ماں کا دل خوف سے ڈوبنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ دونوں کس چیز کے متعلق بات کر رہے تھے۔ اس نے اتنا تو محسوس کرلیا کہ کوئی بری مصیبت اس پر آنے والی ہے۔

''کرنا کیا چاہتا ہے؟''

پاویل واپس آیا تو اس کے ساتھ آندری بھی تھا۔

''وہی، ایسائی، ایسائی! آخر اس کا کیا علاج کیا جائے؟'' خوخول نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''بہتر ہے کہ اس کو تنبیہ کر دی جائے کہ ان معاملات سے ہاتھ اٹھا لے'' پاویل نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''پاویل، تم کیا کرنے کی سوچ رہے ہو؟'' ماں نے گردن کو جھکاتے ہوئے دریافت کیا۔

''کب؟ ابھی؟''

''یکم۔ یکم مئی کو۔''

''اوہ!'' پاویل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''مجھے جلوس کے آگے اپنا جھنڈا لے کر جانا ہے اور میرا خیال ہے کہ صرف اسی وجہ سے مجھے پھر جیل میں ڈال دیا جائے گا۔''

ماں کی آنکھوں میں چبھن اور جلن سی محسوس ہونے لگی اور اس کا تالو خشک ہو گیا۔ پاویل نے ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپانا شروع کیا۔

''کرنا ہی ہوگا ماں۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کرو!''

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا'' اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اٹھاتے ہوئے کہا لیکن جب اس کی پر عزم نگاہوں سے اس کی نگاہیں ملیں تو وہ کانپ سی اٹھی۔

اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور ماں کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''تمہیں رنجیدہ ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہئے'' اس نے ملامت کے انداز میں کہا۔ ''نہ جانے ایسی مائیں کب آئیں گی جو اپنے بیٹوں کو مسکراتے ہوئے مرنے کے لئے بھیج دیں؟''

''اوہو!'' خوخول زیر لب بڑبڑایا۔ ''دماغ بالکل عرش معلیٰ پر پہونچ گیا ہے...''

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا'' ماں نے دھرایا۔ ''میں تمہارے راستہ میں نہ آؤں گی، لیکن اگر اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ تو میں بہرحال ماں ہوں...''

وہ اس دور ہٹ گیا اور اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا اس سے ماں کو بے حد قلبی صدمہ ہوا:

''ایک ایسی محبت ہوتی ہے جو انسان کو اپنی پسند سے زندگی گذارنے نہیں دیتی...''

''ایسا نہ کہو پاشا'' اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ وہ ڈر گئی کہ کہیں وہ اور کوئی ایسی بات نہ کہہ

دے جس سے اسے اور زیادہ تکلیف پہونچے۔ ''میں سمجھ گئی۔تم اور کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اپنے ساتھیوں کی خاطر...''

''نہیں!'' وہ بولا۔ ''خود اپنی خاطر!''

آندری دروازے میں نمودار ہوا جو اس کے قد کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ اسی وجہ سے اسے عجیب طرح سے اپنے گھٹنے جھکانے پڑتے تھے۔ ایک کاندھا کنڈے کے اس پار ہوتا اور اس کا سر اور دوسرا کاندھا آگے کی طرف نکلا رہتا۔

''حضور والا یہ بات ختم ہی کر دیں تو مناسب ہے'' وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولا اور اپنی بڑی سی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی چٹان کی درز میں گرگٹ بیٹھا ہوا ہے

ماں بس رونے ہی والی تھی۔

''ارے میں تو... بالکل بھول ہی گئی...'' وہ بڑبڑائی اور ڈیوڑھی میں چلی گئی تاکہ اسکا بیٹا اسے روتا ہوا نہ دیکھ سکے۔ باہر آنے کے بعد وہ ایک کونے میں دبک گئی اور سسک سسک کر رونے لگی اور ایسی نڈھال ہوگئی جیسے آنسوؤں کے ساتھ اس کے دل کا سارا لہو بہہ گیا ہو

ادھ کھلے دروازے سے اس نے دونوں کو دھیمے لہجے میں بحث کرتے سنا۔

''کیا مطلب کیا ہے؟ اسے تکلیف پہونچاتے ہوئے تم اپنے آپ کو بڑا ہیرو سمجھتے ہو؟ خوخول نے پوچھا۔

''تمہیں یہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے! پاویل چلایا۔

''تم احمقوں کی سی حرکتیں کرو اور میں دوست ہو کر خاموش بیٹھا رہوں تمہیں یہ سب کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ کیا ہو رہا ہے؟''

''ہمیں مضبوطی سے کام لینا ہوگا۔ 'ہاں' یا 'نہیں' کہنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس ہونی چاہئے۔''

''اس کے ساتھ بھی؟''

''ہر شخص کے ساتھ۔ میں ایسی محبت نہیں چاہتا جو چاؤں کی بیڑی بن جائے اور آگے بڑھنے سے روک دے...''

''بڑے تیس مار خاں بنے ہیں۔ جاؤ ناک صاف کرو، ایسی باتیں ساشا سے کہنا بس وہی...''

''اس سے بھی کہہ چکا ہوں۔''

''کہہ دیا؟ جھوٹ بول رہے ہو۔اس سے تم نے نرمی سے کہا وہ گا،محبت سے کہا ہوگا،محبت سے کہا ہوگا،بغیر سنے ہوئے بھی میں بتا سکتا ہوں،لیکن ماں سے کہتے ہوئے بڑے ہیرو بن گئے! سچ پوچھو تو تمہاری ساری اکڑ دمڑی برابر نہیں!''

پلاگیا نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔اس خوف سے کہ کہیں خوخول کوئی سخت بات نہ کہہ دے اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔

''ار۔ر۔ر! کتنی ٹھنڈک ہے!'' اس نے زور سے کہا۔اس کی آواز خوف اور دکھ کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہار کا موسم آیا ہی نہیں...''

بغیر کسی مقصد کے وہ چیزوں کو ادھر سے ادھر رکھتی اٹھاتی رہی تا کہ دوسرے کمرے کی آواز میں دب جائیں۔

''ہر چیز بدل گئی ہے'' اس نے اور زور سے کہنا شروع کیا۔''لوگ زیادہ گرم مزاج اور موسم زیادہ سرد ہو گیا ہے'ایسے موسم میں تو خاصی گرمی ہو جایا کرتی تھی۔آسمان صاف رہتا تھا اور دھوپ نکل آتی تھی...''

آوازیں رک گئیں۔باورچی خانے کے درمیان وہ کھڑی سنتی رہی۔

''سنا تم نے؟'' خوخول نے آہستہ سے کہا۔''اب بھی نہ سمجھ تو بس تمہیں خدا سمجھے! تم سے زیادہ تو اس میں سمجھ ہے!...''

چائے پیو گے؟'' ماں نے کانپتی ہوئی آواز میں دریافت کیا اور آواز کی کپکپاہٹ کی تاویل کرنے کے لئے بولی۔''ارے میں تو سردی بالکل اکڑی جا رہی ہوں!''

پاویل آہستہ آہستہ اندر اس کے پاس گیا،سر جھکا ہوا،ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ جیسے اپنے قصور کا اعتراف کر رہا ہو۔

''مجھے معاف کر دو ماں،میں ابھی کم عمر۔اور بے وقوف ہوں!..'' اس نے آہستہ سے کہا۔

اس نے بیٹے کے سر کو اپنے سینے سے لگاتے اور بے بسی سے روتے ہوئے کہا:

''بس مجھ سے کچھ نہ کہو! خدا جانتا ہے کہ تم اپنی زندگی کے ساتھ جو چاہے کر سکتے ہو لیکن۔میرے دل کو بخش دو! ماں پیار کیسے نہ کرے؟ اسے تو محبت کرتی ہوں،تم سب لوگ مجھے عزیز ہو اور تم سب لوگ

پیار کرے گا؟ تم سب چلے جاؤ گے۔ تم سب کے آگے۔ دوسرے تمہارے پیچھے۔ ہر چیز چھوڑ کر۔ آہ پاشا!''

بڑے بڑے شعلہ ساماں خیالات اس کے دل میں طوفان سا اٹھا رہے تھے۔ اس کا دل درد انگیز مسرت سے پھٹا جا رہا تھا لیکن ماں کو اس کے اظہار کے لئے الفاظ نہ مل سکے اور اپنی اس بے زبان اذیت میں اس نے اپنے بیٹے کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھا جن میں تیز اور شدید درد کی چمک تھی...

''میں جانتا ہوں ماں، مجھے معاف کر دو۔ اب میں سمجھ گیا، اور اب کبھی نہ بھولوں گا!'' وہ مسکرا کر مڑ گیا۔ اس وقت وہ خوش تھا مگر شرمندہ بھی۔

وہ اسے چھوڑ کر دوسرے کمرے کے دروازے کے پاس چلی گئی۔ ''آندریوشا!'' اس کے لہجے میں بڑی نرم سی التجا تھی۔ ''اس پر غصہ مت ہوا کرو، تم تو اس سے بڑے ہو...''

''افوہ۔ ہ۔ ہ! ضرور خفا ہوں گا! اور خفا ہی نہیں ہوں گا بلکہ اس کی ساری حماقتیں بھی مار مار کر نکال دوں گا!'' وہ اس کی طرف اپنی پیٹھ کر کے کھڑا ہوا تھا۔

وہ اس کے پاس گئی اور اپنا ہاتھ بڑھایا۔

''تم بہت اچھے ہو...''

خوخول مڑا اور اس کے پاس سے ہوتا ہوا باورچی خانے میں چلا گیا۔ اس کے ہاتھ پر بندھے ہوئے تھے اور گردن بیل کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ ماں نے اس کو انتہائی مضحکہ اڑانے کے لہجے میں کہتے سنا:

''چلے جاؤ پاویل ورنہ تمہارے سر کی خیر نہیں! میں صرف مذاق کر رہا ہوں ننکو!۔ ڈرومت! اچھا ادھر لاؤ، سماوار میں چڑھاتا ہوں۔ واہ کیا اچھا کوئلہ ہے۔ سارا بھیگا ہوا!''

وہ خاموش ہو گیا۔ جب ماں باورچی خانے میں داخل ہوئی تو وہ زمین پر بیٹھا سماوار کو پھونک رہا تھا۔

''ڈرومت، میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا!'' اس نے اوپر نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ ''کتنا تو نرم ہوں میں، بالکل ابلے ہوئے شلجم کی طرح! اور میں۔ اے جناب ہیرو صاحب ہماری بات مت سنو۔ اور میں سچ مچ اسے بہت چاہتا ہوں لیکن یہ حضرت جو خلعت ملی ہے تو خیال ہے کہ بہت خوبصورت ہے اس لئے تو ند نکالے ہر طرف پھر رہا ہے اور جو ملتا ہے اس کو پکڑ کے کہتا ہے، دیکھو کتنی اچھی خلعت ہے میری!، خلعت تو

اچھی ہے لیکن ہر شخص کو کیوں پریشان کرو؟ لوگوں سے پہلو بچانا پہلے ہی کون سا آسان کام ہے!''

''کب تک کیہ سلسلہ جاری رکھو گے؟'' پاویل نے کچھ ہنستے ہوئے کہا۔ ''ایک مرتبہ مجھے مزہ چکھا دیا۔ بس اب حساب بیباق سمجھو!''

خوخول اپنے پیر سماوار کے دونوں طرف پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے اوپر دیکھا۔ ماں دروازے میں کھڑی بڑی شفقت سے آندری کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے جسم کو موڑتے ہوئے ہاتھوں کا سہارا لیا اور ماں اور بیٹے کی طرف دیکھا۔

''بڑے اچھے ہو تو دونوں...'' آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کی آنکھیں کچھ سرخ سی ہو گئی تھیں۔

پاویل نے جھک کر اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔

''کھینچو مت!'' خوخول بولا۔ ''گرا دو گے مجھے...''

''تمہیں ڈر کس بات کا ہے؟'' ماں نے پوچھا۔ ''جاؤ ایک دوسرے کو پیار کرو اور ایک دوسرے سے خوب خوب بغلگیر ہو...''

''کیوں کیا خیال ہے؟'' پاویل نے پوچھا۔

''آؤ'' خوخول نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

دونوں بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے۔ دو قالب اور ایک روح جو دوستی کے جذبے سے منور تھی۔ ماں کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے لیکن اس بار آنسو خوشی کے تھے۔

''عورتوں کو رونا بہت آتا ہے'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے شرمندگی کے ساتھ کہا۔ ''خوش ہوں تب بھی روتی ہیں اور دکھی ہوں تب بھی!...''

خوخول نے پاویل کو آہستہ سے پیچھے ہٹایا۔ ''بس بہت ہو گیا'' اس نے بھی اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ''خوب مزے سے کلیلیں کر لیں، اب کام میں جتنے کا وقت آ گیا۔ عجیب ذلیل کوئلے ہیں یہ! اتنا پھونکا میں نے کہ آنکھوں سے پانی بہنے لگا!''

''ان آنسوؤں سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں'' پاویل نے کھڑکی کے پاس بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

اس کی ماں بھی اسکے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل ایک نئی جرأت سے لبریز تھا جس نے دکھی ہونے کے باوجود اس تسکین اور سکون بخشا۔

''میں چائے کے برتن لے چلتا ہوں۔ تم مت اٹھو ننکو!'' خوخول نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑا آرام کرلو تو بہتر ہے ابھی ابھی تو تمہارے دل کو اس بری طرح مسلا گیا ہے...''

اس کی بھرپور آواز ان لوگوں تک پھر آئی:

''زندگی کا لطف تو آ گیا۔ پرخلوص انسان زندگی کا لطف!..''

''ہاں'' پاویل نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اور اس سے ہر چیز تبدیل سی ہو گئی'' ماں نے کہا۔ ''ہماری پریشانیاں مختلف ہو گئیں اور ہماری مسرتیں مختلف...''

''ایسا ہی ہونا چاہئے!'' خوخول نے کہا۔ ''کیونکہ ایک نیا دل جنم لے رہا ہے میری ننکو۔ زندگی کو ایک نیا دل مل رہا ہے۔ انسان قدم بڑھاتا آگے جا رہا ہے اور عقل کی روشنی سے ہر چیز کو منور کرتا لوگوں کو آواز دیتا جا رہا ہے۔ دنیا کے لوگو متحد ہو جاؤ۔ ایک خاندان میں متحد ہو جاؤ!، اور اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے سارے صحت مند دل مل کر ایک واحد عظیم الشان دل صورت اختیار کر رہے ہیں جس میں نقرئی گھنٹیوں کی سی شوکت اور توانائی ہے۔''

ماں نے مضبوطی سے ہونٹ بھینچ لئے تا کہ کانپ نہ سکیں اور آنکھیں زور سے بند کر لیں تا کہ آنسو نہ نکل سکیں۔

پاویل نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن ماں نے اسے اپنے نزدیک کھینچ لیا اور دھیرے سے بولی:

''اسے ٹوکرمت۔''

خوخول آ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ ''لوگ ابھی بہت سی مصیبتیں اٹھائیں گے۔ ابھی بہت سا خون بہے گا۔ لیکن جو کچھ میرے سینے میں ہے اور جو کچھ میرے دماغ میں ہے، میری ساری تکلیف اور مصیبت اور میرا سارا خون جگر اس کے سامنے ہیچ ہے... میں ستارے کی طرح مالدار ہوں جس کے پاس لاتعداد شعاعین ہیں۔ میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں، ہر چیز سہہ سکتا ہوں اس لئے کہ میرا دل بے

پایاں مسرت سے معمور ہے جیسے کوئی چیز اور کوئی شخص کبھی ختم نہیں کر سکتا اور اسی مسرت میں میری قوت کا راز مضمر ہے!''

رات دیر گئے تک وہ لوگ چائے کی میز پر بیٹھے زندگی اور انسان اور مستقبل کے متعلق باتیں کرتے رہے جو انکے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھیں۔

جب کبھی کوئی تصور ماں پر واضح ہو جاتا تو ایک آہ بھر کر اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتی اور کسی کھردری تکلیف دہ سی یاد پر اس تصور کو سہارا دیتی۔

ان کی گفتگو کے گرم و نرم دھارے میں اس کا خوف بہہ گیا۔ اور ایک بار پھر اس کو ویسا ہی محسوس ہوا جیسا بہت عرصہ پہلے اس دن ہوا تھا جب اس کے باپ نے سختی کے ساتھ کہا تھا:

''منہ لٹکانے سے کوئی فایدہ نہیں! اگر کوئی ایسا احمق ہے جو تمہیں اپنی بیوی بنانے کے لئے تیار ہو تو جاؤ اور موقع سے فایدہ اٹھاؤ! ساری چھوکریوں کی شادی ہو جاتی ہے اور سب ہی کے بچے ہیں جن سے سوائے پریشانیوں کے اور کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ تم بھی دوسروں سے کچھ مختلف نہیں ہو۔''

ان الفاظ کے بعد اسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے سامنے صرف ایک راستہ ہے جو کسی تاریک، بنجر افتادہ زمین میں بلا وجہ مڑتا ہوا خم کھاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اس راستہ پر لازمی طور پر چلنے کے احساس نے اس کے دل میں ایک قسم کے اندھے سکون کو جگہ دے دی تھی۔ اور اس وقت بھی بالکل ایسا ہی ہوا لیکن ایک نئی مصیبت کو آتا محسوس کر کے وہ اپنے دل ہی دل میں کسی نا معلوم شخص سے گویا اسے دق کرنے کے لئے کہتی رہی:

''لو یہ بھی لیتے جاؤ!''

اس کی وجہ سے اس کے دکھی دل کو کچھ تسکین ہوئی جو اس کے سینے میں ایک تنے ہوئے تار کی طرح جھنجھنا رہا تھا۔ لیکن دل کی گہرائی میں اسے ایک خفیف لیکن یقینی امید ضرور تھی کہ اس سے ہر چیز نہیں چھینی جائے گی۔ ہر چیز نہیں جائے گی، یقیناً کچھ تو باقی رہ جائے گا!

24

ایک دن صبح سویرے ہی جب پاویل اور آندری کام پر جا چکے تھے کارسونووا نے کھڑکی پر دستک دی

اور چلا کر کہا:

''ایسائی کو قتل کر دیا گیا! چلو دیکھیں...''

ماں چونک پڑی۔اس کے ذہن میں قاتل کا نام بجلی کی طرح کوند گیا۔

''کس نے کیا؟'' اپنے کاندھوں پر شال ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''قاتل ایسائی کے پاس تھوڑا ہی بیٹھا ہوا ہے،ختم کر کے رفو چکر ہو گیا!'' سڑک پر چلتے چلتے کارسونو وا نے کہا: ''ایک بار پھر تلاشیاں شروع ہوں گی اور لوگ ضرور معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ قتل کس نے کیا اچھا ہوا کہ تمہارے گھر کے لوگ رات گھر ہی پر تھے، میں اس کی شاہد ہوں، آدھی رات کے بعد میں واپس آئی تھی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا۔تم لوگ سب میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے...''

''تمہارا مطلب کیا ہے ماریا؟ ان لوگوں پر خیال کیسے جا سکتا ہے؟'' اس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

''اچھا تو قتل کسی نے کیا ہوگا؟ تمہارے ہی گھر والوں کا ساتھی رہا ہوگا'' کارسونو وا نے پورے اعتماد سے کہا۔''ہر شخص کو معلوم ہے وہ ان لوگوں کی مخبری کیا کرتا تھا...''

ماں رک گئی۔اس کا دم گھٹ رہا تھا اور اپنے ہاتھ سے سینے کو دبائے ہوئے تھی۔

''کیا بات کیا ہے؟ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔اس کی تقدیر میں جو تھا وہی ہوا! جلدی چلو ورنہ لاش اٹھا لے جائیں گے!''

وسوف شیکوف کے متعلق شبہات ماں کے پیروں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔

''افوہ، یہ تو حد کر دی اس نے!'' اس نے سوچا۔

کارخانے کے قریب ہی ایک کھلے میدان میں جہاں ایک مکان جل کر ڈھیر ہو گیا تھا، لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔لوگ بھڑوں کی طرح بھنبھناتے جلی ہوئی لکڑیوں پر چڑھتے راکھ اڑاتے چلے جا رہے تھے۔عورتیں بہت سی تھیں اور ان سے زیادہ بچے، دوکاندار، سرائے کے ملازم اور پولیس والے تھے۔اور پولیس والا پیٹلین بھی تھا، ایک لانبا بوڑھا شخص جسکی سفید ڈاڑھی بڑی ملائم سی تھی اور جسکے سینے پر تمغے ہی تمغے لگے تھے۔

ایسائی زمین پر آدھا بیٹھا آدھا لیٹا سا تھا، اس کی پیٹھ ایک جلے ہوئے لٹھ سے ٹکی ہوئی تھی، ننگا سر سیدھے کاندھے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں مٹی کے

ڈھیر میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ماں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ایک بے رونق آنکھ ٹوپی کی طرف اداسی سے دیکھ رہی تھی جو اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان پڑی ہوئی تھی۔ منہ آدھا کھلا تھا جیسے کسی چیز پر حیرت کر رہا ہو اور سرخ ڈاڑھی ٹیڑھی ترچھی ہو رہی تھی۔ اس کا دبلا پتلا جسم اور نوکیلا سر اور کو کہا ہوا چھائیوں والا چہرہ۔ سب پہلے سے بھی زیادہ چھوٹے معلوم ہو رہے تھے، موت نے انہیں چرمرا دیا تھا۔ ماں نے اپنے سینے پر صلیب کا نشاں بنایا اور ایک آہ بھری۔ زندگی میں اسے اس سے نفرت رہی لیکن اس وقت اس پر کچھ رحم سا آ گیا...

''خون تو ہے ہی نہیں'' کسی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ گھونسے سے مارا ہوگا۔''

''غدار کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا...'' کسی نے انتقامی انداز میں کہا۔ پولیس انداز میں کہا۔

پولیس والے نے سر کو جھٹکا دیا اور عورتوں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا۔

''کس نے کہی یہ بات؟'' اس نے دھمکی کے انداز میں دریافت کیا۔

اس کی موجودگی میں لوگ منتشر ہو گئے۔ کچھ لوگ بھاگ گئے اور ایک شخص ہنسا جیسے چڑھا رہا ہو۔

ماں گھر چلی گئی۔

''کوئی بھی تو افسوس نہیں کرتا اس پر'' اس نے اپنے آپ ہی سوچا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پستہ قد فربہ اندام نکولائی اس کے سامنے کھڑا سرک اور سخت نظروں اسے دیکھ رہا ہے اور اس کا سیدھا ہاتھ اس طرح جھول رہا ہے جیسے ابھی ابھی اس میں چوٹ لگی ہو۔

اس کا بیٹا اور آندری جیسے ہی گھر آئے اس نے اس واقعہ کے متعلق دریافت کیا:

''کوئی گرفتار ہوا، ایسائی کو قتل کرنے کے جرم میں؟''

''ابھی تک تو کوئی خبر نہیں'' خوخول نے جواب دیا۔

اس نے دیکھا کہ دونوں کچھ پژمردہ سے ہیں۔

''کسی نے نکولائی کا نام تو نہیں لیا؟'' ماں نے دریافت کیا۔

''نہیں'' اس کے بیٹے نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں سختی تھی اور اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ ''اور غالباً اس پر شبہ بھی نہیں کیا جا رہا۔ وہ یہاں ہے بھی نہیں۔ کل دوپہر کو دریا کی طرف چلا گیا تھا او و راب تک واپس نہیں آیا۔ میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تھا۔''

''خدا کا شکر ہے!'' ماں نے اطمینان کا سانس لیا۔ خدا کا شکر ہے!''

خوخول نے اس کی طرف دیکھا اور اپنا سر جھکا لیا۔

''ایسا پڑا ہوا ہے جیسے اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ ہوا کیا ہے'' ماں نے اسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''اور کسی کو بھی اس پر رحم نہیں آتا۔ کوئی بھی تو ہمدردی کا ایک لفظ کہہ کر اس کی آنکھیں بند نہیں کر دیتا۔ اتنا ہیچ اور حقیر جیسے کوئی چیز کٹ کر گئی ہو اور وہیں پڑی رہے...''

کھانے کے وقت پاویل نے دفعتاً اپنا چمچہ رکھ دیا اور چیخ پڑا:

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکتی!''

''کیا؟'' خوخول نے دریافت کیا۔

''جانوروں کو مار کر ہم گوشت حاصل کرتے ہیں، یہی کون سی اچھی بات ہے اور یہ بھی صاف ہے کہ جنگلی جانور اگر خطرناک ہو جائیں تو انہیں مار ڈالنا چاہئے۔ میں خود ایسے انسانوں کا شکار شروع کر دیا ہو ۔لیکن اس جیسی ہیچ اور حقیر ہستی کو ختم کر دینا۔ کوئی اس پر ہاتھ بھی کیسے اٹھا سکتا ہے؟''

خوخول نے اپنے کاندھوں کو جھٹکا دیا۔

''وہ بھی اتنا ہی خطرناک تھا جتنا کوئی جنگلی جانور'' اس نے کہا۔ ''صرف ایک قطرہ خون پینے کے جرم میں ہم مچھروں کو مار ڈالتے ہیں۔''

''یہ تو ٹھیک ہے، لیکن میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کتنی گھن آتی ہے اس خیال سے!''

''تو کیا کیا جا سکتا ہے'' آندری نے پھر کاندھے کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

''تم کر سکتے ہو قتل ایسے شخص کو؟'' پاویل نے ایک طویل وقفے کے بعد دریافت کیا۔

خوخول نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس پر گاڑ دیں اور پھر تیزی سے ماں کی طرف دیکھا۔

''اپنے رفیقوں اور اپنے مقصد کی خاطر میں ہر چیز کر سکتا ہوں'' اس نے مضبوطی سے کہا۔ ''میں اپنے بیٹے کو۔ بھی قتل کر سکتا ہوں۔''

''آہ، آندریوشا!'' ماں بڑے نرم لہجے میں بولی۔

''کیا کیا جا سکتا ہے ماں؟'' وہ مسکرایا۔ ''زندگی ایسی ہی ہے۔''

''دفعتاً آندری ایک ہیجانی کیفیت میں اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی اندرونی قوت اس کو مجبور کر رہی

ہو۔

''ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟'' اس نے اپنے ہاتھ گھماتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگوں سے نفرت کرنے پر مجبور ہیں تا کہ وہ وقت جلدی آ سکے جب ہم صرف ان سے محبت کر سکیں۔ ہر اس شخص کو راستے سے ہٹانا ہوگا جو ترقی کے راستے میں حائل ہوتا ہے، جو لوگوں کو دولت کی خاطر بیچ دیتا ہے تا کہ خود اپنے لئے نام و نمود یا تحفظ خرید سکے۔ اگر کوئی جوڈاس *ایماندار لوگوں کے راستے میں حائل ہے اور ان کے ساتھ غداری کرنے کا موقع تلاش کر رہا ہے تو اگر میں اسے راستے سے نہ ہٹادوں تو میں خود جوڈاس ہو جاؤں گا! تم کہتے ہو مجھے کوئی حق نہیں ہے؟ لیکن ہمارے آقاؤں کو؟ کیا انہیں حق ہے کہ فوج اور جلاد، قحبہ خانے اور قید خانے، جلاوطنی کے مقامات اور دوسری تمام لعنت زدہ چیزیں قائم رکھیں جن کی مدد سے وہ اپنے آرام و آسائش کی حفاظت کرتے ہیں؟ اگر مجبور ہو کر کبھی ان کی لاٹھی میں اٹھا لوں تو کیا یہ میرا قصور ہے؟ میں تو یقیناً اٹھاؤں گا اور بغیر کسی جھجک کے اٹھاؤں گا۔ اگر ہیں سینکڑوں۔

☆جوڈاس۔ جس نے حضرت عیسیٰ سے غداری تھی۔ (مترجم۔)

ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا جا سکتا ہے تو مجھے بھی حق ہے کہ اپنے ہاتھ سے ان میں سے کسی کا صفایا کر دوں، اس قابل نفرت سر کا جو دوسروں کے مقابلے میں میرے نزدیک ہے اور دوسروں کے مقابلے میں میری زندگی کے مقصد کے لئے زیادہ خطرناک ہے۔ زندگی ایسی ہی ہے، لیکن میں ایسی زندگی کا مخالف ہوں، مجھے معلوم ہے کہ ان کے خون سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ان کا خون بانجھ خون ہے۔ ہمارا خون جب بارش کے لاتعداد قطروں کی طرح دھرتی پر گرتا ہے تو اس سے قدا قت جنم لیتی ہے۔ لیکن ان کا خون نام و نشان چھوڑے بغیر خشک ہو جاتا ہے... مجھے یہ سب معلوم ہے۔ لیکن اس گناہ کا عذاب میں اپنے سر پر لے لوں گا۔ اگر میں ضروری سمجھوں گا تو ضرور قتل کروں گا! لیکن یہ صرف میں اپنے متعلق کہہ رہا ہوں، میرا گناہ میرے ساتھ سر جائے گا۔ مستقبل کے دامن پر اس کا دھبہ نہیں پڑے گا۔ ہاتھ میرے خون آلودہ ہوں گے اور کسی کے نہیں۔ کسی کے بھی نہیں!''

وہ کمرے میں ادھر ادھر پھرتا رہا اور ایسے اشارے کرتا رہا جیسے کسی چیز کو کاٹ کر پھینک رہا ہو، خود اپنی ہستی سے کسی چیز کو کاٹ کر الگ کر رہا ہو۔ ماں غمزدہ اور پریشان ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ اسے نے محسوس کیا کہ خوخول کے اندر کوئی چیز ٹوٹ سی گئی ہے اور یہ اس کے لئے تکلیف دہ ہے۔ قتل کا تاریک

خوفناک تصور ماں کے ذہن سے ختم ہو چکا تھا۔ اگر وسوف شیکوف نے جرم نہیں کیا تھا تو پاویل کا کوئی اور دوست یہ حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ پاویل سر جھکائے بیٹھا خوخول کی جوشیلی طولانی تقریر سن رہا تھا۔

''بعض اوقات آگے بڑھتے رہنے کے لئے ہمیں خود اپنے خلاف جانا پڑتا ہے۔ ہر چیز کی قربانی دینے کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے۔ اپنے پورے دل تک کی قربانی دینی ہوتی ہے۔ اپنے مقصد کے لئے جان دینا آسان ہے۔ لیکن کچھ اس سے بھی زیادہ قربانی دینی ہوتی ہے۔ اس چیز کی جو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو اور ایسی قربانی دے کر ہم اس صداقت کو اور زیادہ مستحکم کرتے ہیں جس کے لئے ہم لڑ رہے ہیں۔ وہ صداقت جو دنیا میں ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے!''

وہ کمرے کے وسط میں آ کر رک گیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا، آنکھیں ادھ کھلی سی تھیں اور ہاتھ اس طرح بلند تھے جیسے کوئی گمبھیر عہد کر رہا ہو۔

''مجھے معلوم ہے کہ وہ وقت آئے گا جب انسان خود اپنے حسن پر عش عش کریں گے، جب ہر شخص ایک دوسرے کے لئے ستارے کی طرح حسین ہوگا! دھرتی پر آزاد انسان آباد ہوں گے جو آزاد فضا میں پروان جڑھیں گے اور اپنی آزادی کے باعث عظیم ہوں گے۔ تمام انسانوں کے دل کشادہ ہوں گے اور ہر دل حسد اور کینے سے پاک اور مبرا ہوگا۔ اس وقت زندگی انسانیت کی عظیم الشان خدمت میں تبدیل ہو جائے گی اور انسان کی ہستی آسمانوں سے بلند ہوگی کیونکہ وہ کون سی بلندی ہے جو آزاد انسانوں کی پہونچ سے باہر ہے! اس وقت انسان حسن کی خاطر صداقت اور آزادی کی زندگی بسر کریں گے اور ان میں سب سے بلند وہ کھلائیں گے جن کے دل پوری دنیا کو سمو لینے اور اس سے محبت کرنے کی صلاحیت رکھیں گے اور جو سب سے زیادہ آزاد ہوں گے، کیونکہ ان کے دل عظیم ترین حسن کی آماجگاہ ہوں گے! بڑے عظیم لوگ ہوں گے وہ، نئی زندگی کے وہ علم بردار!...''

ایک لمحے کے لئے وہ خاموش ہو گیا اور پھر سیدھے ہو کر اس نے ایسی آواز میں بولنا شروع کیا جو اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی تھی:

''اور ایسی زندگی کی خاطر۔ میں ہر چیز کر نیک یلئے تیار ہوں...''

اس کے چہرے پر کچھ تشنجی کیفیت طاری ہوئی اور موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں سے بہہ کر نیچے گرنے لگے۔ پاویل کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ سر اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اور ماں کے دل میں تاریک، بھیانک اندیشہ بیدار ہوا ہی تھا کہ وہ چونک سی پڑی۔

''بات کیا ہے آندری؟'' پاویل نے آہستہ سے دریافت کیا۔

خوخول نے سر کو جھٹکا دیا، سیدھا کھڑا ہو گیا اور ماں کی طرف تکنے لگا۔

''میں نے وہ واقعہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے...''

''وہ دوڑ کے اس کے پاس گئی اور اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ مضبوطی سے چمٹی رہی اور سرگوشی کے انداز میں کہتی رہی:

''ہش! میرے لعال! میرے بچے!...''

''ٹھہرو'' خوخول نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں بتاتا ہوں کہ یہ سب کیسا ہوا...''

''نہیں، ضرورت نہیں'' آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے ماں نے کہا۔

''نہیں آندریوشا مت بتاؤ...''

پاویل آہستہ آہستہ اس کے نزدیک آیا۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھیں اور چہرہ زرد، اس نے مختصر سی ہنسی ہنس کر کہا:

''ماں کو خوف ہے کہ تم نے کیا ہے...''

''مجھے۔ خوف نہیں ہے! مجھے یقین ہی نہیں ہے! اگر اپنی آنکھوں سے دیکھتی تب بھی مجھے یقین نہ آتا!''

''ٹھہرو!'' خوخول نے گردن گھماتے اور اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے نہیں کیا، لیکن میں چاہتا تو روک سکتا تھا...''

''جب رہو آندری'' پاویل نے کہا۔

اس نے اپنے دوست کا ہاتھ اپنے ایک ہاتھ میں لیا اور دوسرا ہاتھ خوخول کے شانے پر رکھا جیسے اس بلند قامت جسم کی کپکپاہٹ کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ آندری نے پاویل کی طرف مڑ کر شکستہ آواز میں کہا:

''پاویل تم جانتے ہو کہ میں ایسا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ ہوا یہ کہ تم تو آگے چلے گئے تھے اور میں نکڑ پر دراگونوف کے ساتھ کھڑا تھا کہ ایسائی آیا اور ایک طرف کھڑا ہو کر ہمیں تاکنے اور کچھ طنز کرنے لگا۔ دراگونوف نے کہا 'دیکھتے ہو اسے! ساری رات اس نے میرا پیچھا کیا ہے، آج اسے مار ہی ڈالوں گا'۔

پرھ وہ چلا گیا۔ میں سمجھا گھر گیا ہے۔اس کے بعد ایسائی میرے پاس آیا...''

خوخول نے گہرا سانس لیا۔

''کسی نے میری ایسی توہین نہیں کی تھی جیسی اس کتے نے کی!''

ماں اسے خاموشی سے میز کے پاس لے آئی اور اسے بٹھا دیا۔خود اس کے نزدیک اس طرح بیٹھ گئی کہ دونوں کے کاندھے ایک دوسرے سے چھو گئے۔ پاویل وہیں کھڑا اداس انداز میں اپنی ٹھوڑی کھجاتا رہا۔

''اس نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں کو ہمارے سارے نام معلوم ہیں۔ پولیس والوں کے پاس ہم سب لوگوں کی فہرست موجود ہے اور یہ کہ یوم مئی کے قبل ہی ہم سب لوگ گرفتار کر لئے جائیں گے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔صرف ہنس دیا لیکن اندر کھول رہا تھا۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا کہ تم تو بہت ذہین آدمی ہو،اس راستے پر چل کر بڑی غلطی کر رہے ہو زیادہ بہتر ہوگا کہ تم...''

وہ خاموش ہو گیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اس نے چہرے سے پسینہ پونچھا۔اس کی آنکھوں میں خشک سی چمک تھی۔

''میں سمجھ گیا!'' پاویل بولا۔

''قانون کا ساتھ دینا زیادہ بہتر ہوگا؟'' اس نے کہا۔

خوخول نے گھونسا دکھایا۔

''قانون۔لعنت ہو اس پر!'' اس نے دانتوں کو بھینچتے ہوئے کہا۔''اگر اس نے مجھے تھپھڑ مارا ہوتا تو وہ میرے لئے بہتر ہوتا۔اور شاید اس کے لئے بھی، میرے دل پر اس طرح اپنے غلیظ منہ سے تھوکا کہ میری برداشت سی باہر ہو گیا!''

آندری نے ایک تشنجی حرکت کے ساتھ اپنی ہاتھ پاویل کی گرفت سے الگ کر لیا ور دھیمی آواز میں بولتا گیا جو کراہیت سے پر تھی۔

''میں نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور چل کھڑا ہوا۔ پھر مجھے اپنے پیچھے دراگونوف کی دھیمی آواز کہتی ہوئی سنائی دی، آخر تمہیں بھی پکڑ ہی لیا نہ!، غالبا وہ وہیں کونے میں کھڑا انتظار کر رہا تھا...''

کچھ وقفے کے بعد خوخول نے کہا:

’’میں پیچھے نہیں مڑا۔ حالانکہ مجھے کچھ احساس ہوا کہ... کسی نے مارا... لیکن میں چلتا ہی رہا جیسے میرے پاؤں کے نیچے مینڈک آ گیا ہو۔ کارخانے میں لوگ چیختے ہوئے آئے’ایسائی کوقتل کر دیا گیا!، مجھے یقین نہیں آیا۔ لیکن میرے بازو میں ایسا درد ہونے لگا کہ میں کام ہی نہ کر سکا۔ کوئی تکلیف تو نہیں محسوس ہوئی لیکن ایسا معلوم ہوا کہ میرا ہاتھ جھڑ گیا ہے...‘‘

اس نے کنکھیوں سے اپنے ہاتھکی طرف دیکھا۔

’’اس دھبے کوشاید عمر بھر نہ دھوسکوں گا...‘‘

’’اہم بات یہ ہے کہ تمہارا دل صاف ہے!‘‘ ماں نے دھیرے سے کہا۔

’’میں اپنے کو موردالزام نہیں ٹھہراتا!۔ بالکل نہیں!‘‘

خوخول نے زور دیتے ہوئے کہا۔’’بات صرف اتنی ہے کہ مجھے گھن آتی ہے مجھے اس معاملے میں پڑنا ہی نہیں چاہئے تھا۔‘‘

’’تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے!‘‘ پاویل نے کاندھے کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔’’تم نے قتل نہیں کیا اور اگر کیا بھی ہوتا...‘‘

’’سنو بھائی۔ ایک بار یہ معلوم ہو جائے کہ قتل واقع ہو رہا ہے اور پھر اسے روکنے کے لئے کچھ نہ کیا جائے تو...‘‘

میری سمجھ میں نہیں آتا...‘‘ پاویل نے اصرار کیا۔’’یعنی یہ کہ سمجھ تو گیا ہوں لیکن میں اس سے متاثر نہیں ہو رہا ہوں۔

کارخانے کی سیٹی بجی۔ خوخول نے اس تحکمانہ بلاوے کو سنا، پھر اپنے پورے جسم کو جنبش دیتے ہوئے بولا:

’’میں کام پر نہیں جا رہا ہوں...‘‘

’’میں بھی نہیں جا رہا‘‘ پاویل نے کہا

’’میں حمام کی طرف جا رہا ہوں‘‘ خوخول نے خفیف سا ہنستے ہوئے کہا اور پھر اپنے کپڑے سمیٹنے لگا۔ جب گھر سے چلا تو بڑا اداس اداس سا تھا۔

ماں اسے بڑے ہمدردانہ انداز میں دیکھتی رہی۔

''تم چاہے جو بھی کہو پاویل'' ماں نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ ''میں یہ جانتی ہوں کہ انسان کو قتل کرنا گناہ ہے، لیکن میں کسی کو مجرم نہیں گردانتی، مجھے ایسائی پر افسوس ہوتا ہے، اتنا بے یارومددگار سا تھا۔ آج جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے یاد آیا کہ ایک دن تمہیں پھانسی دینے کی دھمکی دی تھی لیکن اس کی وجہ سے مجھے اس سے نفرت نہیں ہوئی اور نہ اب اس کی موت کی وجہ سے خوشی ہوئی۔ مجھے تو اس پر صرف افسوس ہوا لیکن اب۔ تو افسوس بھی نہیں محسوس ہوتا...''

وہ خاموش ہو گئی اور کچھ سوچنے لگی اور پھر کچھ تعجب سے مسکراتے ہوئے بولی:

''ارے واہ، سنا تم نے میں کیا کہہ گئی پاشا؟''

صاف ظاہر تھا کہ اس نے نہیں سنا کیونکہ نظریں نیچی کیے فرش پر ٹہلتے ہوئے اس افسردگی سے کہا:

''کیا زندگی ہے! لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف کس طرح چھوڑ دیا جاتا ہے؟ لاکھ نہ چاہو لیکن کسی نہ کسی پر ہاتھ اٹھ ہی جاتا ہے اور ہاتھ کس پر اٹھتا ہے؟ کسی ادنیٰ قسم کی ہستی پر جسے ہم زیادہ حقوق حاصل نہیں۔ اور جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے وہ ہم سے بھی کم خوش قسمت تھا کیونکہ احمق تھا۔ پولیس اور فوج اور خفیہ کے لوگ سب ہمارے دشمن ہیں۔ لیکن وہ سب لوگ ہماری طرح کے انسان ہیں جن کا خون ہماری طرح چوسا جاتا ہے اور بالکل ہماری ہی طرح ان کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ ہر چیز۔ بالکل ایک طرح کی ہے! لیکن آقاؤں نے لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا ہے، خوف اور احمقانہ باتوں سے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے، ان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے ہیں، ان کا خون نچوڑ کی پی رہے ہیں اور ایک دوسرے کو مارنے اور کچلنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ انسانوں کو بندوقوں اور لاٹھیوں اور پتھروں میں تبدیل کر دیا ہے اور کہتے ہیں: 'یہ حکومت ہے'!''

وہ اپنی ماں کے نزدیک آیا۔

''یہ سراسر جرم ہے ماں! لاکھوں کروڑوں انسانوں کا نفرت انگیز قتل عام! انسانی روحوں قتل... سمجھتی ہو؟ وہ لوگ روحوں کے قاتل ہیں! ان کے اور ہمارے درمیان فرق سمجھ میں آیا؟ ہم ایک انسان کو مارتے ہیں اور اس سے خود ہمیں کراہیت آتی ہے، شرم محسوس ہوتی ہے، تکلیف ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ۔ کراہیت آتی ہے! لیکن وہ لوگ ہزاروں انسانوں کو بہت اطمینان اور بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیتے ہیں اور ان کی تیوری پر بل تک نہیں آتا۔ بلکہ اس سے انہیں الٹی تسکین ہوتی ہے! اور لوگوں کو موت کے

گھاٹ اتارنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ اپنا سونا چاندی اور اپنی ہنڈیاں اور وہ تمام بے ہودہ چیزیں محفوظ کرنا چاہتے ہیں جن کی مدد سے وہ ہم پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ذرا سوچو لوگوں کو قتل کرنے اور ان کی روحوں کو مسخ کرنے کا مقصد اپنی جانوں کی حفاظت نہیں ہوتا۔ اپنی خاطر یہ سب کچھ نہیں کرتے بلکہ اپنی ملکیت کی خاطر کرتے ہیں! وہ لوگ اس کا تحفظ نہیں کرتے جو ان کے اندر ہے بلکہ اس کا کرتے ہیں جو باہر ہے...''

اس نے ماں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے اور ان پر جھکا۔ پھر انہیں دباتے ہوئے اس نے کہا:

''اگر تم اس گھناؤنے پن اور شرمناک دلالت کو سمجھ جاؤ تو تم اس صداقت کو سمجھ جاؤ گی جس کے لئے ہم لڑ رہے ہیں۔ تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ صداقت کتنی سچی اور کتنی عظیم ہے!''

ماں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت وہ بے انتہا متاثر تھی اور اس کا سارا وجود اس آرزو سے معمور تھا کہ اس کے سینے میں جو آگ بھڑک رہی ہے اسے اپنے بیٹے کی سوزش دل کے ساتھ ملا کر ایک واحد، عظیم اور فروزاں شعلے میں تبدیل کردے۔

''صبر کرو پاویل!'' وہ مشکل سے کہہ سکی۔ ''میں بھی کچھ دن میں محسوس کرنے لگوں گی لیکن ذرا صبر کرو!...''

25

کوئی شخص ہنگامہ مچاتا ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ دونوں چونک پڑے اور انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

آہستہ سے دروازہ کھلا اور ربین داخل ہوا۔

''میں آ گیا!'' اس نے مسکرا کر سر بلند کرتے ہوئے کہا۔

''دنیا بھر کا شکی، قول کا پکا، آج یہاں، کل وہاں، ہر جگہ اپنی ٹانگ اڑانے والا!''

وہ پوستین پہنے ہوئے تھا جس پر تارکول لگا ہا تھا، پاؤں میں چٹائی کے جتے تھے اور سر پر لمبے بالوں والی ٹوپی۔ پیٹی میں ایک جوڑ بے نگلیوں کا سیاہ دستانہ اڑسا ہوا تھا۔

''تمہاری صحت کیسی ہے؟ تو تمہیں چھڑ دیا آخر پاویل؟ بہت اچھا ہوا۔ کیا حال چال ہیں پلا گیا نلوونا؟'' اپنے سفید دانت نمایاں کرتے ہوتے وہ مسکرایا۔ اس کی آواز زیادہ ترم ہوگئی تھی اور چہرے پر

ڈاڑھی بے حد پھیل گئی تھی۔

ماں اس سے مل کر خوش ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر اس کا بڑا سا ہاتھ تھام لیا جس پر سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے۔

''افوہ!'' اس نے تارکول کی تیز خوش گوار خوشبو کو زور سے سونگھتے ہوئے کہا۔ ''تم سے مل کر کتنی خوشی ہوئی!''

''ہو سچ مچ کسان!'' پاویل نے مسکرا کر ریبن کو گھورتے ہوئے کہا۔

مہمان نے آہستہ آہستہ اپنا کوٹ وغیرہ اتارا۔

''بالکل صحیح۔ پھر سے کسان ہو رہا ہوں، تم روز بروز رئیسوں میں شامل ہوتے جا رہے ہو اور میں بالکل مخالف سمت جا رہا ہوں!''

وہ کمرے میں چکر لگانے لگا اور اپنی رنگین قمیص کو ٹھیک کرتے ہوئے دوسری چیزوں کا معائنہ کرنے لگا۔

''کوئی خاص نئی چیز نہیں سوائے کتابوں کے۔ ہونہہ۔ اچھا تو ذرا سارے قصے سناؤ۔''

وہ دونوں ٹانگوں کو دور دور رکھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑ لیا اور اپنی سیاہ آنکھوں سے پاویل کو دیکھنے لگا اور جواب کا انتظار کرتے ہوئے مسکرانے لگا۔

''ہمارا کام آگے بڑھ رہا ہے'' پاویل نے کہا۔

''جوتتے ہیں اور بوتے ہیں، شراب کھینچتے ہیں اور پیتے ہیں اور باقی وقت میں سوتے ہیں۔ کیوں ہے نا یہی بات دوست؟'' ریبن ہنسا۔

''تم اپنے حال چال بتاؤ میخائل ایوانووچ'' پاویل نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا حال اچھا ہی ہے۔ یگید یو و میں رہتا ہوں۔ کبھی نام سنا ہے اس کا؟ یگیلد یور۔ اچھا چھوٹا سا قصبہ ہے۔ سال میں دو میلے لگاتے ہیں۔ دو ہزار سے زیادہ آبادی ہے۔ مگر سب مفلس اور قلاش۔ کسی کی اپنی زمین نہیں ہے، سب پٹے پر لیتے ہیں۔ اور زمین بھی اچھی نہیں ہے۔ میں وہاں ایک خون چوسنے والی جونک کے یہاں ملازم ہو گیا ہوں۔ قصبہ ایسے لوگوں سے اس طرح بھرا پڑا ہے جیسے کیڑوں سے لاش۔ کوئلہ جلاؤ اور تارکول بناؤ۔ جتنا یہاں کماتا تھا اس کا چوتھائی حصہ کماتا ہوں اور کام اس سے دوگنا کرتا

ہوں۔ ہونہہ۔ ہم سات آدمی کام کرتے ہیں اس کے لئے۔ اس جونک کے لئے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ سب جوان ہیں اور سب مقامی لوگ ہیں، سوائے میرے اور سب پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔ ان میں سے ایک جس کا نام یفیم ہے اتنا گرم مزاج ہے۔ کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ اس کے ساتھ کیا کیا جائے!''

''تم کام کیسے کرتے ہو۔ ان لوگوں کے ساتھ بحث اتنا تو تم سمجھ رکھو! تمہارے سارے پرچے ساتھ لیتا گیا تھا۔ کل ملا کر چونتیس۔ لیکن زیادہ تر تو میں انجیل کی مدد سے کام کرتا ہوں۔ انجیل سے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ کتاب موٹی بھی ہے اور مقدس مجلس کلیسا کی منظور کی ہوئی بھی۔ بات دراصل یہی ہے! بڑا کام لے سکتے ہو اس سے۔''

اس نے ہنس کر پاویل کو آنکھ ماری۔

''لیکن صرف وہی کافی نہیں ہے۔ میں تمہارے پاس کتابوں ہی کے لئے آیا ہوں۔ ہم دو آدمی ہیں۔ وہ یفیم میرے ساتھ ہے۔ ہم لوگوں کو تارکول لے کر بھیجا گیا تھا تو ہم نے موقع سے فایدہ اٹھایا۔ ذرا راستہ کاٹ کر ادھر آ گئے۔ یفیم کے آنے سے قبل کتابیں دیدو۔ ساری چیزیں اسے نہیں معلوم ہونی چاہیں...''

ماں نے ریبن کی طرف دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے کپڑوں کے علاوہ کوئی اور چیز بھی بدل دی ہے۔ اس کے طور طریقوں میں رعب ڈالنے والی بات کم ہو گئی تھی۔ نظروں میں چالاکی زیادہ آ گئی تھی اور آنکھوں میں صاف گوئی پہلے کے مقابلے میں کم ہو گئی تھی۔

''ماں'' پاویل نے کہا۔ ''تکلیف نہ ہو تو کتابیں جا کر لا سکتی ہو؟ وہاں لوگ جانتے ہیں کہ کس قسمکی کتابیں دینا ہیں۔ ان سے کہہ دینا کہ کتابیں دیہات بھیجی جائیں گی۔''

''اچھی بات ہے'' ماں نے کہا۔ ''سماوار ابلتے ہی میں جاتی ہوں۔''

''تم بھی ان معاملات میں پھنس گئیں پلاگیا نلوونا؟'' ریبن ہنسا۔ ''ہونہہ، وہاں قصبہ میں بے انتہا لوگوں کو کتابوں کی خواہش ہے اور یہ سارا کارنامہ مقامی معلم کا ہے۔ آدمی اچھا ہے حالانکہ ایک پادری کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کوئی چار میل پر ایک استانی بھی رہتی ہے۔ یہ لوگ غیر قانونی کتابیں نہیں پڑھاتے۔ اپنی نوکری کا ڈر لگا رہتا ہے۔ لیکن مجھے تو وہی غیر قانونی کتابیں چاہئیں۔ ذرا چٹپٹی سی۔ میری

دی ہوئی کتابوں کو پولیس انسپکٹر اور پادری نے دیکھ بھی لیا تو سوائے معلم اور استانی کے اور کسی کو ذمہ دار گردانیں گے؟ اور میں تھوڑے دنوں تک دبک کر بیٹھ جاؤں گا۔''

اپنی چالاکی پر خود ہی خوش ہوتے ہوئے وہ مسکرایا۔

''افوہ!'' ماں نے سوچا۔ ''دیکھنے میں ریچھ معلوم ہوتا ہے لیکن ہے لومڑی!''

''اگر ان لوگوں کو شبہ ہو گیا کہ ماسٹر غیر قانونی کتابیں بانٹتے ہیں تو کیا تمہارے خیال میں ان لوگوں کو جیل بھیج دیا جائے گا؟'' پاویل نے دریافت کیا۔

''یقیناً بھیج دیں گے'' ریبن نے جواب دیا۔ ''لیکن اس سے کیا ہوا؟''

''لیکن قصور تو تمہارا ہے نہ کہ ان کا۔ جیل تو تمہیں جانا چاہئے...''

''عجیب آدمی ہو!'' ریبن نیا اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''مجھ پر کسی کو شک نہ ہو گا! کسان ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔ کتابوں کی بات تو وہی قسم کے لوگ کرتے ہیں اور ان ہی کو اس کا جواب دہ ہونا چاہئے...''

ماں نے محسوس کیا کہ ریبن کی بات پاویل کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس نے اپنے بیٹے کو آنکھیں سکیڑتے ہوئے دیکھا اور اس کا مطلب تھا کہ وہ غصے میں ہے۔

''میخائل ایوانووچ کام خود کرنا چاہتے ہیں لیکن ذمہ داری ڈالنا چاہتے ہیں دوسروں پر...'' ماں نے محتاط طریقے سے کہا۔

''بالکل صحیح'' ریبن نیا پنی ڈاڑھی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تو ایسا ہی ہے۔''

''ماں!'' پاویل نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اگر ہمارے ساتھیوں میں کوئی شخص مثلاً آندری کوئی ایسا کام کرنے کے بعد میرے پیچھے چھپ جائے جس کی وجہ سے مجھے گرفتار کر لیا جائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟''

ماں چونک سی پڑی اور اپنے بیٹے کی طرف تعجب سے دیکھا۔

''اپنے رفیق کے ساتھ ایسی حرکت کیسے کی جا سکتی ہے؟'' اس نے ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''آہا!'' ریبن نے چبا چبا کر کہا۔ ''میں تمہیں بات سمجھ گیا پاویل'' ماں کی طرف مڑ کر اس نے کچھ فخریہ انداز میں آنکھ ماری۔ ''بڑا نازک معاملہ ہے ماں۔'' ایک بار پھر وہ پاویل کی طرف مڑا اور اس انداز میں بولنا شروع کیا جیسے سبق پڑھا رہا ہو۔ ''تمہارے خیالات ابھی ناپختہ ہیں، میرے بھائی! غیر قانونی

کام میں ایمانداری وغیرہ کی بات نہیں چلتی۔تم خود ہی فیصلہ کرو: پہلا شخص جسے جیل میں ڈال دیں گے وہ استاد نہیں بلکہ وہ ہوگا جس کے پاس کتابیں پکڑی جائیں گی۔ یہ تو ہوئی پہلی بات۔ دوسری بات یہ کہ مان لیا کہ مدرسین صرف منظور شدہ کتابیں ہی پڑھاتے ہیں لیکن جو خیالات پیش کرتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں۔صرف الفاظ کا فرق ہوتا ہے۔ان کے الفاظ میں کم سچائی ہوتی ہے۔مختصر یہ کہ وہ بھی وہی چاہتے ہیں جو میں جانتا ہوں۔فرق صرف اتنا ہے کہ وہ پگڈنڈی پر چلتے ہیں اور میں سڑک پر چلتا ہوں۔آقاؤں کے نقطۂ نظر سے ہم دونوں مجرم ہیں۔ ہے نا ٹھیک! اور تیسری بات ہے کہ مجھے ان کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے میرے بھائی! پیدل دستے گھوڑ سواروں سے دوستی نہیں کیا کرتے۔ممکن ہے میں کبھی کسی کسان کے ساتھ ایسا نہ کرسکوں لیکن وہ لوگ۔ایک پادری کا بیٹا ہے اور دوسری زمیندار کی بیٹی ہے۔ان لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ لوگوں کو اکساتے پھرتے ہیں؟ انکے ذہنوں کو پڑھنا مجھ جیسے کسان کا کام نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔اور ذرہ برابر بھی علم نہیں کہ وہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ ہزار برس سے رئیس قسم کے لوگ اپنی جگہ جمے بیٹھے رہے اور کسانوں کی کھال ادھیڑتے رہے اور اب دفعتاً بیدار ہوکر کسانوں کی آنکھوں پر سے خود ہی پٹیاں کھولنا شروع کر دی ہیں! میں وہ نہیں ہوں کہ پریوں کی کہانی اور کیا ہوگی۔ بات دراصل یہی ہے۔تمہارے رئیس لوگوں اور میری درمیان بہت فاصلہ ہے۔سردیوں میں کبھی ہوتا ہے نا کہ کھیتوں میں سے ہوکر گھوڑے پر بیٹے چلے جا رہے ہیں کہ کچھ دور آگے کوئی چیز آہستہ سے سڑک پر آجاتی ہے۔کیا چیز ہے؟ بھیڑیا یا لومڑی یا کوئی کتا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔اتنی دور ہوتی ہے وہ چیز۔''

ماں نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔وہ اداس سا نظر آرہا تھا۔

کچھ کچھ گھبرائے گھبرائے انداز میں اپنی ڈاڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے ربین نے دل جمعی سے پاویل کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھیں دہشت ناک روشنی سے چمک رہی تھیں۔

''اچھے طور پر طریقوں کے متعلق سوچنے کا وقت گیا'' اس نے بات جاری رکھی۔''زندگی بڑی کٹھن ہے۔کتے کوئی بھیڑ بکری تو ہوتے نہیں۔ ہر کتا اپنی اپنی طرح بھونکے گا۔''

''ان ہی رئیسوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عام لوگوں کی خاطر موت کے منہ میں جاتے ہیں'' ماں نے کچھ مانوس چہروں کا تصور کرتے ہوئے کہا۔''اپنی ساری زندگی جیل میں کاٹ دیتے ہیں...''

''ان کی تو الگ بات ہے'' ربین نے جواب دیا۔ ''کسان بھی امیر ہو جاتا ہے۔ رؤسا کے برابر پہونچ جاتا ہے۔ رؤسا غریب ہو جاتے ہیں۔ کسانوں کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ ہاتھ اچھا تو کام سچا۔ یاد ہے نا مجھے تم نے کس طرح سمجھایا تھا پاویل: انسان کے رہن سہن کے طریقہ ہی پر اس کے خیالات کا دار و مدار ہوتا ہے؟ بات دراصل یہی ہے۔ اگر مزدور کہتا ہے 'ہاں'، تو مالک کہتا ہے 'نہیں'، اگر مزدور کہتا ہے 'نہیں'، تو مالک کہتا ہے 'ہاں'۔ اور بالکل یہی فرق کسان اور زمیندار کو نیند نہ آوے۔ ظاہر ہے کہ ہر طبقے میں کچھ حرامزدے بھی ہوتے ہیں اور میں تمام کسانوں کی وکالت تو نہیں کر رہا ہوں...''

وہ کھڑا ہو گیا۔ مضبوط اور سانولا انسان۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور ڈاڑھی میں ایسی کپکپی پیدا ہوئی جیسے اس نے آواز پیدا کئے بغیر دانتوں کو پیسا ہو اور پھر اس نے نرم لہجے میں اپنی بات جاری رکھی:

''پانچ سال تک ایک کارخانے سے دوسرے کارخانے میں مارا مارا پھرتا رہا۔ بالکل بھول ہی گیا کہ گاؤں کسے کہتے ہیں۔ جب میں واپس گیا اور میں نے چیزوں کو دیکھا تو محسوس ہوا کہ اب پہلے کی طرح نہیں رہ سکتا! سمجھے؟ بالکل ناممکن تھا! یہاں رہ کر ان ناانصافیوں پر نظر نہیں جاتی جو وہاں ہوتی ہیں۔ وہاں بھوک لوگوں کے ساتھ سایہ سایے کی طرح پھرتی ہے، اور روٹی کی کوئی امید بھی نہیں۔ بالکل کوئی امید نہیں۔ بھوک ان کی روح کو نگل جاتی ہے اور ان کے انسانی چہروں کو مسخ کر دیتی ہے۔ وہ لوگ زندہ نہیں کہلاتے جا سکتے، بس ایک متواتر احتیاج کی حالت میں گھسٹتے رہتے ہیں... اور چاروں طرف عہدے دار گدھ کی طرح تاکا کرتے ہیں کہ کہیں یہ لوگ کسی زاید چیز پر ہاتھ نہ ڈال دیں اور اگر کسی کسان کے پاس کچھ نکل آیا تو اس سے چھین لیتے ہیں اور اچھی خاصی مرمت کر دیتے ہیں...''

ربین نے اپنے چاروں طرف دیکھا، پھر میز کی دوسری سمت پاویل کی طرف جھکا۔

''اس زندگی کی طرف پھر سے واپس جانے کی وجہ سے مجھے متلی ہونے لگی میں نے سوچا کہ اب اس کو برداشت نہ کر سکوں گا۔ لیکن پھر میں نے اپنے آپ سے کہا یہ غلط بات ہے! جاؤ اور اسے برداشت کرو۔ ہو سکتا ہے کہ تم ان لوگوں کو روٹی نہ دے سکو لیکن لوگوں کو جوش تو دلا سکتے ہو!، اور میں وہیں ٹھیر گیا۔ میرا دل غصے کی وجہ سے پھٹا جا رہا تھا۔ اور غصہ اب بھی میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہے۔''

دھیرے دھیرے وہ پاویل کے نزدیک گیا اور اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور ہاتھ کانپ رہا تھا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے! مجھے کتابیں دو۔ایسی کتابیں جنہیں کوئی ایک بار پڑھ لے تو نیند نہ آئے۔ان کے دماغوں میں انگارے رکھ دینا چاہتا ہوں۔دھکتے ہوئے انگارے۔جو لوگ تمہارے لئے لکھتے ہیں ان سے کہو کہ دیہات کے لئے بھی کچھ لکھیں۔اور ایسا لکھیں کہ خود الفاظ لو دینے لگیں! تا کہ لوگ اپنے مقصد کی خاطر مرنے کو بھی تیار ہو جائیں!''

اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے کہنے لگا:

''موت ہی موت پر فتح پائے گی! یعنی لوگوں کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے مرنا ہوگا! ہم میں سے ہزاروں کو مرنا ہوگا تا کہ ساری دنیا میں کروڑوں انسان پھر سے زندہ ہو سکیں!۔بات دراصل یہی ہے! مرنا آسان ہے۔از سر نو زندگی کے لئے! بس کاش عوام بیدار ہو جائیں، اٹھ کھڑے ہوں!''

ماں سماوار اٹھا لائی اور اس نے ریبن کی طرف دیکھا۔وہ اس کے الفاظ کے بوجھ اور قوت کے نیچے جیسے دب سی گئی۔اس میں کوئی ایسی بات تھی جس سے اس کے شوہر کی یاد تازہ ہوگئی۔اس کا شوہر اسی طرح اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔اسی طرح اپنے ہاتھ اٹھایا کرتا تھا۔اس میں بھی کچھ اسی قسم کا بے صبر غصہ تھا۔بے صبر لیکن بے آواز۔لیکن یہ شخص اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا اسی وجہ سے اس سے زیادہ ڈر نہیں لگا۔

''اچھا ہم ایسا کریں گے'' پاویل نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔''ہمیں حقائق اور واقعات بتاؤ اور ہم تمہارے لئے اخبار نکال دیں گے...''

اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے ماں مسکرائی۔ایک الفظ کہے بغیر اس نے کپڑے بدلے اور باہر چلی گئی۔

''ٹھیک! ہم تمہیں ہر چیز دیں گے! اتنا آسان لکھنا کہ بچے بھی سمجھ جائیں!'' ریبن نے زور سے کہا۔

باورچی خانے کا دروازہ کھلا اور کوئی شخص داخل ہوا۔

''یفیم ہے'' باورچی خانے کی طرف دیکھتے ہوئے ریبن نے کہا۔''ادھر آؤ یفیم، یہ ہیں۔یفیم اور ان کا نام ہے پاویل۔میں نے بتایا تھا نا ان کے بارے میں۔''

پاویل کے سامنے ایک بلند قامت، بھورے بالوں اور چوڑے چہرے کا لڑکا کھڑا تھا۔اونچا سا

پوستین کا کوٹ، ہاتھ میں ٹوپی، جھکی ہوئی نظروں سے پاویل کو دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ بڑا طاقت ور انسان ہے۔

''بہت خوشی ہوئی مل کر!'' اس نے بھاری آواز میں کہا اور جب وہ پاویل کے ساتھ ہاتھ ملا چکا تو دونوں ہاتھوں کو سر پر پھیرا۔ پھر کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا اور جب کتابوں پر نظر پڑی تو آہستہ آہستہ ان کی طرف چل پڑا۔

''ماں گئیں اسے!'' ریبن نے پاویل کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ یفیم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کتابیں دیکھنے لگا۔

''پڑھنے کے لئے کتنی چیزیں ہیں!'' وہ بولا۔ ''لیکن شاید تمہیں وقت نہیں ملتا۔ اگر گاؤں میں رہتے تو پڑھنے کے لئے وقت زیادہ ملتا...''

''اور خواہش کم ہوتی؟'' پاویل نے پوچھا۔

''نہیں، بالکل نہیں! خواہش بھی بہت ہے'' لڑکے نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لوگوں نے اپنے دماغوں سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ ارضیات، ۔ یہ کیا چیز ہے؟''

پاویل نے سمجھایا۔

''ہم لوگوں کو اس کی ضرورت نہیں'' لڑکے نے کتاب کو الماری میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔

''کسان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ زمین کیسے بنی؟'' ریبن نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ''اسے دلچسپی اس بات میں ہے کہ زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تقسیم کیسے ہوئی۔ زمیندار نے اس کے دیکھتے دیکھتے کس طرح زمین چرا لی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ زمین گھومتی ہے یا ساکن ہے۔ دیتی رہے گیہوں تو کاہے کو روؤں، دیتی رہے رائی تو فکر کیا ہے بھائی۔''

''غلامی کی تاریخ،'' یفیم نے پھر پڑھا۔ ''یہ ہمارے بارے میں ہے کیا؟''

''نہیں۔ مگر اس میں روسی زرعی غلامی پر بھی ایک باب ہے'' پاویل نے اسے ایک اور کتاب دیتے ہوئے کہا۔ یفیم نے کتاب لے لی، ہاتھوں میں الٹا پلٹا اور واپس رکھتے بولا:

''یہ تو گزرے ہوئے زمانے کی باتیں ہیں۔''

''تمہاری اپنی کچھ زمین ہے؟'' پاویل نے دریافت کیا۔

''ہاں، میرے دو بھائیوں کے اور میرے پاس ملا کر کوئی نو ایکڑ زمین ہے۔ ساری ریتلی ہے۔ تابنہ صاف کرنے کے کام تو آ جائے شاید لیکن کاشت کے قابل نہیں ہے۔''

ایک لمحے کے بعد وہ پھر بولا:

میں نے زمین چھوڑ دی ہے۔ اس سے فایدہ ہی کیا تھا؟ کھانے کو دے نہیں سکتی صرف باندھے رکھتی ہے۔ چار سال سے کھیت مزدوری کر رہا ہوں۔ پت جھڑ میں فوجی نوکری کرنی ہوتی ہے۔ چچا میخائلو کہتے ہیں کہ اب کی ڈیوٹی پر مت جاؤ۔ کہتے ہیں کہ آج کل فوجیوں سے عوام کو کچلنے کا کام لیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ چلا جاؤں۔ فوجی تو اسٹیپان رازن اور پگا چوف کے زمانے میں بھی لوگوں کو کچلا کرتے تھے۔ اب تو وقت آ گیا ہے کہ ان حالات کو بدلا جائے۔ کیا خیال ہے؟'' اس نے پاویل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یقیناً وقت آ گیا ہے'' پاویل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن آسان کام نہیں ہے۔ پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ فوجیوں سے کیا کہنا چاہئے؟...''

''ہم سیکھ جائیں گے'' یفیم نے کہا۔

''اگر افسروں کو معلوم ہو گیا تو گولی مار دیں گے'' پاویل نے یفیم پر ایک پر تجسس نگاہ ڈال کر کہا۔

''ان سے کسی قسم کے رحم کی امید رکھنا تو بیکار سی بات ہے'' اس نے سکون اور سنجیدگی سے ہاں میں ہاں ملائی اور پھر سے کتابیں دیکھنے لگا۔

''چائے پی لو یفیم'' ربین بولا۔ ''جلدی چلنا ہے۔''

اچھا۔ انقلاب بغاوت ہی کو کہتے ہیں؟''

آندری کمرے میں داخل ہوا۔ نہانے کی وجہ سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور جسم سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اور اس کا منہ لٹکا ہوا سا تھا۔ خاموشی سے اس نے یفیم سے ہاتھ ملایا۔ ربین کو دیکھ کر کچھ ہنسا اور اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

''اتنے اداس کیوں ہو؟'' ربین نے اس کے گھٹنے کو تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ بھی مزدور ہیں؟'' یفیم نے آندری کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں'' آندری بولا۔ ''یہ سوال کیوں؟''

''اس نے اس سے پہلے کبھی کارخانے کے مزدوروں کو نہیں دیکھا تھا'' ریبن نے سمجھایا۔''ان لوگوں میں اسے کوئی خاص بات نظر آتی ہے...''

''کسی لحاظ سے؟'' پاویل نے دریافت کیا۔

''تم لوگوں کے جسموں کی ہڈیاں کچھ نکیلی سی ہوتی ہیں''یفیم نے آندری کو بغور دیکھنے کے بعد کہا۔ ''اور کسان کے جسم کی ہڈیاں کچھ گول...''

''کسان اپنے پیروں پر زیادہ اعتماد سے کھڑا ہوتا ہے'' ریبن نے کہا۔''اپنے قدموں تلے زمین کو محسوس کرتا ہے چاہے زمین خود اس کی نہ ہو۔ وہ محسوس کرتا ہے۔ زمین کو۔ لیکن کارخانے کا مزدور ایک پرند کی طرح ہے۔ نہ کوئی گھر نہ بار۔ آج یہاں کل وہاں۔ عورت بھی اسے ایک جگہ پر نہیں روک سکتی۔ کچھ گڑ بڑ ہوئی کہ اس نے اسے بھی دھتا بتایا۔ کسی اور بہتر چیز کی تلاش میں نکل پڑا۔ لیکن کسان قدم اکھاڑے بغیر چیزوں کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔ لو تمہاری ماں بھی آ گئیں۔''

''مجھے اپنی ایک کتاب دے سکو گے؟''یفیم نے پاویل کے نزدیک آتے ہوئے پوچھا۔

''ضرور!'' پاویل نے جواب دیا۔

لڑکے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

''میں واپس کردوں گا'' اس نے جلدی سے پاویل کو یقین دلایا۔''ہمارے ساتھی اکثر اس طرف تارکول لے کر آتے ہیں۔ انہیں کے ہاتھ بھیج دوں گا۔''

''چلنا چاہئے'' ریبن نے کہا۔ وہ پوستین کا کوٹ پہن چکا تھا اور کس کر پیٹی باندھ رہا تھا۔

''پڑھنے میں کتنا لطف آئے گا!''یفیم نے مسکرا کر کتاب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد پاویل بڑے جذباتی انداز میں آندری سے مخاطب ہوا۔

''کیا خیال ہے ان لوگوں کے بارے میں؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ہونہہ'' خوخول نے الفاظ چبا چبا کر کہا۔''جیسے دو طوفانی بادل۔''

''میخائلو؟'' ماں نے کہا۔''ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے کبھی کارخانے میں کام کیا ہی نہیں۔ بالکل کسان معلوم ہو رہا تھا! کتنا ڈر لگتا ہے اسے دیکھ کر!''

''برا ہوا تم شروع سے یہاں نہیں تھے'' پاویل نے آندری سے کہا جو میز پر بیٹھا اپنے چائے کے

گلاش کو گھور کر دیکھ رہا تھا ''تم ذرا دیکھتے تو سہی کہ اس کے دل میں ہو کیا رہا ہے۔تم ہمیشہ انسانی دل کی باتیں کیا کرتے ہو! ریبن نے تو وہ زوردار باتیں کی کہ میں ہکا بکا رہ گیا...ایک لفظ بھی اس سے نہ کہہ سکا۔ انسانوں میں کتنا کم اعتماد ہے اسے اور کتنی کم قدر و قیمت سمجھتا ہے وہ ان کی! ماں ٹھیک کہتی تھی۔ کوئی خوفناک قوت اس پر حاوی ہے!...''

''میں سمجھ گیا تھا'' خوخول نے اسی اداس انداز میں کہا۔''حکمرانوں نے لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر دیا ہے ایک بار عوام اٹھ کھڑے ہوں گے تو ہر چیز تہس نہس کر دیں گے۔انہیں خالی زمین چاہئے اور سچ مچ اسے خالی ہی کر دیں گے۔ ہر چیز کو اکھاڑ کر پھینک دیں گے!''

وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور صاف ہو رہا تھا کہ اس کے ذہن پر کوئی اور خیال طاری ہے۔ ماں نے ہاتھ بڑھا کر اسے نرمی سے تھپتھپایا۔

''اپنے آپ کو سنبھالو آندریوشا!'' اس نے کہا۔

''ذرا ٹھہرو میری ننکو!'' اس نے خاموش محبت سے مسکرا کر جواب دیا۔ پھر دفعتاً بکھر سا گیا اور میز پر زور سے مارا۔''بالکل سچ ہے پاویل! ایک بار کسان اٹھ کھڑا ہو گا تو خود اپنے استعمال کے لئے وہ زمین پر سے ہر چیز کو مٹا دے گا۔ ہر چیز کو جلا دے گا جیسے طاعون کے بعد کرتے ہیں اور ان تمام یادگاروں کو راکھ بنا کر اڑا دے گا جنہوں نے اسے تکلیف پہونچائی ہے...''

''اور پھر وہ ہمارے راستے میں حائل ہو گا!'' پاویل نے آہستہ سے کہا۔

''اس کا انحصار تو ہم پر ہے کہ ایسا نہ ہونے دیں! ہم اسے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ دوسروں کے مقابلے میں ہم اس سے زیادہ نزدیک ہیں۔ وہ ہم پر بھروسہ کرے گا اور ہمارے پیچھے پیچھے چلے گا!''

''ریبن نے کہا ہے کہ دیہات کے لئے ہم لوگ ایک اخبار نکالیں'' پاویل نے کہا۔

''بہت ضروری ہے۔''

''برا ہوا میں نے اس سے بحث نہیں کی'' پاویل نے کچھ ہنس کر کہا۔

''اب بھی وقت ہے'' خوخول نے بہت سنجیدگی سے اپنی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ہم تو یہی سنجیدگی سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔''ہم تو یہی تال دیتے جائیں گے اور جن کے پیر زمین سے بندھے ہوئے نہیں ہیں وہ اس تال پر ناچیں گے...ریبن صحیح کہتا تھا کہ ہم اپنے

پیروں تلے زمین کومحسوس نہیں کرتے۔اور بات تو یہ ہے کہ ہمیں کرنا بھی نہیں چاہئے کیونکہ ہمارا کام تو یہ ہے زمین کوایک زوردار جھٹکا دیں۔ہم اسے ایک دفعہ جھٹکا دیں گےاورعوام کے پاؤں کی بیڑیاں کمزور پڑ جائیں گی۔پھر جھٹکا دیں گے۔اورلوگ آزاد ہوجائیں گے!...''

''تمہارے لئے تو ہر چیز بے حد سادہ ہے آندریوشا!''زندگی ہے!''

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا:

''میں کھیتوں کی طرف ذرا ٹہلنے جاتا ہوں...''

''نہانے کے بعد؟ تیز ہوا چل رہی ہے۔سردی لگ جائے گی'ماں نے آگاہ کیا۔

''مجھے ہوا ہی کی ضرورت ہے''اس نے جواب دیا۔

''دیکھو کہیں زکام نہ ہوجائے''پاویل نے محبت سے کہا۔''بہتر ہے کچھ آرام کرلو۔''

''نہیں میں جارہا ہوں۔''

اس نے ضرورت کے کپڑے پہنےاورایک لفظ کہے بغیر چلا گیا۔

''بڑے کرب میں مبتلا ہوگیا ہے''ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا۔

''مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس واقعہ کے بعد سے اس کے ساتھ تمہاری شفقت اور بڑھ گئی ہے'پاویل نے کہا۔

ماں نے تعجب سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تم نے بڑا محبت بھرا دل پایا ہے ماں''پاویل نے نرمی سے کہا۔

''کاش میں تمہاری اور تمہارے سارے دوستوں کی تھوڑی سی بھی مدد کرسکتی! کاش مجھے معلوم ہوتا کہ کیسے مدد کروں!''

''پریشان کی کوئی بات نہیں۔تم سیکھ جاؤ گی!''

''کاش میں سیکھ سکتی۔کہ پریشان نہ ہوا کروں!''اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا ماں اس بات کو چھوڑو۔لیکن ایک بات یاد رکھو۔میں تمہارا بےانتہا شکرگذار ہوں!''

وہ باورچی خانے میں چلی گئی تا کہ وہ اس کے آنسو نہ دیکھ سکے۔

شام کو خوخول دیر سے واپس آیا اور فوراً ہی بستر پر لیٹ کر بولا:

''تقریباً سات میل چل کر آرہا ہوں۔''

''کچھ فایدہ ہوا؟'' پاویل نے دریافت کیا۔

''اس کے متعلق بات نہ کرو۔ میں سونے جارہا ہوں۔''

اس کے بعد وہ خود ایک لفظ بھی نہ بولا۔

تھوڑی دیر بعد وسوف شیکوف آ گیا۔ بالکل اسی طرح میلا، کچیلا اور بے چین سا۔

''سنا تم نے ایسائی کو کس نے قتل کیا؟'' اس نے کمرے میں بڑے بھدے طریقے سے ٹہلتے ہوئے پاویل سے پوچھا۔

''نہیں'' پاویل نے مختصر سا جواب دیا۔

''کوئی ایسا آدمی مل ہی گیا جو بہت زیادہ نفیس مزاج اور محتاط نہیں تھا، میں تو خود اسے ختم کرنیک ے لئے تیار ہو رہا تھا اور میں سچ مچ یہ کام کر بھی ڈالتا۔ میں ہی سب سے زیادہ مناسب تھا۔''

''بند کرو یہ بکواس نکولائی'' پاویل نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''یہ خیال تو اتنا نرم ہے اور شیر کی طرح گرجتے پھرتے ہو! ایسا کیوں کرتے ہو؟''

اس وقت نکولائی کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔ اس کے چیچک زدہ چہرے میں بھی آج ایک کشش سی محسوس ہو رہی تھی۔

''ایسے کام کے علاوہ میں اور کسی قابل نہیں ہوں'' نکولائی نے کاندھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''میں سوچتا ہوں۔ میری جگہ کہاں ہے؟ میری کوئی جگہ نہیں۔ لوگوں سے بات کرنا ضروری ہوتا ہے اور مجھے بات کرنا نہیں آتا۔ میں ہر چیز سمجھتا ہوں۔ ساری ناانصافیوں کو دیکھتا ہوں۔ لیکن الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔ بالکل بے زبان جانور کی طرح ہوں...''

پاویل کی طرح جا کر اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور میز کو کریدتے ہوئے بچوں کی سی فریادی آواز میں کہا جس میں اس کے عام لہجے کا شائبہ تک نہ تھا:

''مجھے کوئی مشکل کام دو بھائی۔ اس طرح بغیر کسی مصروف رہتے ہوا اور میں خوب دیکھتا ہوں کہ کام ترقی کر رہا ہے اور میں الگ تھلگ کھڑا ہوا ہوں! لکڑیاں اور تختے ڈھو کر لے جاتے ہوں لیکن اس سے زندگی کا مقصد تو حاصل نہیں ہوتا۔ مجھے کوئی مشکل سا کام دو!''

پاویل نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے نزدیک کھینچ لیا۔

''اچھا!..''

پردے کے پیچھے سے خوخول کی آواز آئی:

''میں تمہیں اپنے چھاپے خانے میں ٹائپ جمانے کا کام سیکھا دوں گا نکولائی۔ کیا خیال ہے تمہارا؟''

نکولائی اس کے پاس اندر چلا گیا۔

''اگر تم سکھا دو گے تو۔ میں اپنا چاقو تمہیں تحفے کے طور پر دیدوں گا...'' اس نے کہا۔

''ایسی تیسی میں جائے تمہارا چاقو!'' خوخول قہقہہ مار کر زور سے ہنسا۔

''بڑا اچھا چاقو ہے'' نکولائی نے اصرار کیا۔

پاویل بھی ہنسنے لگا۔

''مجھ پر ہنس رہے ہو؟'' نکولائی کمرے کے بیچ میں آتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے'' خوخول نے بستر سے اچک کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اچھا سنو، چلو کھیتوں کی طرف ٹہلنے چلیں۔ آج رات کتنا اچھا چاند نکلا ہے! چلیں؟''

''اچھی بات ہے'' پاویل نے کہا۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں'' نکولائی نے اعلان کیا۔ ''مجھے خوخول کی ہنسی بہت پسند ہے...''

''اور مجھے تمہارا تحفے کا وعدہ کرنا بہت پسند ہے'' خوخول نے اندر ہی اندر ہنستے ہوئے کہا۔

وہ باورچی خانے میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔

''کچھ گرم کپڑے پہن لینا'' ماں کی آواز میں التجا تھی۔

جب وہ تینوں چلے گئے تو وہ انہیں کھڑکی میں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے مقدس تصویر کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا:

''یا اللہ ان پر عنایت کی نظر رکھنا۔ ان کی مدد کرنا...''

دن اتنی تیزی سے گذرتے گئے کہ ماں کو سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ یوم مئی بھی نزدیک آرہا ہے لیکن جب رات کو وہ دن کے شوروشغب اور پریشانیوں سے تھک کر بستر پر لیٹتی تو اسے دل میں ایک دردسا محسوس ہوتا۔

''کاش وہ دن جلدی سے آئے اور گذر جائے...''

صبح تڑکے کارخانے کی سیٹی بجتی۔اس کا بیٹا اور آندری جلدی جلدی ناشتہ کر کے چلے جاتے اور ماں کو اپنے لئے درجنوں کام کرنے کیلئے چھوڑ جاتے۔پنجرے میں بند گلہری کی طرح وہ دن بھر ادھر سے ادھر پھرا کرتی، کھانا تیار کرتی، انکے پوسٹروں کے لئےلئی اور ارغوانی رنگ تیار کرتی، اجنبی لوگوں سے ملتی جو بڑے پراسرار انداز میں آتے، پاویل کے لئے چٹھیاں دیتے اور اسی انداز سے چلے جاتے اور جاتے جاتے اپنے جوش و ہیجان کا اثر اس پر بھی چھوڑ جاتے۔

تقریباً ہر رات کو یوم مئی کے پرچے جن میں مزدوروں سے یوم مئی کے مظاہرے میں حصہ لینے کی اپیل ہوتی، احاطے کی دیواروں اور یہاں تک کہ پولیس چوکی کے دروازوں پر بھی چپکا دیئے جاتے اور ہر روز یہ پرچے کارخانے میں بھی نظر آتے۔صبح کو پولیس والے مزدوروں کی بستی میں آکر پرچوں کو نوچ ڈالتے لیکن کھانے کے وقت ہوا پھر پرچوں کو اڑا کر راہگیروں کے قدموں میں ڈال دیتی۔شہر سے خفیہ کے آدمی بھیجے گئے جنہوں نے ہر موڑ پر کھڑے ہو کر مزدوروں کے چہروں کو غور سے دیکھنا شروع کیا جو کھانے کے وقت ہنستے بولتے کارخانے آیا جایا کرتے تھے۔صورت حال پر قابو نہ پا سکنے میں پولیس کی بےبسی دیکھ کر ہر شخص کو لطف آرہا تھا یہاں تک کہ بوڑھے مزدور بھی مسکرا کر ایک دوسرے سے کہتے:

''دیکھو تو یہ لوگ کیا کر رہے ہیں!''

ہر طرف مزدوروں کے جتھے کھڑے جوشیلی اپیل پر بحث کرتے نظر آنے لگے۔زندگی کے لئے زندگی زیادہ پرآہنگ اور دلچسپ ہوگئی تھی کیونکہ اس میں کوئی نیا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔بعض لوگ ہمیشہ سے زیادہ غضب ناک تھے اور باغیوں کو خوب کھری کھری گالیاں اور کوسنے دے رہے تھے۔دوسروں کے دلوں میں امید و بیم کا مبہم سا احساس تھا۔کچھ اور لوگوں کو، جن کی تعداد کم تھی اس بات سے بہت گہری مسرت حاصل ہو رہی تھی کہ لوگوں کو جوش دلانے کا سہرا ہمارے ہی سر ہے۔

پاویل اور آندری تقریباً ساری رات جاگتے رہتے۔صبح تڑکے گھر آتے۔ چہرے زرد، تھکے

ہارے، گلا بیٹھا ہوا۔ ماں کو معلوم تھا کہ یہ لوگ دلدل کے نزدیک اور جنگل میں جلسے منعقد کر رہے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گھوڑ سوار پولیس بستی کے چاروں طرف پہرہ دے رہی ہے اور یہ کہ خفیہ کے لوگ ہر جگہ رینگتے پھر رہے ہیں، الگ الگ مزدوروں کو پکڑ کر ان کی تلاشی لیتے ہیں اور کبھی کبھی کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کر لیتے ہیں۔ اسے احساس تھا کہ ہر لمحے اس کے بیٹے اور آندری کو گرفتاری کا خطرہ درپیش ہے اور وہ تقریباً یہ چاہنے لگی تھی کہ ایسا ہی ہو جائے کیونکہ اس کے خیال میں ان کے لئے یہی بہتر تھا۔

کسی نامعلوم سبب سے ٹائم کیپر کے قتل کا واقعہ دبا دیا گیا۔ دو دن تک مقامی پولیس تفتیش کرتی رہی لیکن تقریباً ایک درجن لوگوں کے بیان لینے کے بعد قتل میں انکی دلچسپی ختم ہو گئی۔

ماں سے بات چیت کے دوران ان میں ماریا کارسونو وا نے پولیس والوں کی رائے کا اظہار کر دیا جن کے ساتھ اس کے تعلقات اتنے ہی اچھے تھے جتنے ہر شخص کے ساتھ:

''بس ہو چکا قاتل گرفتار! اس روز صبح کو تقریباً سو آدمیوں نے ایسائی کو دیکھا تھا اور ان میں سے کم سے کم نوے ایسے ہوں گے جو اسے مار کر خوش ہوتے، سات برس سے ہر شخص کو تنگ کر رکھا تھا اس نے...''

خوخول میں بڑی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس کا چہرہ اور کھنچ گیا، آنکھیں سوج گئیں، جس کی وجہ سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں آدھی بند سی ہو گئیں، نتھنوں سے لے کر دھن کے کونوں تک باریک سی لکیریں نظر آنے لگیں۔ عام چیزوں کے متعلق وہ بہت کم باتیں کرنے لگا البتہ ایسے لمحات زیادہ آنے لگے جب وہ اپنے جذبات میں شدت محسوس کرتا اور اس وقت مستقبل کا خواب دکھا کر وہ سننے والوں کے رگ و پے میں جوش کی کہر دوڑا دیتا، اس مستقبل کا جہاں عقل اور آزادی کی حکمرانی ہو گی۔

ایسائی کے قتل کی بات آئی گئی ہو گئی۔

''یہ لوگ عوام کی کیا پرواہ کریں گے۔ ایسے لوگوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے جنہیں اپنے شکاری کتوں کی طرح ہم پر چھوڑتے ہیں۔ اپنے بھاڑے کے ٹٹوؤں کی موت سے انہیں کوئی غم نہیں ہوتا۔ صرف اپنے پیسے ضائع ہونے کا غم ہوتا ہے...''

اس نے تلخی سے مسکرا کر کہا۔

''بہت ہو گئی یہ بات آندری!'' پاویل نے سختی سے کہا۔

''سڑی گلی چیز انگلی لگاتے ہی گر جاتی ہے۔ اور نہیں تو کیا'' ماں نے کہا۔

یہ بات وہ اکثر کہتا اور جب وہ یہ کہتا تو الفاظ پھیل کر ایک کلیہ کی شکل اختیار کر لیتے جس میں تندی اور تلخی ہوتی...

...آخر کار وہ دن بھی آ گیا جس کا اتنے دنوں سے انتظار تھا۔ یکم مئی۔

کارخانے کی سیٹی حسب معمول تحکمانہ انداز میں بجی۔ ماں نے رات بھر ایک پلک بھی نہ جھپکائی تھی لیکن بستر سے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور سماوار کو فوراً سلگا دیا جسے اس نے شام ہی سے تیار کر لیا تھا۔ جسب معمول لڑکوں کے کمرے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اسے خیال آیا کہ ابھی کچھ ٹھیر جانا چاہئے، وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی اور ہاتھ کو منہ پر اس طرح رکھ لیا جیسے دانت میں سخت تکلیف ہو۔

ہلکے نیلے آسمان پر پیازی اور سفید رنگ کے بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے جیسے بڑی بڑی چڑیوں کے جھنڈ کارخانے سے نکلتی ہوئی بھاپ کی سرسراہٹ سے خوف زدہ ہو گئے ہوں۔ ماں خوابوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی بادلوں کو دیکھتی رہی۔ راتوں کو جاگنے کی وجہ سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں خشک اور سوجی ہوئی تھیں اس پر ایک عجیب وغریب طرح کا سکون طاری ہو گیا۔ دل معمولی انداز سے دھڑک رہا تھا اور ذہن میں سادہ اور عام سے خیالات تھے...

''سماوار ذرا جلدی سلگا دیا۔ پانی کھول کھول کر گرنے لگے گا...وہ دونوں بیحد تھکے ہوتے ہیں آج ذرا زیادہ سو لیں تو بہتر ہے...''

آفتاب کی ایک نوخیز کرن کھڑکی پر آ کر ناچنے لگی۔ اس نے کرن کی طرف ہاتھ بڑھایا اور جب وہ اس کے ہاتھ پر کھیلنے لگی اور اس نے ایک چمکیلی گرمی ہاتھ پر محسوس کی تو دوسرے ہاتھ سے اسے چپکے سے تھپتھپایا اور اس وقت اس کے لبوں پر غور وفکر میں ڈوبی ہوئی بڑی معصوم سی مسکراہٹ تھی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور سماوار سے پائپ کو ہٹا لیا۔ اس کے بعد منہ ہاتھ دھو کر عبادت کرنے لگی وہ ذوق وشوق سے اپنے جسم پر صلیب کا نشان بنا کر بے آواز طریقے سے ہونٹ ہلا رہی تھی۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور اسکی داہنی بھوں لرز رہی تھی۔

دوسری سیٹی میں وہ زور اور تحکم نہ تھا بلکہ موٹی نم آواز میں ایک خفیف سا ارتعاش تھا۔ ماں کو ایسا محسوس ہوا جیسے آج سیٹی سب دنوں سے زیادہ دیر تک بجتی رہی۔

دوسرے کمرے سے خوخول کی بھاری صاف آواز سنائی دی:

''سنتے ہو پاویل؟''

فرش پر کسی کے ننگے پیر چلنے کی آواز آئی اور دونوں میں سے کسی نے بڑی لمبی سی جمائی لی۔

''سماوار تیار ہے!'' ماں نے زور سے کہا۔

''ہم لوگ اٹھ رہے ہیں'' پاویل نے شگفتگی سے جواب دیا۔

''سورج نکل رہا ہے'' خوخول نے کہا۔ ''اور آسمان پر بادل ہیں آج بادل نہ ہوتے تو کیا برا تھا۔''

وہ باورچی خانے میں داخل ہوا تو آنکھوں میں نیند کا خمار باقی تھا لیکن بڑے اچھے موڈ میں تھا۔

''آداب ننکو! کیسی نیند آئی؟''

ماں اس کے نزدیک گئی اور بولی:

''اس کے ساتھ ساتھ چلنا اندریوشا۔''

''یقیناً!'' خوخول نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''یقین رکھو ننکو کہ جس وقت تک ہم دونوں ایک ساتھ ہیں ایک دوسرے کے ساتھ چلیں گے!''

''کیا کھسر پھسر کر رہے ہو تم دونوں؟'' پاویل نے دریافت کیا۔

''کوئی خاص بات نہیں پاشا۔''

''مجھ سے کہہ رہی ہیں ذرا صورت شکل ٹھیک کرلو! آج لڑکیاں تمہیں گھوریں گی!'' خوخول نے ڈیوڑھی میں منہ دھونے کے لئے جاتے ہوئے کہا۔

''اٹھو مزدور جہد کے لئے اٹھو!'' پاویل نے گنگنایا۔

دن چڑھنے کے ساتھ موسم خوشگوار ہوتا گیا۔ ہوا نے بادلوں کو منتشر کر دیا تھا۔ میز پر ناشتہ جماتے ہوئے ماں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور سوچتی رہی کہ یہ سب کچھ عجیب سا ہے۔ یہ لوگ آج صبح کو یہاں بیٹھے ہنس رہے ہیں اور خوش گپیاں کر رہے ہیں حالانکہ کسی کو نہیں معلوم کہ آج کے بعد کیا ہونے والا ہے اور نہ معلوم کس وجہ سے اسے بھی کچھ تسکین بلکہ خوشی سی محسوس ہوئی۔

وہ لوگ بڑی دیر تک ناشتہ کرتے رہے تاکہ انتظار کا بوجھ کم ہو سکے۔ پاویل نے حسب عادت اپنے گلاس میں شکر آہستہ آہستہ ملانا شروع کی، پھر اپنی روٹی پر۔ اسے کرکری روٹی بہت پسند تھی بہت احتیاط سے نمک چھڑکا۔ خوخول میز کے نیچے اپنے پاؤں ادھر کرتا رہا (وہ اپنے پیروں کو کبھی آرام سے نہ رکھ پاتا

تھا) اور ایک کرن کو دیکھتا رہا جو چائے پر پڑنے کے بعد مڑ کر دیوار اور چھت پر ناچ رہی تھی۔

''جب میں دس برس کا بچہ تھا تو ایک بار میرا جی چاہا کہ سورج کی فرن کو ایک گلاس میں بند کرلوں ''اس نے کہا۔ ''تو میں نے ایک گلاس لیا اور چپکے چپکے دھوپ کے ایک نقطے تک پہونچا۔ اور بھڑ سے گلاس اس پر اوندھا دیا! اپنے ہاتھ بھی کاٹ لئے اور اوپر سے مار بھی کھائی۔ مار کھانے کے بعد باہر احاطے میں چلا گیا اور جب ایک نالے میں میں نے سورج کو دیکھا تو جس قدر بھی ممکن ہوسکتا تھا اسکی طرف لپکا۔ ظاہر ہے سر سے پیر تک کیچڑ میں لت پت ہو گیا جس کی وجہ سے پھر مار پڑی، میں ایک ہی بدلہ لے سکتا تھا۔ سورج کو چڑھانے کیلئے زبان نکال کر بولا 'مجھے چوٹ نہیں آئی لال سر کے شیطان! بالکل چوٹ نہیں آئی!' اس سے مجھے کچھ تسکین ہوئی!''

''لال سے والے کیوں کہا تھا؟'' پاویل ہنسا۔

''ہماری سڑک کے اس پار ایک لال چہرے والا لوہار رہتا جس کی سرخ ڈاڑھی تھی، تھا بہت مرنجان خوش باش اور رحم دل انسان اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سورج اس سے ملتا جلتا ہے...''

جب ماں ان باتوں کو برداشت نہ کرسکتی تو بولی:

''یہ بات کیوں نہیں کرتے کہ آج جلوس میں کس طرح چلو گے؟''

''ایک بار جس چیز کا فیصلہ ہو چکا اس کے متعلق باتیں کرنے سے الجھن کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوگا'' خوخول نے نرمی سے کہا۔ ''ننکو، اگر ہم سب لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا تو نکولائی ایوانووچ آکر تمکو بتائیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔''

''اچھی بات ہے'' ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''ٹہلنے کیوں نہ چلیں؟'' پاویل نے جیسے کچھ خواب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسی حالت میں گھر ہی پر رہنا بہتر ہے'' آندری نے جواب دیا۔ ''وقت سے پہلے پولیس کی آنکھ میں کانٹا بن کر کیوں کھٹکو؟ تمہیں پہلے ہی سے اچھی طرح جانتے ہیں۔''

فیدور مازن دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور گال تمتمار ہے تھے۔ اس کے پرمسرت ہیجان نے ان لوگوں کے انتظار کی تکلیف کو ختم کردیا۔

''معاملہ شروع ہوگیا!'' اس نے کہا۔ ''لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ سڑکوں پر نکل آئے ہیں اور

چہرے ایسے ہو رہے ہیں جیسے درانتی، وسوف شیکوف اور واسیا گوسیف اور سموئلوف کارخانے کے پھاٹک پر کھڑے تقریریں کر رہے ہیں۔ بہت سے مزدور گھر واپس چلے گئے۔ چلو! چلنے کا وقت آ گیا۔ دس کبھی کے بج چکے؟...''

''میں تو چلتا ہوں!'' پاویل نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ذرا دیکھنا تو سہی!'' فیدور بولا۔ ''کھانے کے وقفے کے بعد سارا کارخانہ باہر نظر آئے گا!''

وہ دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔

''ایسا جل رہا ہے جیسے ہوا میں موم بتی'' ماں نے کہا۔ پھر وہ اٹھی اور اٹھ کر کپڑے بدلنے کے لئے باورچی خنانے میں چلی گئی۔

''تم کہاں جا رہی ہو ننکو؟''

''تم لوگوں کے ساتھ'' اس نے جواب دیا۔

آندری نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور پاویل کی طرف دیکھا۔ پاویل اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے اس کے نزدیک گیا۔

''میں تم کو روکنے کے لئے ایک لفظ بھی نہ کہوں گا ماں اور۔ تم بھی مجھ سے ایک لفظ نہ کہنا۔ سمجھیں؟''

''اچھی بات ہے، اچھی بات، خدا تمہیں اپنی حفاظت میں رکھے'' اس نے زیر لب کہا۔

27

جب وہ باہر آئی اور اسنے فضا میں ہیجانی اور پرامید آوازوں کی گونج سنی اور جب اس نے دیکھا کہ لوگ اپنے گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں سے متجسس نگاہوں سے اسے کے بیٹے اور آندری کو دیکھ رہے ہیں تو اس کی آنکھوں کے سامنے ہر چیز گھومنے لگی اور بھورے اور سبز رنگ کے مبہم سے امتزاج کے علاوہ اسے کچھ اور نظر نہیں آیا۔

لوگوں نے انہیں سلام کیا، اور اس بار ان کے الفاظ میں خاص اہمیت پوشیدہ تھی۔ دھیمی دھیمی آوازوں میں جو جملے کہے جا رہے تھے وہ اس کے کان تک پہونچ گئے:

''وہ جارہے ہیں لیڈر...''

''یہ کہنے کی بات نہیں کہ ہم لیڈروں کے جانتے ہیں...''

''میں نے کوئی نقصان پہونچانے کیلئے تھوڑا ہی کہا!...''

ایک دوسرے احاطے سے کسی نے غصے میں چیخ کر کہا:

''پولیس پکڑے گی اور سارا معاملہ ختم ہوجائے گا!''

''ایک بار پہلے بھی تو پکڑ چکی ہے!''

ایک عورت کی آہ وزاری کی آواز کھڑکی سے ہوتی ہوئی سڑک پر بھی آپہونچی:

''ذرا سوچو تو کیا کررہے ہو؟ اب تم بال بچوں والے آدمی ہو!''

وہ لوگ بے ٹانگوں والے زوسیموف کے گھر کے پاس سے ہوکر گذرے جسے ہر مہینے کارخانے سے وظیفہ ملتا تھا کیونکہ کام کرتے وقت اس کے پیر کٹ گئے تھے۔

''پاویل!'' وہ کھڑکی سے سر نکال کر چلایا۔''ابے غنڈے تیرا سر کچل کر رکھ دیں گے وہ لوگ! جب سر پر پڑے گی تو مزا چکھ لوگے!''

ماں کانپ اٹھی اور ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سر سے پاؤں تک غصے سے کانپ رہی تھی۔ اس نے اس لنجے لنگڑے انسان کے موٹے پھولے پھولے سے چہرے کو گھور کے دیکھا۔ اس نے گالی دے کر گردن اندر کرلی اور ماں قدم بڑھا کر تیز تیز چلتی اپنی بیٹے سے جا ملی اور اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی اور کوشش کرتی رہی کہ زیادہ پیچھے نہ رہ جائے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاویل اور آندری کسی چیز کا خیال ہی نہیں کررہے اور نہ ان جملوں کو محسوس کر رہے ہیں جو ان کے گزرتے وقت کہے جارہے تھے۔ وہ آہستہ خرامی اور سکون کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ ایک بار انہیں مرونوف نے روکا جو بہت منکسر مزاج اور ادھیڑ عمر کا انسان تھا اور جس کی ایماندارانہ اور اعتدال پسند زندگی کی وجہ سے ہر شخص اس کی عزت کرتا تھا۔

''تم بھی کام پر نہیں جارہے ہو، دانیلوایوانووچ؟'' پاویل نے دریافت کیا۔

''میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے، اس کے علاوہ آج کے سے دن کون ہے جسے سکون ہو...'' اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف غور سے دیکھا اور پھر دھیمی آواز میں کہا:

''لوگ کہتے ہیں تم لوگ آج ڈائرکٹر کے لئے مصیبت لانے والے ہو۔ کھڑکیاں وغیرہ توڑنے کا ارادہ ہے۔ کیوں؟''

''شراب تو پی نہیں گئے ہم لوگ'' پاویل بولا:

''ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ سڑک پر جھنڈے لے کر نکلیں اور کچھ گانے گائیں'' خوخول نے کہا۔ ''ہمارے گانے سننا۔ ان میں ہمارے اعتقاد کا اعلان ہے۔''

''تمہارے اعتقاد کے بارے میں تو مجھے سب کچھ معلوم ہے'' مرونوف نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے اخبار پڑھتا ہوں۔ اوہ پلا گیا نلوونا!'' اس نے ماں کی طرف اپنی تیز مسکراتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی بغاوت میں شامل ہو گئیں؟''

''چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے ایک بار عدل وانصاف کے ساتھ قدم ملا کر چلوں!''

''خوب، خوب!'' مرونوف نے کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ سچ ہی کہتے تھے کہ کارخانے میں پرچے تم ہی لاتی تھیں!''

''کون کہتا تھا؟'' پاویل نے دریافت کیا۔

''ہونہہ۔ وہ لوگ کہتے تھے۔ خیر، خدا حافظ، ذرا اپنا خیال رکھنا!''

ماں آہستہ سے مسکرائی۔ اسے بڑا اچھا معلوم ہوا کہ لوگ اس کے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں۔

''ماں، تم ایک نہ ایک دن اپنے کو جیل میں پاؤ گی'' پاویل نے ہنس کر کہا۔

آفتاب اونچا ہوتا چلا گیا اور اس نے موسم بہار کی فرحت بخش تازگی میں اپنی حرارت بھی شامل کر دی بادلوں کی رفتار میں کمی آ گئی تھی اور ان کے سائے ہلکے اور زیادہ شغاف ہو گئے تھے۔ سائے آہستہ آہستہ کبھی سڑکوں پر چلتے، کبھی گھروں کی چھتوں پر تیرتے کبھی لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے اور ایسا محسوس ہوتا جیسے ساری بستی کو صاف کر رہے ہیں، دیواروں اور چھتوں سے خاک دھول کو اور لوگوں کے چہروں سے اکتاہٹ کو پونچھ رہے ہیں۔ ہر چیز زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ آوازوں میں زیادہ کھنک تھی جس نے دور کی مشینوں کی بھنبھناہٹ کو ڈبو دیا تھا۔

ایک بار پھر کھڑکیوں اور احاطوں سے الفاظ کبھی اڑتے ہوئے کبھی رینگتے ہوئے ماں کے کان میں آنے لگے۔ الفاظ جن میں کمینگی اور خوف تھا، فکر مندی اور زدہ دلی تھی، لیکن اب وہ تردید کرنا چاہتی تھی،

اور اپنے احساس تشکر کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔ غرض کہ آج کی اس حیرت ناک رنگا رنگ زندگی میں حصہ لینا چاہتی تھی۔

ایک پتلی سی گلی کے نکڑ پر چند سو لوگ جمع تھے، وسوف شیکوف کی آواز وہاں بلند ہو رہی تھی:

''وہ لوگ ہمارے جسم سے خون اسی طرح نچوڑ لیتے ہیں جیسے رسے بھری میں سے رس'' اس کے الفاظ کچھ عجیب بھونڈے پن سے لوگوں کے سروں پر برس رہے تھے۔

''بالکل صحیح ہے!'' بہت سی کھردری آوازوں نے بہ یک وقت کہا۔

''لڑکا کوشش تو کر رہا ہے'' خوخول بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ جا کر اس کی مدد کی جائے۔''

اور اس سے پہلے کہ پاویل اسے روک سکتا وہ اپنے لمبے لوچ دار جسم کو بل دیتا مجمع میں داخل ہو چکا تھا جیسے کاگ میں پیچ کش داخل ہو جائے۔

''ساتھیو!'' اس نے اپنی بھرپور آواز میں چیخ کر کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں مختلف قومیں آباد ہیں۔ یہودی اور جرمن، انگریز اور تاتاری، لیکن میں نہیں مانتا۔ صرف دو قومیں ہیں۔ دو مخالف قومیں۔ امیر اور غریب۔ لوگوں کے لباس جدا ہوتے ہیں، زبان الگ ہوتی ہے، لیکن یہ تو دیکھو کہ مالدار فرانسیسی، مالدار انگریز محنت کشوں سے کیسا برتاؤ کرتے اور پھر معلوم ہوگا کہ ہم مزدوروں کے لئے وہ سب کے سب یکساں پاجی اور بدذات ہیں۔ لعنت ہو ان پر!''

مجمع میں کوئی ہنسا۔

''اور دوسری طرف دیکھو تو نظر آئے گا کہ فرانسیسی اور تاری اور ترکی مزدور سب کے سب بالکل ہم روسی مزدوروں کی طرح کتوں کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔''

گلی میں لوگ جوق در جوق آ رہے تھے اور اپنے پنجوں پر کھڑے گردنیں آگے کی طرف بڑھائے خاموشی سے سن رہے تھے۔

آندری نے اپنی آواز اونچی کی۔

''دوسری ملکوں کے مزدور اس سیدھی ساری سچائی کو سمجھ چکے ہیں اور آج یکم مئی کو...''

''پولیس!'' کوئی چلایا۔

چار گھوڑ نے سوار پولیس والے گلی میں گھس آئے۔ اپنے کوڑوں کو ہوا میں نچاتے ہوئے وہ چیخ

رہے تھے:

''مجمع منتشر کرو!''

لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی اور بادل ناخواستہ گھوڑوں کے آگے بڑھنے کے لئے راستہ بنادیا۔ کچھ لوگ احاطے کی دیوار پر چڑھ گئے۔

''یہ دیکھو! سور کے بچے گھوڑے پر بیٹھ کر آتے ہیں اور چیختے ہیں 'کپتان بہادر کو راستہ دو،!'' کسی نے بڑی بے باکی سے چلا کر کہا۔

خوخول سڑک کے بیچ میں کھڑا رہا۔ دو گھوڑے سر ہلاتے ہوئے اس کی طرف آرہے تھے۔ وہ ایک طرف کو ہو گیا اور اسی وقت ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ پاویل کے ساتھ رہو گے'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''اور یہاں دیکھو تو خود مصیبت میں تن تنہا سر ڈالے دے رہے ہو۔''

''ہزار بار توبہ'' خوخول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پلاگیا کی نس نس میں تکلیف دہ خوفناک سا درد پیدا ہو گیا جو اس کے وجود کی انتہائی گہرائی سے اٹھ رہا تھا اور جس کی وجہ سے اس کا سر چکرا رہا تھا، اور اسے کبھی خوشی محسوس ہوتی اور کبھی تکلیف۔ اس کا جی چاہا کہ کھانے کی سیٹی بج جائے۔

وہ لوگ چوراھے پر گرجا کے نزدیک آئے۔ تقریباً پانچ سو جوشیلے نوجوان اور بچے گرجا کے احاطے میں جمع تھے۔ مجمع کبھی آگے بڑھتا اور کبھی پیچھے ہٹتا تھا۔ لوگ بے چینی سے سر اٹھا اٹھا کر دور دیکھتے تھے جیسے کس چیز کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں۔ فضا میں ہیجانی سی کیفیت تھی۔ چند لوگ اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے انہیں کچھ نہیں معلوم کہ کرنا کیا چاہئے۔ کچھ لوگ بہادری دکھانے کے لئے ڈینگیں مار رہے تھے۔ عورتوں کی دبی دبی سی آوازیں مردوں سے التجا کرتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں جن کی طرف سے مرد چڑ کر واپس آجاتے تھے۔ کبھی کبھی دھیرے سے گالی دینے کی آواز آتی۔ اس پورے رنگ برنگ مجمع میں سے مخاصمت کی دھیمی بھنبھناہٹ اٹھ رہی تھی۔

''متنکا!'' ایک عورت کی نرم کپکپاتی ہوئی آواز آئی۔ ''اپنے اوپر رحم کرو!...''

''میری جان مت کھاؤ!'' جواب ملا۔

سیزوف کی رعب دار آواز میں سکون اور اعتماد تھا:

''نہیں، ہم نوجوان کو قربانی کا بکرا نہیں بننے دیں گے۔ ان میں ہم سے زیادہ سمجھ اور زیادہ ہمت ہے۔ دلدل کے کوپک کیلئے کون کھڑا ہوا تھا؟ یہی لوگ تھے اور ہمیں اس بات کو بھولنا نہیں چاہئے کہ اس کی وجہ سے انہیں جیل میں ڈال دیا گیا تھا اور فائدہ ہم سب نے اٹھایا...''

سیٹی کی آواز گونجی اور اپنے سیاہ شور میں لوگوں کی آوازوں کو نگل لے گئی۔ سارا مجمع جیسے کانپ سا اٹھا۔ جو لوگ بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے اور ایک لمحے کے لئے ہر شخص ساکت اور چوکنا سا ہو گیا۔ بہتوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔

''ساتھیو!'' پاویل کی گہری پاٹ دار آواز آئی۔ ماں کی آنکھوں میں گرم گرم آنسوؤں سے جلن سی ہونے لگی اور ایک ہی قدم میں وہ اپنے بیٹے کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ ہر طرف سے آ کر تمام لوگ پاویل کے گرد جمع ہو گئے جیسے مقناطیس کی طرف لوھے کے ٹکڑے کھنچ آتے ہیں۔

ماں نے اس کے چہرے کو دیکھا۔ اور اسے صرف اس کی غیور، جرأت مند، جلتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔

''ساتھیو! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آج ہم کھلم کھلا اعلان کریں گے کہ ہم کیا ہیں۔ آج ہم اپنا پرچم بلند کریں گے، عقل، عدل وانصاف اور آزادی کا پرچم!''

ایک لمبی سفید چھڑی ہوا میں لہرائی، پھر مجمع میں سما گئی اور اسے دو حصوں میں بانٹ کر نظروں سے پوشیدہ ہو گئی۔ پھر ایک لمحے بعد مزدور طبقے کا عالی شان سرخ پرچم لوگوں کے اوپر اٹھے ہوئے چہروں پر بلند ہوا جیسے کوئی بڑا سا سرخ پرندا اپنے پر کھولے ہوئے ہو۔

پاویل نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور پرچم میں لہریں پیدا ہوئیں۔ ایک درجن ہاتھوں نے پرچم کی سفید چھڑ کو تھام لیا اور ان ہاتھوں میں ماں کا ہاتھ بھی تھا۔

''مزدور طبقہ زندہ باد!'' پاویل نے نعرہ لگایا۔

جواب میں سینکڑوں آواز گونجیں۔

''زندہ باد سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی ہماری پارٹی، ساتھیو۔ ہمارے سارے تصورات کا سرچشمہ!''

مجمع میں جوش پیدا ہوگیا۔ جولوگ جھنڈے کی اہمیت سے واقف تھے وہ اس کی طرف چلے۔ اس طرح جلد ہی مازن، سموئلوف اور دونوں گوسیف مجمع میں گھستا گھستا آگے بڑھتا گیا اور ماں کو ایسا محسوس ہوا کہ دوسرے چمکتی ہوئی آنکھوں والے نوجوانوں نے جن سے وہ واقف نہیں تھی اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

''دنیا کے مزدور زندہ باد!'' پاویل نے نعرہ لگایا۔

اس کے جواب میں ہزاروں گلوں سے روح کو بیدار کرنے والا شور بلند ہوا جو نشاط و مسرت اور صلاقت و توانائی کے چڑھتے طوفان کی طرح تھا۔

ماں نے نکولائی اور ایک کسی اور کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا لیکن وہ روئی نہیں۔ اس کے گھٹنے کانپنے لگے اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے وہ کہتے رہی:

''میرے بچو...''

نکولائی کے چیچک زدہ چہرے پر کشادہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جھنڈے کی طرف دیکھتے اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ زیر لب کچھ بولا پھر دفعتاً اس نے یہی ہاتھ ماں کے گلے میں ڈال دی اور اسے پیار کیا اور ہنس پڑا۔

''ساتھیو!'' خوخول نے شور کے درمیان اپنی رسیلی اور نرم آواز کو اونچا کرتے ہوئے تقریر شروع کی۔ ''ہم نے ایک نئے خدا کے نام پر جہاد شروع کیا ہے، روشنی اور عقل، نیکی اور صداقت کا خدا۔ ہماری منزل مقصود بہت دور ہے لیکن ہمارا کانٹوں کا تاج نزدیک ہی ہے، جس کسی کو صداقت کی فتح پر یقین نہیں ہے، جس کسی میں اس صداقت کے لئے اپنی جان قربان کرنے کی ہمت نہیں ہے، جس کسی کو خود اپنی قوت پر بھروسہ نہیں ہے اور مشکلات سے ڈر لگتا ہے تو وہ ایک طرف ہو جائے! ہم اپنی صفوں میں صرف انہی کو چاہتے ہیں جنہیں ہماری فتح پر یقین ہے! جو منزل کو نہیں دیکھ سکتے انہیں ہمارے ساتھ قدم ملا کر نہ چلنا چاہئے کیونکہ آخر میں انہیں افسوس ہوگا۔ ساتھیو، ان صفوں میں شامل ہو جاؤ! آزاد انسانوں کا جشن زندہ باد، یکم مئی زندہ باد!''

مجمع کچھ اور گنجان ہوگیا۔ پاویل نے پرچم کو اٹھالیا اور جب وہ اسے لے کر آگے بڑھا تو جھنڈا ہوا میں لہرانے لگا اور جب دھوپ میں چمکا تو ایسا معلوم ہوا جیسے بڑی کشادہ دلی اور تابناکی سے مسکرا رہا ہو...

فیدور مازن نے گانا شروع کیا:

''پرانی دنیا کو ہمیشہ کیلئے ٹھکراتے ہوئے...''

دوسرے مصرعے میں درجنوں آوازوں جنیاس کا ہاتھ دیا:

''ہم اپنے پیروں سے اس کی خاک کو جھاڑ دیتے ہیں!...''

ماں مازن کے پیچھے چل رہی تھی۔ اس کے لبوں پر تابناک مسکراہٹ کھیل رہی تھی اوراس کی آنکھیں فیدور کے سر سے پرے جھنڈے پراوراپنے بیٹے پر جمی ہوئی تھیں۔اس کے چاروں طرف ہنس مکھ چہرے اور مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔اور سامنے اس کا بیٹا اور آندری آگے بڑھتے جارہے تھے۔دونوں کے گانے کی آواز اس کے کانوں میں آرہی تھی۔آندری کی پرشوکت گونجتی ہوئی آواز پاویل کی گہری مترنم آواز میں مل رہی تھی:

''اٹھومزدورو جہد کے لئے اٹھو! اٹھوتم جومحنت کرتے اور فاقے کرتے ہو!''

لوگ دوڑتے ہوئے سرخ پرچم کو دیکھنے کے لئے آرہے تھے، دوڑ ہوئے وہ چیخ رہے تھے لیکن ان کا شور گیت کی آواز سے دبا جارہا تھا۔ یہ وہی گیت تھا جو ماں کے گھر میں دوسرے گیتوں کے مقابلے میں زیادہ نرمی اور دھیرج سے گایا جاتا تھا لیکن جواب تمام بندھنوں کو توڑ کر ایک عظیم الشان قوت کے ساتھ سڑکوں پر گونج رہا تھا۔اس میں ناقابل تسخیر جرات کی گونج تھی اورایک طرف وہ لوگوں کو مستقبل کی طرف جانے والے طویل راستے کو اختیار کرنے کی دعوت دے رہا تھا تو دوسری طرف ان پر صاف طور پر یہ حقیقت بھی واضح کئے دے رہا تھا کہ راستے میں کتنی دشواریاں، کتنی کٹھنائیاں ہیں۔گیت کے پرسکون شعلے نے ان تمام چیزوں کے سیاہ اور مکر، وہ میل کچیل کے رنگ خوردہ ڈھیروں کو جلا کر بھسم کر ڈالا اور نئی زندگی کے خوف کو جلا کر راکھ کر دیا۔

کسی کا چہرہ، جس پر خوف بھی تھا اور مسرت بھی، ماں کے نزدیک آیا اور ایک کانپتی تھرتھراتی آواز نے کہا:

''متیا! تم کہاں جارہا ہو؟''

''جانے دو اسے'' ماں نے رکے بغیر کہا۔''مت فکر کرو اس کی، پہلے مجھے بھی ڈر لگتا تھا۔میرا بیٹا وہاں سب سے آگے ہے۔وہ جس کے ہاتھ میں جھنڈا ہے۔''

''کہاں جا رہے ہو احمقو! وہاں فوجی تعینات ہیں!''

دفعتاً اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ میں ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس لمبی عورت نے کہا:

''ارے بہن ذرا سنو تو کیسا گا رہے ہیں یہ لوگ؟ اور میرا متیا بھی!''

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں'' ماں نے سمجھایا۔''ان کا مقصد زندگی مقدس ہے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ اگر لوگ یسوع کی خاطر اپنی جان نہ دیتے تو خود یسوع کا وجود کیسے ہوسکتا تھا؟''

یہ تصور دفعتاً اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا اور اپنی صاف اور سیدھی سادی صداقت کے ساتھ ماں کے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا۔ اس نے اس عورت کی طرف دیکھا جو مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی۔

''اگر لوگ اس کی خاطر، خدا کی خاطر اپنی جان نہ دیتے تو یسوع کہاں ہوتا!'' اس نے ایک متحیر مسکراہٹ کے ساتھ دہرایا۔

سیزوف اس کے نزدیک آنا۔

''آج تو لوگ کھلم کھلا جلوس میں جا رہے ہیں ماں!'' اس نے ٹوپی اتار کر ہاتھ ہلاتے ہوئے گانے کو تال دی۔''گانا ہو رہا ہے، اور گانا بھی کیسا ماں کیوں؟''

''جنگ پر بھیجنے کے لئے زار سپاہی چاہتا ہے۔ تو اپنے بیٹوں کو اس کے حوالے کو دو...''

''کسی چیز سے بھی نہیں ڈرتے'' سیزوف نے کہا۔''اور میرا بچہ بچارا قبر میں لیٹا ہے...''

ماں کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ پیچھے رہ گئی تھی۔ جلدی ہی اسے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا گیا اور پھر دھکے کھاتی وہ احاطے کی دیوار کے پاس آ گئی اور لوگ ایک بہت بڑی لہر کی طرح اس کے پاس سے آگے بڑھتے ہوئے گزر گئے۔ لوگ بہت تھے اور اس بات سے اسے خوشی ہوئی۔

''اٹھو مزدور وجہد کے لئے اٹھو...''

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک بہت بڑا سا پتیل کا بھونپو گیت کو فضا میں بکھیر رہا ہو، وہ لوگوں کو بیدار کرتا، کسی کو جدوجہد پر اکساتا، کسی کو ایک شعلہ بداماں تجسس میں گرفتار کرتا، نشاط ومسرت کے ایک مبہم سے احساس سے آشنا کرتا اور کسی نئی چیز کا دھندلا دھندلا خواب دکھاتا، چلا جا رہا تھا۔ اس نے یہاں کسی کے دل میں لرزاں وترساں امیدوں کی ایک ہلکی سی لہر پیدا کی تو وہاں مدت دراز کے مجتمع غصے کے طوفان

کے لئے دروازے کھول دیئے۔ ہر شخص ادھر دیکھ رہا تھا جہاں سرخ پرچم ہوا میں لہرا رہا تھا۔

''وہ جارہے ہیں'' کسی نے چیخ کر کہا۔آواز وجد وانبساط سے لبریز تھی۔''شاباش، دوستو!''

اور چونکہ وہ شخص کوئی بہت عظیم الشان بات کہنا چاہتا تھا جو عام الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکتی تھی اس لئے اس نے ایک بھدی موٹی سی گالی دی۔لیکن کینہ، ایک غلام کا تاریک، اندھا کینہ ایک ایسے سانپ کی طرح پھنکاریں مار رہا تھا جس پر سورج کی کرن پڑی ہو اور بل کھاتا ہوا تلخ وتند الفاظ کا روپ دھار رہا تھا:

''کافر!'' کوئی ایک مکان کی کھڑکی سے گھونسا دکھاتے ہوئے چیخا۔

''ملک معظم کے خلاف، ملک معظم زار کے خلاف بغاوت کر رہے ہیں! بغاوت!'' ماں کے کان میں ایک روتی جھینکتی ہوئی سی آواز آئی۔

مرد اور عورتیں آگے بڑھتے گئے اور ماں کو لوگوں کے پریشان چہروں کی جھلکیاں نظر آتی رہیں۔مجمع لاوے کی طرح آگے بڑھتا ہی جارہا تھا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گیت اپنے سامنے ست ہر چیز کو ہٹاتا، سڑک کو صرف اپنی قوت سے صاف کرتا مجمع کو اور آگے بڑھاتا جارہا ہے۔ماں نے دور، اوپر لال جھنڈے کو لہراتے دیکھا تو اس کی تصور کی نگاہوں کے سامنے اس کے بیٹے کا چہرہ گھوم گیا۔اس کے تمتمائے ہوئے ماتھے پر اور اس کی آنکھوں میں اعتقاد کی روشنی چمک رہی تھی۔

اب وہ جلوس میں سب سے پیچھے رہ گئی تھی اور ایسے لوگوں کے ساتھ تھی جو دھیرے دھیرے اطمینان سے چل رہے تھے اور ایسے تماشائیوں کی طرح بے نیازانہ سردمہری کے ساتھ ہر چیز کو دیکھ رہے تھے جنہیں تماشے کا انجام معلوم ہو۔وہ لوگ غیر جذباتی آواز اور تیقن کے لہجے میں باتیں کر رہے تھے:

''ایک کمپنی مدرسے کے پاس اور ایک کارخانے کے پاس تعینات ہے...''

''گورنر آگیا ہے...''

''سچ!''

''میں نے خود دیکھا ہے، ابھی تھوڑی دیر ہوئے تو آیا ہے۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ ڈرنے لگے ہیں''

ہم سے۔ذرا سوچو تو۔فوج اور گورنر!'' بولنے والے نے خوش ہو کر گالی دی۔

''اوہ، تم بھلے لوگوں!'' ماں نے سوچا۔

لیکن جو الفاظ اس نے سنے وہ سرد اور مردہ سے تھے۔ ان لوگوں سے دور ہو جانے کے لئے اس نے قدم تیز کر دیئے۔ کہ ان لوگوں دور ہو جانے کے لئے اس نے قدم تیز کر دیئے۔ وہ لوگ ایسے آہستہ آہستہ اور سستی سے قدم بڑھا رہے تھے کہ ان سے آگے نکل جانا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

دفعتاً ایسا محسوس ہوا جیسے جلوس کا اگلا سرا کسی چیز سے ٹکرایا اور اس کی وجہ سے جلوس باقی حصہ ایک ڈرے ہوئے شور کے ساتھ پیچھے ہٹا۔ گیت بھی تھرتھرایا اور پھر اور زیادہ بلند ہو گیا اور تال اور تیز ہو گئی۔ لیکن کچھ دیر بعد آواز پھر رک گئی۔ ایک ایک کر کے لوگوں نے گانا بند کر دیا صرف کچھ الگ الگ آوازیں سنائی دیرہی تھیں جو گانے کو اٹھا کر اس کی پہلی سی عظمت و عروج پر پہونچا دینا چاہتی تھیں:

''اٹھو مزدور و جہد کے لئے اٹھو!

اٹھو تم جو محنت کرتے اور فاقت کرتے ہو!...''

لیکن اس کوشش میں وہ پہلی سی اجتماعی خواہش نہ تھی اسے کچھ نہ معلوم وہ سکا کہ آخر ہوا کیا۔ اس نے جلوسیوں کو ادھر ادھر دھکے دے کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ آگے بڑھتے ہوئے وہ ان لوگوں سے ٹکراتی رہی جو پیچھے ہٹ رہے تھے، کچھ کی تیوریوں پر بل تھے اور سر جھکے ہوئے تھے، کچھ پریشان ہو کر مسکرا رہے تھے اور کچھ طنزیہ انداز میں سیٹی بجا رہے تھے، وہ ان کے چہروں میں کچھ تلاش کرتی رہی، اس کی آنکھوں میں سوال تھے، التجا تھی اپیل تھی...

''ساتھیو!'' پاویل کی آواز آئی۔ ''فوجی بھی اسی قسم کے انسان ہیں جیسے ہم ہیں! وہ لوگ ہم پر ہاتھ نہ اٹھائیں گے اور کیوں اٹھائیں؟ صرف اس لئے کہ ہم ایسی صداقت کا اعلان کرتے ہیں جس سے ہر ایک کو واقف ہونا چاہئے؟ انہیں بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ہمیں۔ ہوسکتا ہے انہیں ابھی اس بات کا احساس نہ ہو لیکن وہ وقت دور نہیں جب قتل اور غارت گری کے پرچم کے نیچے ہماری مخالفت کرنے کے بجائے یہ سب لوگ آزادی کے پرچم کے نیچے ہمارے ساتھ آئیں گے، اور صداقت کے متعلق ان کی سمجھ بوجھ کو جلدی بڑھانے کے لئے ہمیں آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ آگے بڑھو، ساتھیو! آگے بڑھو!''

پاویل کی آواز میں عزم تھا۔ اس کے الفاظ بہت واضع اور صاف تھے لیکن مجمع منتشر ہونے لگا۔ ایک ایک کر کے لوگ جلوس کی صفوں سے پیچھے رہتے گئے، کچھ گھروں کی طرف چلے گئے اور کچھ باڑوں سے سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ جلوس نے اب ای گاؤدم مثلث کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے

سرے پر پاویل تھا اور مزدوروں کا سرخ پرچم اس کے سر پر تانبا کی کے ساتھ لہرا رہا تھا یا شاید جلوس ایک سیاہ پرند سے زیادہ مشابہ تھا جو پروں کو پھیلائے اڑ جانے کے لئے تیار تھا اور پاویل اس پرند کی منقار کی جگہ پر تھا...

ماں نے دیکھا کہ سڑک کے سرے پر بے چہرہ لوگوں کی یک رنگی بھوری سی دیوار چوک کے داخلے کا راستہ روکے کھڑی ہے۔ ان میں سے ہر شخص کے کاندھے پر سنگینیں بے رحمی سے چمک رہی تھیں اور اس خاموش بے حس وحرکت دیوار سے ایک سرد برفانی سانس نکل رہا تھا جس نے مزدوروں کو محیط کر لیا تھا اور جس نے ماں کے دل کو خوف زدہ کر دیا۔

ماں ادھر ادھر دھکے دے کر مجمع کے درمیان اپنے لئے راستہ بنانے لگی تا کہ اس مقام تک پہنچ جائے جہاں جھنڈے کے گرد لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں وہ جانتی تھی اور ایسی بھی تھے جن سے وہ واقف نہیں تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دوست ان انجانے لوگوں سے مدد اور تائید کے خواہاں ہیں۔ وہ ایک لمبے ڈاڑھی مونچھیں صاف کانے شخص کی پیٹھ سے ٹکرا گئی۔

''کون ہو تم؟'' اس نے سر کو کچھ موڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''پاویل ولاسوف کی ماں ہوں'' اس نے کہا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے گھٹنے جواب دے رہے ہیں اور اس کا نچلا ہونٹ کانپ رہا ہے۔

''آہا!'' کانے شخص نے کہا۔

''ساتھیو!'' پاویل نے کہا۔ ''ساری زندگی ہمیں آگے بڑھتے رہنا چاہئے۔ ہمارے لئے قطعی کوئی اور راستہ نہیں!''

لوگ خاموش اور متوقع ہو گئے۔ جھنڈا اوپر اٹھا، ایک لمحے کے لئے تھرتھرایا، پھر لوگوں کے سروں پر تیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا کیونکہ اسے فوجیوں کی بھوری دیوار کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ماں لرز اٹھی، اور ایک ہچکی سی لے کر اس نے آنکھیں بند کر لیں: صرف چار آدمی۔ پاویل، آندری، سموئلوف اور مازن۔ مجمع سے الگ ہو گئے تھے۔

ہوا میں فیدور مازن کی واضح آواز تیرنے لگی:

''ہم شہید ہوئے ایک عالی شان قربانی دی...''

اور دھیمے سروں میں اس کا جواب اس طرح ملا جیسے کوئی گہرا ٹھنڈا سانس بھر رہا ہو:

''اس نامساوی جنگ میں...''

وہ لوگ موسیقی کو تال دیتے ہوئے آگے بڑھے۔

فیدور کی آواز ایک چمکتے ہوئے فیتے کی طرح کھلتی گئی جس میں بھرپور اعتماد تھا اور جو اس عزم کا اعلان کر رہی تھی:

''تم نے کچھ قربان کر دیا جو تمہارے پاس تھا...''

اور اس کے ساتھیوں نے دوسرا مصرعہ اٹھایا:

''آزادی کی خاطر...''

''آہا!'' کسی نے کونے میں خوشی کا اظہار کیا۔ ''نوحہ پڑھ رہے ہیں حرامزادے!...''

''دنیا ایک ہاتھ اسے!'' غصے میں بھری ہوئی ایک آواز آئی۔

ماں نے اپنے سینے کو ہاتھوں سے دبایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ مجمع جو پہلے ساری سڑک پر پھیلا ہوا تھا اب ان چار آدمیوں کو جھنڈا لے کر آگے جاتے ہوئے دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ کوئی ایک درجن جلوسی ان کے پیچھے چلے لیکن ہر قدم پر کوئی نہ کوئی پیچھے رہ جاتا جیسے سڑک کے پتھروں سے ان کے پیر جلے جا رہے ہوں۔

''تشدد کا خاتمہ ہوگا...''

فیدور نے پیغمبرانہ انداز میں گایا اور بھرپور آوازوں کے کورس نے اس کے جواب میں پر یقین اعلان کیا:

''لوگ بیدار ہوں گے!...''

لیکن خوفزدہ سرگوشیاں گانے کے ساتھ مل گئی تھیں:

''اب حکم دیا ہی جانے والا ہے...''

اور اسی وقت سامنے سے ایک تیز سی آواز آئی:

''بندوقیں تان لو!''

سنگینیں لہراتی ہوئی گئیں یہاں تک کہ آگے بڑھتے ہوئے پرچم کا مکارانہ فولادی مسکراہٹ کے

ساتھ خیر مقدم کرنے لگیں۔

''آگے بڑھ جاؤ!''

''وہ آ گئے'' کانے آدمی نے اپنے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک طرف جاتے ہوئے کہا۔

ماں پلک جھپکائے بغیر یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ فوجیوں کی بھوری سی لہر سڑک کی پوری چوڑائی پر پھیل گئی اور بے رحمانہ استقلال کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ سنگینوں کی سیمیں کلغیاں سامنے چمک رہی تھیں۔ چند تیز ڈگ بھر کر وہ اپنے بیٹے کے نزدیک آ گئی اور اس نے دیکھا کہ آندری اپنے لمبے جسم سے پاویل کی حفاظت کرنے کے لئے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''اپنی جگہ پر جاؤ کامریڈ!'' پاویل نے تیز لہجے میں کہا۔

آندری سر کو بلند کئے ہاتھوں کو پیٹھ پر باندھے گا رہا تھا۔ پاویل نے کاندھے سے اسے دھکا دیا اور ایک بار پھر چلا کر کہا:

''پیچھے ہٹو! تمہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں! پہلے جھنڈے کو آگے جانا چاہئے۔''

''من۔ت۔شر ہو جاؤ!'' ایک مختصر سے افسر نے اپنی تلوار کو گھماتے ہوئے باریک سی آواز میں حکم دیا۔ وہ اپنے قدم اوپر اٹھا کر بغیر گھٹنے جھکائے ہوئے چلتا اور اپنے جوتوں کے تلوں سے زمین پر سختی سے دھب دھب کرتا جا رہا تھا۔ ماں کو ان جوتوں کی چمک کا احساس تھا۔

ایک لمبا آدمی جس کی ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی اور گھنی سی سفید مونچھیں تھیں، اس سے ذرا پیچھے ہٹ کر چل رہا تھا۔ اس کے لمبے خاکی کوٹ کا استر سرخ رنگ کا تھا اور اس کے پتلوں کے دونوں پائنچوں ایک چوڑی زرد دھاری پڑی ہوئی تھی۔ خوخول کی طرف وہ بھی ہاتھ پیچھے باندھ کر چل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پاویل پر جمی ہوئی تھیں اور گھنی بھوویں اوپر کی طرف کھنچی ہوئی تھیں۔

ماں کی نظریں ان تمام چیزوں کا احاطہ نہ کر سکیں جو اس نے دیکھی تھیں۔ اس کے سینے میں ایک دلخراش چیخ بند تھی جو ہر سانس کے ساتھ باہر نکل جانا چاہتی تھی، اس چیخ سے اس کا دم گھٹنے لگا لیکن اس نے سینے کو ہاتھوں سے دبا لیا اور اسے روکے رہی۔ لوگ اسے دھکے دے رہے تھے اور خالی الذھن سی ہو کر تقریباً بے ہوش کے عالم میں آگے بڑھتے ہوئے وہ کچھ جھوم سی رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے مجمع کم ہوتا جا رہا ہے۔ آگے بڑھتی ہوئی سرد لہر نے ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے تھے۔

سرخ پرچم کو اٹھائے ہوئے لوگ اور آگے بڑھ گئے اور خاکی وردیوں والے لوگوں کی دیوار اور زیادہ نزدیک آ گئی یہاں تک کہ وہ فوجیوں کا مشترکہ چہرہ دیکھ سکتی تھی۔ایک مسخ شدہ چہرہ ایک مٹیالے زرد رنگ کی قطار میں گھس پڑا جو سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی اور جس پر ناہموار طریقے سے رنگ برنگی آنکھیں چمک رہی تھیں۔اس قطار کے سامنے جلوسیوں کے سینوں کو نشانہ بنائے ہوئے فولاد کے بے رحم سرے چمک رہے تھے۔یہ فولاد انہیں ہاتھ لگائے بغیر ہی ایک کے بعد ایک کو الگ کرتا گیا اور اس طرح مجمع منتشر ہو گیا۔

ماں کو اپنی پشت پر لوگوں کے بھاگنے کی آواز آئی۔کچھ لوگ ہیجانی آوازوں میں چیخ رہے تھے:

''منتشر ہو جاؤ،لوگوں!''

''بھاگ چلو ولاسوف!...''

پیچھے ہٹ جاؤ پاویل!''

''جھنڈا چھوڑ دو پاویل!'' وسوف شیکوف نے جھلا کر کہا۔''مجھے دو،میں چھپا دوں گا!''

اس نے چھڑ کو پکڑ لیا۔پرچم پیچھے کی طرف مڑا۔

''ہٹو،جانے دو!'' پاویل چیخا۔

نکولائی نے تیزی سے اپنا ہاتھ گھسیٹ لیا جیسے جل گیا ہو۔گیت ختم ہو گیا۔لوگ رک گئے،اور انہوں نے پاویل کے چاروں طرف ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی۔لیکن وہ آگے بڑھتا گیا۔دفعتاً غیر متوقع طور پر سناٹا چھا گیا۔جیسے خاموشی نے کہیں اوپر سے آکر تمام لوگوں کو ایک غیر مرئی بادل میں لپیٹ لیا ہو۔

زیادہ نہیں،تقریباً بیس آدمی پرچم کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔لیکن وہ قدم جمائے کھڑے رہے۔ماں اپنی تشویش میں اور ان سے کچھ کہنے کی مبہم خواہش میں ان تک پہنچ گئی۔

''چھین لو جھنڈا اس کے ہاتھوں سے لفٹننٹ!''بوڑھے لمبے سے شخص نے پرچم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پستہ قد افسر پاویل کی طرف دوڑتا ہوا آیا اور اس نے جھنڈے کو پکڑ لیا۔

''چھوڑو!'' وہ چلایا۔

''ہٹاؤ اپنے ہاتھ!'' پاویل نے اونچی آواز میں کہا۔

پرچم چمکتا ہوا ہوا میں لہرایا، دائیں طرف جھکا اور پھر بائیں طرف جھکا اور ایک بار پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پستہ قد افسر پیچھے کی طرف اچھلا اور گر پڑا۔ نکولائی ماں کے نزدیک سے تیزی سے گھونسا دکھاتا ہوا دوڑا۔

''گرفتار کر لو انہیں!'' بوڑھے شخص نے پیر پٹکتے ہوئے چلا کر کہا۔

بہت سے فوجی دوڑ پڑے۔ ایک نے اپنی بندوق کا کندا گھمایا۔ پرچم تھر تھرایا، آگے کی طرف جھکا اور پھر خاکی وردی والے فوجیوں کے درمیان گر کر غائب ہو گیا۔

''آہ!'' کوئی تلخی سے چیخا۔

ماں ایک زخمی درندے کی طرح چیخ پڑی۔ جواب میں پاویل کی واضح آواز فوجیوں کے درمیان سے آئی:

''خدا حافظ ماں! خدا حافظ!''

ماں کے ذہن میں بہ یک وقت دو خیال کوند گئے: ''وہ زندہ ہے۔ اس نے مجھے یاد رکھا!''

''خدا حافظ میری ننکو!''

انہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے وہ پنجوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ دور فوجیوں کے سروں کے اوپر اسے آندری کا چہرہ نظر آیا۔ وہ مسکرا کر اسے سلام کر رہا تھا۔

''آہ میرے کلیجے کے ٹکڑو۔ آندریوشا! پاشا!...'' وہ چلائی۔

خدا حافظ ساتھیو!'' انہوں نے فوجیوں کے درمیان سے چیخ کر کہا۔

ٹکڑے ٹکڑے ہوتی ہوئی کثیر الاواز صدائے بازگشت نے ان کا جواب دیا۔ یہ آواز کھڑکیوں سے، کہیں اوپر سے، یہاں تک کہ چھتوں سے آئی۔

کس نے ماں کی چھاتی میں زور سے کچھ مارا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے مختصر افسر کے سرخ چہرے کو جس پر ایک تناؤ سا تھا محض دھندلے سے طریقے سے دیکھ سکی۔

''ہٹتی ہے یا نہیں عورت!'' وہ چلایا۔

ماں نے ایک نظر میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے پیروں کے پاس جھنڈے کی چھڑ دو

ٹکڑوں میں ٹوٹی پڑی ہوئی تھی، ایک ٹکڑے پر لال کپڑے کا سرا اب تک بندھا ہوا تھا۔ ماں نے جھک کر اس ٹکڑے کو اٹھالیا۔ افسر نے اس کے ہاتھ سے اسے چھین لیا اور چیختے پیر پٹکتے ہوئے اسے ایک طرف دھکا دیا:

''میں کہتا ہوں چلی جا یہاں سے!''

فوجیوں کے درمیان سے ایک گیت بلند ہوا:

''اٹھو مزدور و جہد کے لئے...''

ہر چیز چکرائی، تھرتھرائی اور کانپ گئی، فضا ایک عجیب ڈراؤنی سی آواز سے پر تھی جو بجلی کے تاروں کی جھنجھناہٹ سے ملتی چلتی تھی۔ افسر دوڑ کر ادھر گیا:

''بند کرو گانا!'' وہ غصے سے چلایا۔ ''سارجنٹ میجر کرائنوف!...''

ماں آہستہ آہستہ وہاں تک گئی جہاں افسر نے جھنڈا کے ٹکڑے کو پھینک دیا تھا۔ اس نے اسے پھر اٹھا لیا۔

''بند کرو ان بے ہودہ لوگوں کے منہ!...''

گیت نے مزاحمت کی، کانپا، رکا اور پھر خاموش ہو گیا، کسی نے ماں کا کاندھا پکڑ کر موڑا اور اسے ساتھ لے جاتے ہوئے کہتا رہا:

''چلی چلو یہاں سے، چلی چلو!''

''ہٹ جاؤ سڑک سے!'' افسر چلایا۔

چند قدم پر ماں کو کچھ لوگوں کا مجمع نظر آیا، چیختے، گالیاں دیتے، سیٹیاں بجاتے، وہ لوگ سڑک پر پیچھے ہٹتے جا رہے تھے اور آخر گھروں کے احاطوں میں غائب ہو گئے۔

''ہٹ یہاں سے چڑیل!'' بڑی بڑی مونچھوں والے ایک نوجوان فوجی نے بالکل ماں کے کان میں چیخ کر کہا، اور اسے سڑک کے کنارے تک ڈھکیل آیا۔

ماں جھنڈے کی چھڑ سے لاٹھی کی طرح سہارا لیتی چلتی رہی کیونکہ اس کے گھٹنے جواب دے چکے تھے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ دیواروں اور باڑوں کا سہارا لے رہی تھی کہ کہیں گر نہ پڑے۔ اس کے پاس سے لوگ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے اور اس کے پیچھے اور اس آس پاس فوجی چیختے پھر رہے تھے:

’’چلو ہٹو یہاں سے!...‘‘

اس نے فوجیوں کو اپنے پاس سے گذر جانے دیا۔ پھر اس نے رک کر چاروں طرف دیکھا، سڑک کے آخر میں اور بہت سے فوجی قطار میں کھڑے تھے تا کہ چوک میں کوئی داخل نہ ہو سکے جو خالی پڑا ہوا تھا ۔اور ماں کے سامنے کے خاکی وردی والے سپاہی لوگوں کو مسلسل پیچھے کی طرف دھکیل رہے تھے۔

وہ واپس جانا چاہتی لیکن غیر ارادی طور پر ایک بار پھر اس کے قدم آگے کی طرف بڑھنے لگے یہاں تک کہ وہ ایک تنگ و ویران گلی کے نکڑ پر پہونچ گئی جس می وہ مڑ گئی۔

وہ پھر رک گئی، گہرا سانس لے کر سننے لگی، کہیں دور سے مجمع کی مدہم آواز آ رہی تھی۔

لاٹھی کا سہارا لیتی وہ ایک بار پھر چل پڑی، پسینے می شرابور، بھوویں پھڑک رہی تھیں ہونٹ ہل رہے تھے اور ہاتھ اشارے کر رہے تھے کیونکہ بے ربط سے الفاظ اس کے ذہن میں چنگاریوں کی طرح چمک اٹھے تھے اور یہ چنگاریاں زیادہ روشن ہوتی جا رہی تھیں یہاں تک کہ وہ ایک وسیع، بھرپور خواہش کے شعلے میں تبدیل ہوگئیں، یہ خواہش کہ انہیں زبان مل جائے، کہ کوئی بہ آواز بلند ان کا اظہار کر دے۔

گلی دفعتاً بائیں طرف مڑ گئی اور ماں نے دیکھا کہ نکڑ پر بہت سے لوگ کھڑے ہیں

’’سنگینوں کی قطار کے سامنے جانا کوئی ہنسی کھیل نہیں دوستو!‘‘ کسی نے اونچی مضبوط آواز میں کہا۔

’’ارے تم نے کبھی پہلے بھی ایسا نظارہ دیکھا تھا؟ سنگینیں ہیں کہ ان کی طرف چلی آ رہی ہیں اور وہ قدم جمائے کھڑے ہیں! بالکل پہاڑ کی طرح میرے بھائی، اور خوف کا تو نام ونشان نہیں!...‘‘

’’کیا آدمی ہے پاویل ولاسوف بھی!‘‘

’’اور خوخول؟‘‘

’’ہاتھ پیچھے باندھے اور تمام وقت مسکراتا ہوا انتہا درجے کا نڈر اور بے باک!‘‘

’’دوستو!‘‘ ان کے درمیان جاتے ہوئے ماں نے کہا۔ لوگوں نے بڑی عزت سے اس کے لئے راستہ بنا دیا۔ کوئی شخص ہنسا:

’’دیکھو اس کے ہاتھ میں جھنڈا ہے! جھنڈا ہے اس کے ہاتھ میں!‘‘

خاموش رہو!‘‘ ایک سخت، درشت آواز نے کہا۔

ماں نے اپنے ہاتھوں کو پوری طرح پھیلا دیا۔

''سنو۔ خدا کے نام پر! میرے اچھے دوستو، میرے عزیز دوستو، آنکھیں کھول کر، نڈر ہو کر دیکھو کہ یہ سب کچھ کیا ہوا۔ خود ہمارے بچے، ہمارے ہی گوشت پوست عام عدل وانصاف کی خاطر آگے بڑھ گئے ہیں۔ وہ تم سب کے لئے، اور تمہارے انجنے بچوں کے لئے، ایک درخشاں مستقبل کی تلاش میں صلیب پر چڑھ رہے ہیں۔ وہ ایک دوسری قسم کی زندگی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ایسی زندگی جس میں سچائی وہ اور انصاف ہو۔ وہ سارے لوگوں کو بہتری اور بہبودی چاہتے ہیں!''

اس کے سینے میں دل پھٹا جا رہا تھا اور اس کا گلا گرم اور خشک ہو گیا تھا۔ اسکے وجود کی گہرائی میں عظیم الفاظ جسم لے رہے تھے۔ ایک وافر ہمہ گیر محبت کے الفاظ جو اس کی زبان کو جلائے دے رہے تھے اور مجبور کر رہے تھے کہ اور زیادہ روانی اور زور کے ساتھ بولے۔

اس نے دیکھا کہ ہر شخص خاموشی سے اس کی تقریر سن رہا ہے، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ لوگ جو اس کے اتنے نزدیک جمع ہو گئے تھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ اور اس کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی، جو اب بالکل صاف اور واضح ہو چکی تھی، کہ لوگوں کے پیچھے چلیں جنہیں انہوں نے فوجیوں کے ہاتھ میں چلے جانے دیا تھا، جنہیں انہوں نے ان کے قسمت پر چھوڑ دیا تھا

تیوریوں پر بل ڈالے اور غور وفکر سے سنتے ہوئے چہروں پر ایک نظر ڈال کر اس نے مشفقانہ اصرار کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔

''ہمارے بچے مسرت کی تلاش میں دنیا میں سرگرداں ہیں اور وہ ہم سب لوگوں کی خاطر اور یسوع کی سچائی کی خاطر آگے بڑھے ہیں۔ وہ ہر اس چیز کے خلاف لڑنے کے لئے اٹھے ہیں جس کے ذریعہ دنیا کے جھوٹے، برے، لالچی لوگوں نے ہمارا گلا گھونٹا ہے، ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہماری پیٹھ پر کوڑے برسائے ہیں۔ عزیزو، ہم ہی سب لوگوں کے لئے ہمارے نوجوان اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ساری دنیا کی خاطر۔ محنت کشوں کی خاطر۔ چاہے وہ دنیا کے کسی حصے میں ہوں۔ انہیں اکیلا مت رہنے دو، ان کا ساتھ مت چھوڑو، خود اپنے پر رحم کھاؤ! اپنے بچوں کے دلوں پر بھروسہ کرو جنہوں نے سچائی کا اعلان کیا ہے اور اس کی خاطر وہ اپنی جانیں بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہیں ان پر بھروسہ کرو!''

اس کی آواز رک گئی اور وہ چکرائی جیسے بے ہوش ہونے والی ہو۔ کسی نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا۔

''خدا لگتی بات کہہ رہی ہے!'' کسی نے ہیجانی آواز میں چیخ کر کہا۔ ''خدا لگتی بات دوستو! ذرا

سنو!''

''دیکھوتو اپنے آپ کو کیسی اذیت دے رہی ہے؟'' دوسرے نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''اپنے آپ کو اذیت نہیں دے رہی ہے'' کسی اور نے درشت لہجے میں کہا۔'' بلکہ ہم جیسے بے وقوفوں کو ڈانٹ پھٹکار رہی ہے!''

''خدا پرستو!'' ایک عورت نے بلند کانپتی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا۔'' میرا متیا۔ بالکل معصوم ہے! اس نے کیا قصور کیا؟ وہ تو صرف اپنے ساتھیوں کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، ان سے محبت کرتا تھا، یہ مو کچھ بھی کہہ رہی ہے سچ ہے۔ اپنے بچوں کو اس مصیبت میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ انہوں نے کون سی غلط بات کی ہے؟''

ان الفاظ کو سن کر ماں کانپ گئی اور خاموشی سے رونے لگی۔

''چلو گھر چلو، پلاگیا نلووونا!'' سیزوف نے کہا۔'' چلو ماں، ایک دن کے لئے یہی بہت کافی ہے۔''

اس کا چہرہ زرد تھا اور ڈاڑھی الجھی ہوئی تھی، دفعتاً وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے چاروں طرف اس نے ایک سخت گیرانہ نظر ڈالی اور مرعوب کن انداز میں کہا:

''آپ سب کو معلوم ہے کہ میرا بیٹا ماتوئی کارخانے میں کسی طرح مرا لیکن اگر وہ زندہ ہوتا تو میں خود اسے ان لوگوں کے ساتھ بھیج دیتا۔ میں خود اس سے کہتا، تم بھی جاؤ ماتوئی، یہی تو ہے واحد صحیح راستہ، واحد ایماندرانہ راستہ،!''

وہ خاموش ہو گیا، اور ہر شخص کسی نئی اور مہان چیز کی گرفت میں آ کر جس سے یہ لوگ بالکل نہیں ڈرتے تھے، خاموش ہو گیا۔ سیزوف نے مکا تان کر ہاتھ اٹھاتے ہوئے پھر سے بولنا شروع کیا:

''میں ایک بوڑھا شخص تم سے مخاطب ہوں، تم سب ہی مجھے جانتے ہو، ترپین برس سے اس زمین پر زندہ ہوں اور انتالیس سال سے یہاں کام کر رہا ہوں، آج میرے بھتیجے کو پھر گرفتار کر لیا گیا، کتنا اچھا، کتنا تیز لڑکا ہے، وہ بھی ولاسوف کے ساتھ، جھنڈے کے بالکل نزدیک چل رہا تھا...''

اس نے اپنا ہاتھ ہلایا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوا گویا اس کی توانائی اور قوت کچھ کم ہو گئی ہو۔ وہ ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا:

''اس خاتون نے جو کچھ کہا ہے بالکل سچ ہے، ہمارے بچے ایمانداری سے رہنا چاہتے ہیں،

سمجھداری کے ساتھ زندگی گذارنا چاہتے ہیں اور ہم نے انہیں بیچ منجھدار میں چھوڑ دیا، اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آؤ چلو پلا گیا نلوونا...''

''اچھے دوستو'' ماں نے کہا اور اپنے چاروں طرف دیکھا اس آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئی تھیں۔ ''زندگی ہمارے بچوں کے لئے ہے، ساری دھرتی ان ہی کے لئے ہے!''

''چلو، پلا گیا نلوونا، یہ لو اپنی لاٹھی'' سیزوف نے جھنڈے کی چھڑ کا ٹکڑا دیتے ہوئے کہا۔

لوگ بڑے افسوس اور بڑی عزت کے ساتھ ماں کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور وہ ہمدردی کے جملے سنتی ہوئی آگے اور لوگ ایک لفظ کہے بغیر راستہ دے رہے تھے، کسی نا قابل فہم قوت کی کشش سے وہ سڑک پر اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ دھیمے لہجے میں ایک دوسرے سے مختصر طور پر اظہار رائے کرتے جا رہے تھے۔

جب وہ لوگ اس کے گھر کے دروازے تک آ گئے تو وہ ان کی طرف مڑی، لاٹھی کا سہارا لیتے ہوئے جھکی اور دھیرے سے احسان مندانہ لہجے میں کہا:

''شکریہ...''

ایک بار پھر وہی نیا خیال جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوا ہے، اس کے ذہن میں آیا اور اس نے کہا:

''اگر لوگوں نے اس عظمت و جلال کی خاطر اپنی جانیں نہ قربان کی ہوتیں تو یسوع کا وجود بھی نہ ہوتا۔''

مجمع اس کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا۔

وہ مجمع کے آگے ایک بار پھر جھکی اور اندر چلی گئی۔ سیزوف سر جھکا کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

تھوڑی دیر تک لوگ دروازے پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ پھر سب لوگ آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے۔

حصہ دوئم

1

دن کا باقی حصہ دھندلی دھندلی یادوں میں گزرا۔اس کی روح اوراس کے جسم میں بلا کی تھکن تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے اس پستہ قد افسر کا خاکی ساھیولی، پاویل کا تمتمایا ہوا چہرہ اور آندری کی ہنستی ہوئی آنکھیں ناچتی رہیں۔

اس نے کمرے میں کئی چکر لگائے پھر کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ گئی اور باہر سڑک کی طرف دیکھنے لگی ۔ایک بار پھر اٹھی اور تیوریاں چڑھائے ٹہلتی رہی۔ذراسی آواز پر چونک چونک اٹھتی ادھر ادھر دیکھتی یا بے معنی طور پر کسی چیز کو تلاش کرنے لگتی۔اس نے پانی پیا،لیکن اس سے نہ تو اس کی پیاس بجھ سکی اور نہ اس کے سینے کی تکلیف اور آرزو کی بھڑکتی ہوئی آگ سرد پڑسکی۔دن کے دوٹکڑے ہو گئے تھے۔پہلا حصہ بامعنی تھا لیکن دوسرے حصے میں سے سارے معنی نچوڑ لئے گئے تھے اور اس کے سامنے ایک تیرہ و تار خلا پیدا ہو گیا تھا اور اس کے ذہن میں سوال پیدا ہو رہا تھا:

''اب کیا ہوگا؟...''

کارسونووا اس سے ملنے آئی۔اس نے ہاتھ مٹکائے چیخی، چلائی، روئی، جوش وانبساط کی کیفیت طاری کی، کچھ پیر پٹکے، کسی کو دھمکیاں دیں، کچھ وعدے کئے، کچھ تجویزیں پیش کیں، لیکن ماں پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔

''آہا! لوگ بہرحال اٹھ تو کھڑے ہوئے! سارا کا خانہ اٹھ کھڑا ہوا ہے! سارا کارخانہ!'' خوانچے والی کی تیز آواز آئی۔

''ہاں!'' ماں نے گردن ہلاتے ہوئے آہستہ سے کہا لیکن اس کی نظریں ماضی پر جمی ہوئی تھیں، ان تمام چیزوں پر جو پاویل اور آندری نے ساتھ غائب ہوگئی تھیں۔اسے رونا بھی نہیں آرہا تھا۔دل سکڑ کر بالکل خشک ہو گیا تھا، ہونٹ بھی بالکل خشک تھے اور تالو چیخ رہا تھا، ہاتھ کانپ رہے تھے اور سارے جسم میں بار بار ٹھنڈی پھریری آرہی تھی۔

شام کو پولیس والے آئے۔انہیں دیکھ کر اسے نہ تو کوئی تعجب ہوا اور نہ خوف محسوس ہوا۔ پولیس والے ہنگامہ کرتے داخل ہوئے جیسے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔زرد چہرے والے افسر نے دانت نکال کر مسکراتے ہوئے کہا:

''کیسے مزاج ہیں؟ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آج تیسری بار ملاقات ہوئی ہے۔''

اس نے صرف اپنی خشک زبان ہونٹوں پر پھیری۔ افسر بکواس کرتا رہا اور کچھ مشورے دینے کی بھی کوشش کرتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس شخص کو باتیں کرنے میں لطف آرہا ہے لیکن اس کے الفاظ سے اسے تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ سن ہی کب رہی تھی ہاں جب اس نے کہا کہ:

''اگر اپنے بیٹے کے دل میں خدا اور زار کی عزت نہ پیدا کرسکیں تو غلطی تمہاری ہے۔''

تو اس نے وہیں دروازے کے پاس کھڑے کھڑے دھیمے لہجے میں جواب دیا:

''ہم اپنے بچوں کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ایسے کٹھن راستے پر جاتے ہوئے ہم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ اس کا جواب طلب کریں گے۔''

''کیا؟'' افسر چلایا۔ ''ذرا زور سے بولو!''

''میں نے کہا کہ ہمارے بچے ہم سے جواب طلب کریں گے''

ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

افسر غصے میں جلدی جلدی کچھ بڑبڑایا لیکن ماں اس کے الفاظ سن نہ سکی۔

تلاشی کے دوران میں ماریا کارسونووا گواہ کی حیثیت سے لائی گئی۔ وہ ماں کے پاس ہی کھڑی ہوگئی لیکن اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ افسر جب بھی اس سے کوئی سوال کرتا تو وہ احتراماً جھک کر ایک ہی جواب دیتی:

''حضور، مجھے کچھ نہیں معلوم، میں جاہل عورت ٹھیری، محنت حکم کر کے کچھ کما کھا لیتی ہوں اور اتنی احمق ہوں کہ ایک لفظ بھی نہیں جانتی...''

''اچھا، ذرا زبان کو لگام دو'' افسر نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے حکم دیا وہ ایک بار پھر تعظیماً جھکی لیکن جیسے ہی اس کی پیٹھ مڑی کہ اس نے زبان نکال کر اسے چڑھایا۔

''اس کی ایسی تیسی!'' اس نے ماں کے کان میں کہا۔

جب اسے حکم دیا گیا کہ پلا گیا کی تلاشی لو تو آنکھیں جھپکا کر افسر کی طرف گھورنے لگی اور خوف زدہ آواز میں بولی:

''لیکن حضور مجھے یہ سب کچھ آتا ہی نہیں!''

افسر نے پیر پٹخے اور اس پر چلایا۔ ماریا نے نظریں جھکا لیں اور ماں سے آہستہ سے کہا:

''اچھا تو پھر بٹن کھولنا شروع کرو، پلا گیا نلوونا...''

ماں کے کپڑوں کو ٹٹولتے ہوئے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''ذلیل کتے'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

''کیا کہہ رہی ہے؟'' افسر نے چلا کر ادھر دیکھا جہاں تلاشی لی جا رہی تھی۔

''عورتوں کی باتیں ہیں حضور!'' ماریا نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

آخر افسر نے ماں سے کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے کہا۔ اس کے نا تجربہ کار ہاتھ بڑے بڑے روشن حروف لکھا:

''پلا گیا ولاسوسا، ایک مزدور کی بیوہ۔''

''یہ کیا لکھا ہے؟ کیوں لکھا یہ سب کچھ؟'' افسر نے منہ بنا کے پوچھا اور پھر ہنس کر کہا:

''جنگلی!..''

وہ لوگ رخصت ہو گئے، ماں کھڑکی کے پاس سینے پر ہاتھ باندھے اسی طرح کھڑی رہی اور سامنے بغیر کچھ دیکھے گھورتی رہی، بھویں تنی ہوئی، ہونٹ بھنچے ہوئے، جبڑے اتنی سختی سے بھنچے ہوئے کہ اسے جلد ہی درد محسوس ہونے لگا۔ چراغ میں تیل ختم ہو گیا، بتی چرچرائی اور لو کانپنے لگی۔ اس نے پھونک مار کر چراغ بجھا دیا اور اندھیرے میں کھڑی رہی۔ اس کا دل اس قدر شدید درد اور کرب سے معمور تھا کہ اس کے لئے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اسی انداز سے وہ بڑی دیر تک کھڑی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں اور اس کے پیر درد کرنے لگے، اسے محسوس ہوا کہ ماریا کھڑکی کے پاس آئی اور مخمور آواز میں بولی:

''سو گئیں پلا گیا؟ بیچاری کیسی تکلیف اٹھا رہی ہے! جاؤ سو جاؤ!''

ماں کپڑے تبدیل کئے بغیر لیٹ گئی اور تالاب کی لہروں کی طرح ایک گہری نیند نے فوراً ہی اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ دلدل کے اس پار ایک زرد ریتلی پہاری کے پاس سے گزر کر شہر جانے والی سڑک پر چل رہی ہے جہاں سے ریت لے جائی جاتی تھی۔ پاویل اس کی چوٹی پر کھڑا ہے اور آندری کی نرم اور مترنم آواز میں گا رہا ہے:

''اٹھو مزدور و جہد کے لئے اٹھو...''

وہ اپنے ماتھ پر ہاتھ سے بھینچے اپنے کو دیکھتی چلی جا رہی ہے۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں اسکے بیٹے کا جسم بہت واضح اور صاف نظر آ رہا۔ اسے اپنے بیٹے کے پاس تک جاتے ہوئے شرم آ رہی ہے کیونکہ وہ حاملہ تھی اور اس کی گود میں ایک اور بچہ تھا۔ وہ چلتی رہی یہاں تک کہ ایک میدان میں پہونچ گئی جہاں بچے گیند سے کھیل رہے ہیں۔ بچے بہت سے ہیں اور گیند سرخ ہے۔ گود کے بچے نے گیند لینے کی کوشش کی اور رونے لگا۔ اس نے بچے کو اپنی چھاتی دی اور واپس آنے لگی۔ لیکن اب پہاڑی پر فوجی کھڑے ہوئے ہیں اور اس کی طرف اپنے نیزے تانے ہوئے ہیں۔ وہ جلدی سے ایک گرجے کی طرف بھاگی جو ایک میدان کے بیچ میں بنا ہوا تھا سفید، لطیف اور ہوائی سا گرجا، بے اندازہ اونچا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بادلوں کا بنا ہوا ہے۔ وہاں کسی کو دفن کیا جا رہا ہے اور تابوت لمبا اور سیاہ اور سختی سے بند کیا ہوا ہے۔ پادری چل پھر رہے ہیں اور گا رہے ہیں:

''خدا کا شکر ہے کہ یسوع پھر آ گیا...''

عود دان کو لہراتے ہوئے نائب پادری اس کی طرف تعظیماً جھکا اور مسکرایا۔ سموئلوف کی طرح اس کے بال سرخ اور اس کا چہرہ ہنستا ہوا ہے۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے گنبدوں سے سورج کی شعاعیں سفید ڈوپٹوں کی طرح نیچے اتر رہی ہیں۔ دونوں گانے والی بالائی نشست گاہوں میں لڑکے گا رہے ہیں:

''خدا کا شکر ہے کہ یسوع پھر آ گیا...''

''گرفتار کر لو انہیں!'' دفعتاً پادری گرجے کے بیچوں بیچ رک کر چلایا۔ اس کی عبا غائب ہو گئی اور اس کے اوپری ہونٹ کے اوپر سفید مونچھیں ابھر آئیں۔ ہر شخص ڈر کر بھاگنے لگا، یہاں تک کہ نائب پادری نے بھی عود دان کو ایک طرف پھینک کر اور اپنے سر کو خوخول کی طرح پکڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ ماں نے بھاگتے ہوئے لوگوں کے قدموں میں اپنے شیر خوار کو ڈال دیا، لیکن وہ لوگ اس سے بچتے اور ننگے جسم کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے بھاگتے رہے۔ ماں نے گھٹنوں کے بل جھک کر ان سے کہنا شروع کیا۔

''بچے کو چھوڑ کر مت جاؤ! اسے بھی اپنے ساتھ لیتے جاؤ!...''

خوخول نے گانے شروع کیا:

''خدا کا شکر ہے کہ یسوع پھر آ گیا...''

وہ مسکرا رہا ہے اور اس کے ہاتھ پیٹھ پر بندھے ہوئے ہیں۔

اس نے جھک کر بچے کو اٹھا لیا اور ایک گاڑی پر لٹا دیا جس میں تختے ہی تختے بھرے ہوئے تھے۔ نکولائی گاڑی کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا ہے اور ہنس رہا ہے۔

''آخر مجھے ان لوگوں نے ایک سنجیدہ کام دے دیا!'' اس نے کہا۔

سڑکیں گندی ہیں اور گھروں کی کھڑکیوں سے لوگ گردن نکالے چیخ رہے ہیں، سیٹیاں بجا رہے ہیں، ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ مطلع صاف ہے، آفتاب پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اور دور دور تک چھاؤں کا شائبہ بھی نہیں ہے

''گاؤ میری ننکو!'' خوخول نے زور سے کہا۔ ''زندگی ایسی ہی ہے۔''

اس نے خود بھی گانا شروع کر دیا اور دوسری تمام آوازیں اس کی آواز کے سامنے دب گئیں۔ ماں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی لیکن دفعتاً ٹھوکر کھا کر ایک اتھاہ غار میں گر پڑی جس خلاء اس کی طرف چیختا ہوا بڑھ رہا ہے...

اس کی آنکھ کھلی تو وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی سخت بھاری سا ہاتھ اس کے دل کو اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے تھا اور اسے آہستہ آہستہ مسلنے میں لطف لے رہا تھا۔ کارخانے کی سیٹی مزدوروں کو مسلسل بلائے جا رہی تھی۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ دوسری سیٹی ہے۔ کمرے میں چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں ہر چیز الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔ فرش پر کیچڑ بھرے جوتوں کے نشان تھے۔

اس نے اٹھ کر کمرہ صاف کرنا شروع کر دیا اور نہ منہ ہاتھ دھویا نہ نماز ادا کی با ورچی خانے میں اس کی نظر چھڑ کے ٹکڑے پر پڑی جس میں جھنڈے کا ایک ٹکڑا اب بھی بندھا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر چولہے میں ڈالنے والی تھی کہ کچھ سوچ کر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا، کپڑے کو لکڑی سے الگ کیا، اور اسے احتیاط سے تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر لکڑی کو گھٹنے سے زور لگا کر توڑا اور اسے چولہے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے کھڑکیوں اور کپڑے تبدیل کئے۔ پھر وہ باروچی خانے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی اور ایک بار یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا:

''اب کیا ہوگا؟''

اسے یاد آیا کہ اس نے صبح کی نماز نہیں پڑھی تھی اور وہ اٹھ کر مقدس تصویر کے سامنے گئی لیکن چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد پھر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بالکل ویران تھا۔

ہر طرف عجیب و غریب قسم کی خاموشی طاری تھی جیسے وہ تمام لوگ جو کل سڑکوں پر گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ چلا رہے تھے آج اپنے گھروں میں چھپ کر ان غیر معمولی واقعات پر غور کر رہے ہوں۔

دفعتاً اسے اپنی جوانی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا جاگیردار زاؤسائلوف کی کوٹھی کے پرانے باغ میں ایک بڑا سا تالاب تھا جو سوسن کے پھولوں سے بھرا رہتا تھا۔ خزاں کی ایک شام کو وہ تالاب کے نزدیک سے گزر رہی تھی کہ اس کی نظر ایک کشتی پر پڑی جو تالاب کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ تالاب کا پانی سیاہی مائل اور پرسکوت تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کشتی اس سیاہ پانی کے اوپر گوند سے چپکا دی گئی ہو جس پر مرجھائی ہوئی پتیوں کے افسردہ کن نقش و نگار بنے تھے۔ اس بغیر ملاح یا پتوار کی اکیلی کشتی کا منظر، جو بدرنگ سے پانی کے اوپر، جھڑی ہوئی پتیوں کے درمیان بے حس و حرکت کھڑی تھی، کسی نامعلوم سے صدمے کے گمبھیر دکھ کا اظہار کر رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ تالاب کے کنارے کھڑی سوچتی رہی کہ اس دن شام کو اسے معلوم ہوا کہ جاگیر کے ایک ملازم کی بیوی نے جس کا قد قامت مختصر تھا، بال سیاہ اور بے قابو تھے اور چال میں چستی تھی، تالاب میں ڈوب کر جان دیدی تھی۔

ماں نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور اس کے خیالات کل کے تاثرات کے درمیان بھٹکنے لگے۔ بہت دیر تک وہ انہیں تاثرات کے افسوں میں کھوئی ہوئی بیٹھی رہی، اس کی نظریں ٹھنڈی چائے کے گلاس پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے دل میں خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کسی سیدھے سادے عقلمند آدمی سے باتیں کرے جو اس کے تمام سوالات کا جواب دے سکے۔

کھانے کے بعد گویا اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے نکولائی ایوانووچ آ گیا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی اس پر دفعتاً خوف طاری ہو گیا اور وہ اس کے سلام کا جواب دیئے بغیر بولی:

''تم کیوں آئے؟ بہت غلطی کی تم نے! اگر کسی نے دیکھ لیا تو تم بھی گرفتار کر لئے جاؤ گے۔''

اس نے ماں کا ہاتھ مضبوطی سے دبایا، اپنا چشمہ ٹھیک کیا اور اس کے نزدیک جھک کر جلدی جلدی اسے سمجھانے لگا:

''پاویل اور آندری کے اور میرے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا کہ اگر وہ لوگ گرفتار کر لئے جائیں تو

دوسرے دن میں تمہیں شہر پہونچا دوں گا۔' اس کے لہجے میں نرمی اور ماں کے لئے تشویش کی جھلک تھی۔ ''تمہارے یہاں تلاشی ہوئی۔''

''شرم کیوں آنے لگی ان لوگوں کو؟'' نکولائی نے کاندھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا پھر اس نے سمجھانا شروع کیا کہ ماں کو شہر میں منتقل کرنا کیوں ضروری ہے۔

ماں اس کی دوستانہ اور فکرمند آواز کو سنتی رہی، پھر آہستہ سے مسکرائی نکولائی کے دلائل اس کی سمجھ میں نہیں آئے لیکن اس نے ماں کے دل میں جس قدر اعتماد اور محبت کے جذبات بیدار کئے اس پر ماں کو تعجب ہوا۔

''اگر پاشا کی یہی مرضی تھی'' اس نے کہا۔ ''اگر میری وجہ سے تمہیں تکلیف نہ ہو...''

''اس کی فکر مت کرو'' اس نے بات کاٹی۔ ''میں تو تنہا رہتا ہوں، کبھی کبھی میری بہن ملنے کے لئے آجاتی ہے۔''

''لیکن میں کوئی کام کئے بغیر تمہارے یہاں روٹی توڑنے نہیں آسکتی'' اس نے کہا۔

''اگر چاہو تو تمہیں کچھ کام بھی دلا دیں گے'' نکولائی کے اور قریب آگئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''سچ مچ کام دلا سکتے ہو کیا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''میں تو کنوارا ہوں اس لئے میرے گھر میں تو کچھ کام ہے نہیں...''

''اس کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی میں۔ گھریلو کام کے متعلق نہیں!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

اس نے ٹھنڈا سانس بھرا کیونکہ نکولائی کے نہ سمجھنے کی وجہ سے اسے تکلیف ہوئی تھی لیکن نکولائی کی نزدیک بیں آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلنے لگی اور اس نے سوچتے ہوئے کہا:

''اگر پاویل سے مل کر تم کسی طرح اس سے ان کسانوں کا پتہ معلوم کرلو جنھوں نے اخبار چھاپنے کے لئے کہا تو...''

''میں جانتی ہوں انہیں!'' اس نے خوش ہوکر کہا۔ ''میں پتہ لگالوں گی اور تم جو بھی کہوگے وہ کروں گی! کوئی شبہ بھی نہ کرسکے گا کہ میں ان لوگوں کو غیر قانونی پرچے دیتی ہوں۔ تم خود ہی سوچو کہ میں کارخانے میں پرچے نہیں لے جاتی تھی کیا؟''

دفعتاً اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اپنی پیٹھ پر ایک تھیلا لٹکا کر اور ہاتھ میں ایک لاٹھی لے کر جنگلوں اور گاؤں سے گذرتی ملک کے چپے چپے میں گھومتی پھرے۔

''مجھے ضرور اجازت دو اس بات کی! تم دیکھنا کہ تم جہاں بھیجو گے وہیں چلی جاؤں گی! ہر علاقے کا راستہ ڈھونڈھ نکالوں گی! گرمی ہو یا سردی۔ مرتے دم تک۔ ایک جہاں گشت زائر کی طرح۔ میرے لئے اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی؟''

لیکن جب اس نے تصور میں اپنے آپ کو ایک بے گھر جہاں گشت کی شکل میں دیکھا جو گاؤں کے ایک ایک گھر پر جا کر یسوع کے نام پر بھیک مانگ رہی ہو تو اس کا دل پژمردہ ہو گیا۔

نکولائی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی گرم ہتھیلی سے اسے تھپتھپایا۔ پھر اس نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا:

''اس کے بارے میں بعد میں گفتگو کریں گے!''

''اگر ہمارے بچے، ہمارے جگر کے ٹکڑے اپنے متعلق سوچے بغیر اپنی جانیں، اپنی آرزوئیں اور اپنی آزادی قربان کر سکتے ہیں تو مجھ سے، ایک ماں سے کیا کوئی توقع نہیں کی جا سکتی؟'' وہ چلا پڑی۔

نکولائی زرد پڑ گیا۔

''ایسے الفاظ اس سے قبل میں نے کبھی نہیں سنے تھے...'' اس نے آہستہ سے کہا اور بڑی محبت اور خلوص سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں کہہ بھی کیا سکتی ہوں؟'' ماں نے درد بھرے انداز میں سر کو جنبش دیتے اور ہاتھوں کو بلاوجہ ہلاتے ہوئے کہا۔

''کاش میرے پاس یہ بتانے کے لئے الفاظ ہوتے کہ میرے سینے میں ماں کا دل کس طرح دھڑک رہا ہے تو...''

وہ ایک عظیم قوت کے زیر اثر اٹھ کر کھڑی ہو گئی، جس نے اس کے ذہن میں غصے سے بھرپور الفاظ کا طوفان بیدار کر دیا تھا۔

''اس وقت بہت سے لوگ رو پڑتے۔ ذلیل ترین اور بے شرم لوگ بھی تو پڑتے...''

نکولائی بھی کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک بار گھڑی کی طرف پھر دیکھا۔

''تو پھر طے ہو گیا نا؟ تم شہر میں میرے گھر منتقل ہو جاؤ گی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کب؟ جلد سے جلد جب بھی ممکن ہو سکے!'' نکولائی نے کہا۔ پھر بولا ''جب تک تم آ نہ جاؤ گی میں پریشان رہوں گا۔''

ماں نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ وہ اس کی کون ہے؟ وہ سر کو ذرا ٹیڑھا کئے ہوئے، کھڑا شرمیلے انداز سے مسکرا رہا تھا۔ وہ ایک معمولی سیاہ کوٹ میں ملبوس کچھ خمیدہ سا نزدیک بین نظروں والا انسان تھا اس کا حلیہ اور اس کی فطرت ایک دوسرے کی ضد تھے۔

''کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس؟'' اس نے نظریں جھکا کر دریافت کیا۔

''نہیں۔''

جلدی سے اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، اپنا بٹوا نکالا اور کھول کر اسے کچھ پیسے دیئے۔

''یہ لو، رکھ لو اپنے پاس...'' اس نے کہا۔

ماں غیر ارادی طور پر مسکرائی اور سر ہلاتے ہوئے بولی:

''تم لوگوں کو ہر بات نرالی ہے! تمہارے لئے پیسے کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ کچھ لوگ تو پیسے کی خاطر اپنا ایمان تک بیچ دیتے ہیں لیکن تم۔ تمہارے نزدیک اس کی کوئی قیمت ہی نہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تم لوگ پیسے رکھتے ہی اس لئے ہو کہ لوگوں کی مدد کی جائے۔''

نکولائی آہستہ سے ہنسا۔

''بڑی خراب چیز ہے یہ پیسہ: چاہے کسی سے وصول کرو یا کسی کو دو، ہمیشہ الجھن اور زیر باری ہی ہوتی ہے۔''

اس نے ایک بار پھر ماں کا ہاتھ مضبوطی سے دبایا اور کہا:

''جتنی جلد ممکن ہو چلی آؤ!''

پھر وہ خاموشی کے ساتھ چلا گیا۔

وہ دروازے تک پہونچانے گئی تو سوچتی رہی:

''کتنا ہمدرد انسان ہے۔ لیکن میرے لئے متاسف نہیں ہے۔''

لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کرسکی کہ اسے یہ بات ناگوار ہوئی یا صرف تعجب ہوا۔

2

اس کے آنے کے چار دن بعد ماں اس کے گھر پہونچ گئی۔ جب اپنے دو صندوقوں کو گاڑی میں رکھ کر وہ بستی کے باہر میدان میں پہونچی تو اس نے ایک دم پلٹ کر دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ جگہ ہمیشہ کے لئے چھنٹ رہی تھی جہاں اس نے زندگی کے تاریک اور مشکل دن گزارے تھے اور جہاں اس نے ایک نئی زندگی میں قدم رکھا تھا جو ایسی نئی مسرتوں اور نئے دکھوں سے بھرپور تھی جن کی وجہ سے دن تیزی سے گزرنے لگے تھے۔

کارخانہ اپنی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چمنیوں کے ساتھ کوئلے سے سیاہ شدہ زمین پر ایک سرخ مکڑی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد مزدوروں کے یک منزلہ مکان بکھرے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے، مٹیالے چھوٹے چھوٹے مکان دلدل کے بالکل کنارے تک چلے گئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اپنی بے جان چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں سے ایک دوسرے کی طرف قابل رحم انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ کلیسا ان سب مکانوں سے بلند تھا، کارخانے کی طرح اس کا رنگ بھی گہرا سرخ تھا لیکن مینار کارخانے کی چمنیوں سے نیچے تھے۔

ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر اپنے بلاؤز کا کالر درست کیا جو گلے کو گھوٹے دے رہا تھا۔

''چلو چلو آگے بڑھو!'' گاڑی بان کی ٹانگیں کچھ ٹیڑھی سی تھیں، عمر کا پتہ چلانا مشکل تھا۔ سر اور چہرے پر چھدرے، بے رنگ بال تھے اور آنکھیں بے نور سی تھیں۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ ادھر سے ادھر لڑھک سا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کے لئے اس میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ دائیں کو مڑنے یا بائیں کو۔

''چلو، چلو آگے بڑھو!'' اس نے بے رس سی آواز میں کہا اور اپنی مڑی ہوئی ٹانگوں کو، جن میں کیچڑ میں لت پت بھاری بھاری جوتے تھے، کچھ عجیب مضحکہ خیز انداز میں جھٹکے دیئے۔ ماں نے اپنے چاروں طرف دیکھا، کھیت اس کی روح کی طرح ویران تھے۔

گھوڑے نے کچھ سست انداز میں سر ہلایا اور گرم گہری ریتلی زمین پر گاڑی کو گھسیٹنے لگا۔ ریت

سرسرائی، پرانی گاڑی کا ڈھانچہ چر چرایا اور یہ ساری آوازیں اور گردن کے پیچھے پیچھے لگیں۔

نکولائی ایوانووچ شہر کے سرے پر ایک دور افتادہ سی گلی میں رہتا تھا۔ اس کا مکان ایک دومنزلہ عمارت میں تھا جو حد سے زیادہ پرانی ہونے کی وجہ سے کچھ ابھری سی گئی تھی۔ مکان کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ تھا، لائی لیک اور کیکر کی شاخیں اور نوخیز وسہی قامت درخت حور کی نقرئی پتیاں تینوں کمروں کی کھڑکیوں سے جھانکا کرتیں۔ اندر ہر چیز صاف ستھری اور ساکت تھی اور خاموش سایے فرش پر کانپتی ہوئی شکلیں بنایا کرتے تھے۔ دیواروں کے سہارے سہارے کتابوں کی الماریاں تھیں، ان کے اوپر کچھ ایسے لوگوں کی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں جن کے چہروں سے سنجیدگی ٹپکتی تھی۔

''یہاں آرام ملے گا تمہیں؟'' نکولائی نے ماں کو ایک چھوٹے سے کمرے میں لے جاتے ہوئے پوچھا جس کی ایک کھڑکی باغ میں کھلتی تھی اور دوسری گھاس سے ڈھکے ہوئے احاطے میں۔ اس کمرے کی دیواروں کے سہارے بھی کتابوں کی الماریاں کھڑی ہوئی تھیں۔

''میں تو سمجھتی ہوں کہ باورچی خانے میں رہوں تو اچھا ہے'' اس نے کہا ''باورچی خانہ اچھا صاف ستھرا ہے...''

ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے الفاظ سے وہ ڈر گیا۔ اس نے کنھ عجیب بھونڈے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی کہ باورچی خانے میں نہ رہے اور جب ماں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو وہ فوراً خوش ہوگیا۔

تینوں کمروں میں ایک خاص قسم کی فضا تھی۔ یہاں سانس لینا آسان اور خوشگوار تھا لیکن زور سے بات کرتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوتی تھی کیونکہ یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ اس سے ان ہستیوں کے آرام میں خلل پڑے گا جو اتنی گہری توجہ اور محویے کے ساتھ دیواروں سے نیچے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔

''پودوں کو پانی کی ضرورت ہے'' ماں نے کھڑکیوں میں رکھے ہوئے گملوں کی مٹی کو چٹکی میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں!'' ان گملوں کے مالک نے مجرمانہ انداز میں کہا۔

''مجھے ان پودوں سے بہت انس ہے، لیکن کیا کروں وقت ہی نہیں ملتا۔''

اسے دیکھ کر ماں کو محسوس ہوا کہ اپنے آرام دہ گھر میں بھی نکولائی بڑے محتاط طریقے سے چلتا تھا جیسے

چاروں طرف کی چیزوں سے اسے غیریت سی محسوس ہورہی ہو۔ کمرے کی مختلف چیزوں کے نزدیک چہرہ لے جا کر دیکھتا، اپنے سیدے ہاتھ کی پتلی پتلی انگلیوں سے چشمہ ٹھیک کرتا جاتا اور جو چیز بھی اس کی تونہ کا مرکز بن جاتی اس کی طرف کھنکیوں سے سوالیہ انداز میں دیکھتا۔ بعض اوقات وہ کسی چیز کو اٹھا کر چہرے کے نزدیک لے جاتے جیسے اسے آنکھوں سے محسوس کررہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ماں کے ساتھ ساتھ وہ بھی کمرے میں پہلی بار داخل ہوا ہے اور ماں کی طرح اس کے لئے بھی ہر چیز نئی اور غیر مانوس ہے۔ اس کی وجہ سے ماں کو تسکین ہوئی۔ وہ نکولائی کے پیچھے پیچھے پھرتی رہی، دیکھتی رہی کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے اور اس سے مختلف اوقات پر اس کی ضروریات کے متعلق دریافت کرتی رہی۔ وہ ایسے شخص کی طرح خطاوارانہ انداز میں جواب دیتا رہا جسے اس بات کا احساس ہو کہ اسے جس طرح کام کرنا چاہئے وہ اس طرح نہیں کر رہا ہے لیکن مجبور ہے۔

ماں نے گملوں میں پانی ڈالا اور موسیقی کی کتابوں کو اکٹھا کر کے پیانو پر رکھ دیا، سماوار کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا:

''اس پر صیقل ہونی چاہئے۔''

نکولائی نے اس کی بے قلعی سطح پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اسے ناک کے پاس لے جا کر دیکھنے لگا۔ ماں ہنس پڑی۔

جب رات کو وہ سونے لیٹی تو دن کے واقعات کے متعلق سوچنے لگی، پھر اس نے تکیئے پر سے سر اٹھایا اور خاموشی سے ادھر ادھر دیکھا۔ آج اپنی زندگی میں پہلی بار وہ کسی دوسرے شخص کے گھر میں رات بسر کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود اسے کچھ برا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ نکولائی کے متعلق اسے کچھ تردد سا محسوس ہوا اور پھر اس کا جی چاہا کہ اس کی زندگی کو زیادہ خوشگوار بنا دے اور اس سے ایسی شفقت سے پیش آئے جو اس کی زندگی میں کچھ آسائشا اور حرارت پیدا کر سکے۔ اس کا بھونڈا انداز اور اس کی دلچسپ نااہلیت، عام لوگوں کے مقابلے میں اس کی مختلف ہستی اور اس کی مختلف ہستی اور اس کی شفاف آنکھوں کا گمبھیر لیکن بچکانہ تاثر ۔ان سب باتوں کا ماں کے دل پر بہت اثر ہوا۔ پھر اس کے خیالات کی رو اپنے بیٹے کی طرف مڑ گئی اور یکم مئی کے واقعات ایک بار پھر اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے لیکن اس بار وہ نئی صداؤں میں ملبوس تھے اور نئے معانی نے انہیں پر پرواز عطا کئے تھے۔ اس دن کے غم میں خود اس دن کی طرح کوئی خاص

بات تھی۔جس طرح کسی کی زبردست مار سے سر جھک کر زمین سے جا لگتا ہے اس طرح اس غم سے نہیں ہوا۔اس غم نے متواتر دل کو چھید کر بے شمار زخم پیدا کر دئے تھے اور اس کی وجہ سے غم و غصے کا طوفان آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا۔اور اس نے جھکی ہوئی کمر کو بھی سیدھا کر دیا تھا۔

''ہمارے بچے میدان میں کود پڑے ہیں''اس نے سوچا۔اس کے کانوں میں شہر کی رات کی نامانوس آوازیں کھڑکی سے رینگتی، باغ کی پتیوں کو جھولا جھلاتی کہیں بہت دور سے تھکی ہاری مدہم مدہم سی آرہی تھیں اور کمرے مین پہونچ کر دم توڑ دیتی تھیں۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی اس نے سماوار کو مانجھا، چائے کا پانی گرم کیا، بہت خاموشی سے چائے کی میز تیار کی اور باورچی خانے میں بیٹھ کر نکولائی کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔آخر اس نے کھانستے ہوئے ایک ہاتھ سے چشمہ تھامے ہوئے اور دوسرے سے قمیص کا کالر سنبھالے ہوئے دروازہ کھولا۔آداب تسلیمات کے بعد وہ سماوار کو کمرے میں لے گئی اور نکولائی منہ دھونے لگا، اچھل اچھل کر پانی فرش پر گر رہا تھا۔پھر صابن اور برش اس کے ہاتھ سے گر پڑے اور وہ اپنے بھونڈے پن پر بڑبڑایا۔ناشتے کے وقت اس نے ماں سے کہا:

''زیمسٹوو بورڈ، میں میرے سپرد بڑا تکلیف دہ کام ہے۔یعنی یہ دیکھنا کہ ہمارے کسان کس طرح تباہ ہو رہے ہیں...''

خطاوارنہ انداز میں مسکرا کر اس نے بات جاری رکھی:

''غذا کی کمی کی وجہ سے کسان کس طرح وقت پہلے ہی موت کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ان کے بچے کمزور اور لاغر پیدا ہوتے ہیں اور گرمیوں میں مکھیوں کی طرح مر جاتے ہیں۔ہمیں یہ سب کچھ معلوم ہے اور اس کے اسباب بھی معلوم ہیں۔یہ عمل دیکھنے کے لئے ہمیں تنخواہ دی جاتی ہے لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھتی...''

''تم طالب علم ہو کیا؟''اس نے دریافت کیا۔

''نہیں، استاد ہوں۔میرے باپ ویاتکا شہر کے ایک کارخانے میں منیجر ہیں لیکن میں نے تعلیم وتدریس کو پسند کیا۔گاؤں میں میں نے کسانوں کو کتابیں دینا شروع کیں جس کی وجہ سے مجھے جیل بھیج دیا گیا۔سزا کاٹنے کے بعد میں نے کتابوں کی ایک دوکان پر نوکری کر لی لیکن خود اپنی لاپرواہی کی وجہ سے

مجھے پھر گرفتار کرلیا گیا اور بعد میں آرخانگلسک شہر میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں بھی گورنر مجھ سے ناخوش ہو گیا اس لئے اس نے جہاز میں سوار کر کے بحیرۂ ابیض کے ساحل پر ایک چھوٹے سے گاؤں میں نظر بند کر دیا جہاں میں پانچ سال رہا۔''

☆ زیمتسو و بورڈ۔ ہندوستان کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے مرادف ہے۔ (مترجم۔)

دھوپ سے منور کمرے میں اس کی آواز نرم خرامی سے بہہ رہی تھی۔ ماں اب تک ایسے بہت سے قصے بیان کرتے ہیں وہ ایسے پرسکون اور گمبھیر رہ سکتے ہیں جیسے وہ کسی ناگزیر چیز کے متعلق باتیں کر رہے ہوں۔

''آج میری بہن آرہی ہے'' اس نے کہا۔

''شادی ہوگئی ان کی؟''

''بیوہ ہے، اس کے شوہر کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا تھا لیکن وہ وہاں سے بھاگ آیا۔ دو سال ہوئے دق کے مرض میں یورپ میں انتقال ہوگیا۔''

''چھ برس بڑی۔ مجھ پر بڑا احساس ہے ان کا۔ ذرا انہیں پیانو بجاتے ہوئے سننا! یہ ان ہی کا پیانو ہے۔ عام طور پر یہاں تک سی چیزیں ان ہی کی ہیں۔ کتابیں البتہ میری ہیں۔''

''کہاں رہتی ہیں؟''

''ہر جگہ'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''جہاں بھی کسی دل گردے کے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پہونچ جاتی ہیں۔''

''وہ بھی اسی قسم کا۔ کام کرتی ہیں؟''

''اور کیا!'' اس نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ جلدی ہی چلا گیا اور ماں ''اس قسم کے کام'' کے متعلق سوچتی رہی اور ان لوگوں کے متعلق سوچتی رہی جو خاموشی اور مستقبل مزاجی کے ساتھ دن رات اس کام میں مصروف ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق سوچ کر وہ خود اپنی نظروں میں حقیر سی معلوم ہونے لگی جیسے کوئی شخص رات کے وقت پہاڑ کے شکوہ اور عظمت کو دیکھ کر اپنی ہستی کے چھوٹے پن کو محسوس کرتا ہے۔

تقریباً دو پہر میں ایک بلند قامت خوبصورت سی عورت سیاہ لباس پہنے گھر میں داخل ہوئی۔ ماں

نے دروازہ کھولا تو اس عورت نے اپنے زرد تھیلے کو زمین پر ڈال کر ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

''میرا خیال ہے تم پاویل میخائلووچ کی ماں ہو؟'' اس نے کہا۔

''ہاں'' ماں نے عورت کے اچھے کپڑوں سے کچھ پریشان ہو کر کہا۔

''تمہارے بارے میں جیسا سوچتی تھی بالکل ویسی ہی ہو۔ میرے بھائی نے کہا تھا کہ تم پاس رہنے کے لئے آ رہی ہو'' عورت نے آئینہ کے سامنے ہیٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ''پاویل میخائلووچ سے میری خاصی پرانی ملاقات ہے۔ اس نے بھی تمہارے بارے میں بتایا تھا۔''

اس کی آواز بھاری تھی اور وہ آہستہ آہستہ بات کرتی تھی لیکن اس کی چال ڈھال میں پھرتیلا پن اور مضبوطی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں کی جوانی اور وہ باریک سی لکیریں جو کنپٹیوں پر ابھر آئی تھیں اور سفید بال تھے جو اس کے نازک سے کانوں کے اوپر چمک رہے تھے ایک دوسرے کا تضاد پیش کر رہے تھے۔

''مجھے بھوک لگی ہے'' اس نے اعلان کیا۔ ''ایک پیالہ کافی پینا چاہتی ہوں۔''

''ابھی بناتی ہوں'' مان نے جواب دیا۔ کافی لینے کے لئے نعمت خانے کے پاس جاتے ہوئے اس نے پوچھا:

''تم نے ابھی کیا کہا کہ پاویل نے کچھ میرے بارے میں تم سے کہا تھا؟''

''بہت کچھ...'' اس نے ایک چمڑے کا سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ سلگائی۔

''اس کے لئے تم بے انتہا خوف زدہ رہتی ہو نا؟'' اس نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے پوچھا۔

ماں کافی کی کیتلی کے نیچے اسپرٹ کے چولھے کے ننھے ننھے شعلوں کو دیکھتی اور مسکراتی رہی۔ اس عورت کے سامنے اس جو پریشانی محسوس ہوئی تھی مسرت نے اسے ختم کر دیا۔

''تو اس سے میرے بارے میں باتیں کیں کیسا اچھا لڑکا ہے!'' اس نے دل ہی دل میں سوچا پھر آہستہ سے کہا:

''ظاہر ہے، میں خوف زدہ رہتی ہوں۔ یہ کچھ آسان بات نہیں ہے میرے لئے لیکن اگر اب سے پہلے ایسا ہوتا تو اور بھی تکلیف پہنچتی۔ لیکن اب کم سے کم اتنا تو جانتی ہوں کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔''

اس عورت کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے ماں نے اس کا نام پوچھا۔

''سوفیا!'' جواب ملا۔

پلا گیا بڑے غور سے اس کا مطالعہ کرتی رہی۔ اس عورت میں کوئی چیز تھی جس سے وسعت کا احساس ہوتا تھا اور ایک حد تک ضرورت سے زیادہ جرأت اور جلد بازی کا۔

''سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو بہت دنوں تک جیل میں نہیں رہنا چاہئے'' سوفیا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اگر مقدمہ کا فیصلہ جلدی ہو جاتا تو اچھا تھا! جیسے ہی وہ شہر بدر کئے جائیں گے ہم لوگ پاویل میخائلووچ کو فرار کرانے کا انتظام کر دیں گے۔ اس کی یہاں بڑی ضرورت ہے۔''

ماں نے سوفیا کی طرف غیر یقینی انداز میں دیکھا۔ وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جس میں سگریٹ بجھا سکے۔ آخر اس نے ایک گملے میں سگریٹ بجھا دی۔

''اس سے پھول خراب ہو جاتے ہیں'' ماں نے غیر ارادی طور پر کہا۔

''معاف کرنا'' سوفیا نے کہا۔ ''نکولائی بھی ہمیشہ یہ بات کہتا ہے۔'' اس نے سگریٹ کے ٹکڑے کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

ماں ایک دم سے پریشان سی ہو گئی۔

''مجھے معاف کرو'' اس نے کہا۔ ''میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔ بھلا میں تم سے کیسے کہہ سکتی ہوں کہ یہ کرو اس یہ نہ کرو۔''

''اگر میں ایسی گندی ہوں تو کیوں نہ کہو؟'' سوفیا نے کاندھوں کا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ ''کافی تیار ہو گئی کیا؟ شکریہ۔ لیکن یہ ایک ہی پیالہ کیوں؟ تم نہیں پیو گی؟''

دفعتاً اس نے ماں کو کاندھوں سے پکڑ کر اپنے نزدیک گھسیٹ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے پوچھا:

''شرم آ رہی ہے؟''

ماں مسکرائی۔

''وہ سگریٹ والی بیوقوفی کی بات کے بعد مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ مجھے شرم آ رہی ہے یا نہیں؟''

پھر اپنے حیرت واستعجاب کو چھپائے بغیر اس نے کچھ سوالیہ انداز میں کہا:

''میں کل ہی یہاں آئی ہوں لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا اپنا مکان ہو، نہ کسی سے خوف اور نہ یہ خیال کہ کس سے کیا کہہ دیا...''

''ہونا بھی ایسا ہی چاہئے!'' سوفیا نے کہا۔

''میرا سر تو چکر کھانے لگتا ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے میں خود اپنے آپ ہی کو نہیں پہچانتی'' ماں نے بات جاری رکھی۔ ''پہلے کسی سے اپنے دل کی بات کہنی ہوتی تھی تو مدت درکار ہوتی تھی لیکن اب تو دل ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور ایسی باتیں زبان پر آ جاتی ہیں جن کا پہلے تصور بھی نہیں کر سکتی تھی...''

سوفیا نے دوسری سگریٹ نکالی اور اپنی بھوری چمکتی ہوئی آنکھوں سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

''تم نے کہا کہ اسے فرار کرا سکو گی لیکن مفرور کی حیثیت سے وہ رہ کیسے سکے گا؟'' ماں نے یہ پوچھ کر اس پریشان کن سوال کے بوجھ سے دل کو ہلکا کر لیا۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں'' سوفیا نے اپنے لئے دوسرا پیالہ کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''دوسرے درجنوں مفرور ساتھیوں کی طرح رہے گا... ابھی ایک ایسے ہی شخص سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اسے ایسی جگہ پہونچا دیا جہاں اسے رہنا تھا۔ وہ بھی بڑا اہم آدمی ہے۔ پانچ سال کی سزا ہوئی تھی لیکن نظر بندی میں صرف تین مہینے گذارے...''

ماں کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی، پھر مسکرائی اور سر کو جھٹکا دے کر آہستہ سے اس نے کہا:

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس یکم مئی کو مجھے کچھ ہو گیا۔ گویا رستے کی سدھ نہ رہی ہو اور ایک ہی وقت میں دو مختلف راستوں پر جا رہی ہوں۔ کبھی معلوم ہوتا ہے کہ میں ہر چیز سمجھتی ہوں، پھر اس کے بعد ہر چیز پر غبار سا چھا جاتا ہے۔ اب تم اپنی ہی بات لو۔ ایک شریف گھرانے کی عورت ہو کر اس کام میں پڑ گئی ہو... تم میرے پاویل سے واقف ہو اور اس کی تعریف کرتی ہو اور میں اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔''

''شکریہ کی مستحق تو تم ہو...'' سوفیا ہنسی۔

''میں نے کیا کیا؟ اسے کوئی میں نے تھوڑا ہی یہ سب سکھایا'' ماں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

سوفیا نے اپنی سگریٹ طشتری میں بجھائی اور سر کو جھٹکا دیا۔ اس کے سنہرے بالوں کے گچھے اس کی کمر تک پھیل گئے۔

''ان ڈھکوسلے کی چیزوں کو اتار کے آتی ہوں'' اس نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

3

نکولائی شام کو واپس ہوا۔ رات کھانا کھاتے وقت سوفیا نے ہنستے ہوئے بتایا کہ جلاوطنی سے بھاگے ہوئے ایک شخص سے اس کی کیسے ملاقات ہوئی اور کس طرح اس نے اسے چھپنے میں مدد دی، اسے خفیہ کے لوگوں سے کتنا ڈر لگا یہاں تک کہ ہر شخص کو وہ خفیہ کا آدمی سمجھنے لگی اور یہ کہ مفرور شخص نے کیا کیا مضحکہ خیز حرکتیں کی تھیں۔ ماں کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کچھ ڈینگیں مار رہی ہے جیسے کوئی مزدور کسی مشکل کام کو اچھی طرح کرنے کے بعد ڈینگیں مارتا ہے۔

اس وقت وہ گرمیوں کا بھورا لباس پہنے ہوئے تھی جس کا سایہ خوب گھیر پھیر کا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اور بھی لمبی معلوم ہو رہی تھی، اس کی آنکھیں زیادہ سیاہ دکھائی دے رہی تھیں اور چال ڈھال میں زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔

''تمہیں ایک دوسرا کام کرنا ہے سوفیا'' کھانے کے بعد نکولائی نے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ہمیں کسانوں کے لئے اخبار نکالنا ہے۔ لیکن ان حالیہ گرفتاریوں کی وجہ سے اس شخص سے ربط ٹوٹ گیا جو اخبار تقسیم کرنے والا تھا۔ پلاگیا نلوونا ہی واحد انسان ہیں جو اسے ڈھونڈھ نکال سکتی ہیں۔ تم ان کے ساتھ گاؤں جاؤ اور جلد از جلد یہ کام کر ڈالو۔''

''اچھی بات ہے'' سوفیا نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''ضرور جائیں گے، کیوں پلاگیا نلوونا؟''

ضرور...''

''بہت دور ہے گاؤں؟''

''تقریباً پچپن میل ہوگا۔''

''ٹھیک!... اچھا اب ذرا موسیقی رہے۔ تم میری پیانو نوازی کو سہہ سکو گی، پلاگیا نلوونا؟''

''میرا خیال مت کرو۔ سمجھ لو کہ میں یہاں ہوں ہی نہیں'' ماں نے کہا اور تخت کیا یک کونے میں کھسک کر بیٹھ گئی۔ بظاہر بھائی بہن اس کی طرف کوئی توجہ دیتے معلوم نہیں ہو رہے تھے لیکن بڑی ہوشیاری سے، نامعلوم طور پر وہ برابر اسے بھی گفتگو میں شامل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''سنو نکولائی، یہ گرائیگ کی موسیقی ہے، میں آج ہی اپنے ساتھ لائی ہوں، کھڑکیاں بند کر دو۔''

اس نے موسیقی کی کتاب کھولی اور الٹے ہاتھ سے آہستہ آہستہ پیانو بجانا شروع کیا۔ تاروں سے گمبھیر اور بھرپور آواز پیدا ہوئی۔ ایک دھیمی آہ کے ساتھ ایک اور آواز شامل ہوگئی۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کے نیچے سے کھنکتی ہوئی نقرئی آوازوں کا جھرمٹ مدھم سر کے پس منظر میں خوفزدہ چڑیوں کی طرح پر پھیلائے کانپ رہا تھا۔

پہلے تو ماں پر موسیقی کا کوئی اثر نہ ہوا جس کے بہاؤ میں اسے صرف آوازوں کی چیخ و پکار محسوس ہوئی۔ اس کے کان اس پیچیدہ آہنگ کے ترنم کو محسوس نہ کر سکے۔ وہ سوئے انداز میں نکولائی کو دیکھتی جو تخت کے دوسرے سرے پر ٹانگیں سکیڑے بیٹھا ہوا سوفیا کے متین اور خشک چہرے کو ایک رخ سے دیکھ رہا تھا جس پر سنہرے بالوں کا تاج سا رکھا ہوا تھا۔ سورج کی ایک کرن نے سوفیا کے سر او کاندھوں کو روشن کر دیا، پھر پھسل کر پیانو کے کے پردوں کے تختے پر اتر آئی اور اس کی انگلیوں کو پیار کرنے لگی۔ موسیقی ابھر کر کمرے میں چھا گئی اور غیر محسوس طور پر ماں کے دل میں بھی اتر گئی۔

کسی وجہ سے ماضی کے تاریک غار میں سے ایک شدید دکھ کی یاد ابھری جسے عرصہ ہوا اس نے بھلا دیا تھا لیکن آج وہ تمام تلخیوں کے ساتھ پھر سے زندہ ہوگئی۔

ایک دفعہ بہت رات گئے سے اس کا شوہر شراب کے نشے میں دھت گھر واپس آیا تھا اور آتے ہی اس کا بازو پکڑ کر بستر سے گھسیٹ کر فرش پر گرا دیا اور پسلی میں ٹھوکر مار کر کہا تھا: نکل جا یہاں سے کتیا! میں نہیں برداشت کر سکتا تجھے۔

اس کی مار سے بچنے کے لئے اس نے اپنے دو سالہ بچے کو ویسے ہی زمیں میں بیٹھے بیٹھے اٹھا لیا اور اسے ہاتھوں میں لے لیا جیسے اسے ڈھال کی طرح استعمال کرنے والی ہو۔ بچہ جو ننگا اور خوفزدہ تھا، اس کی گود میں رونے اور مچلنے لگا۔

''نکل جا! میخائیل چیخا''۔

وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی، دوڑ کر باورچی خانے میں گئی، ایک صدری اپنے کندھوں پر ڈال کر بچے کو شال میں لپیٹا اور ایک آنسو ٹپکائے یا شکایت کئے بغیر خاموشی سے ننگے پاؤں شب خوابی کے لباس اور صدری میں ملبوس سڑک پر چل نکلی۔ مہینہ مئی کا تھا اور رات سرد تھی، سڑک کی ٹھنڈی مٹی اس کے تلووں سے چپک چپک جا رہی تھی اور انگلیوں کے درمیان پھنس رہی تھی۔ گود میں بچہ رویا اور مچلا۔ اس نے صدری کے

نیچے اسے چھاتی سے چمٹا لیا اور خوف کے مارے سڑک پر تیزی سے چلتی رہی اور بچے کو بہلاتی رہی:

''آہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا! آھا۔ ھا۔ ھا! آہا۔ ہا۔ ہا!''

صبح ہوتے ہوتے اسے شرم محسوس ہوئی اور ڈر معلوم ہوا کہ اس نیم برھنگی کے عالم میں سڑک پر کوئی دیکھے گا تو کیا ہوگا۔ اس لئے وہ دلدل کی طرف چلی گئی اور سفیدے کے ننھے پودوں کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ وہاں وہ دیر تک بیٹھی تاریکی میں آنکھیں پھاڑے دیکھتی اور اونگھتے ہوئے بچے کو بہلانے اور خود اپنی توہین کو بھلانے کے لئے بڑی یکسانیت کے ساتھ کہتی رہی:

''آہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا!... آہا۔ ہا۔ ہا!... آہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔!...''

وہ وہاں بیٹھی ہوئی تھی کہ دفعتاً ایک سیاہ خاموش چڑیا اس کے نزدیک سے نکل گئی۔ اس کی وجہ سے اس کی بے حسی ختم سی ہوگئی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سردی میں کانپتی وہ گھر کی طرف چل پڑی۔ اس مارکٹائی اور توہین کی مانوس ہیبتنا کیوں کی طرف...

آخری تار جھنجھنایا۔ ایک ٹھنڈی، غیر متعلق آہ کے ساتھ موسیقی سرد پڑ گئی...

سوفیا اپنے بھائی کی طرف مڑی۔

''پسند آئی تمہیں؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''بے انتہا!'' اس نے جیسے خواب سے بیدار ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ''بے انتہا!''

اس کی یادوں کی صدائے بازگشت تھرتھرائی اور اس کے سینے میں گنگنانے لگی اور ذہن کے کسی ایک گوشے میں یہ خیال پیدا ہوا:

''دیکھا۔ ایسے بھی لوگ ہیں۔ آپس میں اطمینان اور محبت کی زندگی گذارتے ہیں۔ نہ لڑتے ہیں نہ شراب پی کر بدمست ہو جاتے ہیں۔ اور نہ اس تاریک زندگی کے لوگوں کی طرح ایک ایک روٹی کے ٹکڑے پر ایک دوسرے سے لڑتے ہیں...''

سوفیا نے سگریٹ نکالی۔ وہ تھوڑا سا دم لئے بغیر مسلسل سگریٹ پیا کرتی تھی۔

''یہ مرحوم کوستیا کا محبوب گیت تھا'' اس نے کہا۔ پھر سگریٹ کا ایک گہرا کش لگایا اور ایک بار پھر پیانو کی طرف مڑ کر نیچے سروں میں ایک غمناک سر چھیڑا۔ ''اس کے سامنے بجاتے ہوئے کتنا اچھا لگتا تھا! کتنا حساس تھا وہ، ہر چیز کو محسوس کرتا تھا، ایسا معلوم ہوتا کہ اس کا دل اب پھٹا اب پھٹا!''

''اپنے شوہر کے متعلق سوچ رہی ہے شائد' ماں نے سوچا۔ ''اور وہ بھی مسکرا کر...''

''مجھے کتنی مسرت دی اس نے!'' سوفیا آہستہ آہستہ کہتی رہی اور ساتھ ہی ساتھ سرسری طریقے سے پیانو پر نغمے بھی ترتیب دیتی۔ ''اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ زندگی کس طرح گزارنی چاہئے۔''

''ہاں!'' نکولائی نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اتفاق کیا۔ ''اس کی روح ہمیشہ گاتی رہتی تھی!...''

سوفیا نے ابھی جو سگریٹ جلائی تھی اس پھینک دیا اور ماں کی طرف مخاطب ہوئی۔

''میری آواز تمہیں ناگوار تو نہیں گزری ہوگی شائد؟'' اس نے کہا۔

ماں اپنی جھنجھلاہٹ کو نہ چھپا سکی۔

''میری بالکل پرواہ مت کرو۔ میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ میں بیٹھی سن رہی ہوں اور خود ادھر ادھر کی سوچ رہی ہوں...''

''لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم سمجھو!'' سوفیا نے کہا۔ ''ایک عورت موسیقی کو ضرور سمجھے گی، خصوصا جب کہ وہ افسردہ ہو۔''

اس نے ساز کے پردوں کو تیزی سے چھیڑا اور پیانو سے ایسی صدا بلند ہوئی جیسے کسی کو بری خبر سنائی گئی ہو۔ وہ یہ ہوش وحواس غائب کر دینے والی چیخ پیدا کرنے کے قابل اسی وقت ہوا ہوگا جب اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا گیا ہو۔ اس کے جواب میں خوف زدہ، نوخیز آوازیں باہر نکلنے لگیں اور پھر غائب ہو گئیں۔ ایک بار پھر وہی زوردار، غصے سے بھری ہوئی چیخ بلند ہوئی اور تمام چیزوں کو ڈبو گئی۔ کوئی بہت بڑی آفت اور مصیبت آئی تھی لیکن اس سے رحم کے بجائے غصے کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ایک منجھی ہوئی، پرزور آواز نے سیدھی سادی خوبصورت لئے اور دلکش مسحور کن انداز میں گانا شروع کر دیا۔

ماں کا بے اختیار چاہا کہ ان لوگوں سے کچھ اچھی محبت بھری باتیں کہے۔ موسیقی کا سرور اس پر چھا گیا تھا۔ وہ مسکرائی۔ اسے یہ یقین تھا کہ وہ ان بھائی بہن کی مدد کر سکتی ہے۔

اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ کیا کر سکتی ہے؟۔ آہستہ سے وہ باورچی خانے میں چلی گئی اور سماوار سلگا دیا۔

لیکن اس عمل سے ان لوگوں کے لئے کچھ کرنے کی خواہش کم نہیں ہوئی۔ چائے انڈیلتے وقت کچھ

گھبرائے ہوئے انداز میں ہنس کر اس نے باتیں شروع کیں۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یہ الفاظ صرف ان سے نہیں کہہ رہی بلکہ ان سے اپنے دل کو تسکین بھی دے رہی ہے۔

''ہم جو اس تاریک زندگی کے عادی ہیں۔ہم ہر چیز کو محسوس کر لیتے ہیں لیکن الفاظ میں ادا نہیں کر سکتے اور ہمیں شرم آتی ہے کیونکہ۔ہم سمجھ جاتے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے اور اکثر۔شرم سے پانی پانی ہو کر۔ہم خود اپنے خیالوں سے برہم ہو جاتے ہیں۔زندگی ہر طرف سے ٹھوکریں مارتی رہتی ہے۔ہم آرام کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے خیالات آرام نہیں کرنے دیتے۔''

نکولائی اپنا چشمہ صاف کرتے ہوئے سن رہا تھا اور سوفیا اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑے سن رہی تھی۔وہ سگریٹ پینا بھی بھول گئی جواب تقریباً بجھ جانے والی تھی۔وہ ابھی تک پیانو کے قریب کچھ اس کی طرف مڑی ہوئی بیٹھی تھی اور کبھی کبھی اپنے سیدھے ہاتھ سے ایک آدھ پردے کو چھیڑ دیتی تھی۔تاروں کی جھنجھناہٹ ماں کے ان سیدھے سادے پر تاثیر الفاظ سے آہنگ ہوگئی جن میں وہ اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔

''اب تو میں خود اپنے بارے میں اور دوسرے لوگوں کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہوں۔اب میں باتیں سمجھ بھی لیتی ہوں اور مقابلہ بھی کر سکتی ہوں۔پہلے پرکھنے کے لئے تھا ہی کیا۔ہماری زندگی میں ہر شخص ایک ہی طرح رہتا لیکن اب میں جان گئی کہ دوسرے لوگ کس طرح رہتے ہین اور جب میں یاد کرتی ہوں کہ میں کس طرح رہتی تھی۔بہت تکلیف ہوتی ہے یہ سوچ کے!''

اس نے آواز اور نیچی کر لی اور بات جاری رکھی:

''ممکن ہے میرے کہنے کا انداز اچھا نہ ہو، یا ممکن ہے میری باتوں کا کوئی موقع محل ہی نہ ہو کیونکہ یہ تو تم سب لوگ جانتے ہو...''

اس کی آواز وقت آمیز تھی لیکن جب اس نے ان لوگوں کی طرف دیکھا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی:

''لیکن میں تم لوگوں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں تم لوگوں کے لئے کس قسم کی بہتری اور مسرت کی آرزومند ہوں۔''

''ہمیں معلوم ہے'' نکولائی نے آہستہ سے کہا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی تمنا اور آرزو کو کسی طرح پورا ہی نہیں کر پا رہی اور اس نے ان تمام چیزوں کے متعلق گفتگو جاری رکھی جو اس کے لئے نئی اور بے انتہا قیمتی تھیں۔ اس نے انکو اپنی تلخ اور صبر آزما مصیبتوں سے پر زندگی کے متعلق بتایا۔ وہ بغیر کسی قسم کے بغض و عناد کے بول رہی تھی لیکن اس کے ہونٹ کچھ تمسخر آمیز انداز میں مڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے ان بے کیف اور بے رنگ دنوں کے تانے بانے کو کھالنا شروع کیا جن پر اس کی گزشتہ زندگی مشتمل تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر اسے کس طرح مارا کرتا تھا اور اس بات پر اس نے اپنے تعجب کا اظہار بھی کیا کہ اس مار پیٹ کی وجہ ہمیشہ بہت ہی معمولی ہوتی تھی اور یہ کہ وہ اس مار پیٹ کو روک نہ سکتی تھی...

وہ دونوں خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ ان کو شدید احساس ہو رہا تھا کہ ایک ایسی ہستی کی سیدھی سادی زندگی کی کہانی میں جسے آج تک ایک جانور سے زیادہ درجہ نہیں دیا گیا تھا اور جس نے خود بھی اپنے متعلق دوسرے لوگوں کی رائے کو بلا چون و چرا قبول کر لیا تھا، کس قدر عمیق معنی پوشیدہ تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ہزار ہا زندگیاں اس کی زبان سے بول رہی ہیں اس پر جو کچھ گزری تھی وہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اس کی زندگی اتنی عام اور سیدھی سی تھی جیسے اس دھرتی پر رہنے والوں کی اکثریت کی زندگی۔ اور اس کی کہانی نے ایک علاماتی اور نمائندہ حیثیت اختیار کر لی۔ نکولائی نے میز پر کہنیاں ٹیک کر ہاتھوں سے سر کو سہارا دیا اور اپنے چشمے کے پیچھے سے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ سوفیا کرسی کی پشت سے سہارا لے کر بیٹھ گئی وہ کبھی کبھی کانپ اٹھتی اور کبھی سر ہلاتی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا چہرہ پتلا اور زرد پڑتا جا رہا ہے۔ وہ سگریٹ پینا بھول گئی تھی۔

''ایک زمانہ تھا کہ میں اپنے آپ کو بدقسمت سمجھا کرتی تھی'' سوفیا نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ''میں ایک مسلسل ہذیانی کیفیت میں زندگی گزارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایک چھوٹے سے قصبے میں جلاوطن تھی۔ کچھ کام نہیں تھا اور اپنے علاوہ کسی چیز کے متعلق سوچنے کو بھی کچھ نہ تھا۔ کوئی بہتر کام نہ ہونے کی وجہ سے میں ہمیشہ اپنی بدقسمتی کے واقعات کو یاد کیا کرتی تھی۔ میں اپنے باپ سے لڑتی تھی جن سے میں بہت محبت کرتی تھی، مجھے اسکول سے خارج کر کے لوگوں سے کہا گیا تھا کہ اس بے شرم کی تقلید نہ کرنا، مجھے جیل میں ڈالا گیا، ایک ساتھی نے میرا پتہ پولیس کو بتا دیا تھا، میرا شوہر گرفتار کر لیا گیا، اس کے بعد پھر جیل اور جلاوطنی، پھر میرے شوہر کے انتقال کی خبر آئی، مجھے

ایسا محسوس ہوا کہ اس دنیا میں سب سے زیادہ دکھی ہستی میری ہی ہے۔لیکن پلا گیا نلوونا، میری زندگی کی ساری مصیبتیں بلکہ ان کی دس گنی مصیبتیں تمہاری زندگی کے ایک مہینے کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ سال ہا سال تک تم نے شب و روز مصیبتیں اٹھائی ہیں...اتنی مصیبتیں برداشت کرنے کے لئے انسان میں اتنی شکتی کہاں سے آجاتی ہے؟''

''لوگ عادی ہوجاتے ہیں'' پلا گیا نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں'' نکولائی نے غور و فکر کے انداز میں کہا۔ ''لیکن جب کبھی مجھے کوئی ایسی آپ بیتی سناتا ہے اور میں زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرسکتا ہوں۔کوئی کتابی مشاہدہ نہیں اور نہ ہی خود میرے منتشر تاثرات کے بنیاد پر تعمیر کیا ہوا مشاہدہ تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔اور یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی ہیں جو اس قدر خوفناک ہوتی ہیں۔وہ غیر اہم لمحات جن سے ماہ و سال تعمیر ہوتے ہیں...''

گفتگو جاری رہی، بڑھتی رہی، یہاں تک کہ تاریک زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھا گئی۔ ماں نے حافظے میں دور تک غوطہ لگایا اور شب و روز کی توہین اور مشکلات کی زنجیر کو ماضی کے دھندلکے میں سے نکال کر باہر لائی جس نے اس کی جوانی کے دنوں کو جہنم بنا دیا تھا آخر اس نے کہا:

''میں بھی کیسی ہوں کہ بس بیٹھی باتیں کئے چلی جارہی ہوں اور یہ خیال بھی نہیں آتا کہ تم لوگوں کے آرام کا وقت ہے کہنے کو تو اتنا ہے کہ عمر بھر کہے جاؤں تب بھی ختم نہیں ہوسکتا...''

بھائی اور بہن نے اسے خاموشی سے رخصت کیا اسے ایسا محسوس ہوا کہ نکولائی پہلے سے زیادہ جھک گیا ہے۔ جاتے وقت اس نے ماں کا ہاتھ بڑی گرم جوشی سے دبایا۔سوفیا اسے کمرے تک پہونچانے گئی اور دروازے کے پاس پہونچ کر واپس جاتے ہوئے بولی:

''اچھی طرح آرام کرلو۔خدا حافظ!''

اس کی آواز جذبات سے پر تھی اور اس کی بھوری آنکھیں ماں کے چہرے کو محبت سے دیکھ رہی تھیں۔

پلا گیا نے سوفیا کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

''شکریہ!...'' اس نے کہا۔

چند دنوں کے بعد ماں اور سوفیا غریب قصباتی عورتوں کا لباس پہنے نکولائی کے سامنے آئیں۔ ان کے جسم پر پرانے سوتی کپڑے اور صدریاں تھیں پیٹھ پر تھیلے لٹکے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ان کپڑوں میں سوفیا کچھ چھوٹی نظر آنے لگی تھی اور اس کا زرد چہرہ کچھ اور سنجیدہ معلوم ہونے لگا تھا۔

رخصت کرتے ہوئے نکولائی نے اپنی بہن کا ہاتھ زور سے دبایا اور ماں ایک بار پھر ان تعلقات کی پرسکون سادگی سے متاثر ہوئی۔ انہوں نے نہ تو ایک دوسرے کو پیار کیا اور نہ پیار کے ناموں سے پکارا لیکن وہ ہمیشہ دونوں ایک دوسرے کی طرف سے متردد اور پریشان رہتے تھے۔ جہاں وہ رہتی تھی وہاں لوگ ایک دوسرے کو ہمیشہ پیار کرتے اور پیار کے نام سے پکارتے لیکن بھوکے کتوں کی طرح ایک دوسرے کی بوٹیاں ضرور نوچتے تھے۔

دونوں عورتیں خاموشی کے ساتھ شہر کی سڑکوں سے ہوتی ہوئی کھیتوں کی طرف چل کھڑی ہوئیں۔ دونوں کاندھے سے کاندھا ملائے برچ کے درختوں کی دورویہ قطاروں کے درمیان ناہموار سڑک پر چلی جا رہی تھیں۔

''تھک تو نہیں جاؤ گی؟'' ماں نے سوفیا سے دریافت کیا۔

''تم سمجھتی ہو میں زندگی میں بہت کم پیدل چلی ہوں؟ میں ان سب باتوں کی عادی ہوں...''

سوفیا نے ہنس ہنس کر اپنی انقلابی سرگرمیوں کے بارے بتانا شروع کر دیا جیسے بچپنے کی شرارتوں کا ذکر کر رہی ہو۔ وہ مختلف ناموں اور جھوٹے کاغذات کے ساتھ رہ چکی تھی، بھیس بدل کر خفیہ کے لوگوں سے چھپ چکی تھی، ایک شہر سے دوسرے شہر تک ڈھیروں کتابیں پہونچا چکی تھی، جلاوطن ساتھیوں کی فراری کا انتظام کر چکی تھی اور انہیں بیرونی ممالک تک جا کر چھوڑ بھی آئی تھی۔ ایک بار اس نے اپنے مکان میں غیر قانونی چھاپہ خانہ قائم کر لیا تھا ار جب پولیس کو اس کی اطلاع ہوئی اور وہ لوگ آئے تو وہ گھر کی ملازمہ کا بھیس بدل کر بچ نکلی اور پولیس والوں سے پھاٹک پر ملاقات کرتی ہوئی فرار ہوگئی۔ سردیوں کا زمانہ تھا اور وہ ایک ہلکے سے لباس میں، کانوں کو ایک سوتی چادر سے لپیٹے ایک ہاتھ میں تیل کا پیپا اٹھائے سارے شہر کا چکر لگاتی رہی جیسے مٹی کا تیل خریدنے جا رہی ہو۔

ایک بار اسے ایک نئے شہر میں چند دوستوں سے ملنے جانا پڑا۔ جب اوپر ان کے کمرے کے نزدیک پہونچی تو پولیس والے تلاشی لے رہے تھے، واپس آنا مشکل تھا اس لئے اس نے نیچے کے مکان پر

ڈھٹائی سے گھنٹی بجائی اور بغیر کسی جان پہچان کے ان لوگوں کے گھر میں داخل ہوگئی۔ ان لوگوں کو صاف صاف طریقے سے ساری کیفیت بتانے کے بعد اس نے کہا:

''اگر آپ چاہیں تو مجھے پولیس کے حوالے کر سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ ایسا ہرگز نہ کریں گے۔''

وہ لوگ اتنے خوفزدہ تھے کہ ساری رات ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوئے، سمجھے کہ اب کسی نے دستک دی اور اب دی لیکن اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ اور دوسرے دن صبح وہ اس دلچسپ واقعہ پر خوب دل کھول کر ہنسے۔

ایک مرتبہ اور اس نے کلیسا کی راہبہ کا بھیس بدل کر اس خفیہ کے آدمی کی نشست کے پاس اور اس کے ڈبے میں بیٹھ کر سفر کیا جسے اس کی تلاش کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ اس نے نیچے کے مکان پر ڈھٹائی سے گھنٹی بجائی اور بغیر کسی جان پہچان کے ان لوگوں کے گھر میں داخل ہوگئی۔ ان لوگوں کو صاف صاف طریقے سے ساری کیفیت بتانے کے بعد اس نے کہا:

''اگر آپ چاہیں تو مجھے پولیس کے حوالے کر سکتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ ایسا ہرگز نہ کریں گے۔''

وہ لوگ اتنے خوفزدہ تھے کہ ساری رات ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوئے، سمجھے کہ اب کسی نے دستک دی اور اب دی لیکن اسے پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ اور دوسرے دن صبح وہ اس دلچسپ واقعہ پر خوب دل کھول کر ہنسے۔

ایک مرتبہ اور اس نے کلیسا کی راہبہ کا بھیس بدل کر اس خفیہ کے آدمی کی نشست کے پاس اور اس کے ڈبے میں بیٹھ کر سفر کیا جسے اس کی تلاش کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ اس نے بڑے گھمنڈ سے بتایا تھا کہ وہ اس عورت کی نگرانی کس ہوشیاری سے کر رہا ہے۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ عورت اسی گاڑی کے سکنڈ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہی ہے۔ ہر اسٹیشن وہ اس کا پتہ لگانے کیلئے اترتا اور واپس آ کر اس سے کہتا:

''کہیں نظر ہی نہیں آتی۔ غالباً سوگئی۔ یہ لوگ بھی تھک جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کچھ ہم سے بہتر نہیں ہے۔''

ان کہانیوں کو سنتے ہوئے ماں ہنسی اور اس نے بڑی شفقت سے سوفیا کی طرف دیکھا۔ لمبی نازک

سی سوفیا اپنے خوبصورت پیروں سے بڑی پھرتی سے چل رہی تھی۔ اس کی چال ڈھال اور بول چال کے اسلوب، اس کی خوشگوار بھاری آواز اور اس کے سیدھے، سہی قامت جسم غرض ہر چیز سے ایک توانائی اور جرأت ٹپکتی تھی۔ ہر چیز کی طرف اس کا رویہ بڑا زندگی بخش تھا۔ جدھر بھی دیکھتی اسے وہاں کوئی ایسی چیز ضرور نظر آجاتی جس سے وہ محظوظ ہو سکے۔

''کتنا خوبصورت صنوبر ہے؟'' سوفیا نے ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ماں نے رک کر دیکھا۔ صنوبر دوسرے درختوں سے بالکل بھی مختلف نہیں تھا۔

''ہاں بہت خوبصورت درخت ہے'' ماں ہنس اور یہ دیکھتی رہی کہ ہوا کی وجہ سے سوفیا کے سفیدی مائل بالوں کی ایک لٹ اس کے کان کے آس پاس لہرا رہی ہے۔

''چنڈول!'' سوفیا کی بھوری آنکھیں نرمی سے چمکنے لگیں اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سارے جسم سے اسے کھلی فضا میں گونجتی ہوئی غیر مرئی موسیقی کو سننا چاہتی ہو۔ بعض اوقات اپنے لچک دار جسم کو جھکا کر وہ کسی جنگلی پھول کو اٹھا لیتی، اس کی لرزتی ہوئی پتیوں کو اپنی نکیلی پتلی انگلیوں سے سہلاتی اور کوئی دھن گنگنانے لگتی۔

ان تمام باتوں کی وجہ سے اس بھوری آنکھوں والی عورت نے ماں کا دل موہ لیا اور وہ اس کے بہت نزدیک چلنے لگی اور کوشش کرنے لگی کہ اس سے پیچھے نہ رہ جائے۔ لیکن کبھی کبھی سوفیا بڑی سختی سے بات کرتی۔ اس وقت ماں کو پچھتاوا ہونے لگتا تھا۔ وہ بے چینی سے سوچتی:

''ریبن اسے پسند نہ کرے گا...''

لیکن دوسرے ہی لمحے سوفیا بڑی گرمجوشی اور سادگی سے باتیں کرنے لگتی اور ماں مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگتی۔

''اب تک تم کتنی جوان ہو!'' اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

پلا گیا مسکرائی۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا، چہرے سے تو اس سے بھی زیادہ بڑی معلوم ہوتی ہو۔ لیکن جب میں تمہاری باتیں سنتی اور تمہاری آنکھوں کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے ہمیشہ تعجب ہوتا ہے۔ بالکل لڑکی نظر آنے لگتی ہو، تمہاری زندگی سخت اور خطرناک رہی ہے لیکن تمہارا دل ہمیشہ مسکراتا رہتا ہے۔''

''مجھے کبھی سختی کا احساس نہیں ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میری زندگی سے زیادہ کوئی اور زندگی بہتر یا دلچسپ نہیں ہوسکتی۔ میں تمہیں تمہارے پدری نام سے پکارا کروں گی۔ نلوونا۔ پلا گیا۔ تمہارے لئے کچھ موزوں نہیں ہے۔''

''جو بھی چاہو پکارو'' ماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''جو بھی دل چاہئے، میں تو تمہاری طرف دیکھا کرتی ہوں، تمہاری باتیں سنا کرتی ہوں اور کچھ سوچا کرتی ہوں۔ یہ دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے کہ تمہیں انسانی دل تک پہنچنے کا راستہ مل گیا۔ ہر شخص تم سے کھل کر بات کرسکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ اس کے دل میں کیا کیا خیالات آرہے ہیں۔ خود اپنی مرضی سے اپنی روح کو بے نقاب کرسکتا ہے۔ اور یہ خیال بار بار میرے ذہن میں آتا ہے۔ تمہارے ساتھی آخر کار زندگی کی خرابیوں پر فتح پائیں گے۔ یہ بات تو بالکل یقینی ہے!''

''ہماری فتح اس لئے یقینی ہے کہ محنت کش ہمارے ساتھ ہیں!'' سوفیا نے پرزور اعتماد سے کہا۔ ''ان میں بڑی قوت پوشیدہ ہے اور ان کے لئے ہر چیز ممکن ہے! بس اتنا چاہئے کہ انہیں ان کی قدر و قیمت سمجھا دی جائے تاکہ وہ آزادی سے ترقی کرسکیں...''

اس کے الفاظ سے ماں کے دل میں ملے جلے سے جذبات پیدا ہونے لگے۔ کسی وجہ سے اس سوفیا پر رحم آیا، اس رحم میں کوئی خراب غیر دوستانہ جذبہ نہ تھا لیکن اس کا جی چاہا کہ وہ کوئی اور سیدھی سادی بات کرے۔

''تمہیں کوئی کبھی اس کا صلہ بھی دے سکے گا؟'' اس نے آہستہ سے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''صلہ تو مل بھی چکا!'' سوفیا نے جواب دیا۔ اور ماں کو ایسا محسوس ہوا کہ ان الفاظ میں فخر کی آمیزش تھی۔ ''ہمیں زندگی کا ایسا راستہ نظر آگیا ہے جو ہمارے لئے باعث اطمینان ہے، ہم اپنی تمام روحانی طاقتوں کا بھرپور استعمال کرکے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ زندگی سے اور چاہ بھی کیا سکتے ہیں؟''

ماں نے اس کی طرف دیکھا اور نظریں جھکالیں اور ایک بار سوچنے لگی:

''میخائلو اسے پسند نہ کرے گا...''

وہ دونوں تیز رفتاری سے لیکن بغیر جلد بازی کے جا رہی تھیں، خوشگوار ہوا کے گہرے سانس لیتے ہوئے۔ اور ماں کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دونوں کہیں زیارت کے لئے جا رہی ہیں۔ اسے اپنی وہ خوشی یاد

آئی جب بچپنے میں وہ اپنے گاؤں سے دور ایک نقاہ میں عبادت کیل ئے گئی تھی جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہاں ایک معجزے دکھانے والی مورتی رکھی ہے۔

کبھی کبھی سوفیا آسمان کے متعلق یا محبت کے متعلق بڑے ترنم کے ساتھ کوئی نیا گیت گاتی یا کبھی وہ کھیتوں، جنگلوں اور والگا کے متعلق نظمیں پڑھتی اور ماں ان نظموں کو سن کر مسکرا دیتی اور غیر ارادی طور پر نظر کی بحر کے ساتھ اپنا سر ہلاتی اور موسیقی کی رو میں بہہ جاتی۔

اسے اپنے اندر بڑی محبت، سکون اور سوچ بچار کا احساس ہو رہا تھا جیسے گرمی کی کسی شام میں ایک چھوٹے سے باغ کے کونے میں بیٹھی ہوئی ہو۔

5

تیسرے دن وہ دونوں اپنی منزل مقصود پر پہونچ گئیں۔ ماں نے کھیت میں کام کرتے ہوئے ایک کسان سے تارکول کے کارخانے کا پتہ پوچھا اور پھر وہ دونوں جنگل کے درمیان ڈھلوان سڑک پر چلنے لگیں جس پر درختوں کی جڑوں سے سیڑھیاں سی بن گئی تھیں۔ اس سڑک پر چل کر وہ ایک کھلی جگہ پہونچیں جہاں ہر طرف کوئلے اور لکڑی کے ٹکڑے اور تارکول کے ڈھیر نظر آ رہے تھے۔

''آخر پہونچ ہی گئے!'' ماں نے کچھ پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بانس اور درخت کی شاخوں سے بنائے ہوئے سائبان کے سامنے ایک میز پڑی ہوئی تھی۔ زمین میں گڑے ہوئے کھمبوں میں تین تختیوں کو کیلوں سے ٹھونک کر میز بنا دی گئی تھی۔ ربین سر سے پاؤں تک تارکول کی سیاھی میں لپا ہوا قمیص کے بٹن کھولے اس میز پر یفیم اور دو اور نوجوان لڑکوں کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ سب سے پہلے ربین نے عورتوں کو دیکھا اور آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے خاموشی سے ان لوگوں کے نزدیک آنے کا انتظار کرتا رہا۔

''آداب میخائلو بھائی!'' ماں دور سے چلائی۔

وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ ان کی طرف چلا اور جب اسے پہچان لیا تو رکا اور مسکرایا اور اپنے سیاہ ہاتھ سے ڈاڑھی کو سہلانے لگا۔

''ہم زیارت کرنے جا رہے تھے'' ماں نے نزدیک آتے ہوئے کہا۔ ''تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ

اپنے بھائی کی خیریت پوچھ لی جائے۔ یہ میری سہیلی ہیں آنا...''

اپنی جدت طبع سے خوش ہوکراس نے کنکھیوں سے سوفیا کے گمبھیر چہرے کی طرف دیکھا۔

''آداب!'' ربین نے کچھ بناوٹی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، پھر ماں سے مصافحہ کیا اور سوفیا کو تعظیم دی۔

''جھوٹ مت بولو، اب تم شہر میں نہیں ہو۔ یہاں جھوٹ کی ضرورت نہیں، یہ سب اپنے ہی لوگ ہیں...''

یفیم میز پر بیٹھے بیٹھے ہی ان زائرین کو دیکھتا رہا۔ پھراس نے سرگوشی کے انداز میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ جب عورتیں نزدیک آ گئیں تو اس نے خاموشی سے اٹھ کر ان کو تعظیم دی۔ اس کے ساتھی خاموش بیٹھے رہے جیسے مہمانوں کو دیکھا ہی نہیں۔

''ہم لوگ تو بالکل راہبوں کی طرح رہتے ہیں'' ربین نے آہستہ سے پلا گیا کے کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی ملنے نہیں آتا، مالک چلا گیا ہے اوراسکی بیوی شفا خانے میں ہے۔ اب تقریباً میں ہی ساری دیکھ بھال کررہا ہوں۔ بیٹھو، کچھ پیوگی تو ضرور۔ یفیم تھوڑا سا دودھ لے آؤ''

یفیم سائبان میں چلا گیا اور زائرین نیا پنی پیٹھ پر سے تھیلے اتارے ایک نوجوان دبلے پتلے لڑکے نے اٹھ کران کی مدد کی لیکن اس کا دوسرا موٹا، پستہ قد، جھبرا سا ساتھی میز پراپنی کہنیاں ٹکائے وہیں بیٹھا رہا۔ پھراس نے کچھ گنگناتے ہوئے ان لوگوں کوغور سے دیکھنا شروع کیا۔

تارکول کی تیز بو نے سڑی ہوئی پتیوں کی بو کے ساتھ مل کرعورتوں کا سر چکرادیا۔

''اس کا نام یاکوف ہے'' ربین نے لمبے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''اور دوسرا اگناٹ ہے۔ اچھا تمہارا بیٹا کیسا ہے؟''

''جیل میں ہے!'' ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''پھر جیل پہونچ گیا!'' ربین بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے جیل بہت پسند ہے...''

اگناٹ نے گانا بند کر دیا اور یاکوف نے ماں کے ہاتھ سے لاٹھی لے لی اور بولا:

''بیٹھ جاؤ!...''

''کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ'' ربین نے سوفیا سےکہا۔ وہ خاموشی سے ایک درخت کے تنے پر بیٹھ

گئی اور ربین کو غور سے دیکھنے لگی۔

''کب گرفتار کیا اسے؟'' ربین نے ماں کے سامنے بیٹھ کر سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ ''بڑی خراب قسمت ہے تمہاری نلوونا!''

''سب ٹھیک ہے'' اس نے کہا۔

''عادی ہوگئیں ان سب باتوں کی؟''

''نہیں عادی نہیں ہوئی لیکن سوچتی ہوں کیا بھی جاسکتا ہے!''

''ہونہہ'' ربین بولا۔ ''تو ذرا تفصیل سے سناؤ...''

یفیم ایک برتن میں دودھ لے کر آیا۔ میز پر سے ایک پیالی اٹھائی، اسے صاف کر کے دودھ انڈیلا اور سوفیا کو دیا۔ وہ اس دوران میں ماں کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس نے بہت احتیاط سے سب کام کیا اور ذرا بھی شور نہیں کیا۔ جب ماں نے سارے واقعات بیان کر دئے تو کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی اور کسی شخص نے بھی دوسرے کی طرف نہیں دیکھا۔ ایگناٹ میز پر بیٹھا ناخنوں سے تختوں پر شکلیں ٹکائے کھڑا تھا۔ یاکوف ایک درخت کا سہارا لئے ہاتھ باندھے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سوفیا بیٹھی کسانوں کو غور سے دیکھ رہی تھی...''

''ہونہہ'' ربین نے آہستہ سے دکھ بھرے انداز میں کہا۔ ''تو اس طرح دھاڑے!...''

''اگر ہم کبھی ایسا جلوس نکالیں''، یفیم نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تو کسان تو ہمیں جان سے مار ڈالیں۔''

''بالکل، سچ مچ مار ہی ڈالیں'' ایگناٹ نے سر ہلا کر تائید کی۔ ''میں تو کارخانے میں کام کرنے جانے والا ہوں۔ وہاں حالت کچھ بہتر ہے...''

''تم نے ابھی کیا کہا تھا کہ پاویل پر مقدمہ چلے گا؟'' ربین نے دریافت کیا۔ ''اور سزا کیا ملے گی؟ کچھ معلوم ہوا؟''

''قید بامشقت یا سائبیریا میں عمر قید'' اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

تینوں نوجوان لڑکے ایک دم اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ربین نے سر جھکا کر پوچھا:

''یہ سب کچھ کرنے سے پہلے اسے معلوم تھا کہ سزا کیا ملنے والی ہے؟''

''ہاں معلوم تھا'' سوفیا نے اونچی آواز میں کہا۔

ہر شخص چپ چاپ بیٹھا رہا جیسے اس تصور نے ان سب کو منجمد کر دیا ہو۔

''ہونہہ'' ریبن متانت کے ساتھ کہتا رہا۔ ''میرا بھی خیال ہے کہ اسے سب کچھ معلوم تھا۔ آنکھیں بند کر کے غوطہ لگانے والا آدمی نہیں ہے وہ۔ بہت سنجیدہ ہے اس بارے میں۔ سنتے ہو تم لوگ؟ اسے معلوم تھا کہ پولیس کی سنگینیں اس کا سینہ چھید سکتی ہیں یا اسے سائبیریا بھیجا جا سکتا ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کے قدم نہیں رکے۔ اگر اس کی اپنی ماں بھی اس کے راستے میں لیٹ جاتی تو وہ اس کے سینے پر سے ہوتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ کیوں ہے نا، نلوونا؟''

''بالکل ٹھیک کہتے ہو'' ماں نے چونک کر کہا۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور چاروں طرف دیکھا۔ سوفیا نے خاموشی سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور تیوری چڑھا کر ریبن کی طرف دیکھنے لگی۔

''اسے کہتے ہیں مرد!'' اس نے ان لوگوں کی طرف اپنی سیاہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک بار پھر چھیوں آدمی خاموش ہو گئے۔ سورج کی شعاعیں ہوا میں سنہرے فیتوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ کہیں دور سے کالے کاگ کی کائیں کائیں کی آواز آئی۔ یکم مئی کے واقعات اور پاویل اور آندری کی یاد نے ماں کو کچھ دل گرفتہ کر دیا۔ ماں نے چاروں طرف دیکھا۔ چھوٹے سے میدان میں تار کول کے خالی پیپے بکھرے ہوئے تھے اور ہر طرف جڑوں سے اکھڑے ہوئے پودے پڑے تھے۔ کنارے پر شاہ بلوط اور برچ کے گھنے درخت خاموشی سے کھڑے زمین پر پرسکون سیاہ سائے پھیلا رہے تھے۔

یاکوف دفعتاً درخت کے نزدیک سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔

''فوج میں جبریہ بھرتی کے بعد ایسے ہی لوگوں کے خلاف مجھے اور یفیم کو بھیجیں گے کیا؟'' اس نے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''پھر اور کس کے خلاف بھیجیں گے؟'' ریبن نے جواب دیا۔ ''خود ہم سے کہتے ہیں کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا گھونٹو۔ یہی تو ان کی چالاکی ہے!''

''لیکن میں تو بہر حال سپاہی ہی بنوں گا۔'' یفیم نے سختی سے کہا۔

''تمہیں روکتا کون ہے؟'' ایگناٹ نے زور سے کہا۔ ''ضرور جاؤ، ہاں البتہ'' اس نے آہستہ سے ہنس کر کہا۔ ''جب مجھے گولی مارنا تو سر کا نشانہ لینا۔ ادھر ادھر مار دیا تو عمر بھر کے لئے ناکارہ ہو جاؤں گا، بس

ایسا مارنا کہ ختم ہی ہو جاؤں۔''

''اس سے پہلے بھی کئی بار سن چکا ہوں!'' یفیم نے چڑھ کر جواب دیا۔

''ایک لمحہ ٹھیرو دوستو!'' ریبن نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس عورت کو دیکھو!'' ماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''جس کا بیٹا غالباً ہمیشہ کے لئے گیا...''

''ایسا کیوں کہتے ہو؟'' ماں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''کہنا ہی پڑتا ہے'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے بال یوں ہی سفید نہیں ہوئے ہیں۔ اور تمہارا کیا خیال ہے۔ کہ اس کے بیٹے کے ساتھ یہ سب کچھ کر کے اس کی ماں کو بھی مار ڈالا؟ نلوونا تم پرچے لائی ہو؟''

ماں نے اس پر نظر ڈالی۔

''ہاں...'' اس نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔

''دیکھا!'' ریبن نے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔ اور کون سی چیز تمہیں یہاں لا سکتی ہے! کیا سمجھے؟ بیٹے کو گرفتار کر لیا گیا۔ تو ماں نے اس کی جگہ لے لی!''

ہوا میں مکا لہراتے ہوئے اس نے موٹی سی گالی دی۔

ماں نے اس چیخ سے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ اس میں بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ وہ دبلا ہو گیا تھا، ڈاڑھی الجھی ہوئی تھی اور اس کے نیچے سے اس کے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ آنکھوں کے نیلے سے ڈھیلوں میں سرخ نسیں ابھر آئی تھیں جیسے بہت دنوں سے سو نہ سکا ہو۔ شکاری پرندوں کی طرح اس کی ناک آگ کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ گریبان میں سے، جو کبھی سرخ تھا اور اب سیاہ ہو گیا تھا، ہنسلی کی ہڈیاں اور اس کے سینے کے گھنے سیاہ بال نظر آ رہے تھے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ متانت اور ماتمی انداز اختیار کئے ہوئے تھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں غیض وغضب کی جوالا اندر ہی اندر بھڑک رہی تھی اور اس نے اس کی سیاہ چہرے کو روشن کر دیا تھا۔ سوفیا پیلی اور خاموش بیٹھی ہوئی تھی اور ان کسانوں کی طرف سے نظریں ہٹانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایگناٹ نے سر ہلایا اور آنکھیں میچ لیں، یاکوف سائبان کے پاس جا کر کھمبوں سے چھال کے ٹکڑے اکھاڑنے لگا۔ یفیم ماں کی پشت پر میز کے نزدیک ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ ریبن بولتا رہا:

''تھوڑے ہی دنہوئے ضلع کے افسر نے مجھے بلایا اور بولا' تو نے پادری سے کیا کہا تھا بے غنڈے؟'، 'مجھے غنڈہ کیوں کہتے ہو؟' میں نے کہا' خون پسینہ ایک کر کے روٹی کماتا، ہوں اور کسی کو نقصان نہیں پہونچاتا۔،بس مجھ پر چیخنے لگا اور میرے منھ پر زور سے تھپڑ مارا اور تین دن تک جیل میں رکھا' تو اس طرح عام آدمیوں کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں کیوں؟، میں نے سوچا' تو پھر یہ امید مت رکھنا کہ ہم لوگ یہ سب بھول جائیں گے حرامزادو! میں نہ سہی کوئی اور تم سے یا تمہاری اولاد سے بدلہ لے گا۔ یاد رکھنا! اپنے آہنی پنجوں سے تم نے لوگوں کے سینوں کو چھلنی کر دیا ہے اور ان میں نفرت کے بیج بودئے ہیں، تو پھر رحم کی توقع بھی نہ کرنا ظالمو!' بات دراصل یہ ہے!''

غصے کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماں ڈر گئی۔

''اور میں نے پادری سے کہا کیا تھا؟ اس نے کچھ آہستگی سے بات جاری رکھی۔'' گاؤں کا چکر لگانے کے بعد وہ کچھ کسانوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ ایسی باتیں کر رہا تھا گویا عام لوگ بھیڑ بکری ہیں اور انہیں کسی گلے بان کی ضرورت ہے۔ ہونہہ۔ تو پھر میں نے مذاقا کہا، اگر لومڑی کو جانوروں کا سردار بنا دیا جائے تو پھر چڑیوں کے بجائے پر اڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔، اس کے کان کھڑے ہو گئے اور کہنے لگا کہ لوگوں کو بے انتہا مصیبتوں کا عادی ہونا چاہئے اور ہمیشہ خدا سے دعا کرتے رہنا چاہئے کہاں مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کی طاقت عطا کرے۔ میں نے کہا' لوگ تو پہلے ہی سے دعا مانگتے آ رہے ہیں لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اللہ میاں اتنے مصروف ہیں کہ ان کی بات سننے کا موقع ہی نہیں ملتا، کیونکہ کسی کی دعا میں اثر ہی نہیں ہوتا۔ ہونہہ۔ تو پھر اس نے مجھ سے پوچھا' تم کیا دعا مانگتے ہو؟' اور میں نے جواب دیا 'دوسرے عام آدمیوں کی طرف ایک ہی دعا کرتا آیا ہوں: خداوندا مجھے بتا کہ کس طرح پتھر کھاؤں اور لٹھ اگلوں اور رئیسوں کے لئے اینٹیس ڈھوؤں،۔ لیکن مجھے بات ختم کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔'' دفعتاً ربین سوفیا کی طرف مخاطب ہوا۔'' تمہارا بھی رئیس لوگوں سے تعلق ہے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''رئیسوں سے کیوں تعلق ہونے لگا؟'' اس نے تعجب سے چونک کر جلدی سے پوچھا۔

''کیوں؟'' ربین بھنبھنایا۔'' اس لئے کہ میرا خیال ہے تم ان ہی لوگوں میں پیدا ہوئی ہو۔ ہر ایک کی قسمت میں لکھا ہے کہ جہاں پیدا ہوا ہے وہیں کا ہو کر رہے گا۔ ہونہہ۔ تمہارا خیال ہے کہ اس سوتی رومال کے نیچے جو تم نے سر پر باندھ رکھا ہے رئیسوں کے گناہوں کو چھپا سکو گی؟ ہم تو پادری کو دیکھ کر پہچان

جاتے ہیں چاہئے بورے میں کیوں نہ بند ہو۔ میز پر کوئی چیز گری ہوئی تھی اور جب تم نے بھولے سے اس پر اپنی کہنیاں رکھ دیں ایک جھرجھری سی لی۔ اور تمہاری کمر بھی اتنی سیدھی ہے کہ محنت کش تو کسی طرف تو کسی طرف سے ہو ہی نہیں سکتیں...''

ماں کو خطرہ محسوس ہوا کہ وہ اپنے بھونڈے مذاق سے سوفیا کو تکلیف پہونچا دے گا اس لئے وہ بیچ میں بول پڑی:

''یہ میری سہیلی ہیں میخائلوا ایوانو وچ، اور بہت ہی اچھی عورت ہیں، ہمارے ہی لئے کام کرتے کرتے انہوں نے اپنے بال سفید کئے۔ تم ذرا سخت ہوتے جا رہے ہو...''

ربین نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''لیکن میں نے ایسی بات کون سی کہی جو بری لگے؟''

''میرا خیال ہے تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے'' سوفیا نے خشک انداز میں کہا۔

''میں؟ ارے ہاں، تھوڑے دن ہوئے یہاں ایک نیا آدمی آیا تھا۔ یاکوف کا چچا زاد بھائی، دق کا مریض ہے۔ اسے بلا بھیجوں؟''

''ضرور!'' سوفیا نے کہا۔

ربین نے آنکھیں میچ کر اس کی طرف دیکھا اور مڑ کر یفیم سے آہستہ سے کہا:

''جاؤ، اس سے جا کر کہو کہ شام کو ادھر آ جائے۔''

یفیم نے ٹوپی پہنی اور کسی کی طرف دیکھے یا ایک لفظ کہے بغیر چلا گیا اور جنگل میں غائب ہو گیا۔ ربین نے اس کے جانے کے بعد سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا:

''اس کی زندگی بڑی مشکل میں گذر رہی ہے۔ بہت جلدی بھرتی کر لیا جائے گا۔ یہ اور یاکوف۔ یاکوف تو کوئی چھپی ڈھکی نہیں رکھتا: اس نے تو کہہ دیا 'میں نہیں جا سکتا'، جانا تو یہ بھی نہیں چاہتا لیکن جائے گا ضرور۔ کہتا ہے کہ میں فوجیوں کو بیدار کروں گا۔ میں کہتا ہوں کہ سر مار مار کر دیوار نہیں گرائی جا سکتی۔ ایک بار ہاتھ میں سنگینیں تھما دی گئیں تو یہ لوگ بھی سب کے ساتھ ہو لیں گے۔ لیکن یفیم ہے بہت پریشان اور اگناٹ بار بار اس بات کو دھرا کر اسے تنگ کرتا رہتا ہے۔ بلا وجہ کی بات ہے۔''

''بالکل بلا وجہ کی بات نہیں ہے'' اگناٹ نے ربین کی طرف دیکھ کر چڑ چڑے انداز میں کہا۔

''بھرتی ہونے کے بعد ہی دوسروں کی طرح آقاؤں کے حکم پر گولی نہ چلانے لگے تو کہنا...''

''مجھے یقین نہیں آتا'' ربین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''ہاں اچھا تو یہی ہے کہ نہ جائے۔ روس اتنی بڑی جگہ ہے۔ کہاں کہاں تلاش کریں گے؟ جعلی پاسپورٹ لے لے اور گاؤں گاؤں گھومتا پھرے۔''

''میں تو یہی کرنے جا رہا ہوں'' ایگناٹ نے ایک چھڑی اپنے پیر پر مارتے ہوئے کہا۔''ایک بار ان کی مخالفت پر کمر باندھ لی تو پھر ہمیشہ آگے بڑھتے ہی رہنا چاہئے!''

گفتگو رک گئی۔ شہد کی مکھیاں اور بھڑیں سر کے اوپر چکر لگاتی ہوئی بھنبھنانے لگیں۔ چڑیاں چہک رہی تھیں اور دور کھیتوں سے ایک گیت کی آواز آ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ربین بولا:

''اچھا، اب کام کا وقت ہو گیا، تم لوگ بھی آرام کرو، وہاں سائبان میں کچھ تختے ہیں۔ یاکوف ذرا جا کر کچھ سوکھے پتے اٹھا لاؤ۔ اور ماں لاؤ اب ذرا پرچے دو۔''

ماں اور سوفیا نے اپنے بنڈل کھولنا شروع کئے۔

''کتنے بہت سے پرچے لے آئی ہو!'' کتابوں پر جھکتے ہوئے ربین نے خوشی سے کہا۔''بہت عرصے سے یہ کام کر رہی ہو۔ اے۔ کیا۔ کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے سوفیا سے پوچھا۔

''آننا ایوانوونا'' اس نے جواب دیا۔''بارہ برس سے، کیوں پوچھا تم نے؟''

''کوئی خاص بات نہیں، جیل بھی جا چکی ہو شاید؟''

''ہاں۔''

''دیکھا؟'' ماں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔''اور تم اس سے بے ہودہ طریقے سے پیش آ رہے تھے...''

''برا مت مانو'' اس نے کچھ دیر بعد مسکراتے ہوئے کتابوں کا ایک بنڈل اٹھایا۔''رئیس اور کسان تارکول اور پانی کی طرح ہوتے ہیں۔ کبھی مل نہیں سکتے۔''

''لیکن میں تو رئیس زادی نہیں ہوں، میں ایک انسان ہوں'' سوفیا نے نرم سی ہنسی ہنس کر احتجاج کیا۔

''ہو سکتا ہے'' ربین نے جواب دیا۔''کہتے ہیں کہ کتے بھی کبھی بھیڑیئے تھے۔ میں جا کر ذرا ان پرچوں کو چھپا دوں۔''

ایگناٹ اور یاکوف ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس کی طرف آئے۔

''ذرا دیکھنے تو دو'' ایگناٹ نے کہا۔

''جب ایک ہی ہیں کیا؟'' ریبن نے سوفیا سے دریافت کیا۔

''نہیں، مختلف قسم کے پرچے ہین اور اخبار بھی ہیں...''

''سچ؟''

تینوں آدمی جلدی سے سائبان میں چلے گئے۔

''کسان اٹھ کھڑا ہوا ہے'' ماں نے ریبن کی طرف دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''ہاں'' سوفیا نے جواب دیا۔ ''ایسا چہرہ تو میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ایک شہید کا چہرہ! چلو وہیں چلیں، میں ذرا ان لوگوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''اس کی سختی کا برا مت ماننا'' ماں نے نرمی سے کہا۔

سوفیا ہنسی۔

''تم کتنی اچھی ہو نلوونا!''

جب دونوں دروازے میں پہونچیں تو ایگناٹ نے گردن اٹھا کر انہیں ایک نظر دیکھا، اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور اپنے گھٹنوں پر پھیلے ہوئے اخبار کو پڑھنے لگا۔ ریبن کھڑا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ سورج کی ایک کرن چھت کی درز سے اس کے اخبار پر پڑ رہی تھی۔ پڑھتے وقت اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ یاکوف تختے پر پھیلی ہوئی کتابوں کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔

ماں سائبان کے دوسرے کونے میں جا کر بیٹھ گئی اور سوفیا اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے پیچھے کھڑی ہوگئی اور خاموشی سے ان لوگوں کو دیکھتی رہی۔

''یہ لوگ ہم کسانوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں میخائلو چچا'' یاکوف نے بغیر مڑے آہستہ سے کہا۔

ریبن اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

''اس لئے کہ ان لوگوں کو ہم سے محبت ہے'' اس نے کہا۔

ایگناٹ نے گہرا سانس لیا اور سر اوپر اٹھایا۔

''یہاں لکھا ہے کہ 'کسان اپنی ساری انسانی خصوصیات کھو چکا ہے۔ ہاں ظاہر ہے'' اس کے

سیدھے سادھے کھلے ہوئے چہرے پر ایک سایہ سا دوڑ گیا جیسے اس کوئی چیز ناگوار گزری ہو۔ ''میری کھال پہن کر دیکھو دوست پھر معلوم ہوگا کہ کیسے لگتے ہو!''

''میں لیٹنے جاتی ہوں'' ماں نے سوفیا سے کہا۔ ''میں ذرا تھک سی گئی ہوں اور یہ بو تو میرا سر چکرائے دے رہی ہے۔ اور تمہارا کیا حال ہے؟''

''مجھے آرام کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔''

ماں تختے پر لیٹ کر اونگھنے لگی۔ کوئی مکھی یا بھڑ آ کر بزرگ خاتون کے آرام میں خلل ڈالنا چاہتی تو وہ بڑی احتیاط سے اسے اڑا دیتی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے ماں اس کو دیکھ رہی تھی۔ کوئی مکھی یا بھڑ آ کر بزرگ خاتون کے آرام میں خلل ڈالنا چاہتی تو وہ بڑی احتیاط سے اسے اڑا دیتی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے ماں اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے اس خیال اور ہمدردی سے اسے بڑی خوشی محسوس ہوئی۔

ریبن نزدیک آیا اور زور سے کھس پھسایا۔

''سوگئی؟''

'' کچھ دیر تک وہ کھڑا ماں کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور آہستہ سے کہا:

''شاید یہ پہلی عورت ہے جو اس راستے پر اپنے بیٹے کے پیچھے پیچھے چل کر آئی ہے۔''

''کہیں اٹھا نہ دینا اسے، چلو باہر چلیں'' سوفیا نے کہا۔

''اب تو کام کا وقت ہو گیا۔ تم سے کچھ باتیں تو کرنی ہیں لیکن شام تک اٹھا رکھنی ہوں گی۔ آؤ یارو، چلیں...''

وہ تینوں سوفیا کو سائبان میں چھوڑ کر چلے گئے۔

''خدا کا شکر ہے کہ یہ دونوں دوست ہو گئے'' ماں نے سوچا۔

اس کی ناک میں جنگل اور تارکول کی تیز بو بسی ہوئی تھی۔ لیکن وہ سوگئی۔

تارکول کے کارخانے کے مزدور واپس آ گئے۔ وہ خوش تھے کہ کام کا وقت ختم ہو گیا۔

ان کی آوازوں سے ماں جاگ پڑی اور جمائیاں لیتی مسکراتی سائبان سے باہر آئی۔

''تم لوگ تو وہاں کام کر رہے تھے اور میں یہاں شہزادی کی طرح پڑی سو رہی تھی'' اس نے ان

لوگوں کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس میں تمہاری کیا خطا؟'' ربین نے جواب دیا۔ تھکن نے اس کا رہا سہا کس بل نکال دیا تھا اور وہ اب پہلے سے زیادہ پرسکون سا نظر آ رہا تھا۔

''ایگناٹ'' اس نے کہا۔ ''کچھ چائے کیوں نہ ہو جائے؟ اوپر کا کام ہم لوگ یہاں باری باری سے کرتے ہیں۔ کھانے اور چائے وغیرہ کے متعلق آج ایگناٹ کی باری ہے۔''

''آج تو جی چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا میرے بدلے کام کر دے'' ایگناٹ نے آگ جلانے کے لئے چھپٹیاں وغیرہ جمع کرتے ہوئے کہا۔

''صرف تم ہی مہمانوں کے پس بیٹھنا چاہتے ہو کیا!'' یفیم نے سوفیا کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری مدد کرتا ہوں ایگناٹ'' یاکوف نے کہا اور اٹھ کر سائبان کے اندر گیا۔ ایک روٹی لا کر اس کے ٹکڑے کاٹے اور میز پر رکھ دئے۔

''سنو!'' یفیم نے کہا۔ ''کوئی کھانس رہا ہے...''

ربین نے کان کھڑے کئے اور سر ہلایا۔

''وہی ہے۔ زندہ ثبوت چلا آ رہا ہے'' اس نے سوفیا کو سمجھایا۔ ''اگر میرا بس چلتا تو اسے شہر شہر لے کر پھرتا اور چوراہوں پر کھڑے کر کے لوگ کو جمع کرتا کہ اس کی باتیں رکھتی ہے۔''

شام کا دھندلکا اور سکوت زیادہ گہرا ہو گیا۔ لوگوں کی آوازیں مدہم پڑ گئیں۔ سوفیا اور ماں کسانوں کو غور سے دیکھ ہی تھیں۔ ان سب کی چال ڈھال اور انداز میں بوجھل پن، سست رفتاری اور ایک عجیب سی اکتاہٹ اور تھکن کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ بھی ان عورتوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

جنگل کی طرف سے ایک لمبا خمیدہ سا شخص چھڑی ٹیکتا آ رہا تھا۔ ہر شخص سن سکتا تھا کہ وہ بڑی کوشش کر کے سانس لے رہا ہے۔

''آ گیا میں'' اس نے کہا۔ پھر اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

وہ ایک لمبا سا بوسیدہ کوٹ پہنے تھا جو ایڑیوں تک پہونچتا تھا۔ زرد سے بالوں کی لٹیں اس کے پچکے ہوئے ہیٹ کے نیچے سے لٹک رہی تھیں۔ اس کے زرد سوکھے ہوئے چہرے پر سنہری ڈاڑھی تھی۔ ہونٹ مستقل طور پر کھلے ہوئے تھے۔ اور آنکھیں سیاہ حلقوں میں بالکل اندر دھنسی ہوئی بخار کی سی کیفیت میں

چمک رہی تھیں۔

''میں نے سنا ہے تم لوگ کتابیں لائی ہو؟'' ربین کے تعارف کرانے کے بعد اس نے سوفیا سے کہا۔

''ہاں'' وہ بولی۔

''شکریہ۔ تمام لوگوں کی طرف سے۔ ابھی سب لوگ حقیقت کو نہیں سمجھ پاتے۔ لیکن میں جو کہ اس حقیقت کو سمجھتا ہوں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سب کی طرف ہے۔''

وہ جلدی جلدی سانس لے رہا تھا جیسے ندیدے پن سے ہوا کو نگل جانا چاہتا ہو۔ اس کی آواز بار بار رک جاتی۔ اپنے کمزور ہاتھوں کی سوکھی ہوئی انگلیوں سے وہ اضطرابی انداز میں کوٹ کے بٹن بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اتنی رات گئے تمہیں جنگل میں نہیں رہنا چاہئے۔ درختوں کی وجہ سے ہوا میں رطوبت اور بھاری پن پیدا ہو جاتا ہے'' سوفیا نے کہا۔

''اب میرے لئے اچھا ہی کیا رہ گیا ہے'' اس نے مشکل سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب تو موت ہی نجات دلائے گی مجھے...''

اس کی آواز سن کے تکلیف ہوتی تھی اور اس کا پورا حلیہ دیکھ کر شدید رحم کا ایک ایسا جذبہ ابھرتا تھا جس کو اپنے ناکارہ پن کا احساس ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے مریضانہ، افسردہ کن غم و غصہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس نے ایک پیپے پر بیٹھ کر اپنے گھٹنوں کو اس احتیاط سے جھکایا جیسے اسے خوف ہو کہ کہیں وہ ٹوٹ نہ جائیں۔ اس کے بعد اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھنا شروع کیا جس پر اس کے خشک مردہ سے بال بکھرے ہوئے تھے۔

آگ سلگ اٹھی اور ہر چیز کانپتی لہراتی ہوئی معلوم ہوئی، جھلسے ہوئے سایے خوفزدہ ہو کر جنگل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ آگ کے اوپر ایگناٹ کا گول پھولا پھولا سا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ پھر آگ بجھ گئی۔ دھوئیں کی بو آنے لگی اور ایک بار پھر میدان میں تاریکی اور خاموشی چھا گئی جیسے اس بیمار انسان کی دستان کو سننے کی انتہائی کوشش کر رہی ہو۔

''میں اب بھی عام انسانوں کے کام آ سکتا ہوں۔ ایک بہت بڑے جرم کی زندہ شہادت کا کام

دے سکتا ہوں۔ دیکھو میری طرف۔ اٹھائیس برس کی عمر میں میں مر رہا ہوں! دس برس پہلے اپنی پیٹھ پر بارہ پوڈ وزن اٹھا لیتا تھا اور ماتھے پر بل نہ آتا تھا، میں سوچتا تھا کہ ایسی صحت کے ساتھ تو میں ستر برس تک ضرور زندہ رہوں گا لیکن صرف دس ہی برس اور زندہ رہا۔ اور اب۔ خاتمہ قریب ہے۔ میرے مالکوں نے مجھے لوٹ لیا۔ میری زندگی کے چالیس سال چھین لئے۔ چالیس سال!''

''ہر وقت یہ راگ الاپا کرتا ہے'' ریبن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ایک بار شعلے پھر بلند ہوئے، پہلے سے زیادہ روشن اور اونچے، اور ایک بار پھر سایے جنگل کی طرف بھاگ اور شعلوں کی طرف واپس آئے اور ان کے چاروں طرف خاموشی سے مخاصمانہ انداز میں ناچنے لگے۔ بھیگی ہوئی لکڑیاں سنسنائیں اور چٹخیں۔ گرم ہوا کے جھونکوں سے درختوں کی پتیاں بے چین ہو کر سرسرانے لگیں۔ لال اور پیلے لپکتے ناچتے ہوئے شعلے بڑے مزے سے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے اور بلند ہو کر چنگاریوں کی بوچھار کر رہے تھے۔ ایک جلتی ہوئی پتی ہوا میں اڑی اور سیاہ آسمان سے ستاروں نے مسکرا کر اڑتی ہوئی چنگاریوں کو اپنے مسکن میں آنے کی دعوت دی۔

''یہ میرا راگ نہیں ہے۔ یہ وہ گیت ہے جسے ہزاروں انسان یہ محسوس کئے بغیر گاتے رہتے ہیں کہ ان کی دکھی زندگیوں سے کتنے انسانوں کو سبق مل رہا ہے۔ کتنے انسان ہیں جو محنت کرتے کرتے ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ فاقہ کشی کی حالت میں خاموشی سے مر جاتے ہیں...'' کھانسی کا دورہ پڑنے سے وہ دہرا ہو گیا۔

یاکوف نے ایک برتن میں کواس ☆ اور موسم بہار کے پیاز کا ایک گچھا میز پر رکھ دیا۔

''ادھر آؤ سویلی، تمہارے لئے کچھ دودھ لایا ہوں...'' اس نے کہا۔

☆ کواس۔ ایک قسم کی روسی بیر۔ (مترجم۔)

سویلی نے انکار کیا لیکن یاکوف اسے ہاتھ پکڑ کر میز تک لے آیا۔

''تم انہیں یہاں کیوں لائے؟'' سوفیا نے ریبن کو ملامت کی۔ ''کسی وقت بھی مر سکتا ہے بچارا...''

''مجھے معلوم ہے'' ریبن نے کہا۔ ''لیکن جب تک باتیں کر سکے کر لینے دو۔ کسی اچھے مقصد کی خاطر زندگی قربان نہیں کی تو اب ایک اچھے مقصد کے لئے تھوڑا یہ بھی برداشت کرنے دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ فکر مت کرو!''

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہیں اس میں مزہ آرہا ہے'' سوفیا بولی۔

ربین نے اس کی طرف نظر ڈالی اور ترش روئی سے بولا:

''تمہارے رئیس لوگ ہی ہیں جو یسوع مسیح کو صلیب پر لٹکا دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔لیکن ہم لوگ اس شخص کی زندگی سے سبق لینا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی سبق لو...''

ماں نے گھبرا کر ایک بھوں چڑھائی اور کہا:[

''بس بہت ہوا گیا!...''

بیمار شخص نے جواب میز کے پاس بیٹھا تھا ایک بار پھر بولنا شروع کیا:

''آخر وہ سخت محنت کے ذریعہ انسانوں کو کیوں مار ڈالتے ہیں؟ انسانوں سے ان کی زندگی کیوں چھینی جاتی ہے؟ میرے مالک نے۔ میں نفیدوف فیکٹری میں کام کرتا تھا۔میرے مالک نے ایک ایکٹرس کو ایک سونے کا طشت تحفے کے طور پر دیا کہ اس میں منہ دھویا کرے اور بستر کے نیچے رکھنے کے لئے ایک سونے کا پاٹ بھی دیا۔میری ساری زندگی اور میری ساری توانائی اس پاٹ کی نذر ہوگئی! ایک انسان نے محنت کرا کے مجھے صرف اس لئے مار ڈالا کہ اس اپنی محبوبہ کو میرے خون کا تحفہ دینا تھا! میرا خون بیچ کر اس کے لئے سونے کا پاٹ خریدنا تھا!''

انسان تو خدا کی شبیہہ ہوتا ہے اور اسی کی خصوصیات لے کر پیدا ہوتا ہے''یفیم نے طنز کیا۔''اور اس کی مٹی اس طرح پلید کی جاتی ہے۔''

''ہر شخص کو اس کے بارے میں بتانا چاہئے!''ربین نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اس کو برداشت ہی نہیں کرنا چاہئے!''یاکوف نے آہستہ سے کہا۔

ایگناٹ دھیرے سے ہنسا۔

ماں نے دیکھا کہ یہ تینوں لڑکے سب باتیں اس طرح سن رہے تھے جیسے ان ی تشنہ روحوں کی پیاس کبھی نہ بجھ سکتی ہو۔جب بھی ربین باتیں کرتا یہ لوگ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگتے،سویلی کے الفاظ سے ان کے چہروں پر ایک عجیب سا استہزائیہ انداز پیدا ہو جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا کہ ان لوگوں کو اس بیمار آدمی پر بالکل رحم نہیں آتا۔

''جو کچھ کہہ رہا ہے کیا یہ سب سچ ہے؟''ماں نے سوفیا کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

''بالکل صحیح ہے''سوفیا نے اونچی آواز میں کہا۔''ماسکو کے اخباروں میں اس قسم کی خبریں شائع بھی

ہوئی تھیں...‘‘

’’لیکن مجرم کو سزا کبھی نہیں دی گئی‘‘ ریبن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔’’سزا ملنی چاہئے تھی۔ لوگوں کے سامنے کھڑا کر کے، ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی بوٹی چیل کووں کو دینے کی بات تھی۔ جب انسان بیدار ہوں گے تو کتنے غضب کی سزا دیں گے! جو کچھ مصیبتیں انہوں نے سہی ہیں انہیں دھونے کے لئے دیکھنا کتنا خون بہائیں گے! اور وہ خون بھی خود ان ہی کا ہوگا جوان کی نس نس سے چوسا گیا اس لئے اس پر ان کا حق بھی ہے۔ جیسا جی چاہے کریں۔‘‘

’’مجھے سردی لگ رہی ہے‘‘ بیمار نے کہا۔

یاکوف اسے سہارا دے کر آگ کے پاس لے گیا۔

اب آگ بڑی چمک دمک سے جل رہی تھی۔ مبہم سے سایہ لہرا رہے تھے اور تعجب سے شعلوں کی اٹکھیلیوں کو دیکھ رہے تھے۔ سویلی ایک درخت کے تنے پر بیٹھ کر اپنے سوکھ ہوئے ہاتھوں سے اغ تاپنے لگا۔ ریبن نے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور سوفیا سے کہا:

’’جو باتیں کتابیں نہیں واضع کرتیں یہ واضع کر دیتا ہے۔ اگر مشین سے کوئی مزدور مر گیا یا اس کا ہاتھ کٹ گیا تو کہا جاتا ہے کہ خود اس کی خطا تھی۔ لیکن جب کسی کا سارا خون چوس کر اسے چچوڑی ہوئی ہڈی کی طرح پھینک دیا جائے تو پھر تاویل کیا کی جاسکتی ہے۔ قتل کر دو تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن میں یہ نہیں سمجھ پاتا کہ صرف لطف اٹھانے کے لئے لوگوں کو کس طرح اذیت دی جاسکتی ہے۔ لوگوں کو اذیت کیوں دیتے ہیں؟ ہم سب کو اذیت کیوں پہونچائی جاتی ہے؟ صرف مزا لینے کے لئے، اس میں لطف آتا ہے تاکہ زندگی میں مزہ لوٹ سکیں، تاکہ انسانی خون کے بدلے جو چیزیں چاہیں خرید سکیں۔ بہتریں گانے والیاں، ریس کے گھوڑے، چاندی کے چاقو سونے کی طشتریاں، بچوں کے قیمتی کھلونے۔ ’تم جا کر کام کرو، ذرا محنت سے کام کرو تاکہ تمہاری محنت سے اتنا بچا لوں کہ اپنی محبوبہ کے پیشاب کرنے کے لئے سونے کا برتن بنوا سکوں!؛‘‘

ماں دیکھتی رہی اور سنتی رہی اور ایک بار پھر پاویل اور اس کے ساتھیوں کا اختیار کیا ہوا روشن راستہ رات کی تاریکی میں اس نظروں کے سامنے چمک اٹھا۔

کھانا ختم ہوا تو سب لوگ الاؤ کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ شعلے زبان نکالے لکڑیوں کو چاٹ رہے

تھے۔ ان کے پیچھے تاریکی کا پردہ بلند ہو کر جنگل اور آسمان کو چھپائے لے رہا تھا۔ بیمار شخص بیٹھا آنکھیں پھاڑے آگ کی طرف گھور کے دیکھے جا رہا تھا۔ اسے مسلسل کھانسی اٹھا رہی تھی اور وہ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے بچی کچھی زندگی اس بیمار لاغر جسم سے چھٹکارا پانے کیلئے بیتابی سے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ آگ کی روشنی اس کی مردہ کھال میں ذرہ برابر چمک پیدا نہ کر سکی۔ صرف اس کی آنکھوں میں بجھتی ہوئی آگ کی چنگاری روشن تھی۔

''میں تو سمجھتا ہوں تم سائبان میں چلے جاؤ سویلی'' یاکوف نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' بیمار شخص نے کوشش کر کے پوچھا۔ ''میں یہیں بیٹھوں گا۔ زیادہ دنوں تک لوگوں کے ساتھ تھوڑے ہی رہنا ہے!...''

کچھ دیر تک اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کچھ وقفے کے بعد ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

''تم لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تمہاری طرف دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ شائد تم ان سب لوگوں کی طرف سے بدلہ لے سکو گے جنہیں لوٹا گیا ہے، جنہیں لالچ کی خاطر قتل کر دیا گیا ہے...''

کسی نے اس کی باتوں کا جواب نہیں دیا۔ جلدی ہی سینے پر سر جھکا کر وہ سو گیا ریبن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا:

''یہاں آ کر بیٹھتا ہے اور ہمیشہ ایک ہی چیز کے متعلق بات کرتا ہے۔ انسانوں کو کس طرح دھوکا دیا جا رہا ہے۔ اس کی روح میں بس یہی بات بسی ہوئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ بات اس کی آنکھوں پر چپکا دی گئی ہے اور اسے کوئی اور چیز نظر ہی نہیں آتی۔''

''اور دیکھ بھی کیا سکتا ہے؟'' ماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر صرف محنت کی وجہ سے ہزاروں انسان روز مر جاتے ہیں اور ان کے مالک ہر بے ہودہ چیز پر روپیہ اڑاتے ہیں تو پھر رہ ہی کیا جاتا ہے؟...''

''اس کی باتیں سن سن کر طبیعت اکتا گئی'' ایگناٹ نے کہا۔ ''ایک بار سن لیا تو یاد رکھنے کے لئے کافی ہے لیکن وہ ہر بار یہی راگ الاپنے لگتا ہے۔''

''اس کے اس راگ میں زندگی کی ہر چیز سموئی ہوئی ہے'' ریبن نے سنجیدہ انداز میں کہا۔ ''سمجھنے کی بات ہے۔ بیسیوں مرتبہ تو میں اس کی کہانی سن چکا ہوں اور اس کے باوجود مجھے کئی شبہات ہیں۔ کبھی ایسے لمحے آتے ہیں جب یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ انسان اتنا ذلیل اور کمینہ ہو سکتا ہے، اس وقت امیر

غریب سب اچھے معلوم ہوتے ہیں، امیروں کو بھی بہکا دیا گیا ہے! کوئی اندھا ہوا رونے سے، کوئی اندھا ہوا سونے سے، بات دراصل یہی ہے!' کتنے اچھے لوگ ہی ہیں، اس وقت ہم لوگ سوچتے ہیں 'سب بھائی بھائی ہیں! آنکھیں کھولو، ایمانداری سے سوچو، اپنے آپ پر رحم کئے بغیر سوچو!''

بیمار شخص نے جھوم کر آنکھیں کھولیں اور زمین پر لیٹ گیا۔ یاکوف خاموشی سے اٹھ کر سائبان میں گیا اور ایک کمبل لے کر آیا اور اپنے بھائی کو اڑھا دیا۔ اس کے بعد وہ پھر سوفیا کے پاس بیٹھ گیا۔

آگ کی چنچل مسکراہٹ نے تاریکی میں لپٹی ہوئی شکلوں کو روشن کر دیا، لوگوں کی آوازیں شعلوں کی سرسراہٹ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر عجیب فضا پیدا کر رہی تھیں۔

سوفیا نے انہیں بتایا کہ دنیا کے مزدور جینے کا حق مانگنے کے لئے کس طرح جدوجہد کر رہے ہیں۔ جرمنی کے کسانوں نے کس طرح بغاوت کی۔ آزادی کی متواتر جدوجہد میں آئرستان کے مزدور کس طرح مصیبتیں اٹھا رہے ہیں اور فرانس کے مزدور کس بے جگری سے لڑ رہے ہیں...

یہاں، رات کا مخملی لبادہ اوڑھے ہوئے اس جنگل میں، اس چھوٹے سے میدان میں جسے چاروں طرف سے درختوں نے گھیر رکھا تھا، جس کے سر پر سیاہ آسمان کی چھت تھی، جہاں الاؤ کی روشنی تھی اور حیرت زدہ خوفناک سایے چاروں طرف ناچ رہے تھے۔ یہاں اس جگہ ان واقعات کی داستانیں بیان کی جا رہی تھیں جنہوں نے پیٹ بھرے لالچی انسانوں کی دنیا کو ہلا دیا تھا۔ سچائی اور آزادی کی جدوجہد میں لڑنے والوں کے نام لئے جا رہے تھے اور ایک ایک کر کے کرہ ارض کی ساری قومیں خون میں نہائی ہوئی سامنے سے گذرتی چلی جا رہی تھیں۔

سوفیا کی بھاری آواز نرم خرامی کے ساتھ بہتی رہی۔ وہ ماضی کی ایک آواز کی طرح معلوم ہو رہی تھی اور اس آواز نے ان کی امیدیں بڑھائیں، ان میں اعتماد پیدا کیا اور یہ مرد خاموشی سے بیٹھے اپنے دوسرے ملکوں کے بھائیوں کی کہانیوں کو سنتے رہے۔ اور جب انہوں نے اس عورت کے زرد پتلے سے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ مقدس مقصد جس کی خاطر ساری دھرتی کے انسان جدوجہد کر رہے ہیں۔ آزادی کی کبھی نہ ختم ہونے والی جدوجہد۔ ان کی نظروں میں اور واضح اور بامعنی ہو گیا۔ دور دراز ماضی کے ان تمام مختلف نسلوں کے انسانوں میں، جن سے حال کو تاریخ کی سیاہ خونیں دیوار نے الگ کر دیا تھا، انہیں اپنے ہی خیالات اور اپنی ہی خواہشات کا عکس نظر آیا۔ اپنے دلوں اور دماغوں سے انہوں نے اس ساری پھیلی ہوئی

دھرتی کو چھولیا اور اس سے رشتہ قائم کرلیا اور وہاں انہیں ایسے رفیق نظر آئے جو متحد ہو کر اس دھرتی پر عدل انصاف کا راج قائم کرنے پر کمر کس چکے تھے اور اس عزم کو مضبوطی اور تقدیس بخشنے کے لئے نئی اور بہتر زندگی کی خاطر ہزار ہا مصیبتیں برداشت کر چکے تھے اور اپنا خون بہا چکے تھے۔ان کے دلوں میں سارے انسانوں کے ساتھ روحانی وابستگی کے احساس کی شمع روشن ہوگئی اور دنیا میں ایک نیا دل پیدا ہوا۔ایسا دل جو ہر چیز کو سمجھنے کے لئے ، ہر چیز کا احاطہ کرنے کے لئے بیتابی سے دھڑک رہا تھا۔

''وہ دن آئے گا جب تمام ملکوں کے مزدور اٹھ کر کہیں گے۔بس بہت ہو گیا! ایسی زندگی سے طبیعت اکتا گئی!'' سوفیا نے اعتماد کے ساتھ کہا۔''اس وقت ان لوگوں کی خیالی طاقت کا جو صرف اپنے لالچ ہی کی حد تک طاقت ور ہوتے ہیں، بھرم کھل جائے گا، زمین ان کے پیروں تلے سے کھسک جائے گی اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی نہ ملے گا...''

''بات دراصل یہی ہے'' ریبن نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔''اگر ہم اپنے پوری قوت سے اپنا خیال کئے بغیر کام کریں تو وہ کون سی چیز ہے جو نہیں کر سکتے۔''

ماں بھوئیں چڑھائے یہ سب سن رہی تھی اور اس کے لبوں پر تعجب اور خوشی کی ملی جلی مسکراہٹ تھی۔ اس نے دیکھا کہ سوفیا کے طور طریقوں میں اسے جو ضرورت سے زیادہ اختصار، بلند آوازی اور ہمہ گیریت محسوس ہوتی تھی۔اس کی داستان کے دلچسپ باربط بیان میں گم ہوگئی تھی۔اس رات کا سناٹا، شعلوں کی اٹکھیلیاں اور سوفیا کا چہرہ بہت اچھا معلوم ہوا لیکن سب زیادہ اسے کسانوں کے گمبھیر چہرے پسند آئے۔وہ خاموشی سے دم سادھے بیٹھے تھے کہ کہیں داستان کا تسلسل نہ ٹوٹ جائے، کہیں وہ روشن رشتہ منقطع نہ ہو جائے جس نے انہیں ساری دنیا کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔انمیں سے کوئی ایک کبھی کبھی خاموشی سے الاؤ میں کچھ لکڑیاں ڈال دیتا اور جب اس کی وجہ سے چنگاریوں کی پھلجھڑیاں چھوٹتیں اور دھوئیں کے بادل بلند ہوتے تو وہ اپنا ہاتھ بلند کر کے کوشش کرتا کہ چنگاریاں اور دھواں عورتوں تک نہ جائیں۔

ایک بار یاکوف اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ سے بولا:

''ایک منٹ ٹھہر جاؤ...''

وہ دوڑ کر سائبان میں گیا اور کچھ کپڑے لے کر آیا جنہیں اس نے اور ایگناٹ نے مہمانوں کے کاندھوں اور پیروں پر ڈال دیا۔اس کے بعد سوفیا نے پھر باتیں شروع کیں۔اس نے اس فتح کے دن کا

نقشہ کھینچنا شروع کیا، ان لوگوں کے اندر خود اپنی قوت کا اعتماد پیدا کیا اور ان تمام لوگوں کے ساتھ ا یکتا کا شعور ابھارا جو پیٹ بھروں کی احمقانہ خواہشوں کی تسکین کے لئے بے مصرف محنت میں اپنا خون پسینہ ایک کئے دے رہے تھے۔ سوفیا کے الفاظ سے ماں کے اندر زیادہ ہیجان خواہشوں کی تسکین کے لئے بے مصرف محنت میں اپنا خون پسینہ ایک کئے دے رہے تھے۔ سوفیا کے الفاظ سے ماں کے اندر زیادہ ہیجانی کیفیت پیدا نہیں ہوئی لیکن ان سب کے دلوں میں سوفیا کے الفاظ نے جو گہرے برادرانہ جذبات پیدا کر دیئے تھے اس کی وجہ سے ماں کے دل میں انلوگوں کی طرف سے جذبہ تشکر پیدا ہوا جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہے تھے تا کہ محبت اور سچائی اور ایماندارانہ خیالات کے تحفے ان تک لاسکیں جو روزمرہ کی محنت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

''خدا ان کی مدد کرے!'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔

صبح ہوتے ہوتے تھکی ماندی سوفیا نے باتیں بند کر دیں اور اپنے چاروں طرف روشن سنجیدہ چہروں کو دیکھ کر مسکرائی۔

''اب چلنا چاہئے'' ماں نے کہا۔

''ہاں چلنا چاہئے'' سوفیا نے جواب دیا۔

ان میں سے ایک لڑکے نے ایک گہرا، ٹھنڈا سانس بھرا۔

''تم لوگوں کا جانا اچھا نہیں لگتا'' ربین نے خلاف معمول بہت نرم لہجے میں کہا۔ ''تم باتیں بہت اچھی کرتی ہو۔ بڑی بات ہے یہ۔ یہی کہ لوگوں کو محسوس کرایا جائے کہ وہ ایک ہیں۔ جب کوئی یہ سمجھ جائے کہ میں جو کچھ چاہتا ہوں وہی بات کروڑوں اور انسان بھی چاہتے ہیں تو دل میں ایک عجیب محبت سی محسوس ہونے لگتی ہے اور محبت بہت بڑی قوت ہے!''

''محبت کرو تا کہ کوئی دوسرا آ کر سر پر جوتا مارے!'' یفیم اٹھتے ہوئے ہنسا۔ ''میخائلو چچا، میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے کہ کوئی ان لوگوں کو دیکھ لے یہلوگ یہاں سے نکل جائیں تو اچھا ہے۔ ہم پرچے تقسیم کریں گے تو حکام فوراً تلاش شروع کریں گے کہ پرچے لایا کون۔ کوئی یہ ضرور کہے گا۔ وہ زائر عورتیں یاد ہیں نہ جو یہاں آئی تھیں؟...''

''تم نے جو تکلیف اٹھائی ماں اس کا شکریہ'' ربین نے بات کاٹی۔ ''تمہیں دیکھتا ہوں تو پاویل یاد

آتا ہے۔ کتنا اچھا کام کر رہی ہو تم!''

اس وقت وہ بڑی نیکی کے دم میں تھا تب ہی تو بہت محبت سے مسکرایا۔ ہوا میں خنکی تھی۔ لیکن وہ وہاں بغیر کوٹ پہنے، قمیص کا گریبان کھولے کھڑا ہوا تھا۔ ماں نے اس کی مضبوط جسمانی ساخت کو دیکھا اور نرمی سے بولی:

''کچھ پہن لو۔ سردی ہے۔''

''میرے سینے کے اندر بہت گرمی ہے!''اس نے جواب دیا۔

تینوں لڑکے الاؤ کے پاس بیٹھے چپکے چپکے باتیں کرتے رہے اور بیمار شخص ان کے پیروں کے پاس کمبل اوڑھے لیٹا رہا۔

افق پر روشنی کے ہلکے سے آثار نمودار ہوئے، سایے تحلیل ہونے لگے اور پتیاں سورج نکلنے کی توقع میں کانپنے لگیں۔

''اچھا تو میں سمجھتا ہوں تم لوگوں کو جانا ہی چاہیئے'' ریبنن نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوفیا سے کہا۔ شہر میں تمہار کیسے پتہ چلا جائے؟''

''تمہیں مجھے تلاش کرنا ہوگا'' ماں نے کہا۔

تینوں لڑکوں نے، آہستہ آہستہ سوفیا کے پاس آکر کچھ بھدیسل سی خوش خلقی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا، صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کو دبی دبی سی مسرت محسوس ہو رہی تھی، ایک لطیف اور دوستانہ جذبہ ابھر رہا تھا اور اس احساس کے نئے پن سے وہ کچھ گھبرا سے گئے تھے۔ ایک پیر سے دوسرے پیر پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالتے ہوئے نیند سے بوجھل آنکھوں سے انہوں نے سوفیا کی طرف دیکھا اور اس احساس کے نئے پن سے وہ کچھ گھبرا سے گئے تھے۔ ایک پیر سے دوسرے پیر پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالتے ہوئے نیند سے بوجھل آنکھوں سے انہوں نے سوفیا کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

''جانے سے پہلے کچھ دودھ نہیں پیو گی؟'' یاکوف نے سوال کیا۔

''دودھ ہے کیا؟''یفیم نے دریافت کیا۔

''نہیں'' ایگناٹ نے کچھ گھبرا کر اپنے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے گر گیا...''

تینوں ہنسنے لگے۔

باتیں تو وہ دودھ کے متعلق کر رہے تھےلیکن ماں نے محسوس کر لیا کہ وہ کسی اور بات کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ یہ کہ ان کے دل اس کے اور سوفیا کے لئے محبت کے جذبے سے لبریز ہیں اور وہ ان دونوں کی بھبوں کے خواہش مند ہیں۔ سوفیا پر اس کا بہت اثر ہوا۔ وہ کچھ شرما سی گئی اور اس کے دل میں پاکیزہ عجز انکساری کا جذبہ بیدار ہوا جس کی وجہ سے وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکی:

''شکریہ ساتھیو!''

لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور انہیں محسوس ہوا جیسے اس کے الفاظ نے انہیں اٹھا کر بہت بلند کر دیا ہو۔

بیمار شخص بری طرح کھانسنے لگا۔ سرد پڑتے ہوئے الاؤ میں انگارے بجھنے لگے۔

''خدا حافظ!'' کسانوں نے آہستہ سے کہا اور یہ اداس لفظ ان عورتوں کے کانوں میں بہت دیر تک گونجتا رہا۔

پو پھٹنے سے پہلے کے مدہم سے اجالے میں وہ آہستہ آہستہ جنگل کے راستہ پر چل کھڑی ہوئیں۔

''کتنا اچھا وقت گزرا!'' ماں نے سوفیا کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ ''جیسے خواب دیکھا ہو۔ لوگ سچائی کو معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ معلوم کرنے کے لئے کتنے بیتاب ہیں اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کرسمس یا ایسٹر کے تہوار کے دن گرجے میں صبح کے وقت نماز سے پہلے پادری نہ آیا ہو، ہر چیز تاریک اور پرسکوت اور بھیانک سی ہو لیکن لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے ہوں۔ کوئی یہاں اٹھ کر مقدس تصویر کے سامنے شمع جلا دے اور آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹ جائے اور خدا کا گھر روشن ہو جائے۔''

''بالکل ٹھیک کہتی ہو!'' سوفیا نے ہنس کر کہا۔ ''ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ یہاں ساری دنیا خدا کا گھر ہے!''

''ساری دنیا!'' ماں نے کچھ سوچ کر دھرایا۔ ''اتنی اچھی بات پر تو آسانی سے یقین بھی نہیں آتا اور تم نے اتنی اچھی طرح سمجھایا میری پیاری۔ بہت ہی اچھی طرح اور میں ڈر رہی تھی کہ ان لوگوں کو تم پسند نہ آؤ گی...''

سوفیا ایک لمحے تک خاموش رہی پھر آہستہ سے بڑے سنجیدہ انداز میں بولی:

''ان کے ساتھ رہنے سے بڑی سادگی آجاتی ہے...''

وہ دونوں سڑک پر چلتی رہیں اور ربین ، بیمار شخص اور لڑکوں کے متعلق باتیں کرتی رہیں جو بہت توجہ کے ساتھ، لیکن خاموشی اور الجھن کے سے عالم میں بیٹھے سنتے رہے تھے لیکن جنہوں نے معمولی معمولی خدمات سے بہت اچھی طرح ثابت کر دیا تھا کہ ان عورتوں کے کتنے ممنون ہیں۔ اب وہ کھلے میدان میں پہونچ چکی تھیں۔ آفتاب ان سے بغلگیر ہونے کے لئے طلوع ہو رہا تھا۔ نظروں سے ابھی تک اوجھل ہونے کے باوجود اس نے اپنی گلابی شعاعوں کے شفاف پنکھے کو ساری آسمان پر پھیلا دیا تھا اور گھاس پر شبنم کے قطرے اپنے دلوں میں بہار کی چنچل مسرتیں لئے ہزار رنگ سے چمک اٹھے۔ پرندوں نے بیدار ہو کر اپنے شادماں نغموں سے صبح کا دامن مالا مال کر دیا۔ بڑے بڑے کالے کاگ اپنے بھاری پروں کو پھڑ پھڑاتے کائیں کائیں کرتے اڑنے لگے اور کہیں دور سے طوطی کی آواز سنائی دی۔ دور دراز کی رسعتوں نے جاگ کر ابھرتے ہوئے سورج کا خیر مقدم کرنے کے لئے رات کے اندھیروں کو تمام پہاڑیوں پر سے ہٹا دیا۔

''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص بات کرتا جائے، کرتا جائے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہنا کیا چاہتا ہے لیکن دفعتاً وہ کوئی بہت سادہ سا لفظ کہہ دیتا ہے جس سے سارا مطلب واضح ہو جاتا ہے'' ماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس بیمار شخص کا بھی یہی حال تھا۔ میں نے سنا بھی بہت ہے اور دیکھا بھی بہت ہے کہ مزدوروں کو کارخانوں میں اور دوسری جگہ کس طرح لوٹتے ہیں لیکن انسان ان باتوں کا عادی ہو جاتا ہے اور پھر ان کا دل پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اس نے دفعتاً جو بات کہی وہ کتنی تکلیف دہ تھی اور کتنی باعث شرم! یسوع! کیا یہ سچ ہے کہ لوگ اپنی ساری زندگی محنت میں اس لئے کھپا دیتے ہیں کہ ان مالک ایسی حماقت کی حرکتیں کریں؟ اس کو کوئی جائز کیسے ٹھہرا سکتا ہے!''

ماں کے سارے خیالات اس واقعہ پر مرکوز ہو گئے اور اس نے اس کے ذہن میں اسی قسم کے دوسرے شرم ناک واقعات کو اجاگر کر دیا جن کے متعلق اس نے کئی مرتبہ سنا تھا لیکن اب بھول چکی تھی۔

''ایسا لگتا ہے ان لوگوں کو ہر چیز اتنی زیادہ ملتی ہے کہ دل بھر جاتا ہے، میں نے سنا ہے کہ ایک گاؤں کا افسر تھا جس نے حکم دیا تھا کہ اس کا گھوڑا جب بھی گاؤں سے گزرے تو سارے کسان اس کے سامنے سر جھکا لیا کریں ورنہ گرفتار کر لئے جائیں گے۔ بھلا ایسا کیوں کیا ہوگا اس نے؟ یہ کوئی بات بھی ہوئی؟''

سوفیا نے دھیمے سروں میں ایک گیت گانا شروع کیا جو صبح کی طرح تازہ اور تابندہ تھا...

7

ماں کی زندگی کچھ عجیب اطمینان اور سکون کے ساتھ گزرنے لگی۔ بعض وقت یہ سکون خود اسے حیران کر دیتا۔ اس کا بیٹا جیل میں تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے بڑی سخت سزا ملنے والی ہے۔ لیکن وہ جب بھی اس کے متعلق سوچتی تو غیر ارادی طور پر اس کے ذہن کے پردے پر آندری اور فیدور اور کئی دوسرے لوگوں کی صورتیں پھرنے لگتیں۔ پھر اس کے بیٹے کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے بڑھنا شروع ہوتی یہاں تک کہ ان تمام لوگوں پر چھا جاتی جنھوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ ماں کچھ سوچ بچار میں پڑ جاتی اور غیر محسوس طور پر پاویل کے متعلق اس کے خیالات پھیلنے شروع ہوتے یہاں تک کہ ہر سمت میں بٹ جاتے۔ ان خیالات کی باریک بھٹکتی ہوئی کرنیں ہر طرف روشن کرنے اور انہیں ایک ہی رشتے میں پرونے کی کوشش کرتیں۔ اسی وجہ سے وہ کسی ایک چیز کے متعلق مسلسل نہ سوچ سکتی، اور خصوصاً اپنے بیٹے کے متعلق اس کے اندیشے اور اس کی آرزئیں اور تمنائیں اس کے ذہن کو بہت دیر تک مسلسل مصروف نہیں رکھ سکتی تھیں۔

سوفیا جلد ہی چلی گئی اور پانچ دن بعد بہت خوش وخرم واپس آئی۔ چند گھنٹے بعد پھر غائب ہوگئی اور دو ہفتے بعد پھر آ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زندگی کی شاہراہ پر بڑے بڑے دائروں میں سفر کر رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بار بار اپنے بھائی کے پاس واپس آ جاتی تا کہ اس کے گھر کو اپنی جرات اور اپنی موسیقی سے مالا مال کر دے۔

ماں رفتہ رفتہ موسیقی کو پسند کرنے لگی۔ وہ موسیقی سنتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے سینے میں گرم گرم لہریں اٹھ کر اس کے دل کو نہلا رہی ہیں، دل اور پرسکون طریقے پر دھڑکنے لگتا اور مختلف خیالات کی کونپلیں اس طرح پھوٹنے لگتیں جیسے زرخیز زمین میں پانی دینے سے بیج پھوٹ نکلتا ہے اور یہ خیالات موسیقی کے زیر اثر آسانی اور خوبصورتی سے الفاظ کا جامہ پہن لیتے۔

سوفیا کے پھوہڑپن سے ماں بہت عاجز تھی۔ وہ سگریٹ کی راکھ ہمیشہ ادھر ادھر جھاڑ دیتی اور اپنی چیزیں سارے گھر میں بکھیر دیتی۔ اس سے زیادہ مشکل کام اپنے آپ کو سوفیا کی گرما گرم جوشیلی باتوں کا عادی بنانا تھا۔ اس کے برخلاف نکولائی کی خاموش خوداعتمادی اور نرم سنجیدگی تھی جو ہمیشہ اس کی باتوں میں جھلکتی رہتی تھی۔ اسے سوفیا ایک ایسی لڑکی کی طرح معلوم ہوتی جس نے شباب کی منزل پر اولیں قدم رکھا

ہو لیکن جو اپنے آپ کو بزرگ منوانا چاہتی ہو۔ وہ لوگوں کو اس طرح دیکھتی تھی جیسے کچھ عجیب وغریب قسم کے کھلونے ہوں۔ وہ ہمیشہ محنت کے تقدس کا ذکر کرتی لیکن اپنے پھوہڑ پن سے ماں پر کام کا بوجھ بڑھا دیتی، وہ آزادی کے متعلق بڑی زوردار باتیں کرتی لیکن ماں ہمیشہ یہ دیکھتی کہ وہ اپنے ضدی پن اور مسلسل بحث سے لوگوں کو سخت تکلیف پہونچایا کرتی ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک مجموعہ اضداد تھی اور ماں نے یہ بات محسوس کر لی تھی اس لئے اس سے بہت محتاط طریقے سے بات کرتی اور اس سے وہ پائدار دلی قربت محسوس نہ کرتی جو نکولائی کے ساتھ کرتی تھی۔

اپنی مسلسل سپاٹ اور اداس سی زندگی میں بھی وہ ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھتا: صبح آٹھ بجے چائے پیتا، اسی وقت اخبار پڑھتا اور ماں کو خبریں سناتا۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے ماں بہت صاف اور واضح انداز میں محسوس کرتی کہ زندگی کی یہ عظیم الشان چکی کس طرح لوگوں کو بے رحمی سے پیس کر روپیہ بناتی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ نکولائی میں آندری کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ وہ خوخول کی طرح جب لوگوں کی باتیں کرتا تو اس میں دشمنی کا شائبہ بھی نہ ہوتا، وہ سب کو زندگی کی غلط تنظیم کا ذمہ دار ٹھہراتا۔ لیکن نئی زندگی پر اس کا اعتماد اتنا پر جوش اور اتنا دل آویز نہیں تھا جتنا آندری کا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک سخت گیر اور ایماندار منصف کی طرح پرسکون انداز میں باتیں کرتا۔ خوفناک سی خوفناک چیزوں کے متعلق باتیں کرتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر یاس انگیز مسکراہٹ کھیلتی رہتی مگر ساتھ ہی آنکھوں میں ایک سخت اور سرد چمک بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ جب اس کی آنکھوں کی اس چمک کو دیکھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ یہ شخص کبھی کسی کو معاف نہیں کرے گا۔ کبھی معاف کر ہی نہ سکے گا۔ اور اس کے لئے ماں کا دل دکھتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سخت گیر خود اسے بھی ناگوار تھی۔ اس کی چاہت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

نو بجے وہ کام پر چلا جاتا اس کے جانے کے بعد وہ کمرے صاف کرتی، کھانا پکاتی خود نہا کر صاف ستھرے کپڑے پہنتی اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر کتابوں کی تصویریں دیکھتی۔ اس وقت تک وہ پڑھنا سیکھ گئی تھی مگر اس میں اتنا سر کھپانا پڑتا تھا وہ جلد ہی تھک جاتی اور الفاظ کا ربط سمجھ میں نہ آتا۔ اس کے برخلاف تصویروں میں اسے ایک نئی عجیب وغریب دنیا نظر آتی جسے وہ سمجھ لیتی بلکہ کسی ٹھوس چیز کی طرح تقریباً محسوس بھی کر لیتی تھی۔ بڑے بڑے شہر، خوبصورت عمارتیں، مشینیں، جہاز، یادگاریں، انسانی ہاتھ رنگارنگی چیزیں اس کی نظروں کے سامنے ابھرتیں اور اپنی رنگارنگی سے اسے حیرت میں ڈال جاتیں۔ زندگی میں

اور وسعت آتی گئی اور اس کی آنکھیں ایک سے بڑھ کر ایک عظیم الشان اور حیرت انگیز چیز کو دیکھتی رہیں جن سے اب تک وہ لاعلم تھی اور یہ چیزیں اس بیدار ہوتی ہوئی عورت کی پیاسی روح کو اپنے انمول خزانوں اور لازوال حسن کا گرویدہ بناتی رہیں۔ اس حیوانات کے متعلق ایک نقشہ بہت ہی اچھا معلوم ہوتا تھا، اس نقشے کی زبان بدیسی تھی لیکن اس کے باوجود ماں کو اچھی طرح محسوس ہونے لگا کہ یہ دھرتی کتنی مالدار، کتنی حسین اور کتنی وسیع ہے۔

''دنیا بھی کتنی بڑی ہے!'' ایک دن اس نے نکولائی سے کہا۔

اسے تصویر میں کیڑے اور خاص طور پر تتلیاں بہت پسند تھیں اس نے تعجب سے تصویروں کو دیکھتے ہوئے کہا:

''یہ چیزیں خوبصورت نہیں ہیں کیا، نکولائی ایوانووچ؟ ہر طرف کتنی خوبصورتی بکھری پڑی ہے۔ ہمارے پاس گذر جاتی ہے اور ہم دیکھ نہیں سکتے۔ ہم پر تو سارے دروازے بند ہیں۔ لوگ بغیر کچھ جانے بوجھے ادھر ادھر مارے مارے پھرا کرتے ہیں، ایسی چیزوں پر نظر ہی نہیں جاتی جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچے۔ ان کے پاس نہ تو وقت ہے نہ خواہش۔ اگر یہ جان گئے ہوتے کہ زمین کتنی مالدار ہے اور کتنی عجیب و غریب چیزیں یہاں آباد ہیں تو ن ہ جانے دلوں کو کتنی مسرت حاصل ہوتی۔ سب چیزیں ہر شخص کے لئے ہیں اور ہر چیز سب کے لئے ہے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''بالکل ٹھیک ہے'' نکولائی نے مسکرا کر کہا۔ اور ایک دوسری تصویروں والی کتاب اس کے لئے لایا۔

شام کو اکثر لوگ اس سے ملنے آجاتے۔ اس کے مہمانوں میں یہ لوگ تھے: الکسی واسیلیوچ، ایک خوبصورت سا شخص، چہرہ کچھ زردی مائل، ڈاڑھی سیاہ، بہت وجیہہ اور کم گو، رومن پیڑووچ، چہرے پر مہاسے، گول سا سر، کسی نہ کسی چیز کے متعلق افسوس کے ساتھ چہ چہ کیا کرتا، ایوان دانیلووچ، پستہ قد دبلا پتلا، نوکیلی ڈاڑھی اور اونچی آواز، پیش قبض کی طرح تیز طرار، یا گور جو ہمیشہ اپنے آپ پر، اپنے دوستوں پر اور اپنی بیماری پر، جو دن بدن بڑھتی جارہی تھی، ہنسا کرتا۔ کچھ دوسرے لوگ بھی تھے جو دور دراز شہروں سے آیا کرتے تھے۔ نکولائی ان لوگوں کے ساتھ بہت آہستہ آہستہ دیر دیر تک ہمیشہ ایک ہی موضوع۔ دنیا کے محنت کش پر باتیں کرتا۔ وہ لوگ بحث کرتے، جذباتی ہو جاتے، ہاتھ پاؤں پٹختے اور خوب چائے

پیتے۔ کبھی کبھی وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے ہوتے تو نکولائی کوئی اعلان نامہ تیار کرتا اور پھر اپنے ساتھیوں کو سناتا۔ وہ لوگ فوراً اس کی نقلیں تیار کر لیتے اور ماں مسودے کے پھاڑے ہوئے سارے ٹکڑوں کو بڑی احتیاط سے سمیٹ کر جلا دیتی۔

چائے انڈیلتے ہوئے ماں سوچتی کہ یہ لوگ کس قدر جوش وخروش سے محنت کشوں کی زندگی اور ان کے مقدر کے متعلق باتیں کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ انہیں صحیح راستہ دکھانے اور پست ہمتی سے نکالنے کے طریقوں کو اور کس طرح بہتر بنایا جائے۔ بعض اوقات انہیں غصہ آجاتا، اپنے اپنے خیالات کی سختی سے تائید کرتے، ایک دوسرے پر سخت سے سخت الزام لگاتے، ایک دوسرے کے جذبات کو ٹھیس پہونچاتے اور گرما گرم بحث میں الجھ جاتے۔

ماں کو ایسا محسوس ہوتا کہ مزدوروں کی زندگی کے متعلق تو خود اسے ان لوگوں سے زیادہ علم ہے۔ اسے ایسا لگتا کہ ان لوگوں نے اپنے ذمہ جو کام لیا ہے وہ بہت بڑا ہے لیکن وہ اس کی اہمیت اور وسعت کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ ان کی طرف کچھ بزرگانہ شفقت کا جذبہ محسوس کرتی، اس کے دل میں کچھ ایسے ہی افسوس کا جذبہ محسوس کرتی، اس کے دل میں کچھ بزرگانہ شفقت کا جذبہ پیدا ہوتا جیسے بزرگ بچوں کو میاں بیوی کا کھیل کھیلتے دیکھتے ہیں جو ان تعلقات کی نوعیت سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ غیر ارادی طور پر وہ ان کی باتوں کا اپنے بیٹے اور آندری کی باتوں سے مقابلہ کرتی اور کی باتوں کا اپنے بیٹے اور آندری کی باتوں سے مقابلہ کرتی اور اسے ان سب میں کچھ فرق سا معلوم ہوتا جسے وہ پہلے سمجھ نہ سکی۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ مزدوروں کی بستی کے مقابلے میں یہاں لوگ زیادہ زور سے چیختے تھے اور اس کا سبب اس نے اپنے آپ کو یوں سمجھایا:

''یہ لوگ زیادہ باتیں جانتے ہیں اس لئے زیادہ زور زور سے باتیں کرتیہیں ...''

لیکن اکثر وبیشتر اسے یوں محسوس ہوتا کہ یہ لوگ جان بوجھ کر ایک دوسرے کو اکساتے اور اپنی گرم جوشی کو نمایاں کرتے ہیں، جیسے ان میں سے ہر شخص اپنے ساتھیوں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ دوسروں کے مقابلے میں حقیقت اس کے لئے زیادہ عزیز اور اہم ہے۔ اور دوسرے لوگ چڑھ کر یہ ثابت کرتے کہ حقیقت سے وہ لوگ زیادہ نزدیک ہیں، اس طرح تیز وتند بحث چھڑ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ ہر شخص دوسرے کے مقابلے میں زیادہ اونچا اچھلنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں

ایک پریشان کن افسردگی چھا جاتی۔ وہ ان لوگوں کی طرف پھڑکتے ہوئے ابروؤں اور ملتجی نگاہوں سے دیکھتی اور دل میں سوچتی:

''یہ لوگ پاشا اور اس کے ساتھیوں کے متعلق ساری باتیں بھول گئے ہیں...''

بڑی توجہ سے وہ ان کی تمام بحث سنتی لیکن ظاہر ہے کہ ان باتوں کو سمجھ نہ پاتی۔ مگر وہ الفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے جذبے کو سمجھنے کی کوشش کرتی اور اس نتیجے پر پہونچتی کہ جب مزدوروں کی بستی میں نیکی وخوبی کے تصور پر بحث ہوتی تھی تو اسے ایک مکمل کل کی حیثیت سے پوری طرح تسلیم کیا جاتا تھا لیکن یہاں اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ وہاں جذبات میں گہرائی اور پائیدار تھی، یہاں جذبات پر تیز عقل کا غلبہ تھا جو ہر چیز کو کاٹ ڈالتی تھی۔ یہاں یہ لوگ پرانی چیزوں کو تباہ کرنے کی باتیں زیادہ کرتے تھے، وہاں وہ لوگ نئی چیزوں کو تباہ کرنے کی باتیں زیادہ کرتے تھے، وہاں وہ لوگ نئی چیزوں کے خواب زیادہ دیکھتے اور اس لئے اپنے بیٹے اور آندری کے الفاظ اسے زیادہ عزیز اور اس کے لئے زیادہ قابل فہم تھے...

اس نے دیکھا کہ جب کبھی مزدوروں میں سے کوئی شخص نکولائی سے ملنے آجاتا تو وہ زیادہ کھل کر آزادی سے باتیں کرتا، اس کے چہرے پر مٹھاس آجاتی اور کچھ نئے ڈھنگ سے۔ زیادہ کھردرے یا سرسری انداز میں۔ باتیں کرتا تھا۔

''اس طرح باتیں کر رہا ہے تا کہ ان لوگوں کی سمجھ میں آجائیں'' اس نے سوچا۔

لیکن اس سے اسے خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ جو مزدور اس سے ملنے آتا وہ بھی کچھ اجنبی سا محسوس کرتا جیسے اس کے اندر ہر چیز دبا دی گئی ہو جس کی وجہ سے وہ نکولائی کے ساتھ اس آزادی اور اطمینان سے باتیں نہ کر سکتا تھا جس طرح کہ خود اس سے جو کہ صرف ایک معمولی مزدور عورت تھی۔ ایک بار جب نکولائی کمرے سے باہر گیا تو اس نے اس نوجوان سے کہا جو اس سے ملنے آیا تھا:

''ڈرتے کیوں ہو؟ کوئی بچہ تو ہو نہیں کہ استاد کے سامنے کھڑے سبق پڑھ رہے ہو...''

وہ شخص کھیسیں نکال کر ہنس دیا۔

''پانی سے نکلنے کے بعد مچھلی کی کیا حالت ہوتی ہے...آخر یہ ہم میں سے تو ہے نہیں...''

کبھی کبھی ساشا آتی، وہ زیادہ دیر نہ ٹھہرتی، ہمیشہ بغیر ہنسے کام کی بات کرتی اور جاتے وقت ہمیشہ ماں سے پوچھتی:

''پاویل میخائلووچ کیسا ہے؟''

''اچھا ہے، خدا کا شکر ہے، مزے میں ہے!''

''میرا سلام کہنا'' لڑکی کے سامنے شکایت کی کہ پاویل کو بغیر مقدمہ چلائے اتنے دنوں سے جیل میں ڈال رکھا گیا ہے۔ ساشا کی تیوریوں پر بل آ گئے۔ اس نے کہا کچھ نہیں لیکن انگلیوں میں کچھ تشنج سا پیدا ہوا۔

ماں اس سے کہنا چاہتی تھی:

''جانتی ہوں میری جان کہ تمہیں اس سے محبت ہے...''

لیکن یہ کہنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ لڑکی کا سنجیدہ چہرہ، اس کے سختی سے بھنچے ہوئے ہونٹ اور اس کے الفاظ کی خشکی دیکھ کر محبت کے الفاظ کہنے کا جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ ٹھنڈا سانس بھر کر ماں نے خاموشی سے ہاتھ ملا اور سوچا:

''افوہ کتنی دکھی ہے یہ!...''

ایک دن نتاشا آئی۔ ماں کو یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے اسے پیار کیا اور دفعتاً اس سے آہستہ سے بولی:

''میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ مر گئیں بے چاری...''

سر کو پیچھے جھٹکا دیتے ہوئے اس نے جلدی سے آنکھیں پونچھیں اور کہا:

''افسوس تو یہ ہے کہ ابھی ان کی عمر پچاس برس کی بھی نہیں تھی۔ ابھی تو بہت زندہ رہ سکتی تھیں لیکن میں تو سوچتی ہوں کہ جیسی زندگی انہیں گزارنی پڑ رہی تھی اس سے تو موت ہی بہتر ہے۔ ہمیشہ تنہا رہیں، کوئی بھی تو ان کے نزدیک نہ تھا، کسی کو ان کی ضرورت نہ تھی، میرے باپ ہمیشہ ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے تھے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی؟ دوسرے لوگ اس لئے زندہ رہتے ہیں کہ انہیں کسی بہتر چیز کی امید ہوتی ہے لیکن میری ماں توہین کے سوا اور کسی چیز کی امید ہی نہیں کر سکتی تھیں...''

''ٹھیک کہتی ہو، نتاشا'' ماں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''لوگ کسی بہتر چیز کی امید میں جیتے رہتے ہیں لیکن جب کوئی امید ہی نہ رہ جائے تو پھر زندگی کی کیا معنی؟'' اس نے محبت سے لڑکی کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

''تو اب تم اکیلی رہ گئیں؟''

''بالکل اکیلی''نتاشانے سرسری طور پر کہا۔

''ٹھیک ہی ہے'' کچھ وقفے کے بعد ماں مسکرائی۔''اچھے لوگ بہت دنوں تک اکیلے نہیں رہتے۔ کوئی نہ کوئی ان کے پیچھے لگا رہتا ہے...''

8

نتاشا نے ایک کپڑے کے کارخانے سے متعلقہ اسکول میں نوکری کر لی اور ماں نے اسے غیر قانونی پرچے،اعلانات اوراخبار پہونچانے شروع کر دئے۔

یہی اس کا کام ہوگیا۔مہینے میں کئی بار وہ کسی بیراگن یا لیس اور گھر کے بنے ہوئے کپڑے بیچنے والی کھاتی پیتی شہری عورت یا زائر کا بھیس بدل کر اپنے کاندھے پر تھیلا لٹکائے یا ہاتھ میں سوٹ کیس لئے مختلف علاقوں کا چکر لگاتی۔ریل ہو یا کشتی، ہوٹل ہو یا سرائے وہ ہمیشہ وہی متین سیدھی سادی عورت ہوتی تھی جو اجنبیوں سے آگے بڑھ کر بات کرتی اور اپنی مرنجان مرنج طبیعت اور زمانہ دیکھے ہوئے انسان کی خود اعتمادی کے ساتھ بغیر کسی جھجھک کے لوگ کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی۔

اسے لوگوں سے باتیں کرنے میں مزہ آتا، وہ ان کی کہانیاں اور شکایتیں اور وہ تمام باتیں سنتی جنہوں نے انہیں حیران کر دیا تھا۔اس ایسے شخص سے مل کر بہت خوشی ہوتی جو تمام چیزوں سے غیر مطمئن رہتا۔ایسی بے اطمینانی جو قسمت کی ٹھوکروں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بالکل واضح سوالوں کا حل تلاش کرتی۔اس کی نظروں کے سامنے انسانی کی تصویر بے نقاب ہوتی گئی جس میں آسودگی کی خاطر ایک بے چین اور بے معنی جدوجہد رہتی تھی۔ ہر طرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوششیں تھیں، کچھ نہ کچھ کرنے کی گھاتیں تھیں، ذاتی مفاد کی خاطر ان خون پینے اور آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی ترکیبیں تھیں۔ اوراس نے یہ بھی دیکھا کہ دھرتی پر کسی چیز کی کمی نہیں ہے لیکن زیادہ تر لوگ اس سے محروم ہیں،اورافراط کی دنیا میں نیم فاقہ کشی کی زندگی گذار رہے ہیں۔شہر کے کلیساؤں میں چاندی سونا بھرا ہوا ہے جن کی خدا کو کوئی ضرورت نہیں،لیکن گرجوں کے دروازوں پر فقیر سردی سے کانپ رہے ہیں اور معمولی سی بھیک کیا انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں۔پہلے بھی اس نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔سونے چاندی سے لدی ہوئے کلیسا اور زربفت کا لباس پہنے ہوئے پادری اور اسکے مقابلے میں غریبوں کے گندے جھونپڑے اور ان کے

جسموں کے چیتھڑے۔ لیکن پہلے وہ انہیں قدرتی بات سمجھ کر تسلیم کرلیا کرتی تھی مگر اب یہ چیزیں اس سے معلوم تھا کہ غریب انسا کلیسا سے زیادہ نزدیک ہیں اور امیروں کے مقابلے میں انہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

یسوع مسیح کی تصویریں دیکھ کر اوران کے متعلق کہانیاں سن کر اسے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا لباس سادہ ہوتا تھا کہ ان کا لباس سادہ ہوتا تھا اور غریبوں کے دوست تھے۔ لیکن کلیساؤں میں اس نے یہ دیکھا تھا کہ ان کی تصویر کو سنہرے اور ریشمی کپڑوں میں دھیرج پانے کے لئے آتے تو یہ کپڑے ان کو دیکھ کر کراہیت سے لہرانے لگتے اور غیر ارادی طور پر اسے ربین کے الفاظ یاد آ گئے:

''خدا کے متعلق بھی ہمیں احمق بنادیا گیا ہے!''

غیر شعوری طور پر اس نے نماز کم کر دی لیکن یسوع کے متعلق اور ایسے لوگوں کے متعلق سوچنا زیادہ شروع کر دیا جو اس کا نام نہ لیتے بلکہ شائد اس سے واقف بھی نہ تھے لیکن اسے ایسا محسوس ہوتا کہ یہ لوگ اسی کے اصولوں کے مطابق، اس کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور دنیا کو غریبوں کی مملکت سمجھتے تھے، اور چاہتے تھے کہ دھرتی کی ساری دولت تمام لوگوں میں مساوی طور پر تقسیم کر دی جائے۔ وہ اس بارے میں بہت سوچتی اور یہ خیالات اس کے دل کے اندر جڑ پکڑتے گئے اور زیادہ گمبھیر ہوتے گئے یہاں تک کہ انہوں نے پھیل کر ہر اس چیز کو جو وہ دیکھتی اور سنتی تھی اپنی آغوش میں لے لیا۔ خیالات نے بڑھ کر دعا کی تابندگی حاصل کرلیا اور اپنی پائدار روشنی سے ساری تاریک دنیا کو اور ساری زندگی کو اور سب لوگوں کو منور کر دیا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ خود یسوع اس کے لئے زیادہ عزیز ہو گئے ہیں جن سے وہ پہلے ایک مبہم سی ملائمت کے ساتھ محبت کرتی تھے۔ ایک پیچیدہ سے جذبے کے ساتھ جس میں خوف کے ساتھ اور مسرت کے ساتھ افسردگی کے آمیزش تھی۔ اور یسوع میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ زیادہ بلند اور قابل حصول، زیادہ روشن اور خوش وخرم ہو گئے تھے جیسے سچ مچ انہیں دوبارہ زندگی مل گئی ہو، ان کے نام پر لوگوں نے بے دریغ اپنا خون بہا کر انہیں گویا دھوڈالا ہو، لیکن جو انکسار کی وجہ سے انسانوں کے اس دوست کا م نام زبان تک نہ لاتے ہوں۔ راستے میں سب کچھ دیکھنے سننے کے بعد اور اس بات پر مسرور کہ میں نے اپنے فرض پورا کرلیا ہے وہ ہر سفر کے بعد خوش خوش نکولائی کے پاس آتی۔

''اس طرح سیر وسفر کرنے اور طرح طرح کی چیزوں کو دیکھنے سے کافی فائدہ ہوتا ہے'' ایک شام

اس نے نکولائی سے کہا۔ ''اس سے زندگی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لوگوں کے لئے جینا بھی دوبھر ہو گیا ہے، اتنے پست ہو گئے ہیں کہ انکی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ آخر ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کیا جا رہا ہے، انہیں کیوں دھتکارا جا رہا ہے؟ جب ہر چیز کی اتنی افراط ہے تو پھر انہیں کیوں تاریکی اور جہالت میں رکھا جاتا ہے؟ اور کہاں ہے وہ خدائے بزرگ و برتر جس کی نظروں میں نہ کوئی امیر ہے نہ غریب بلکہ سب اس کے بچے ہیں؟ اپنی زندگی کے متعلق سوچتے ہیں تو لوگ کچھ برانگیختہ سے ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اس کے متعلق کچھ نہ کیا گیا تو یہ ناانصافی ان کا خاتمہ کر دے گی۔''

کچھ دنوں سے تو اس کا جی چاہتا تھا کہ لوگوں کے ساتھ جو بے انصافی ہو رہی ہے اس کے متعلق خود لوگوں سے بات کرے۔ کبھی کبھی اس جذبے کو دبانے میں اسے کافی دقت محسوس ہوتی۔

جب نکولائی دیکھتا کہ وہ تصویریں دیکھ رہی ہے تو مسکرا کر اس سے دنیا کے کسی اور عجوبے کا ذکر کرتا۔ انسان نے اپنے ذمہ جو فرائض لئے تھے ان کی عظمت سے مرعوب ہو کر وہ کچھ اٹک اٹک کر سوال کرتی:

''کیا یہ بات ممکن ہے؟''

اپنی پیشین گوئی میں راسخ اور غیر متزلزل اعتقاد کے ساتھ وہ اپنی محبت بھری آنکھوں سے چشمے کے پیچھے سے اس کی طرف دیکھتا اور مستقبل کا نقشہ کھینچتا:

''انسان کی ضرورتوں کی کوئی تھاہ نہیں اور اس کی قوت لا انتہا ہے! لیکن ابھی دنیا اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے مالا مال کرنے میں سست رفتاری سے کام لے رہی ہے کیونکہ ابھی جو شخص خود مختار ہونا چاہتا ہے وہ علم کے بجائے روپیہ حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ لیکن جب لوگ لالچ کو ختم کر دیں گے اور زبردستی کی مزدوری سے نجات حاصل کر لیں گے...''

اس کی باتیں ماں کی سمجھ میں مشکل ہی سے آتیں لیکن ان کے پیچھے جو ایک پرسکون اعتماد تھا وہ اس کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آنے لگا۔

''دنیا میں آزاد انسان بہت ہی کم ہیں۔ یہی تو مشکل ہے!'' نکولائی نے کہا۔

یہ بات اس کی سمجھ میں آئی۔ وہ ایسے لوگوں سے واقف تھی جنہوں نے اپنے آپ کو لالچ اور کینے کی گرفت سے آزاد کر لیا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر ایسے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو زندگی اتنی تاریک اور وحشتناک نہ رہے گی بلکہ زیادہ سادہ، زیادہ روشن اور زیادہ بلند و برتر ہو جائے گی۔

''لوگوں کو زبردستی سخت دل بنادیا جاتا ہے'' نکولائی نے درد بھرے لہجے میں کہا۔
ماں نے سر کے اشارے سے اس کی تائید کی اور اسے خوخول کے الفاظ یاد آ گئے۔

9

نکولائی وقت کا بہت پابند تھا۔ ایک دن خلاف معمول وہ دیر سے گھر آیا اور بغیر کپڑے اتارے ہاتھوں کو بے چینی سے ملتے ہوئے بولا:

''نلوونا آج ہمارا ایک ساتھی جیل سے فرار ہو گیا ہے۔ کون ہو سکتا ہے؟ مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا...''

ماں کو کچھ چکر سا آ گیا۔

''ممکن ہے پاویل ہو؟'' اس نے بیٹھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''ممکن ہے'' نکولائی نے کاندھوں کو جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن چھپنے میں اس کی مدد کیسے کی جائے؟ اس سے ملا کہاں جائے؟ ابھی میں سڑک کا چکر لگا رہا تھا کہ شاید کہیں ملاقات ہو جائے۔ ظاہر ہے یہ میری بے وقوفی تھی لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ میں پھر جا رہا ہوں...''

''اور میں بھی!'' ماں نے چیخ کر کہا۔

''تم ذرا یگور کے یہاں جا کر پتہ لگاؤ، شاید اسے کچھ معلوم ہو'' نکولائی نے باہر جاتےہوئے تجویز پیش کی۔

وہ سر پر رومال ڈال کر اس کے پیچھے پیچھے ہی سڑک پر پہونچ گئی۔ اس کا دل امید سے معمور تھا، آنکھوں کے سامنے سرخ سرد ھبے ناچ رہے تھے، دل بانسوں اچھل رہا تھا اور وہ تقریباً دوڑی چلی جا رہی تھی۔ سر جھکائے اپنے چاروں طرف ہر چیز سے بے خبر وہ ایک آس کے سہارے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

''اگر وہاں مل گیا تو کتنا اچھا ہوگا!'' امید نے اس کے قدم اور تیز کر دیئے۔

گرمی کی وجہ سے وہ تھک کر ہانپنے لگی۔ یگور کے گھر کی سیڑھیوں پر پہونچی تو آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور دفعتاً آہستہ سے چیخ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اسے ایسا محسوس ہوا کہ ابھی اس نے نکولائی وسوف شیکوف کو دروازے پر جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہوئے دیکھا لیکن جب اس نے دوبارہ دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا...

''شاید صرف تصور ہوگا'' اس نے سیڑھیوں پر چڑھتے اور خاموشی میں کان لگا کر سنتے ہوئے سوچا۔ احاطے میں کسی کے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے رک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ ایک بار چیچک زدہ چہرہ اسے پھر نظر آیا جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''نکولائی، نکولائی!'' اس نے دوڑ کر اس کی طرف جاتے ہوئے پکارا۔ اس کے دل میں مایوسی کا درد تھا۔

''واپس جاؤ'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر وہ یگور کے کمرے میں پہونچی۔ وہ تخت پر لیٹا ہوا تھا۔

''نکولائی جیل سے بھاگ آیا ہے!'' اس نے ہانپتے ہوئے کہا؛

''کون سا نکولائی؟'' یگور نے تکیئے پر سے سر اٹھاتے ہوئے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''نکولائی کے نام دو آدمی تھے۔''

''وسوف شیکوف۔ یہیں آ رہا ہے!''

''بہت خوب!'' اسی وقت نکولائی کمرے میں داخل ہوا۔ دروازے کی چٹخنی لگا کر سر سے ٹوپی اتاری اور وہیں کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ ہنسنے اور بال درست کرنے لگا۔ یگور کہنیوں کے بل کچھ اوپر اٹھا اور اشارے سے کہا:

''ادھر آؤ...''

نکولائی مسکراتا ہوا ماں کے پاس آیا اور اس سے ہاتھ ملایا۔

''اگر تمھیں نہ دیکھتا تو شاید دوبارہ جیل جانا پڑتا۔ شہر میں کسی کو نہیں جانتا اور اگر بستی کی طرف جاتا تو ایک منٹ میں گرفتار ہو جاتا۔ اس لئے میں سڑکوں پر گشت لگاتا رہا اور سوچ رہا تھا کہ بھاگ کر میں نے بھی عجیب حماقت کی ہے۔ دفعتاً میں نے دیکھا کہ نلووانا سڑک پر چلی جا رہی ہیں۔ میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا...''

''تم بھاگ کیسے سکے؟'' ماں نے دریافت کیا۔ تخت کے کنارے پر کچھ چینی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے کاندھوں کا جھٹکا دیا:

''بالکل اتفاق سے۔ میں باہر یوں ہی ہوا کھانے نکلا تھا کہ مجرم قیدیوں نے اپنے چوکیدار کو مارنا

شروع کر دیا۔اس چوکیدار کوایک زمانے میں چوری کے الزام میں پولیس سے نکال دیا گیا تھا۔اب ہر شخص کی مخبری کرتا ہے اور کسی کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔اس کو یہ لوگ مار رہے تھے۔ایک ہنگامہ ہو گیا۔ چوکیدار سیٹیاں بجاتے پھر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ پھاٹک کھلا ہوا ہے۔ باہر سڑک کا چوراہا اور شہر نظر آ رہا تھا۔آہستہ آہستہ وہاں سے چل نکلا جیسے خواب میں چل رہا ہوں۔ جب سڑک پر دور تک پہونچ گیا تو ہوش آیا اور سوچا کہ کہاں جاؤں؟ پیچھے مڑ کر دیکھا تو پھاٹک بند ہو چکا تھا...‘‘

’’ہونہہ‘‘ یگور بولا۔’’تو جناب واپس کیوں نہیں چلے گئے جا کر شرافت سے دستک دے کر کہا ہوتا کہ پھر سے اندر بلا لیجئے، معاف کیجئے گا جناب ذرا غلطی ہو گئی...‘‘

’’واقعی‘‘ نکولائی ہنسا۔’’یہ حماقت تو ہے لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہو کہ اپنے ساتھیوں سے ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے یوں بھاگ آیا۔تو پھر میں آگ بڑھتا ہی گیا۔ راستے میں جنازے کا جلوس ملا۔ ایک بچے کی لاش تھی۔ میں بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گیا اور جنازے کے پیچھے پیچھے سر جھکا کے ادھر ادھر دیکھے بغیر چلنے لگا۔ کچھ دیر قبرستان میں بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کھائی اور ایک دم سے ایک بات میرے ذہن میں آئی...‘‘

’’صرف ایک؟‘‘ یگور نے سوال کیا اور ٹھنڈا سانس بھر کے کہا۔’’میں سمجھتا ہوں تمہارے بھیجے میں زیادہ سوچنے کی گنجائش ہی نہیں۔‘‘

وسوف شیکوف خوش مزاجی سے ہنسا اور سر کو جھٹکا دیتے ہوئے بولا:

’’ارے نہیں اب میرا بھیجا اتنا خالی نہیں ہے جتنا پہلے تھا! لیکن تم اب تک بیمار ہو یگور ایوانو وچ؟‘‘

’’ہر شخص اپنی بساط بھر کام کرتا ہے‘‘ یگور نے بلغمی کھانسی کھانستے ہوئے کہا۔’’ہاں تو اپنا قصہ سناؤ۔‘‘

’’تو پھر میں مقامی عجائب گھر میں چلا گیا۔ چکر لگاتے لگاتے میں سوچتا رہا کہ اب جاؤں کدھر؟ اپنے اوپر غصہ آنے لگا اور بھوک بھی لگی تھی! سڑک پر نکلا تو پھر عجیب سا محسوس ہوا۔ پولیس والے ہر شخص کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ بس اب جلد ہی عدالت میں گھسیٹ لیا جاؤں گا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ پلا گیا نلوونا میری دوڑتی ہوئی چلی آ رہی ہیں۔ میں ایک طرف کو ہو گیا اور ان کے پیچھے پیچھے چلا، بس یہ ہے سارا قصہ۔‘‘

''میں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں'' ماں نے تقصیروارانہ انداز میں کہا۔ وسوف شیکوف کو اس نے بہت غور سے دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ زیادہ دبلا ہو گیا ہے۔

''سارے ساتھی بہت پریشان ہوں گے...'' وسوف شیکوف نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

''اور عہدہ دار؟ ان پر دل نہیں دکھتا؟ وہ بھی تو پریشان ہوں گے'' یگور بولا۔ منہ کھول کر اس نے اپنے ہونٹ اس طرح چلانے شروع کئے جیسے ہوا کو چبا رہا ہو۔ ''خیر مذاق تو ایک طرف رہا، اب تمہیں کہیں چھپانے کا سوال ہے۔ کام خوشگوار ضرور ہے مگر آسان نہیں ہے۔ اگر میں چل پھر سکتا تو!...''

اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اپنے سینے کو آہستہ آہستہ ہاتھوں سے رگڑنے لگا۔

''بہت بیمار معلوم ہو رہے ہو یگور ایوانو وچ'' نکولائی نے سر جھکا کے کہا۔ ماں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اس چھوٹے سے کمرے میں تشویش کے ساتھ نظر دوڑائی۔

''خیر اسے تو مجھ پر چھوڑ دو'' یگور نے جواب دیا۔ ''اب تکلف کس چیز کا ہے پاویل کے متعلق پوچھ ہی ڈالو۔''

وسوف شیکوف مسکرایا۔

''پاویل اچھا ہے۔ بالکل اچھا ہے۔ ایک طرح سے وہی ہمارا سردار ہے وہاں جیل کے عہدہ داروں سے وہی گفتگو کرتا اور مجموعی طور پر وہی قیادت کرتا ہے۔ ہر شخص کے دل سے میں اس کی بڑی عزت ہے...''

وسوف شیکوف کی باتیں سنتے ہوئے نلوونا نے سر ہلایا اور کنکھیوں سے یگور کے سوجے نیلاہٹ لئے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کا چہرہ بالکل بیجان ہے جس سے کسی قسم کے جذبے کا اظہار ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں اس کی آنکھوں میں زندگی اور مسرت کی چمک تھی۔

''کچھ کھانا مل سکتا تو بڑا اچھا ہوتا۔ تم سمجھ نہیں سکتے کہ کتنا بھوکا ہوں!'' نکولائی دفعتاً بولا۔

''ماں دیکھو وہاں الماری کے اوپر کچھ روٹی رکھی ہے'' یگور بولا۔ ''اس کے بعد بڑے کمرے میں جا کر بائیں ہاتھ کو دوسرے دروازے پر دستک دینا۔ ایک عورت دروازہ کھولے گی تو ذرا اسے یہاں بلا لینا۔ کہنا کہ کھانے کی جتنی چیزیں ہوں لیتی آئے۔''

''ہر چیز کیوں؟'' نکولائی نے احتجاج کیا۔

''فکر مت کرو۔ زیادہ نہیں ہوگا...''

ماں نے جا کر دروازے پر دستک دی۔ آواز کی طرف کان لگا کر اس نے یگور کے متعلق سوچا:

''مر رہا ہے...''

''کون ہے؟'' کسی نے کمرے میں سے پوچھا۔

''یگور ایوانووچ نے بھیجا ہے'' ماں نے آہستہ سے کہا۔ ''اپنے کمرے میں بلایا ہے تمہیں...''

''ابھی آئی'' عورت نے دروازہ کھولے بغیر جواب دیا۔ ماں نے ایک لمحہ انتظار کیا اور پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ جلدی سے کھل گیا اور چشمہ لگائے ہوئے ایک لمبی سی عورت باہر نکلی اپنی آستنوں کی شکنوں کو ٹھیک کرتے ہوئے اس نے ماں سے بڑی سرد مہری سے پوچھا:

''کیا چاہیئے؟''

''یگور ایوانووچ نے بھیجا ہے مجھے...''

''تو آؤ، لیکن ایسا لگتا ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے!'' عورت نے نرمی کے ساتھ کہا۔ ''کیسا مزاج ہے؟ یہاں ذرا اندھیرا ہے۔''

ماں نے اس پر نظر ڈالی اور اسے یاد آیا کہ نکولائی کے مکان پر اسے دو ایک مرتبہ دیکھا تھا۔

''یہ سب اپنے ہی ساتھی ہیں'' اس نے سوچا۔

عورت پلاگیا کو اپنے سامنے لئے جا رہی تھی۔

''طبیعت زیادہ خراب ہوگئی کیا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ہاں لیٹے ہوئے ہیں۔ مجھ سے کہا ہے کہ یہاں آکر کچھ کھانے کے لئے لے آؤں...''

''کھانے کی ضرورت بالکل نہیں ہے۔''

دونوں یگور کے کمرے میں داخل ہوئیں تو اس کے بیٹھے ہوئے گلے سے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی:

''میں تو اپنے آبا و اجداد سے ملنے جا رہا ہوں دوست لدمیلا واسی لیونا۔ یہ نوجوان حضرت جو ہیں نا ان کو سوجھی کہ عہدے داروں سے پوچھے بغیر جیل سے چلے آئیں۔ پہلے تو انہیں کچھ کھانا کھلاؤ اور پھر کہیں چھپا دو۔''

عورت نے سر ہلایا اور بیمار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''ان لوگوں کے آتے ہیں مجھے بلا لینا چاہئے تھا یگور۔ اچھا تو دوا دو دفعہ ناغہ کر دی تو نے! بہت بری بات ہے! میرے ساتھ آؤ کامریڈ۔ تھوڑی ہی دیر میں یگور کو شفاخانے منتقل کرنے کے لئے لوگ آتے ہوں گے!''

''تو سچ مچ مجھے شفاخانہ پہونچانے کا ارادہ کر ہی لیا؟''

''ہاں۔ میں رہوں گی تمہارے ساتھ۔''

''وہاں بھی؟ باپ رے باپ!''

''اچھا چھوڑو یہ مذاق!''

عورت نے باتیں کرتے ہوئے یگور کو ٹھیک سے کمبل اڑھایا۔ نکولائی کو غور سے دیکھا۔ پھر شیشیوں کو اٹھا کر دیکھا کہ دوا کتنی باقی ہے۔ اسی کی آواز ہموار اور موزوں اتار چڑھاؤ والی تھی اور چال میں ایک خاص دلکشی تھی۔ اس کا چہرہ زردی مائل تھا اور کالی بھویں ناک کے اوپر آ کر تقریباً مل گئی تھیں۔ ماں کو اس کی شکل پسند نہ آئی۔ اسے اس کے چہرے مین کچھ خود پسندی کی کی جھلک نظر آئی۔ اس عورت کی آنکھیں نہ تو کبھی مسکراتیں نہ کبھی چمکتیں اور جب بات کرتی ایسا معلوم ہوتا کہ حکم دے رہی ہے۔

''اب ہم لوگ جاتے ہیں'' اس نے بات جاری رکھی۔ ''لیکن میں ابھی آتی ہوں۔ یگور کو اس میں سے ایک چمچہ دوا دیدو۔ اور دیکھو انہیں بات نہ کرنے دینا۔''

وہ نکولائی کو ساتھ لے کے چلی گئی۔

''بہت اچھی عورت ہے'' یگور نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا۔ ''بہت ہی غیر معمولی عورت ہے... میں تمہیں اس کے ساتھ لگائے دیتا ہوں ماں۔ بیچاری بہت تھک جاتی ہے...''

''بات مت کرو۔ لو یہ دوا پیو'' ماں نے محبت سے کہا۔

اس نے دوا پی اور ایک آنکھ بند کر لی۔

''زبان بند کئے رہوں تب بھی مروں گا تو ضرور...'' اس نے کہا۔

دوسری آنکھ سے ماں کو دیکھتا رہا۔ مسکرایا تو ہونٹ آہستہ سے کھل گئے۔ ماں نے سر جھکا لیا اور رحم کے ایک بے پناہ جذبے سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ٹھیک ہی ہے۔ بالکل فطری بات ہے'' وہ بولا۔ ''زندگی اور موت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔''

ماں ن ے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک بار پھر آہستہ سے بولی:

''خاموش نہیں رہ سکتے کیا؟''

اس نے آنکھیں بند کر لیں جیسے اپنے سینے کے اندر کی خرخراہٹ کو سن رہا ہو۔ اس کے بعد پھر اس نے باتیں شروع کیں:

''خاموش لیٹے رہنے کے کوئی معنی نہیں ماں۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ نزع کے چند لمحے اور مل جائیں گے لیکن تم جیسی اچھی خاتون سے چند باتیں کرنے کی سعادت ہاتھ سے چلی جائے گی۔ اتنا تو یقین ہے کہ دوسری دنیا میں لوگ یہاں کی طرح اچھے نہیں ہو سکتے...''

ماں نے کچھ پریشان ہو کر اسے باتیں کرنے سے روکا:

''وہ خاتون پھر واپس آئیں گی اور مجھ پر برس پڑیں گی کہ تمہیں باتیں کیوں کرنے دیا...''

''وہ خاتون نہیں، وہ ایک انقلابی ہے، کامریڈ ہے۔ بہت اچھی عورت ہے۔ خفا تو ضرور ہوگی۔ ہر شخص پر خفا ہوتی ہے...''

اپنے ہونٹوں کو جنبش دینے کی کوشش کرتے ہوئے یگور نے اس سے اپنے پڑوسی کی کہانی سنانی شروع کی۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور ماں نے محسوس کیا کہ وہ جان بوجھ کر چھیڑ رہا ہے اور اس کے نم اور نیلے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ پریشان سی ہوگئی اور سوچنے لگی:

''یہ تو مر رہا ہے...''

لدمیلا واپس آ گئی۔ احتیاط سے دروازہ بند کرنے کے بعد وہ ماں کی طرف مخاطب ہوئی:

''تمہاری دوست کو کپڑے بدل کر میرے کمرے سے فوراً رخصت ہو جانا چاہئے۔ اس لئے اب تم جا کر اس کے لئے کچھ کپڑے لے آؤ۔ یہیں لے آنا۔ برا ہوا کہ سوفیا آج کل یہاں نہیں ہے۔ لوگوں کو چھپانا۔ اس کام میں تو ماہر ہے۔''

''کل آ رہی ہے'' ماں نے شال لپیٹتے ہوئے کہا۔

اسے جب بھی کوئی کام دیا جاتا تو اسے فوراً پورا کرنے کے لئے وہ اتنی بے تاب ہو جاتی کہ کسی اور چیز کے متعلق ذہن میں کوئی بات ہی نہ آتی۔

''کیا خیال ہے تمہارا، کس قسم کا لباس ہونا چاہئے؟'' اس بے بالکل کاروباری انداز میں پوچھا۔

''کوئی سا بھی ہو۔ رات کو جانا ہے۔''

''رات تو اور بھی خطرناک ہوتی ہے۔ سڑکوں پر لوگ کم ہوتے ہیں اور پولیس والے زیادہ چوکنے ہو جاتے ہیں۔ کچھ بہت زیادہ چالاک قسم کا آدمی نہیں ہے یہ۔''

یگور روکھی ہنسی ہنسا۔

''تمہیں دیکھنے شفاخانے آسکتی ہوں کیا؟'' ماں نے دریافت کیا۔

کھانستے ہوئے اس نے سر ہلایا۔

''میرے ساتھ باری باری سے ان کی تیماری داری کرو گی؟'' لدمیلا نے ماں کی طرف اپنی سیاہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تیار ہو نا؟ بہت خوب۔ لیکن اب جلدی سے جا کر آ جاؤ۔''

اس نے محبت لیکن کچھ تحکمانہ انداز سے ماں کا ہاتھ پکڑا اور اسے دروازے تک لے آئی۔ باہر نکل کر اس نے آہستہ سے کہا:

''اس طرح تمہیں وہاں سے ہٹا دیا، اس کا برا مت ماننا، لیکن بات کرنا اس کے لئے مضر ہے اور مجھے تو اب تک امید ہے...''

اس نے دونوں ہاتھ اتنی زور سے کس کر دبائے کہ ہڈیاں چٹخنے لگیں اور پھر تھکے تھکے انداز میں اپنی پلکیں جھکا لیں۔ اس اعتراف سے ماں کچھ پریشان سی ہوگئی۔

''ارے واہ، ظاہر ہے امید ہونی چاہئے!'' ماں نے زیر لب کہا۔

''ذرا دیکھ لینا خفیہ کے لوگ آس پاس تو نہیں ہیں'' عورت نے دھیرے سے کہا۔ اس نے اپنے ہاتھ اٹھا کر کنپٹیوں کو رگڑا۔ اس کے ہونٹ کانپے اور چہرہ نرم پڑ گیا۔

''مجھے معلوم ہے!...'' ماں نے کہا۔ اس کے لہجے میں فخر کی جھلک تھی۔

پھاٹک سے باہر نکلتے ہوئے وہ ایک منٹ کے لئے رکی، تیزی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھ کر اس نے اپنی شال درست کی۔ اچھے خاصے مجمع میں بھی وہ عموماً خفیہ کے لوگوں کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتی تھی۔ ان کی چال کی مبالغہ آمیز بے نیازی، ان کی حرکت وسکنات کا غیر فطری سکون واطمینان اور ان کے چہرے پر تھکن اور اکتاہٹ کی آثار۔ یہ سب چیزیں جوانکی عیار کی محتاط، مجرم نگاہوں کے راز کو بالکل نہیں چھپا سکتی

تھیں، ماں ان سب سے خوب واقف تھی۔

لیکن اس وقت اسے اس قسم کا کوئی چہرہ نظر نہیں آیا اور وہ تیزی سے سڑک پر چل کھڑی ہوئی۔ ایک گاڑی میں بیٹھ کر بازار تک گئی۔ نکولائی کے لئے کپڑے خریدتے وقت وہ بڑی سختی سے مول تول کرتی رہی۔ وہ یہ ظاہر کررہی تھی گویا اس کا شوہر بڑا شرابی اور عیاش قسم کا انسان ہے اور تقریباً ہر مہینے اس کے لئے ایک نیا جوڑا خریدنا پڑتا ہے۔ دوکانداروں پر اس کی کہانیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا لیکن خود اسے بہت خوشی ہوئی کیونکہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا تھا کہ پولیس والے یہ تو محسوس کریں گے ہی کہ نکولائی کے لئے نئے کپڑے خریدے جائیں گے اور اس لئے خفیہ کے لوگوں کو بازار بھیجا جائے گا۔ اسی احتیاط کے ساتھ وہ یگور کے مکان واپس آئی اور اس کے بعد نکولائی کو لے کر شہر کے بالکل کنارے تک گئی۔ وہ لوگ سڑک کے دونوں طرف چل رہے تھے اور ماں یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ نکولائی کس طرح بھاری بھرکم انداز سے آگے چلا جا رہا ہے۔ اس کے لمبے بھورے کوٹ کا دامن بار بار پیروں میں الجھ جاتا، ہیٹ کو بار بار اوپر اٹھاتا جا رہا تھا جو بار بار کھسک کر ناک تک آ جاتی تھی۔ ایک سنسان سی گلی میں ساشا انکے پاس آئی اور ماں نے وسوف شیکوف کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور واپس گھر چلی آئی۔

''لیکن پاویل اب بھی جیل ہی میں ہے... اور آندری...'' اس نے سوچا اور اسے دکھ ہوا۔

نکولائی سے ملاقات ہوئی تو وہ بڑی پریشانی کے عالم میں تھا۔

''یگور کی حالت اچھی نہیں ہے!'' وہ بولا۔ ''بہت خراب حالت ہے! شفاخانے پہونچا دیا گیا ہے۔ لدمیلا یہاں آئی تھی تمہیں بلا کے گئی ہے...''

شفاخانے؟''

نکولائی نے کچھ گھبرائے گھبرائے سے عالم میں اپنی عینک ٹھیک کی اور پھر ماں کو صدری پہننے میں مدد دی۔

''یہ لو۔ یہ بنڈل بھی لیتی جاؤ'' نکولائی نے اس کی انگلیوں کو اپنے گرم ہاتھوں میں دباتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وسوف شیکوف کو ٹھیک سے پہونچا دیا؟''

''ہاں۔''

''میں بھی یگور سے ملنے آؤں گا۔''

ماں تھک کے چور ہوگئی تھی اور نکولائی کی پریشانی نے اسے وسوسے میں ڈال دیا کہ کوئی بڑا حادثہ پیش آنے والا ہے۔

''وہ مر رہا ہے'' یہ خوفناک خیال اس کے ذہن میں آتا رہا۔

لیکن صاف ستھرے چھوٹے سے کمرے میں پہونچنے کے بعد اسے تسکین ہوئی جہاں تکیوں کے ڈھیر کے درمیان یگور بیٹھا ہنس رہا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑی سنتی رہی کہ یگور ڈاکٹر سے کیا کہہ رہا ہے:

''بیمار کا علاج کرنا ایسا ہی ہے جیسے اصلاحات کرنا...''

''اپنی بکواس بند کرو یگور!'' ڈاکٹر کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''لیکن میں انقلابی ہوں اور مجھے اصلاحات سے نفرت ہے...''

ڈاکٹر نے یگور کا ہاتھ نرمی اور آہستگی سے واپس اس کے اوڑھنے کی چادر پر رکھ دیا اور اپنے مریض کا سوجا ہوا چہرہ ہاتھ سے چھو کر محسوس کرتے ہوئے وہ بڑی فکرمندی کے ساتھ اپنی ڈاڑھی کو سہلانے لگا۔

ماں ڈاکٹر سے واقف تھی۔ وہ نکولائی کا بہت اچھا دوست تھا۔ اس کا نام تھا ایوان دانیلووچ۔ وہ یگور کے نزدیک گئی جس نے اسے دیکھ کر زبان نکال کر چڑھایا۔ ڈاکٹر اس کی طرف مڑا۔

''آؤ نلوونا آؤ! ہاتھ میں کیا ہے؟''

''کتابیں ہوں گی شاید'' ماں نے جواب دیا۔

''انہیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے'' ڈاکٹر نے کہا۔

''یہ تو مجھے احمق بنا دینا چاہتے ہیں'' مریض نے شکایت کی۔

وہ کچھ ہانپ سا رہا تھا اور سینے میں خرخراہٹ ہو رہی تھی۔ چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھے اور ماتھے سے پسینہ پونچھنے کے لئے ہاتھ اٹھاتا تھا تو اسے تکلیف ہوتی تھی۔ سوجے ہوئے بے حس و حرکت گالوں نے اس کے چوڑے، محبت بھرے چہرے کو مسخ کر کے ایک بے جان مورت میں تبدیل کر دیا تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں صاف شفاف مسکراہٹ تھی۔

''جناب اسکولاپیں، اب میں تھک گیا۔ لیٹ جاؤں؟''

''نہیں لیٹو مت!'' ڈاکٹر نے روکھے پن سے کہا۔

''تم گئے اور میں لیٹ!''

''لیٹنے نہ دینا نلوونا! ذرا تکیوں کو ٹھیک سے لگا دینا، اور دیکھو انہیں باتیں مت کرنے دو۔ بہت نقصان دہ ہے۔''

ماں نے سر ہلایا اور ڈاکٹر چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔ یگور نے سر کو ڈھیلا چھوڑ دیا، آنکھیں بند کرلیں اور بالکل ساکت ہوگیا۔ صرف اس کی انگلیاں کانپتی رہیں۔ اس چھوٹے سے کمرے کی سفید دیواریں سرد اور افسردہ کن تھیں۔ بڑی سی کھڑکی میں سے لائم کے پودوں کی بل کھاتی ہوئی چوٹیاں نظر آرہی تھیں اور ان کی گہرے رنگ کی گرد آلود پتیوں کے درمیان زرد دھبے چمک رہے تھے اور خزاں کے سرد لمس کا پتہ دے رہے تھے۔

''موت مجھے بڑی آہستگی اور... بے دلی سے لئے جارہی ہے'' یگور نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

''معلوم ہوتا ہے اسے مجھ پر کچھ رحم آگیا ہے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!...''

''باتیں بند کر دو یگور ایوانووچ'' ماں نے اس کے ہاتھ کو محبت سے تھپتھپاتے ہوئے درخواست کی۔

''میں باتیں بند کردوں گا۔ بہت جلد۔''

بڑی مشکل سے اس نے بات جاری رکھی۔ کبھی سانس اکھڑ سا جاتا اور کبھی سکت نہ ہونے سے خاصی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا۔

''کتنی اچھی بات ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ ہو۔ تمہاری صورت دیکھ کر اچھا لگتا ہے۔ میں کبھی کبھی اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔ ان کا حشر کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ تم بھی دوسروں کی طرح۔ جیل میں ڈال دی جاؤ گی۔ اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔ جیل سے ڈر لگتا ہے تمہیں؟''

''نہیں!'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''ظاہر ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ جیل بڑی بری جگہ ہوتی ہے، میرا یہ حال جیل ہی میں ہوا۔ سچ کہتا ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتا...''

ماں کہنے ہی والی تھی کہ ''ممکن ہے تم بچ جاؤ'' لیکن اس کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر وہ خاموش ہو گئی۔

''ابھی کام کی سکت تھی مجھ میں... اگر میں کام نہ کرسکتا۔ تو زندہ رہنے سے کوئی فایدہ نہ ہوتا۔ سراسر

حماقت...''

ماں نے ٹھنڈا سانس بھرا اور غیر ارادی طور پر اسے آندری کا پسندیدہ جملہ یاد آ گیا ''بات تو انصاف کی ہے مگر اس سے سکون نہیں ہوتا!'' دن بھر کے کام نے اسے تھکا دیا تھا اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مریض کی یکساں آواز کمرے میں چھائی ہوئی تھی اور چکنی دیواروں پر بیچارگی سی پھیل رہی تھی۔ باہر لائم کے پودوں کی چوٹیاں نیچے نیچے تیرتے ہوئے بادل معلوم ہو رہی تھیں، بے انتہا سیاہ اور برس جانے پر آمادہ بادل۔ ہر چیز پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ تاریک ہوتی ہوئی شفق ٹھہر کر رات کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

''مجھے کتنا برا لگتا ہے!'' یگور نے آنکھیں بند کر کے بات ختم کی۔

''سو جاؤ'' ماں نے مشورہ دیا۔ ''شاید طبیعت کچھ ٹھیک ہو جائے۔''

اس کے سانسوں کو کان لگا کر سننے کے بعد اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، کچھ دیر تک خاموشی سے ایک جگہ بیٹھی رہی۔ اس کا دل غم کی سرد گرفت میں تھا۔ پھر وہ اونگھ گئی۔

دروازے پر کچھ آواز ہوئی اور وہ جاگ پڑی۔ چونک کر دیکھا تو یگور آنکھیں کھولے دیکھ رہا تھا۔

''میں ذرا اونگھ گئی'' اس نے نرمی کے ساتھ کہا۔ ''معاف کرنا!''

''اور تم میرا کہا سنا معاف کرنا...'' اس نے بھی اسی نرمی کے ساتھ کہا۔

شامکی تاریکی کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی۔ کمرے میں کچھ خنکی تھی اور ہر چیز پر غبار سا چھا گیا تھا۔ مریض کا چہرہ سیاہ تھا۔

کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور پھر لدمیلا کی آواز آئی:

''اندھیرے میں بیٹھے کیا کھسر پھسر کر رہے ہو۔ بجلی کا بٹن کہا۔؟''

دفعتاً کمرے میں تیز سفید روشنی پھیل گئی۔ کمرے کے درمیان میں لمبی سیدھی لدمیلا سیاہ لباس میں ملبوس کھڑی تھی۔

یگور کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر سینے پر رکھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کے نزدیک جا کر لدمیلا نے گھبرا کر پوچھا۔

یگور نے ماں کی طرف ساکت سی آنکھوں سے دیکھا جواب زیادہ بڑی اور زیادہ چمک دار معلوم ہو

رہی تھیں۔

اس نے منہ پورا کھول دیا، سر اوپر اٹھایا اور ہاتھ آگے بڑھا کر کچھ ٹٹولنے سا لگا۔ ماں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سانس روک کے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایک شدید تشنجی کیفیت کے ساتھ اس نے سر تکیئے پر رکھ دیا اور زور سے بولا:

''اب نہیں جی سکتا! بس اب خاتمہ ہے!''

اس کے جسم میں کپکپی سی آئی، منکا ڈھل گیا۔ بستر کے اوپر سے بلب کی سرد بے جان روشنی اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ایک بے جان سا عکس ڈال رہی تھی۔

''ارے یہ کیا ہوا!'' ماں نے آہستہ سے کہا۔

لدمیلا آہستہ سے بستر کے پاس سے اٹھ آئی اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی اور باہر دیکھنے لگی۔

''ختم ہو گیا!...'' وہ دفعتاً ایک بے حد اونچی آواز میں چلائی۔

کھڑکی کی چوکھٹ پر وہ کہنیوں کے سہارے جھکی اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی جیسے کسی نے دفعتاً اسکے سر پر کچھ مار دیا ہو۔

ماں نے یگور کے بھاری ہاتھوں کو اس کے سینے پر رکھ دیا اور تکیئے پر سر کو ٹھیک کیا۔ پھر اپنے آنسو پونچھ کر لدمیلا کے نزدیک گئی اور جھک کر اس کے سر کے گھنے بالوں کو سہلانے لگی۔ لدمیلا نے دھیرے دھیرے سر اوپر اٹھایا، پھٹی پھٹی بے رونق آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور کوشش کر کے کھڑی ہوگئی۔

''ہم دونوں جلاوطنی میں ساتھ رہے تھے'' ہونٹوں سے اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ہم دونوں ساتھ ہی وہاں گئے اور سزا کاٹی... بعض وقت حالات انتہائی ناخوش گوار ہو جاتے تھے۔ بالکل ناقابل برداشت، بہت سے لوگ ہمت ہار گئے...''

وہ سسکیں بھر کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ پھر کوشش کر کے اس نے اپنی سسکیوں کو روکا۔ اپنا منہ ماں کے نزدیک لائی۔ اس وقت اس کا چہرہ حر ماں آمیز محبت سے نرم پڑ گیا تھا اور وہ کچھ اور کم عمر نظر آنے لگی تھی۔

''لیکن اس کی خوش مزاجی کبھی ختم نہ ہوئی'' اس نے سسکیاں لیتے ہوئے دھیمی آواز میں اپنی بات

جاری رکھی۔''ہمیشہ ہنستا مذاق کرتا رہتا، اپنی تکلیف کو چھپائے رہتا تا کہ کمزور لوگوں کی ہمت افزائی ہو۔ ہر شخص کے ساتھ بڑی محبت، ہمدردی اور خیال سے پیش آتا تھا۔ وہاں سائبیریا میں بیکاری اکثر و بیشتر لوگوں کو تباہ کر دیتی ہے، لوگ اپنے سفلہ جذبات کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔لیکن اسے اچھی طرح احساس تھا کہ اس کے خلاف کس طرح جدوجہد کرنی چاہئے! کاش تم جانتیں کہ کتنا اچھا ساتھی تھا یہ شخص! اس کی نجی زندگی بے انتہا ناشاد و نامراد تھی لیکن آج تک کسی نے اس کی زبان سے شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں سنا! میں اس کی بڑی اچھی دوست تھی۔اس کی شفقت نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔اپنے بیش بہا دماغ سے اس نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو ممکن تھا۔لیکن اپنی افسردگی اور تنہائی کے باوجود اس نے کبھی ذرہ برابر شفقت یا ذاتی توجہ کا مطالبہ نہیں کیا...''

یگور کے نزدیک جا کر وہ جھکی اور اس کے ہاتھ کو پیار کیا۔

''کامریڈ، میرے عزیز ترین ساتھی، شکریہ، تہدل سے تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں!'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔''خدا حافظ میں اسی طرح کام کرتی رہوں گی جیسے ہمیشہ تم نے کام کیا۔ساری زندگی تھکے یا ہمت ہارے بغیر...'' خدا حافظ!''

ہچکیوں سے اس کا جسم ہچکولے کھا رہا تھا اور وہ یگور کے پیروں کے پاس بستر پر اپنا سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ ماں خاموشی سے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی، کسی وجہ سے وہ اپنے آنسوؤں کو پی جانا چاہتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ لدمیلا کو دلاسا دے، اس کی ڈھارس بندھائے، وہ چاہتی تھی کہ یگور کے متعلق کچھ محبت اور درد میں ڈوبی ہوئی باتیں کہے۔آنسوؤں کے درمیان میں سے اس نے یگور کے زرد چہرے کو دیکھا، اس کی آنکھوں کو دیکھا جنہیں پلکوں نے صرف آدھا بند کیا تھا جیسے وہ صرف اونگھ رہا ہو۔اس کے سیاہ ہونٹوں کو دیکھا جن پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہر چیز ساکت تھی اور تکلیف دہ حد تک روشن...

ایوان دانیلووچ حسب معمول چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرتا آیا اور دفعتاً کمرے کے درمیان میں رک گیا۔ بے ڈھنگے پن سے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے اونچی، مضطرب آواز میں پوچھا:

''یہ کب ہوا؟''

کسی نے جواب نہیں دیا۔اپنا ماتھا پونچھ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا یگور کے نزدیک پہونچا۔اس کے ہاتھ کو

دبا کر وہ ایک طرف کو ہٹ گیا۔

''کوئی غیر متوقع بات نہیں ہے۔ اس کا دل جس حالت میں تھا اس میں تو...کم سے کم... چھ مہینے پہلے چاہیئے تھا...''

دفعتاً اس کی اونچی، نامناسب حد تک بھاری آواز بھرا گئی، دیوار سے سہارا لے کر اس نے تیزی سے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور بستر کے آس پاس مجتمع عورتوں کو دیکھتا رہا۔

''ایک شخص اور ختم ہو گیا'' اس نے آہستہ سے کہا۔

لدمیلا نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ فوراً ہی وہ سب کھڑکی کے نزدیک کھڑے ہو گئے اور خزاں کی تاریک رات کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ پیڑوں کی سیاہ چوٹیوں کے اوپر تارے جھلملا رہے تھے اور آسمان کی بے پایاں وسعتوں کو اور بھی زیادہ گہرا کر رہے تھے۔

لدمیلا نے ماں کا بازو پکڑا اور اس کے کاندھے پر جھک گئی۔ ڈاکٹر سر جھکائے اپنا چشمہ صاف کرتا رہا۔ کھڑکی کے باہر تاریکی میں سے شہر کی رات کی تھکی ہوئی آوازیں آ رہی تھیں۔ سرد ہوا نے انکے چہروں کو پیار کیا اور بالوں کو اڑایا۔ لدمیلا کے گال سے ایک آنسو بہہ کر نیچے گرا تو وہ کانپ اٹھی۔ باہر برآمدے میں سے گھبرائی پریشان سی آوازیں آ رہی تھیں، کوئی تیزی سے جا رہا تھا۔ لیکن یہ تینوں کھڑکی کے پاس ساکن و ساکت کھڑے رات کی تاریکی کو گھورتے رہے۔

ماں کو احساس ہوا کہ شائد یہاں وہ کسی کے راستے میں حائل ہو۔ اس نے بڑی احتیاط سے اپنا بازو چھڑایا اور دروازے کے نزدیک گئی۔ وہاں پہونچ کر وہ یگور کی طرف دیکھ کر تعظیماً جھکی۔

''جا رہی ہو؟'' ڈاکٹر نے کسی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے سوال کیا۔

''ہاں...''

سڑک پر پہونچ کر اسے لدمیلا اور اسکے دبے دبے انداز میں رونے کا خیال آیا۔

''رونا بھی تو نہیں جانتی...''

مرنے سے پہلے یگور کے آخری الفاظ یاد کر کے ماں نے ایک آہ بھری۔ سڑک پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسے اس کی زندگی سے بھرپور آنکھیں، اس کی خوش طبعی اور زندگی کے متعلق اس کی کہانیاں یاد آئیں...

''ایک اچھے انسان کے لئے زندہ رہنا مشکل لیکن مرجانا آسان ہوتا ہے، معلوم نہیں میں کس طرح مروں گی؟...'' اس نے سوچا۔

اس نے تصور کیا کہ لدمیلا اور ڈاکٹر اس سفید، بے انتہا روشن کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے اور ریگور کی مردہ آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہیں۔ دفعتاً انسانیت کیلئے اس کے دل میں بے پناہ رحم کا جذبہ ابھرا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کے اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے، کچھ مبہم قسم کا جذبہ اسے آگے بڑھائے جا رہا تھا۔

''جلدی جانا چاہئے!'' کسی افسردہ لیکن باہمت اندرونی قوت نے اسے بڑھاوا دیا۔

اسی جذباتی انداز میں وہ ایک بار پھر میز پر کہنیاں رکھ کر بیٹھ گئی اور اپنے ساتھیوں کی طرف مسکرا کر کہر بار نظروں سے دیکھتے ہوئے کچھ سوچ سوچ کر بولتی گئی:

''ممکن ہے ساتھیو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں سب حماقت ہو لیکن میں تو ایماندار لوگوں کی حیات جاودانی کی قائل ہوں ایسے لوگوں کی حیات جاودانی کی قائل ہوں جنہوں نے مجھے اس موجودہ زندگی کی مسرت سے آشنا کیا، اس زندگی کی جو اپنی حیرت ناک پیچیدگیوں، اپنے عجوبہ مظاہر کی فراوانی اور ایسے خیالات کے ارتقاء کی وجہ سے جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں، میرے دل کو گرما دیتی ہے۔ شاید ہم لوگ جذبات واحساسات کو ضرورت سے زیادہ بچا بچا کر رکھتے ہیں۔ ہم اپنے خیالات ہی میں کچھ زیادہ ہی مست رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہماری شخصیتوں کی نشوونما کے رک جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ ہم چیزوں کو محسوس کرنے کے بجائے ان کی آنک پڑتال زیادہ کرتے ہیں۔''

''کوئی بہت اچھا واقعہ پیش آیا کیا؟'' سوفیا نے مسکرا کر سوال کیا۔

''ہاں'' ساشا نے کہا۔ ''مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت اچھی بات ہوئی ہے۔ وسوف شیکوف کے ساتھ باتیں کر کے میں نے ساری رات گزار دی۔ وہ شخص مجھے پہلے پسند نہیں تھا۔ بڑا اجڈ اور جاہل معلوم ہوتا تھا اور تھا بھی ایسا ہی۔ ہر شخص کی طرف سے دل میں کوئی نہ کوئی عداوت لئے رہتا تھا۔ ہمیشہ ہر بات میں اپنے آپ کو بیچ میں ضرور اڑا دیتا تھا اور بڑے بے ہودہ طریقے سے بس میں، میں، کیا کرتا تھا، کچھ عجیب اوچھا سا آدمی تھا اس زمانے میں...''

مسکرا کر اس نے ان لوگوں کی طرف پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

مسکرا کر اس نے ان لوگوں کی طرف پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

''لیکن اب وہ کہتا ہے 'ساتھیو'۔ جب یہ لفظ ادا کرتا ہے تو سننے کے قابل ہوتا ہے! ایک شرمیلی سی محبت کے ساتھ جس کا اظہار الفاظ میں نہیں وہ سکتا۔ حیرت ناک حد تک سادہ مزاج اور پر خلوص ہو گیا ہے جیسے اس نے اپنے آپ کو پا لیا ہے، اپنی خوبیوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہے۔ سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے اس میں رفاقت کا سچا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔''

ساشا کی باتیں سن کر ماں کو اس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ ایسی کھردری سی لڑکی اتنی نرم اور ہنس مکھ ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے دل کے کسی گہرے گوشے میں رہ رہ کر یہ رشک آمیز خیال آ رہا تھا:

''اور پاویل کے بارے میں کچھ کیوں نہیں کہتی؟''

''وہ صرف اپنے ساتھیوں کے متعلق سوچا کرتا ہے'' ساشا نے بات جاری رکھی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ مجھے کس چیز کا یقین دلانے کی کوشش کی؟ دوسرے ساتھیوں کی فراری کا انتظام کرانے کی ضرورت پر زور دیتا رہا۔ وہ تو کہتا ہے یہ کام بہت آسان ہے!''

سوفیا نے سر اٹھا کر اشتیاق سے کہا:

''ساشا بات تو بہت معقول ہے! تمہارا کیا خیال ہے؟''

ماں کے ہاتھ میں چائے کی پیالی کانپی۔ ساشا نے تیوری پر بل ڈال کر اپنے جوش اور جذبے کو دبانے کی کوشش کی۔ کچھ وقفے کے بعد وہ مسکراتی ہوئی سنجیدہ انداز میں بولی:

''جو باتیں وہ بتاتا ہے اگر وہ صحیح ہیں تو ہمیں کوشش کرنا چاہئے بلکہ کوشش کرنا ہمارا فرض ہے!''

دفعتاً وہ کچھ جھینپ سی گئی۔ کرسی میں دھنس کر بیٹھ گئی اور خاموش ہو گئی۔

''میری جان'' ماں نے مسکرا کر سوچا۔ سوفیا بھی مسکرائی اور نکولائی اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے ہنسا۔ لڑکی نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ زرد پڑ گئی تھی اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور لہجے میں خفگی اور رکھائی۔

''میں سمجھ گئی تم لوگ کیوں ہنس رہے ہو'' وہ بولی۔ ''تم لوگوں کا خیال ہے کہ اس کام سے کچھ میرا ذاتی مفاد وابستہ ہے۔''

''کیوں ساشا؟'' سوفیا نے عیاری سے پوچھا اور اٹھ کر اس کے نزدیک گئی، ماں کو ایسا محسوس ہوا

کہ یہ بات ساشا کو ناگوار ہوئی اور سوفیا کو ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔

اس نے سوفیا کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا۔

''تو پھر ایسی حالت میں بھرا اس کام سے کوئی تعلق نہیں'' ساشا بولی۔ ''اگر تم لوگ اسے اس نظر سے دیکھتے ہو تو میں فیصلہ کرنیمیں ساتھ نہیں دے سکتی...''

''بس بہت ہو گیا ساشا!'' نکولائی نے نرمی سے کہا۔

ماں بھی اس کے نزدیک گئی اور اس کے بالوں کو سہلانے لگی، لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ماں نے مسکرا کر ٹھنڈا سانس لیا کیونکہ کچھ کہنے کے لئے اسے الفاظ نہ مل رہے تھے۔ سوفیا نے ساشا کے نزدیک کرسی پر بیٹھ کر اس کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔

''بالکل ننھی سی گڑیا ہو ابھی'' اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے عجیب طرح مسکرا کر کہا۔

''ممکن ہے یہ سب میری حماقت ہو...''

''تمہارے ذہن میں ایسی بات آئی کیسے؟'' سوفیا نے کہا لیکن نکولائی نے بات کاٹ کر بالکل کاروباری انداز اختیار کیا۔

''اگر کوئی امکان ہے تو یقیناً فراری کا انتظام کرنا چاہئے'' اس نے کہا۔ ''لیکن سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ جیل کے ساتھی اس کی تائید میں ہیں یا نہیں۔''

ساشا نے سر جھکا لیا۔

سوفیا نے سگریٹ سلگائی اور اپنے بھائی کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے ماچس ایک کونے پھینک دی۔

''نہ کیوں چاہیں گے؟'' ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ ''البتہ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ ممکن ہے۔''

ماں چاہتی تھی کہ وہ لوگ کہیں کہ امکان ہے لیکن وہ لوگ خاموش رہے۔

''وسوف شیکوف سے ملنا بہت ضروری ہو گیا'' سوفیا نے کہا۔

''میں کل بتا دوں گی کہ تم کب اور کہاں مل سکتی ہو'' ساشا نے جواب دیا۔

''اس کا ارادہ کیا ہے؟'' سوفیا نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے پوچھا۔

''اسے نئے پریس میں ٹائپ جمانے کے کام پر لگایا جائے گا۔اس وقت تک وہ محافظ جنگلات کے ساتھ ہی رہے گا۔''

ساشا کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اوراس کے چہرے نے وہی پہلے کی سی سختی اختیار کر لی تھی۔ وہ بڑے روکھے انداز میں باتیں کررہی تھی۔

''پرسوں پاویل سے ملنے جاؤ تو اسے چٹھی ضرور دے دینا'' نکولائی نے ماں کے پاس جا کر کہا جہاں وہ بیٹھی پیالیاں دھورہی تھی۔''سمجھیں،ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ...''

''میں سمجھ گئی، بالکل سمجھ گئی'' ماں نے اسے جلدی سے یقین دلادیا۔''میں کسی نہ کسی طرح چٹھی پہنچا دوں گی...''

''اب میں جاتی ہوں'' ساشا نے کہااور ہر شخص سے جلدی جلدی خاموشی سے ہاتھ ملا کر وہ سخت اور سیدھی چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔اس کی چال میں بڑا عزم تھا۔

اس کے جانے کے بعد سوفیا نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اسے کرسی پر جھولا سا جھلانے لگی۔

''ایسی بیٹی سے محبت کرسکوگی نلوونا؟...''اس نے مسکرا کر سوال کیا۔

''کاش ان دونوں کوصرف ایک دن ایک ساتھ دیکھ سکتی!'' ماں نے کہا جیسے اب رونے ہی والی ہو۔

''ہاں ذراسی خوشی سے کسی کوکوئی نقصان نہیں پہونچتا'' نکولائی نے آہستہ سے کہا۔''لیکن تھوڑی سی مسرت سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہوتا۔اور جب مسرت بہت ہو جاتی ہے تو۔اس کی قیمت کم ہو جاتی ہے...''

سوفیا پیانو پر ایک یاس انگیز دھن بجانے لگی۔

12

دوسرے دن صبح کو تقریباً تیس چالیس آدمی شفا خانے کے دروازے پر کھڑے اپنے ساتھی کی لاش کا انتظار کررہے تھے۔ان کے درمیان کچھ خفیہ والے بھی تھے جوان لوگوں کی باتوں کوغور سے سن رہے تھے

اوران کے چہروں، ان کے طور پر طریقوں اوران کے جملوں کو ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔اورسڑک کے دوسری طرف پولیس کا ایک دستہ پستول لٹکائے کھڑا ہوا تھا۔خفیہ کے لوگوں کی حرکتوں اور پولیس والوں کھڑا ہوا تھا۔خفیہ کے لوگوں کی حرکتوں اور پولیس والوں کی طنزیہ مسکراہٹ سے جواپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے بالکل تلے کھڑے تھے مجمع میں غصہ پھیل گیا تھا۔چندلوگ اپنا غصہ چھپانے کے لئے مذاق کرر ہے تھے، کچھ دوسرے لوگ زمین پرنظریں گاڑے ہوئے تھے تاکہ ان بے ہودہ حرکتوں کونہ دیکھ سکیں اور چند دوسرے لوگ جو اپنے جذبات کو چھپانہیں سکتے تھے عہدے داروں کو کھری کھری سنا رہے تھے جوایسےلوگوں سے خوف زدہ ہیں جن کے پاس الفاظ کے سوااورکوئی ہتھیارنہیں۔موسم خزان کا ہلکا نیلا آسمان پتھریلی سڑک کے اوپر چمک رہا تھا، جہاں زرد پتیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور ہوا انہیں اڑا کر لوگوں کے قدموں میں لا ڈالتی تھی۔

ماں مجمع میں کھڑی جانی پہچانی صورتوں کی طرف دیکھ کرافسردگی کے ساتھ سوچنے لگی:

''ابھی تم لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں، بالکل زیادہ نہیں ہے!اور مزدورتو تقریباً ہیں ہی نہیں...''

پھاٹک کھلا اور لوگ تابوت کے بالائی حصے کو لے کر باہر نکلے جس کے ڈھکنے پر لال فیتوں سے بندھے ہوئے ہار پڑے تھے۔لوگوں نے فوراً اپنی ٹوپیاں اتارلیں اور کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے سیاہ چڑیوں کا جھنڈ کا جھنڈ پر پھیلا کر دفعتاً اڑ گیا۔ایک لمبا سا پولیس افسر جلدی جلدی مجمع کی طرف آیا، اس کی گھنی مونچھیں سیاہ تھیں اور چہرہ سرخ ہورہا تھا۔اس کے پیچھے پیچھے سپاہی مجمع میں گھس گئے اور سختی اور درشتی سے لوگوں کو دھکے دے کر ہٹانے اور اپنے بھاری بوٹوں سے زمین پر زور زور سے دھپ دھپ کرنے لگے۔

''سرخ فیتوں کو نکال ڈالو!'' افسر نے پھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

مرد اور عورتیں اس کے نزدیک آ کر زور زور سے ہاتھ ہلاتے اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ ماں کی نگاہوں کے سامنے زرد، جوشیلے چہرے گھوم گئے جن کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ایک عورت غصے سے رونے لگی...

''تشدد مردہ باد!'' کسی نوجوان کی آواز آئی لیکن فوراً ہی بحث مباحثہ کی آواز میں ڈوب گئی۔

ماں کے دل پر بھی چوٹ سی لگی اور وہ ایک معمولی کپڑے پہنے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہوئی جو اس کے نزدیک ہی کھڑا ہوا تھا۔

''اپنی مرضی کے مطابق جنازہ اٹھانے کی بھی اجازت نہیں ہے'' اس نے غصہ سے کہا۔ ''بڑی شرم کی بات ہے!''

عداوت کا جذبہ بڑھتا گیا۔ لوگوں کے سروں کے اوپر تابوت کا ڈھکنا جھکولے کھا رہا تھا۔ فیتے ہوا میں اڑ اڑ کر نیچے لوگوں کے چہروں اور سروں کو چھو رہے تھے اور ان ریشمی فیتوں کی وجہ سے فضا میں ایک مضطربانہ، سوکھی سرسراہٹ پھیل گئی تھی۔

ماں کو خوب محسوس ہوا کہ اب ٹکر ہونے والی ہے اور وہ ادھر ادھر دیکھ کر زیر لب بڑبڑاتی رہی:

''اگر یہی دل میں ٹھانی ہے تو خدا ان سے سمجھے۔ فیتے لیتے ہیں تو لے جانے دو، فیتے دے دینے میں کیا حرج ہے۔''

شور کو چیرتی ہوئی کسی کی اونچی تیز آواز آئی:

''ہم اپنا حق مانگتے ہیں کہ اپنے ساتھی کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیں، اس ساتھی کو جسے تم نے اذیتیں دے دے کر مار ڈالا...''

کسی نے اونچی آواز میں گانا شروع کیا:

''تم شہید ہوئے، ایک بیش بہا قربانی دی...''

''فیتے نکالو! یا کوف لیف کاٹ دو ان فیتوں کو!''

تلوار کی جھنکار سنائی دی۔ ماں نے کسی ہنگامے کے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن لوگ صرف بھوک بھیڑیوں کی طرح غرا کر رہ گئے۔ پر خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھنے لگے۔ فضا ان کے پیروں کی چاپ سے بھری ہوئی تھی۔

پولیس والوں کے ہاتھوں سے نجس کیا ہوا تابوت کا ڈھکنا کچلے ہوئے پھولوں کے ساتھ لوگوں کے سروں پر لہرا رہا تھا۔ اور ان کے برابر ہی گھوڑ سوار پولیس والے جھکولے لے رہے تھے۔ ماں سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ اسے تابوت نظر ہی نہیں آ رہا تھا کیوں کہ اب مجمع اتنا بڑھ گیا تھا کہ سڑک پٹی پڑی تھی۔ جلوس کے دونوں طرف پولیس والے تلواروں کے قبضہ پر ہاتھ رکھے چل رہے تھے۔ ماں کو ہر طرف خفیہ کے لوگوں کی تیز نگاہیں نظر آئیں جو بہت ہوشیاری سے لوگوں کے چہروں کا مطالعہ کر رہے تھے۔

''خدا حافظ ساتھی، خدا حافظ...''

دو دل خراش آوازوں نے گایا۔

''گانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!'' کوئی چلایا۔ ''خاموشی سے چلے چلو دوستو!''

اس آواز میں کچھ سختی اور تحکم سا تھا۔ غم زدہ گیت رک گیا، گفتگو مدہم پڑ گئی۔ سڑک پر صرف پیروں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ اور یہ آواز لوگوں کے سروں سے بلند ہوتی ہوئی صاف شفاف آسمان کی طرف اڑنے لگی اور فضا میں ایسی گونج پیدا ہوئی جیسے دور سے آتے ہوئے طوفان کی پہلی گرج سنائی دیتی ہے۔ سرد ہوا تیز تر ہو رہی تھی اور شہر کی سڑکوں کے گرد و غبار اور کوڑے کو اڑا کر ان لوگوں کی طرف پھینک رہی تھی، وہ ان کے بالوں اور کپڑوں کو پریشان کرتی، آنکھوں میں گرد و غبار ڈالتی، سینوں پر دوھتڑ مارتی ان کے پیروں کے گرد ناچ رہی تھی...

اس خاموش ماتمی جلوس نے، جس میں نہ کوئی پادری تھا نہ کوئی دلخراش نوحہ اور ان متفکر چہروں اور تیوریاں پڑے ہوئے ماتھوں نے ماں کو کچھ خوف زدہ سا کر دیا۔ خیالات اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ چکر لگانے لگے اور اس نے ان خیالات کو درد انگیز الفاظ کا جامہ پہنا دیا:

''حق کی تائید کرنے والو، ابھی تمہاری تعداد زیادہ نہیں ہوئی...''

وہ سر جھکائے چلتی رہے اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ لوگ یگور کو نہیں بلکہ کسی اور چیز کو دفن کرنے جا رہے ہیں، ایسی چیز جو اسے بہت عزیز تھی، جو اس کی ہستی کے لئے ضروری تھی۔ وہ بڑی دکھی اور بے یار و مددگار سی محسوس کرنے لگی۔ ان لوگوں کے لئے جو یگور کو دفن کرنے جا رہے تھے اس کے دل میں کچھ عجیب سا، سہما دینے والا اجنبیت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔

''یہ تو ظاہر ہے'' اس نے سوچا۔ ''کہ یگور خدا کو نہیں مانتا تھا۔ اور ان لوگوں میں سے بھی کسی کو خدا پر ایمان نہیں ہے...''

وہ اس بات کے متعلق زیادہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ٹھنڈا سانس بھرا اور اپنی روح پر سے ایک بوجھ ہٹانے کی کوشش کی۔

''خدایا! یسوع! کیا میں بھی۔ بالکل اسی طرح...''

جلوس قبرستان پہنچ گیا اور دیر تک قبروں کے بیچ سے ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ ایک کھلی جگہ پر پہونچا جہاں ہر طرف چھوٹے چھوٹے سفید صلیب نصب تھے۔ لوگ خاموشی سے قبر کے چاروں

طرف آ کر کھڑے ہو گئے۔ قبروں کے درمیان جیتی ہستیوں کی یہ شدید خاموشی جیسے کسی خوفناک چیز کی پیشین گوئی کر رہی تھی جس کی وجہ سے ماں کا دل کانپ کر بیٹھ سا گیا۔ ہوا صلیبوں میں سے ہو کر سیٹی بجاتی، چیختی چلاتی، تابوت کے کچلے ہوئے پھولوں کو اڑاتی گزر رہی تھی۔

پولیس والے سیدھے، اٹنشن کھڑے ہو گئے۔ انکی نظریں اپنے افسر پر تھیں۔ ایک لمبا زرد رو نوجوان قبر کے سرہانے جا کر کھڑا ہو گیا، اس کی بھوئیں سیاہ اور بال لمبے تھے۔ اس وقت پولیس افسر کی بھاری آواز آئی:

''حضرات...''

''ساتھیو!'' سیاہ بھوؤں والے نوجوان نے اونچی واضح آواز میں کہنے شروع کیا۔

''ٹھیرو!'' افسر چلایا۔ ''میں تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں کہ تقریر کی اجازت نہیں دی جاسکتی!...''

''میں صرف چند الفاظ کہوں گا'' نوجوان نے بڑے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ ''ساتھیو! آیئے اپنے دوست اور معلم کی قبر پر عہد کریں کہ ہم ان کی تعلیمات کو کبھی فراموش نہ کریں گے، اور ہم میں سے ہر شخص اپنی ساری زندگی اس طاقت کی جڑ کاٹنے میں وقف کر دے گا جو ہماری مادر وطن کی تمام تباہیوں اور بربادیوں کی ذمہ دار ہے۔ وہ منحوس ظالم طاقت جسے مطلق العنان حکومت کہتے ہیں!''

''گرفتار کر لو اسے!'' افسر نے چلا کر کہا لیکن اس کی آواز ایک زبردست شور میں دب گئی:

''مطلق العنان حکومت مردہ باد!''

پولیس والے مجمع کو چیرتے مقرر کی طرف جانے لگے جس کے ساتھی محافظ نہ انداز میں اس کے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔

''آزادی زندہ باد!'' نوجوان ہاتھ ہلا کر چلایا۔

ماں کو کسی نے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا، ڈر کر وہ ایک صلیب کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی اور مار کے خوف سے آنکھیں بند کر لیں، مختلف قسم کی آوازوں کے شور سے اسکے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ اپنے پیروں تلے زمین اسے کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی اور تیز ہوا اور خوف کی وجہ سے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ پولیس والوں کی سیٹیوں نے خطرے کا اعلان کیا، بھاری آوازیں احکام دینے لگیں عورتوں نے بری طرح چیخنا شروع کیا، جنگلوں کی لکڑیاں ٹوٹیں اور خشک زمین پر بھاری جوتوں کی آواز آنے لگی۔ یہ ہنگامہ

اتنی دیر تک جاری رہا کہ اسے وہاں آنکھیں بند لگی۔ یہ ہنگامہ اتنی دیر تک جاری رہا کہ اسے وہاں آنکھیں بند کئے کھڑے رہنے سے بھی خوف معلوم ہونے لگا۔

اسے نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا اور ہاتھ پھیلا کر چیختی ہوئی آگے کی طرف دوڑی۔ تھوڑی ہی دور پر قبروں کے درمیان ایک پتلے سے راستے پر پولیس والوں نے اس لمبے بالوں والے نوجوان کو گھیر لیا تھا اور ان لوگوں کو مار کر بھگانے کی کوشش کر رہے تھے جو ہر طرف سے اس کی حفاظت کے لئے دوڑ رہے تھے۔ سرد اور سفید چمک والی ننگی تلواریں کبھی ان لوگوں کے سروں پر چمکتیں، کبھی ان کے درمیان آ گرتیں۔ بیدوں اور جنگلوں کے ٹوٹے ہوئے تختوں کو ہتھیاروں کی طرح استعمال کیا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس زرد رو نوجوان کی شخصیت کے زیر اثر یہ چیختے چلاتے ہوئے انسان ایک جنوبی رقص کر رہے ہیں، دیوانگی اور جنون کے اس ہنگامے میں اس کی پاٹ دار آواز آئی:

''ساتھیو! اپنی قووت یوں کیوں ضائع کر رہے ہو؟...''

یہ بات لوگوں کے سمجھ میں آئی۔ اپنی لکڑیاں پھینک کر ایک ایک کر کے وہ لوگ بھاگنے لگے، لیکن ایک ناقابل بیان قوت کے زیر اثر ماں آگے ہی بڑھتی رہی۔ اس نے دیکھا کہ نکولائی اپنی ٹوپی پیچھے کی طرف کئے بپھرے ہوئے لوگوں کو دھکے دے کر پیچھے ہٹا رہا ہے۔

''تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟'' وہ ملامت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''ذرا ضبط سے کام لو!''

اسے ایسا محسوس ہوا کہ نکولائی کا ایک ہاتھ سرخ ہو رہا ہے۔

''نکولائی ایوانووچ! یہاں سے نکل چلو!'' اس کی طرف بھاگتے ہوئے وہ چلائی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟ وہ لوگ تمہیں بھی ماریں گے!''

کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ دیکھا تو سوفیا نزدیک کھڑی تھی۔ ہیٹ غائب تھا۔ بال پریشان تھے اور ایک لڑکے کو ہاتھ سے پکڑے کھڑی تھی۔ لڑکا، جو بالکل بچہ سا، معلوم ہو رہا تھا، اپنے چہرے سے خون پونچھ رہا اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہتا جا رہا تھا:

''جانے دو مجھے یہ تو کوئی بات نہیں...''

''ذرا اسے سنبھالو۔ ہمارے گھر لے جاؤ، یہ لو رومال، اس سے سر باندھ دو'' سوفیا نے جلدی سے کہا

اور ماں کے ہاتھ میں لڑکے کا ہاتھ دے کر وہ جلدی سے چلی گئی اور جاتے جاتے کہتی گئی:

''جلدی جاؤ ورنہ تمہیں بھی گرفتار کر لیں گے!''

لوگ قبرستان میں ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ پولیس والے قبروں کے درمیان بھدے انداز میں بھاگتے اپنے بھاری کوٹوں کے دامن سے پیروں کو بچاتے، گالیاں بکتے تلواریں گھما رہے تھے۔ لڑکا انہیں خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''جلدی چلو!'' ماں نے رومال سے اس کا منہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''میری فکر مت کرو۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے'' اس نے خون تھوک کر بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تلوار کے قبضے سے مارا ہے۔ لیکن میں نے بھی مزا چکھا دیا! وہ لاٹھی گھما کر دی ہے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا! تم ذرا ٹھیرو تو سہی!'' اپنے خونین ہاتھ کو ہلاتے ہوئے اس نے چلا کر کہا۔ ''ابھی ہوا ہی کیا ہے! ایک بار ہم۔ ہم مزدور اٹھیں گے تو بغیر لڑے لڑائی ہی تمہارا خاتمہ نہ کر دیا ہو تو کہنا!''

''جلدی چلو!'' ماں نے قبرستان کے چھوٹے سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جنگلے کے باہر کھلے میدان میں پولیس والے چھپ کر ان لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں اور یہ لوگ جیسے ہی قبرستان سے باہر نکلیں گے وہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ لیکن جب اس نے دروازے کے پاس کی ڈھارس بندھائی، دونوں وقت مل رہے تھے اور میدان میں سائے لہرا رہے تھے۔

''ٹھہرو میں تمہارے چہرے پر پٹی باندھے دیتی ہوں'' ماں نے کہا۔

''فکر مت کرو۔ مجھے بالکل شرم نہیں آ رہی'' وہ بولا۔ ''لڑائی برابر کی ہوئی۔ اس نے مجھے مارا، میں نے اسے...''

لیکن ماں نے جلدی سے زخم پر پٹی باندھی۔ اس کا خون دیکھ کر ماں کا دل دکھنے لگا اور جب گرم خون اسکی انگلیوں سے چھو گیا تو اس کے جسم میں پھریری سی آ گئی۔ کچھ کہے سنے بغیر وہ لڑکے کو میدان سے اپنے ساتھ گھسیٹتی ہوئی لے چلی۔

''مجھے کہاں لے جا رہی ہو کامریڈ؟'' اس نے اپنے منہ پر سے پٹی ہٹا کر طنز سے کہا۔ ''میں تمہاری مدد کے بغیر بھی جا سکتا ہوں!...''

لیکن ماں نے محسوس کیا کہ لڑکے کے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی ہیں وہ کمزور آواز

میں باتیں کرتا رہا،سوالات کرتا رہااور جواب کاانتظار کئے بغیر جلدی جلدی چلتا رہا۔

''تم کون ہو؟ میں ٹین کا کام کرتا ہوں۔میرا نام ہے ایوان۔یگورایوانو وچ کے تعلیمی حلقے میں ہم تین تھے۔یعنی تین تو ٹین کا کام کرنے والے مزدور تھے ورنہ کل گیارہ آدمی تھے۔ہم لوگ بے انتہا چاہتے تھے انہیں۔خدا کرے ان کی روح کوچین نصیب ہو۔حالانکہ میں خدا میں یقین نہیں رکھتا۔''

ایک گلی میں پہونچ کر ماں نے ایک گاڑی والے کو بلایا۔ایوان کو بٹھا کر اس نے کان میں کہا:

''اب کوئی بات مت کرنا''اور پھر بڑی احتیاط سے اس نے اس کے منہ پر پٹی باندھ دی۔

وہ ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے تک لے گیا لیکن پھر بےبسی سے گود میں رکھ لیا کیونکہ اس میں پٹی ہٹانے کی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی۔لیکن منہ پر رومال بندھے ہونے کے باوجود وہ بڑبڑاتا گیا:

''یہ مت سمجھنا مغرور لوگوں کہ میں یہ سب باتیں بھول جاوں گا...اس کے آنے سے پہلے تیتو وچ نام کا ایک طالب علم ہمیں...معاشیات... پڑھایا کرتا تھا۔اسے بھی ان لوگوں نے گرفتار کرلیا...''

ماں نے ایوان کے گلے میں ہاتھ ڈال کے اس کے سر کو سینے سے لگالیا، دفعتاً لڑکے نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دئے اور خاموش ہوگیا۔ڈر ڈر کر ماں کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھتی جارہی تھی۔اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ پولیس والے کسی کونے سے نکل کر اس کی طرف دوڑتے ہوئے آئیں گے اور ایوان کا زخمی سر دیکھ کر اسے پکڑ کر مار ڈالیں گے۔

''بہت پی گیا؟''گاڑی بان نے اپنی گدی پر کسمساتے ہوئے مسکرا کر سوال کیا۔

''حلق تک پی گیا ہے!''ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

''تمہارا بیٹا ہے؟''

''ہاں،جوتے بناتا ہے۔میں کھانا پکاتی ہوں...''

''بڑی مشکل سے کٹ رہی ہوگی زندگی۔ہونہہ...''

چابک گھماتے ہوئے گاڑی بان نے پھر مڑ کر بات جاری رکھی:

''قبرستان میں ابھی جو ہنگامہ ہوا اس کے بارے میں سنا؟ سنا ہے ایک سیاسی آدمی کو دفن کرنے آئے تھے۔ان ہی میں سے ایک تھا جو اونچی کرسی والوں کے خلاف ہیں۔ان سے کسی نہ کسی وجہ سے مخالفت رکھتے ہیں۔لگتا ہیک ہ جو لوگ دفنانے آئے تھے وہ سب ایک ہی قسم کے لوگ تھے۔یعنی کہ یار

دوست ۔تو پھر کیا ہوا کہ یہ لوگ چلانے لگے۔ جولوگوں کوغریب بناتے ہیں انہیں نکال باہر کرو! پولیس کو آتے بھلا کتنی دیرلگتی ہے! آتے ہی مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔سنا ہے کئی لوگوں کو کاٹ کے پھینک دیا۔لیکن پولیس والوں کی بھی خاص مرمت ہوئی!''

ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعداس نے بے یقینی سے سرکو ہلاتے ہوئے عجیب خوف زدہ سے انداز میں کہا:

''مردوں کو جگائے دے رہے ہیں! مرنے والوں کوبھی تو چین نصیب نہیں!''

گاڑی پتھریلی سڑک پر اچھلتی تو ایوان کا سر ماں کی چھاتی سے ٹکرا جاتا۔گاڑی بان اپنی نشست پر کچھ ادھر منہ کئے بیٹھا بڑبڑائے جارہا تھا:

''لوگوں میں بے چینی بہت بڑھ گئی ہے۔ دنیا میں ہر طرف ہنگامہ ہو رہا ہے۔کل رات پولیس والے ہمارے ایک پڑوسی کے گھر آدھمکے اور صبح تک الٹ پلٹ کرتے رہے اور جاتے جاتے ایک لوہار کو ساتھ لیتے گئے۔لوگ کہتے ہیں کہ اس لوہار کو آدھی رات میں دریا کے کنارے لے جا کر ڈبو دیں گے۔ اچھا خاصا آدمی تھا بیچارہ لوہار...''

''کیا نام ہے اس کا؟'' ماں نے سوال کیا۔

''لوہار کا نام؟ ساویل۔ساویل یفچنکو۔ ابھی ہے تو کم عمر مگر جانتا بہت کچھ ہے۔ایسا لگتا ہیکہ آج کل کسی چیز کے بارے میں کچھ جاننا بھی جرم ہے۔وہ ہم لوگوں کے پاس آ کر کہا کرتا تھا، کیا زندگی ہے تمہاری بھی گاڑی بانوں؟، ہم لوگ کہتے' بالکل سچ کہتے ہو دوست، کتے سے بھی بدتر،۔''

''گاڑی روکو!'' ماں نے کہا۔

گاڑی رکنے سے ایوان کی آنکھ کھل گئی اور وہ کراہا۔

''لڑکا نشہ میں بالکل غبن ہے!'' گاڑی بان نے کہا۔''یہ ہے وودکا کا نتیجہ!...'' بڑی مشکل سے ایوان احاطے کے اندر داخل ہوا اور برابر احتجاج کرتا رہا:

''میں بالکل ٹھیک ہوں اپنے آپ ہی چلا جاوں گا...''

سوفیا گھر پہونچ چکی تھی۔ وہ ہونٹوں میں سگرٹ دبائے بے کل اور مضطرب سی پھر رہی تھی۔ زخمی لڑکے کو تخت پر لٹا دیا گیا تو اس نے بڑی ہوشیاری سے اس کی پٹی کھولی اور سگریٹ کے دھوئیں کی وجہ سے آنکھیں میچ کر اس نے احکام دینے شروع کیۓ۔

''ایوان دانیلووچ! دیکھو لڑکے کو لے آئے ہیں۔ تھک گئی ہو نلوونا؟ ڈر گئیں کیا؟ اچھا تم جا کر آرام کرو..نکولائی ذرا نلوونا کو ایک گلاس پورٹ دینا!''

ماں نے ابھی جو کچھ دیکھا تھا اس کے صدمے کے اثر سے بے حال تھی۔ سانس لینے میں دقت محسوس ہو رہی تھی اور سینے میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔

''میری فکر مت کرو...'' وہ بڑبڑائی۔ لیکن اس کی ساری ہستی توجہ کی طالب تھی۔ ایک ہمدردانہ، پر محبت اور سکون بخش توجہ کی۔

دوسرے کمرے سے نکولائی ہاتھ میں پٹی باندھے نکلا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر ایوان دانیلووچ تھا۔ بال پریشان مجسم جھنجھلاہٹ بنا ہوا۔ ڈاکٹر ایوان کے نزدیک جا کر اس کے اوپر جھک گیا۔

''پانی'' وہ بولا۔ ''بہت سا پانی۔ او کچھ روئی اور صاف کپڑا۔''

ماں باورچی خانے کی طرف جانے لگی لیکن نکولائی نے بازو پکڑ کر اسے روک لیا اور اسے کھانے کے کمرے میں لے گیا۔

''سوفیا سے کہا تھا، تم سے نہیں'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں تم کافی پریشان ہو گئیں۔ کیوں ہے نہ؟''

اس کی آنکھوں میں ہمدردی دیکھ کر ماں سسکیاں بھرے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ سب کیا ہو گیا!'' وہ رونے لگی۔ ''تلواروں سے لوگوں کا کاٹ کے ڈال دیا...''

''میں نے سب کچھ دیکھا'' نکولائی نے اسے شراب کا گلاس دیتے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ ''دونوں طرف لوگ ذرا کچھ جنون میں آ گئے تھے، لیکن تم پریشان مت ہو۔ تلواروں کی کند طرف سے مار رہے تھے۔ شائد صرف ایک ہی شخص بری طرح زخمی ہوا ہے۔ خود میری نظروں کے سامنے اسے مارا۔ میں نے کوشش کر کے اسے مجمع میں سے گھسیٹ لیا...''

نکولائی کی آواز اور کمرے کی گرمی اور روشنی سے ماں کے دل کو قرار آیا۔ اس نے نکولائی کی طرف

شکر گزار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

''تمہیں کیا تمہارے بھی چوٹ آئی؟''

''ایسا لگتا ہے کہ شائد میری ہی غلطی کی وجہ سے ہوا۔ لاپرواہی میں کسی چیز سے ہاتھ ٹکرا گیا تو کھال ادھڑ گئی۔ یہ لو کچھ چائے پی لو۔ کافی سردی ہے اور تم بہت ہلکے کپڑے پہنے ہو۔''

اس نے پیالی کے لئے ہاتھ بڑھایا تو دیکھا کہ انگلیوں میں خشک خون لگا ہوا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ گود میں گرا لیا۔ اس کا سایہ گیلا تھا۔ بھوویں چڑھا کر اس نے آنکھیں پھاڑ دیں اور اپنی انگلیوں کی طرف گھور کر دیکھا۔ دل نے زور سے دھڑکنا شروع کیا اور اسے چکر سا آ گیا۔

''پاویل کے ساتھ بھی۔ اس کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاو کر سکتے ہیں!''

واسکٹ پہنے، آستین الٹے ہوئے ایوان دانیلووچ کمرے میں داخل ہوا۔ نکولائی کے خاموش سوال کا جواب اس نے اونچی آواز میں دیا:

''چہرے کا زخم خطرناک نہیں ہے۔ لیکن سر ضرور پھٹ گیا ہے۔ بہت زیادہ نہیں۔ کافی مضبوط لڑکا ہے۔ بہرحال خون بہت بہہ گیا ہے۔ شفا خانے میں منتقل کر دیں گیا؟''

''کیوں؟ یہیں رہنے دو'' نکولائی بولا۔

''آج اور شائد کل یہاں رہنے دو۔ لیکن اس کے بعد اگر اس شفا خانہ بھیج دو تو میرے لئے آسانی ہو جائے گی۔ گھروں پر جانے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ قبرستان کے واقعہ کے متعلق کوئی پرچہ نکالو گے؟''

''ضرور'' نکولائی نے جواب دیا۔

ماں اٹھ کر خاموشی سے باورچی خانے کی طرف جانے لگی۔

''کہاں جا رہی ہو نلوونا؟'' نکولائی نے اسے ہمدردی سے روکتے ہوئے کہا۔ ''سوفیا سب کر لے گی۔''

اس کی طرف دیکھ کر وہ کچھ کانپ سی گئی۔

''سارے ہاتھوں اور کپڑوں پر خون ہی خون ہے...'' اس نے کچھ عجیب طرح سے ہنس کے کہا۔ اپنے کمرے میں کپڑے بدلتے ہوئے وہ ان لوگوں کے پرسکون انداز پر تعجب کرتی رہی کہ ایسی خوفناک چیزوں کو اتنی آسانی سے کس طرح برداشت کر لیتے ہیں۔ ان خیالات نے اس تسکین دی اور دل سے

خوف دور ہو گیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی جہاں زخمی لڑکا لیٹا ہوا تھا تو دیکھا کہ سوفیا جھکی ہوئی اس سے کہہ رہی ہے۔

''بیکار بات مت کرو کامریڈ!''

''میں بلاوجہ تم لوگوں کو کیوں پریشان کروں'' وہ کمزور آواز میں احتجاج کر رہا تھا۔

''باتیں بند کرو۔اس کے کافی فائدہ ہوگا...''

ماں سوفیا کے پیچھے اسکے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی اور لڑکے کے زرد چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور اس سے کہا کہ اس نے کس طرح اپنی خطرناک باتوں سے گاڑی میں اسے بے انتہا خوف زدہ کر دیا تھا۔ایوان کی آنکھیں بخار سے جل رہی تھیں۔

''میں بھی کتنا احمق ہوں!'' اس نے شرمندگی سے کہا۔

''اب ہم لوگ جاتے ہیں'' سوفیا نے کمبل ٹھیک سے اوڑھاتے ہوئے کہا۔''تم سو جاؤ۔''

وہ لوگ کھانے کے کمرے میں چلے گئے اور دن کے واقعات پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ان واقعات کے متعلق وہ لوگ اس طرح باتیں کر رہے تھے جیسے اب وہ قصہ پارینہ بن چکے ہوں۔اور اس کے بعد انہوں نے اعتماد کے ساتھ مستقبل کی طرف دیکھنا شروع کیا اور کل کے کام کے متعلق منصوبے بنانے لگے۔انکے چہروں پر تھکن کے آثار تھے لیکن ان کے خیالات میں جرأت و ہمت تھی اور اپنے کام کا ذکر کرتے وقت اپنے آپ سے غیر اطمینانی کا اظہار بھی کرتے جا رہے تھے۔ڈاکٹر کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

''آج کل صرف پرچار کافی نہیں ہے!'' اس نے اپنی اونچی تیز آواز کو نرم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''نوجوان مزدور ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ہمیں اپنے کام کو اور بڑھانا پڑے گا۔مزدور ٹھیک کہتے ہیں، میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔''

نکولائی نے تیوری پر بل ڈال کر ڈاکٹر والا لہجہ اختیار کیا:

''ہر طرف سے شکایت آ رہی ہے کہ پرچوں اور کتابوں کی سخت کمی ہے۔اور ہم اب تک ایک معقول چھاپہ خانہ بھی نہیں قائم کر سکے ہیں۔لدمیلا کام کرتے کرتے مری جا رہی ہے۔اگر اس کی مدد نہ کی گئی تو بالکل ختم ہو جائے گی۔''

''وسوف شیکوف کے متعلق کیا خیال ہے؟'' سوفیا نے سوال کیا۔

''شہر میں نہیں رہ سکتا۔ جب نیا چھاپہ خانہ قائم ہو جائے تب ہی اسے یہاں کام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے قبل ایک اور ساتھی کی ضرورت ہے۔''

''میں نہیں کر سکوں گی کیا؟'' ماں نے آہستہ سے سوال کیا۔

تینوں اس کی طرف ایک لمحے کے لئے خاموشی سے دیکھتے رہے۔

''خیال تو اچھا ہے!'' سوفیا بولی۔

''تمہارے لئے بڑی مشکل ہوگی نلوونا'' نکولائی نے خشک انداز میں کہا۔ ''تمہیں شہر سے باہر رہنا پڑے گا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ تم پاویل سے نہ مل سکو گی۔ اور عام طور پر...''

''پاویل پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوگا'' اس نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا۔ ''اور سچ تو یہ ہے کہ ملنے جاتی ہوں تو کلیجہ اور پھٹ جاتا ہے۔ کوئی بات نہیں کر سکتی۔ بیٹے کے سامنے احمقوں کی طرح کھڑے رہنے سے کیا فائدہ جب کہ لوگ تاکا کرتے ہیں کہ کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دی جائے۔''

گذشتہ چند دن کے واقعات نے اسے تھکا دیا تھا۔ اور اب جب کہ شہر کے ہنگاموں سے دور جا کر رہنے کا موقع ہاتھ آیا تو وہ فوراً تیار ہوگئی۔

لیکن نکولائی نے موضوع گفتگو تبدیل کر دیا۔

''کیا سوچ رہے ہو ایوان؟'' اس نے ڈاکٹر کی طرف مڑ کر کہا۔

ڈاکٹر نے سر اٹھا کر تھکے تھکے سے انداز میں کہا:

''میں سوچ رہا تھا کہ ابھی ہماری تعداد کتنی کم ہے! زیادہ محنت سے کام کرنا پڑے گا۔ اور پاویل اور آندری کو سمجھانا ہوگا کہ ان کا جیل سے فرار ہونا ضروری ہے۔ ایسے اہم قسم کے لوگوں کو وہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہنا دیا جا سکتا۔''

نکولائی نے تیوریاں چڑھائیں اور سر کو جھٹک کر ماں کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کر لیا کہ یہ لوگ اس کی موجودگی میں اس کے بیٹے کے متعلق کھل کر باتیں نہیں کر پا رہے ہیں۔ اس لئے وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چل گئی۔ اسے رنج تھا کہ ان لوگوں نے اس کی خواہش کو نظر انداز کیا تھا وہ بستر پر آنکھیں کھولے لیٹے رہی اور جب اس نے دھیمی دھیمی آوازوں کو سنا تو اسے کچھ خطرہ سا محسوس ہوا۔

دن کے واقعات بڑے ناخوش گوار اور نا قابل فہم تھے۔ لیکن وہ اس وقت ان کے متعلق سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے ذہن سے ان پریشان کن تاثرات کو نکال کر اس نے صرف پاویل کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ رہا ہو جائے لیکن اسی کے ساتھ وہ خوف زدہ بھی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ حالات ایک ایسے نقطہ کی طرف بڑھ رہے ہیں جب کوئی شدید لڑائی ضرور ہوگی۔ لوگوں کی خاموش قوت برداشت اب کسی شدید انتظار میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ان کی جھنجھلاہٹ میں نمایاں اضافہ ہو گیا تھا۔ ہر طرف اسے سخت اور تیز الفاظ سنائی دیتے تھے اور ہر چیز سے بے چینی کی بو آتی... ہر اعلان پر بازاروں، دوکانوں، ملازمین اور دستکاروں میں بحث چھڑ جاتی تھی۔ ہر گرفتاری کے بعد اس کے اسباب پر رائے زنی شروع ہوتی جس میں کبھی خوف ہوتا، کبھی گھبراہٹ اور کبھی غصہ۔ اکثر و بیشتر سیدھے سادے لوگ ایسے الفاظ استعمال کرتے جن سے پہلے وہ ڈر جایا کرتی تھی: بغاوت، سوشلسٹ، سیاست۔ اگر یہ الفاظ طنز سے کہے جاتے تو طنز کے پیچھے ایک شوق تحقیق صاف جھلکتا نظر آتا، اگر یہ الفاظ حقارت سے کہے جاتے تو اس حقارت میں خوف کا شائبہ ہوتا، اگر کچھ سوچ بچار سے کہے جاتے تو اس فکر میں امید اور دھمکی شامل ہوتی۔ آہستہ آہستہ اس زندگی کی ساکت سیاہ سطح آب پر بے چینی کے حلقے وسیع تر ہوتے گئے۔ سوئے ہوئے خیالات بیدار ہونے لگے اور اب پہلے کی طرح زندگی کے واقعات کو سکون اور خاموشی سے تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ دوسروں کے مقابلے میں وہ ان باتوں کو زیادہ واضح طور پر دیکھ سکتی تھی کیونکہ ان کے مقابلے میں وہ زندگی کی اونچ نیچ سے زیادہ واقف ہو چکی تھی اور اس لئے جب اس نے زندگی کے ماتھے پر تردد اور بے چینی کے بل پڑتے دیکھے تو اسے خوشی بھی ہوئی اور خطرہ بھی محسوس ہوا۔ خوشی اس لئے کہ اسے اس میں اپنے بیٹے کا ہاتھ بھی نظر آیا۔ اور خطرہ اس لئے کہ اس نے سمجھا کہ اگر وہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تو سب کی اگوائی کرے گا اور سب سے زیادہ پر خطر جگہ سنبھال لے گا۔ اور پھر وہ زندہ نہ رہ سکے گا۔

بعض اوقات اپنے بیٹے کے متعلق سوچتی تو وہ قصے کہانیوں کے کسی ہیرو کی طرح معلوم ہونے لگتا اور تمام پر اثر، سچے اور اچھے لفظوں، سارے پسندیدہ انسانوں اور تمام خوبصورت اور بہادرانہ کارناموں کا مجسمہ بن جاتا تھا جنہیں اس نے اب تک سنا یا دیکھا تھا۔ ایسے وقت اس کے دل میں غرور اور مامتا کروٹیں لینے لگتی اور وہ خاموش مسرت کے ساتھ، مزہ لے کر اس کے متعلق سوچتی اور دل کو ڈھارس دیتی:

''ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی۔ ہر چیز!''

لیکن پھر اس کی محبت اور اس کی مامتا ایک دم بھڑک اٹھتی اور اس کے دل میں ٹیس سی اٹھنے لگتی تھی۔ مامتا خالص انسان دوستی کے جذبے کو آگے بڑھنے سے روک دیتی، اپنی آگ میں اسے جلا دیتی، یہاں تک کہ سربلندی اور سرخوشی کی جگہ خوف کی راکھ بکھر جاتی جس میں صرف ایک خیال بے تابی سے تڑپتا رہتا:

''مر جائے گا...وہ ختم ہو جائے گا!...''

14

ایک دن دوپہر کو جیل کے دفتر میں وہ پاویل کے سامنے بیٹھی دھندلائی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی پر ڈاڑھی بڑھ آئی تھی اور موقع کی تلاش میں تھی کہ چٹھی کس طرح دی جائے جو انگلیوں کے درمیان میں اس نے دبا رکھی تھی۔

''میں اچھا ہوں اور دوسرے ساتھی بھی اچھے ہیں'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''تم کیسی ہو؟''

''بالکل اچھی ہوں۔ یگور ایوانووچ کا انتقال ہو گیا'' اس نے میکانکی انداز میں جواب دیا۔

''اچھا!'' پاویل چونک پڑا۔ پھر آہستہ سے اس نے سر جھکا لیا۔

''پولیس نے دفناتے وقت مار پیٹ شروع کر دی۔ ایک آدمی کو گرفتار بھی کر لیا'' ماں معصومیت کے ساتھ کہتی رہی۔ جیل کا نائب عہدے دار غصہ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہیں معلوم نہیں کہ ایسی باتیں کرنا منع ہے!'' وہ بڑبڑایا۔ ''سیاست کے متعلق بات کرنے کی اجازت نہیں!...''

ماں بھی کھڑی ہو گئی اور معزرتی انداز میں بولی:

''میں سیاست پر باتیں نہیں کر رہی تھی، لڑائی کے متعلق کہہ رہی تھی۔ واقعی خوب ہی خوب لڑائی ہوئی۔ ایک لڑکے کا تو سر پھاڑ دیا...''

''ایک ہی بات ہے۔ میں کہتا ہوں تم خاموش رہو۔ یعنی کوئی ایسی بات مت کرو جس ذاتی طور پر تمہارا تعلق نہ ہو۔ یعنی جس کا تعلق تمہارے خاندان یا تمہارے گھر سے نہ ہو...''

یہ محسوس کر کے کہ وہ الجھتا جا رہا ہے وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور کاغذوں کو ادھر ادھر کرنے لگا۔

''جواب دہ تو میں ہوتا ہوں'' اس نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

اس کی طرف سے نظریں بغیر ماں نے چٹھی جلدی سے پاویل کے ہاتھ میں دے دی۔ پھر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

"تمہاری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ تمہیں کس چیز کے متعلق باتیں کرنے کی اجازت ہے" اس نے کہا۔

"سمجھتا تو میں بھی نہیں" پاویل ہنسا۔

"تو پھر یہاں آنے سے کوئی فائدہ نہیں" افسر نے چڑ کر کہا۔ "یہ تو معلوم نہیں کہ بات کیا کرنی ہے لیکن چلی آرہی ہیں۔ بلاوجہ لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے..."

"مقدمہ جلد ہی شروع ہونے والا ہے؟" ماں نے سوال کیا۔

"سرکاری وکیل چند دن پہلے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا جلدی ہی شروع ہو جائے گا..."

اسی قسم کی معمولی غیر اہم باتیں ہوتی رہیں اور ماں نے دیکھا کہ پاویل اس کی طرف بڑی محبت سے دیکھ رہا ہے، ہمیشہ کی طرح پرسکون اور متین۔ اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی سوائے اس کے کہ ہاتھ کچھ سفید ہو گئے تھے اور ڈاڑھی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس سے کوئی بہت اچھی بات کہنا چاہتی تھی۔ نکولائی کے متعلق اسے بتانا چاہتی تھی۔ معمولی قسم کی باتیں جس لہجے میں کر رہی تھی بالکل اسی لہجے میں اس نے بات جاری رکھی:

"ابھی تمہارے دھرم کے بیٹے کو دیکھا تھا..."

پاویل نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ماں نے اپنے گالوں کو انگلیوں سے گودنا شروع کیا، وہ اسے وسوف شیکوف کے چہرے کے چیچک کے داغ یاد دلانا چاہ رہی تھی۔

"بہت ٹھیک ہو گیا ہے، اب تو اسے بہت جلدی ہی کام بھی ملنے والا ہے۔"

بیٹے نے بات سمجھ لی اور ہنستی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

یہ تو بہت اچھا ہوا!" وہ بولا۔

"اور تو کوئی خاص بات نہیں" اس نے بات ختم کی۔ وہ خود اپنے آپ سے خوش اور بیٹے کی خوشی سے متاثر تھی۔

چلتے وقت اس نے ماں سے گرمجوشی سے مصافحہ کیا:

''شکریہ ماں!''

دونوں کے دلوں کی قربت کے پر مسرت احساس نے اسے مست کر دیا۔ اسے جواب دینے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے تو اس نے بیٹے کا ہاتھ خاموشی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

گھر واپس آئی تو ساشا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ عموماً اسی دن آتی جب ماں پاویل سے ملنے جاتی تھی، کبھی پاویل کے متعلق کچھ نہ پوچھتی اور اگر ماں خود ہی ذکر نہ کرتی تو وہ ماں کی آنکھوں کی طرف دیر تک غور سے دیکھنے کے بعد اپنے تجسس کو تسکین دے لیتی۔ لیکن اس بار اس نے بڑی بے چینی سے سوال کیا۔

''کیسا ہے پاویل؟''

''بالکل اچھا ہے۔''

''چٹھی دے دی تھی؟''

''ہاں۔ بڑی ہوشیاری سے دی میں نے چٹھی...''

''چٹھی پڑھی بھی اس نے؟''

''وہاں؟ وہاں کیسے پڑھ سکتا تھا؟''

''ارے ہاں، میں تو بھول ہی گئی تھی'' لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک ہفتے اور انتظار کرنا پڑے گا، پورے ایک ہفتے! کیا خیال ہے راضی وہ جائے گا؟''

ساشا نے پیشانی پر بل ڈال اور غور سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے کیا معلوم'' ماں نے سوچ کے کہا۔ ''اگر خطرے کی بات نہیں ہے تو راضی کیوں نہ ہوگا''۔

ساشا نے سر کو جھٹکا دیا۔

''تمہیں کچھ معلوم ہے کہ اس بیمار لڑکے کو کیا کھانے کو دیا جاتا ہے؟ اسے بھوک لگی ہے'' اس نے دریافت کیا۔

''ہر چیز کھا سکتا ہے۔ ذرا ٹھہرو میں ابھی...''

وہ باورچی خانے میں چلی گئی اور ساشا بھی اس کے پیچھے ہو لی۔

''تمہاری کچھ مدد کروں؟''

''ارے نہیں!''

ماں نے چولھے پر جھک کر ایک پتیلی اٹھالی۔

''ٹھہرو...''لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا آنکھیں تکلیف دہ طریقہ سے پھیل گئیں اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس نے جلدی جلدی سرگوشی کے لہجے میں کہنا شروع کیا:

''میں تم سے درخواست کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ راضی نہ ہوگا۔اس لئے میں چاہتی تھی کہ تم اسے راضی کرلو! یہاں اس کی کتنی ضرورت ہے۔کہنا کہ ہمارے کام کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ کہنا کہ مجھے اس کی صحت کی طرف سے ڈر لگا رہتا ہے۔تم خود ہی دیکھو نہ۔مقدمہ کی تاریخ بھی مقرر نہیں کی گئی ابھی...''

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑی دقت سے یہ باتیں کر رہی ہے۔اس کی آواز کپکپا گئی۔وہ سختی سے تنی ہوئی کھڑی رہی اور ماں سے نظریں نہیں ملائیں۔پھر آہستہ سے اس نے پلکیں جھپکائیں اور ہونٹ چبانے لگی۔مٹھیاں اس سختی سے بھینچیں کہ ماں نے انگلیاں چٹخنے کی آواز تک سنی۔

پلاگیا اس کی باتوں سے کچھ پریشان سی ہوگئی۔لیکن وہ ساشا کے جذبات کو سمجھ گئی اور اس نے اسے سینے سے لگالیا۔

''میری لعال''اس نے نرمی سے جواب دیا۔''اپنے سوا وہ کسی کی بات نہ سنے گیا۔کی بھین ہ سنے گا!''

دونوں خاموش ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی کھڑی رہیں۔پھر ساشا نے آہستہ سے اپنی گردن سے ماں کی باہیں ہٹائیں اور کانپ کر کہا:

''تم ٹھیک کہتی ہوں۔سب حماقت کی باتیں ہیں۔اعصاب...''

دفعتاً اس نے سنجیدگی سے کہا:

''اچھی بات ہے۔چلو بیمار کو کھانا کھلا دیں۔''

ایوان کے بستر کے پاس بیٹھ کر اس نے بڑی محبت سے پوچھا کہ سر میں درد تو نہیں ہو رہا۔

''کمزوری محسوس ہو رہی ہے''ایوان نے ٹھوڑی تک کمبل کھینچ کر کچھ گھبراہٹ کے انداز میں کہا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں جیسے کمرے میں بہت روشنی ہو۔ساشا کو محسوس ہوا کہ اس کی موجودگی میں کھاتے

ہوئے اسے کچھ شرم سی آ رہی ہے اس لئے وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ایوان بیٹھ کر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''کیا حسین لڑکی ہے!'' اس نے زیرِ لب کہا۔

اس کی آنکھیں نیلگوں تھیں، چھوٹے چھوٹے دانت موتیوں کی طرح جڑے تھے اور آواز ایسی تھی جس میں ابھی تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔

''تمہاری عمر کیا ہے؟'' ماں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''سترہ برس۔''

''ماں باپ کہاں ہیں؟''

''گاؤں میں۔ جب دس برس کا تھا تب ہی سے میں یہاں ہوں۔ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہی شہر بھاگ آیا۔ تمہارا نام کیا ہے کامریڈ؟''

جب بھی کوئی ماں کو اس لفظ سے مخاطب کرتا تو ماں کو کچھ ہنسی آتی اور اچھا بھی لگتا۔

''کیا کرو گے معلوم کر کے؟'' اس نے مسکرا کر سوال کیا۔

چند لمحات کی جھینپی جھینپی سی خاموشی کے بعد لڑکے نے سمجھایا:

''بات ایسی ہے کہ ہمارے تعلیمی حلقے کے ایک طالب علم نے۔ یعنی وہ جو ہمیں کتاب پڑھ کر سنایا کرتا تھا، اس نے ہمیں مزدور پاویل ولاسوف کی ماں کی متعلق بتایا تھا۔ یکم مئی کا مظاہرہ یاد ہے نا؟''

ماں کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''پہلی بار پاویل ہی نے ہماری پارٹی کا پرچم کھلم کھلا بلند کیا'' لڑکے نے فخر سے اعلان کیا اور یہی غرور ماں کے سینے میں بھی انگڑائی لینے لگا۔

''میں اس زمانے میں وہاں نہیں تھا۔ ہم لوگ خود مظاہرہ کرنا چاہتے تھے لیکن ہو نہیں سکا۔ بہت کم لوگ تھے۔ لیکن تم دیکھنا۔ اگلے ضرور کریں گے!''

پر امید اور بے تابانہ انتظار کی فراوانی کے باعث وہ مشکل سے سانس لے پا رہا تھا۔

''ہاں تو میں اسی ولاسوف کی ماں کا ذکر کر رہا تھا'' اس نے چمچے کو ہوا میں لہراتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''اس کے بعد اس کی ماں بھی پارٹی میں شریک ہو گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑی غضب کی عورت ہے!''

ماں مسکرائی۔لڑکے کے زبان سے تعریف سن کر اسے مزہ آ رہا تھا۔لڑکے کی زبان سے تعریف سنکر اسے مزہ آ رہا تھا۔مزہ بھی آ رہا تھا اور گھبراہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔وہ کہنا چاہتی تھی: ''میں ہوں ولاسوف کی ماں!...''لیکن وہ ان الفاظ کو روکے رہی اور ہلکے طنز کے ساتھ اپنے آپ سے کہتی رہی: ''تم بھی کتنی احمق ہو!''

دفعتاً اس کی طرف جھک کر ماں نے تیز انداز میں کہنا شروع کیا:

سڑک کا دروازہ کھلا،خزاں کی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور ماں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سوفیا کھڑی مسکرا رہی تھی۔وہ بالکل گلابی ہو رہی تھی۔

''اوفوہ!یہ خفیہ کے لوگ تو اس طرح میرے جلو میں چلتے ہیں جیسے مجھے بڑی بھاری جاگیر ملنے والی ہو۔اب یہاں سے مجھے جانا چاہئے...تمہاری طبیعت کیسی ہے ایوان؟پہلے سے بہتر ہے؟پاویل کی کیا خبر ہے نلوونا؟ساشا آئی ہے کیا؟''

ماں اور لڑکے کو اس نے اپنی بھوری آنکھوں سے محبت سے دیکھا،سگریٹ سلگائی اور مسلسل ایسے سوال کرتی رہی جن کے جواب کی اسے خود توقع نہیں تھی۔ماں اسے دیکھ کر خود ہی مسکرائی اور سوچنے لگی:

''خود میرا شمار ان بھلے لوگوں میں ہونے لگا ہے!''

ایک بار اس نے پھر ایوان کی طرف جھک کے کہا:

''بیٹے،جلدی سے اچھے ہو جانا!''

پھر وہ کھانے کے کمرے میں چلی گئی جہاں سوفیا ساشا سے باتیں کر رہی تھی:

''اس نے تین سو کاپیاں تو تیار کر لی ہیں۔اگر اسی رفتار سے کام کرتی رہی تو ختم ہو جائے گی۔بڑے دل گردے کا کام ہے!ساشا،ایسے لوگوں کے درمیان رہنا،انکا ساتھی ہونا،ان کے ساتھ کام کرنا بھی کتنی عزت افزائی کی بات ہے!''

''ہاں''لڑکی نے نرمی سے جواب دیا۔

شام کو چائے کے وقت سوفیا نے ماں سے کہا:

''ایک بات تمہیں پھر گاؤں جانا پڑے گا نلوونا۔''

اچھی بات ہے۔کب؟''

’’تمہارا کیا خیال ہے کم وبیش تین دن کے اندر تیار ہو جاؤ گی؟‘‘

’’ہو جاؤں گی۔‘‘

’’اس بار گھوڑا گاڑی لے لینا اور دوسرے راستہ سے جانا۔ نکولس کوءَ ڈسٹرکٹ سے‘‘ نکولائی نے مشورہ دیا۔ تیوریوں پر بل ڈالے وہ کچھ چڑ چڑے انداز میں بیٹھا تھا۔ یہ انداز اس پر کھپتا نہیں تھا اور اس کی سلیم الطبعی کو غارت کئے دے رہا تھا۔

’’نکولس کوئی سے ہو کر تو بہت دور پڑے گا‘‘ ماں نے جواب دیا۔’’اور پھر گھوڑا گاڑی لینا بہت مہنگا ہو گا...‘‘

’’سچی بات تو یہ ہے‘‘ نکولائی نے کہا۔’’کہ میں اس بار جانے کے ہی خلاف ہوں۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں وہاں۔ گرفتاریاں ہو چکی ہیں۔ کسی مدرس کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ تھوڑے دنوں انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے...‘‘

’’ان لوگوں کو کتابیں اور پرچے وغیرہ پہونچاتے رہنا بہت ضروری ہے‘‘ سوفیا نے میز کو انگلیوں سے بجاتے ہوئے کہا۔’’تمہیں جانے میں ڈر لگتا ہے نلوونا؟‘‘ اس نے دفعتاً سوال کیا۔

ماں کو تکلیف ہوئی۔

’’میں کبھی ڈری ہوں؟ پہلی بار گئی تو ڈر نہیں لگا...اور ان...ایک دم سے...‘‘ جملہ پورا کئے بغیر اس نے سر جھکا لیا۔ اس سے جب بھی پوچھا جاتا کہ کیا تمہیں ڈر لگتا ہے، کیا اس کام میں کوئی تکلیف تو نہ ہو گی، کیا یہ کام آسانی سے ہو سکے گا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس سے کہا جا رہا ہے کہ تھوڑا احساس کر دو اور اس وجہ سے اسے ایسا لگتا کہ یہ لوگ اسے سب سے الگ ہٹا کر اس کے ساتھ مختلف قسم کا برتاؤ کرتے ہیں۔

’’یہ سوال کیوں کیا کہ مجھے ڈر لگے گا یا نہیں؟‘‘ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔’’تم لوگ آپس میں تو ایسے سوال نہیں کرتے۔‘‘

نکولائی نے کچھ پریشان ہو کر عینک اتاری اور پھر لگا لی اور اپنی بہن کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس تکلیف دہ خاموشی سے ماں بھی پریشان سی ہو گئی، میز کے پاس سے کچھ مجرمانہ انداز میں اٹھی اور کچھ کہنا ہی چاہتی تھی، سوفیا نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے کہا:

’’مجھے معاف کر دو۔ آئندہ کبھی ایسا نہ کہوں گی۔‘‘

اس بات پر ماں مسکرادی۔تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اس کے جانے کے متعلق بہت سنجیدگی سے باتیں کرنے لگے۔

15

صبح سویرے ماں ایک گھوڑا گاڑی میں بیٹھی چلی جارہی تھی۔موسم خزان کی بارش سے سڑک بھیگی ہوئی تھی۔ہوا میں خنکی تھی اور ہر طرف کیچڑ ہورہا تھا۔گاڑی بان نے اپنی نشست پر مڑکر اس سے ناک میں بات کرنی شروع کی:

''تو میں نے اس سے کہا۔یعنی اپنے بھائی سے۔کہ بھائی بٹوارہ کرلو!تو پرھ بٹولوہ شروع ہوگیا...''

بائیں طرف والے گھوڑے کو اس نے دفعتاً زور سے چابک مارا اور غصے سے چلایا:

اور گھوڑے! دیکھ کے چل،سور کے بچے!...''

خالی، چتے ہوئے کھیتوں میں کوے اچکتے پھر رہے تھے اور سرد ہوا چاروں طرف سنسنا رہی تھی، کوے ہوا کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ تان رہے تھے جوان کے پروں کو اڑارہی تھی،ان کے پیروں کو زمین سے اکھاڑے دے رہی تھی اور انہیں کاہلی کے ساتھ پر پھڑ پھڑاتے ہوئے دوسری جگہ جا بیٹھنے پر مجبور کررہی تھی۔

''تو اس نے کیا کیا کہ میرا حصہ بھی ہڑپ کرلیا۔میں نے دیکھا کہ ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی جس پر میں ہاتھ ڈال سکوں...'' گاڑی بان نے باتیں جاری رکھیں۔

ماں اسکی باتوں کو اس طرح سنتی رہی جیسے خواب میں سن رہی ہو۔گذشتہ چندسال کے واقعات اس کے ذہن میں چلے آرہے تھے اور اس نے دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔پہلے ایسا لگتا تھا جیسے زندگی کہیں بہت دور بنائی گئی تھی، نہ جانے کس نے بنائی تھی اور کس لئے بنائی تھی۔لیکن اب زندگی کا بہت بڑا حصہ خود اس کی آنکھوں کے سامنے تخلیق ہورہا تھا اور وہ خود اس میں حصہ لے رہی تھی۔اس کے دل میں کچھ عجیب ملا جلا سا احساس پیدا ہوا جس میں اطمینان بھی تھا اور اپنے اوپر بےاعتباری بھی،الجھاؤ تھا اور ہلکا ہلکا غم بھی...

آس پاس کی جزیں آہستہ آہستہ گھوم رہی تھیں: آسمان پر بھورے بھورے بادل ایک دوسرے کے

پیچھے پیچھے بھاگے چلے جا رہے تھے، سڑک کے دونوں طرف بھیگے ہوئے درخت گزرتے گزرتے اپنی لنڈ منڈ شاخیں ہلاتے جا رہے تھے۔ کھیت ختم ہوئے تو چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آئیں اور پھر وہ بھی اوجھل ہو گئیں۔

گاڑی بان کی منمنی آواز گھوڑوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ہلکی سی صدا، سرد و نم ہوا کی سیٹیاں اور سرسراہٹ، یہ سب مل کر ایک ابلتے، اچھلتے ہوئے چشمے میں تبدیل ہو گئی تھیں جو کھیتوں میں بہتا چلا جا رہا تھا۔

''امیر آدمی کے لئے تو جنت بھی نا کافی ہے'' گاڑی بان نشست پر ہچکولے کھاتا کہتا جا رہا تھا۔ ''اس لئے ہم جیسے غریبوں کا خون چوسنا شروع کیا۔ حکام تو ان کے دوست ہی ٹھہرے...''

اسٹیشن پہونچ کر گاڑی بان نے گھوڑوں کو کھول کر گاڑی سے الگ کیا اور ماں سے کچھ فریادی انداز میں کہا:

''شراب پینے کے لئے پانچ کوپک دیدو تو اچھا ہے...''

جب اس نے پیسے دئے تو ہتھیلی پر رکھ کر اسی انداز میں بولا:

''تین کی وودکا اور دو کی روٹی۔''

ماں تھکی ہاری سہ پہر کے وقت نکولس کوئے نام کے چھوٹے سے قصبہ میں پہونچی۔ وہ چائے پینے اسٹیشن گئی، وہاں ایک کھڑکی کے نزدیک بیٹھ گئی اور اپنا بکس بنچ کے نیچے رکھ دیا۔ کھڑکی سے اسے ایک چھوٹا سا میدان، جس میں کچلی ہوئی زرد زرد گھاس اگی ہوئی تھی اور ایک بھوری سی نیچی چھت کی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اسی عمارت میں مقامی حکومت کا دفتر تھا۔ ایک گنجا ڈھیل کسان باہر برآمدے میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ وہ کوٹ کے بغیر صرف قمیص پہنے ہوئے تھا۔ میدان میں ایک سور کیچڑ کھا رہا تھا۔ کبھی کبھی اپنے کان پھڑ پھڑا کر وہ زمین مین اپنی ناک دھنسا دیتا تھا۔

بادل ایک دوسرے پر جم کر سیاہ ہوتے جا رہے تھے۔ ہر چیز خاموش، تاریک اور وحشتناک تھی جیسے زندگی کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو۔

دفعتاً ایک پولیس سارجنٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا میدان میں داخل ہوا اور دفتر کے برآمدے کے پاس پہونچ کر رک گیا۔ ہوا میں چابک لہراتے ہوئے وہ کسان پر چیخا۔ اس کی آواز کھڑکی سے آ کر ٹکرائی،

حالانکہ الفاظ سنے نہیں جا سکتے تھے۔ کسان نے کھڑے ہو کر دور اشارہ کیا۔ سارجنٹ گھوڑے پر سے اتر پڑا، کسان کے ہاتھ میں لگام دے کر وہ سیڑھیوں پر لڑکھڑاتا ہوا چڑھنے لگا۔ پھر اس نے سیڑھی پر لگی ہوئی سلاخوں کو پکڑ کر کچھ پیر جمائے اور دروازے میں سے غائب ہو گیا۔

ایک بار پھر ہر چیز خاموش ہو گئی۔ گھوڑے نے دو مرتبہ نرم زمین پر ٹاپیں ماریں۔ کمرے میں کوئی چودہ برس کی ایک لڑکی داخل ہوئی۔ اس کے بال کچھ زردی مائل تھے جن کی چھوٹی سی چوٹی گندھی تھی، چہرہ گول سا تھا اور آنکھوں میں نرمی کی جھلک تھی۔ طشتریوں سے بھری ہوئی ٹوٹی کشتی کو اندر لاتے ہوئے وہ اپنے ہونٹ چباتی اور سر ہلاتی رہی۔

''آداب میری پیاری'' ماں نے کہا۔

''آداب۔''

طشتریاں اور چائے میز پر رکھنے کے بعد لڑکی نے دفعتاً جوش اور ہیجان سے پر آواز میں کہا:

''ابھی ابھی ایک ڈاکو گرفتار کیا گیا ہے، یہاں لا رہے ہیں اسے!''

''کون ہے ڈاکو؟''

''مجھے نہیں معلوم...''

''کسے لوٹا اس نے؟''

''مجھے نہیں معلوم'' لڑکی نے پھر وہی جواب دیا۔ ''میں نے تو صرف اتنا ہی سنا کہ اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ دفتر کا چوکیدار پولیس افسر کو بلانے گیا ہے۔''

ماں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ میدان میں کسان جمع ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ آہستہ آہستہ سنجیدگی سے آ رہے تھے اور کچھ دوڑتے اپنے کوٹوں کے بٹن لگاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ سب لوگ عمارت کے برآمدے کے سامنے جمع ہو گئے تھے اور اپنے بائیں طرف دیکھ رہے تھے۔

لڑکی نے کھڑکی میں سے دیکھا اور پھر دروازے کو بھڑ سے کھول کر باہر چلی گئی۔ ماں نے چونک کر اپنا بکس بنچ کے کچھ اور نیچے کھسکا دیا۔ پھر وہ شال اوڑھ کر دروازے کی طرف چلی۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر چلے لیکن وہ اس خواہش کو دبا رہی تھی۔

برآمدے میں پہونچی تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا ایک یخ بستہ ہوا کا جھونکا آنکھوں اور سینے میں

چھا جا رہا ہے۔ وہ دم سا گھٹنے کی وجہ سے منہ کھول کر سانس لینے لگی اور اس کے پاؤں بالکل من من بھر کے ہو گئے۔ میدان کے دوسرے سرے سے ریبن چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دئے گئے تھے۔ دونوں طرف پولیس والے زمین پر لاٹھیاں پٹکتے چلے آ رہے تھے۔ مجمع دفتر کی عمارت کے باہر خاموشی سے کھڑا انتظار کرنے لگا۔

ماں حیرت سے اس منظر کو کھڑی دیکھتی رہی۔ ریبن کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز ماں کے کان میں آ رہی تھی لیکن اس کے ویران اور اداس دل میں اس کے الفاظ جا کر کہیں گم ہوئے جا رہے تھے۔

اس نے گہرا سانس لے کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ برآمدے کے نزدیک ایک کسان کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلگوں تھیں، اور بڑی سی سنہری ڈاڑھی تھی۔ وہ غور سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ ماں کھانسی اور خوف کی وجہ سے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے حلق کو رگڑا۔

''ماجرا کیا ہے؟'' ماں نے کوشش کر کے اس سے سوال کیا۔

''خود ہی دیکھ لو'' اس نے جواب دیا اور اپنا منہ موڑ لیا۔ ایک دوسرا کسان آ کر اس کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

جو پولیس والے ریبن کو پکڑ کر لا رہے تھے مجمع کے سامنے آ کر رک گئے۔ مجمع بڑھتا گیا لیکن لوگ خاموش تھے۔ دفعتاً ریبن کی آواز بلند ہوئی:

''ایمان والو! تم نے ان پرچوں کے متعلق تو سنا ہوگا جن میں ہم کسانوں کی زندگی کے متعلق صحیح صحیح باتیں لکھی گئی ہیں؟ ان ہی پرچوں کے لئے مجھے گرفتار کیا گیا ہے۔ میں نے ہی وہ پرچے لوگوں میں تقسیم کئے تھے!''

مجمع ریبن کے اور نزدیک آ گیا۔ اس کی آواز میں اطمینان اور سکون تھا اور اس سے ماں کی ڈھارس بندھی۔

''سنا تم نے؟'' دوسرے کسان نے نیلی آنکھوں والے کو ٹھوکا دے کر کہا۔ نیلی آنکھوں والے نے گردن اٹھائی اور جواب دئے بغیر ایک بار پھر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ دوسرے کسان نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے کسان سے عمر میں کم تھا۔ اس کی ڈاڑھی چھدری اور سیاہ تھی اور پتلے سے چہرے پر چھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں برآمدے کے پاس سے ہٹ گئے۔

''ڈر گئے یہ لوگ'' ماں نے سوچا۔

وہ زیادہ چوکس ہوگئی، برآمدے میں جہاں وہ کھڑی تھی وہاں سے میخائلوایوانووچ کا سیاہ زخمی چہرہ اور بے چین سی آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی اسے دیکھ لے، اس لئے اس نے پنجوں کے بل کھڑی ہوکر گردن آگے کی طرف بڑھائی۔

لوگ ریبن کی طرف کچھ اکھڑی اکھڑی بے یقین سے دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ البتہ مجمع کے پچھلے حصہ میں آہستہ آہستہ گفتگو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''کسانو!'' ریبن نے پھٹی ہوئی اونچی آواز میں کہا۔ ''ان پرچوں میں جو لکھا ہے بالکل سچ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان پرچوں کی وجہ سے مجھے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مجھے مارا بھی گیا اور اذیت دی گئی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کی گئی کہ مجھے پرچے کہاں سے ملے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے پھر مارا جائے گا۔ لیکن میں ہر چیز کے لئے تیار ہوں کیونکہ پرچوں میں جو جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ سچ ہے اور سچائی ہمیں اپنی روٹی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ بات دراصل یہی ہے!''

''یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟'' برآمدے کے نزدیک کھڑے ہوئے ایک کسان نے کہا۔

''اب کیا فرق پڑتا ہے'' نیلی آنکھوں والے نے کہا۔ ''انسان صرف ایک بار مرتا ہے۔''

لوگ وہیں خاموشی سے کھڑے رہے اور اکھڑے اکھڑے، آزردہ انداز میں ریبن کو تاکتے رہے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ کوئی غیر مرئی بوجھ انہیں دبائے ڈال رہا ہے۔

پولیس سارجنٹ لڑکھڑاتا ہوا دفتر کی عمارت سے نکل کر برآمدے کی طرف آیا۔

''کون باتیں کر رہا ہے؟'' وہ اس طرح چلایا جیسے پٹے ہوئے ہو۔

دفعتاً اس نے سیڑھیوں کے نیچے اتر کر ریبن کے سر کے بالوں کو مٹھی میں پکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑنے لگا۔

''تو بک بک کر رہا تھا سور کے بچے؟'' وہ چلایا۔

مجمع میں جنبش پیدا ہوئی اور لوگوں نے کچھ کہنا شروع کیا۔ ماں نے لاچاری سے اپنا سر جھکا لیا۔ ریبن کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی:

''دستو ذرا دیکھو!...''

''خاموش!'' سارجنٹ نے اس کے کان پر گھونسا مارا۔ ریبن چکرا سا گیا اور اس نے کاندھے اوپر اٹھائے۔

''پہلے تو ہاتھ باندھ دیتے ہیں اور پھر جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں...''

''سپاہی اسے یہاں سے لے جاؤ! اور تم لوگ یہاں سے روانہ ہو جاؤ!'' سارجنٹ ریبن کے سامنے اس طرح اچک رہا تھا جیسے کوئی زنجیر میں بندھا ہوا کتا ہڈی کے سامنے اچکتا اور اچھلتا ہے اور اس کے سینے اور پیٹ پر گھونسے مارتا رہا۔

مت مارو اسے!'' مجمع میں سے کوئی چلایا۔

''کیوں مار رہے ہو ایسے؟'' کسی نے تائید کی۔

''چلو یہاں سے چلیں'' نیلی آنکھوں والے کسان نے اپنے ساتھ کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ دونوں آہستہ آہستہ دفتر کی عمارت کی طرف چلے گئے اور ماں انہیں پیار سے دیکھتی رہی۔ سارجنٹ بھدے پن سے انداز سے برآمدے میں واپس چلا گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن وہ وہیں سے گھونسہ تان کر چلایا:

''یہاں لاؤ اسے! میں کہتا ہوں...''

''مت لے جاؤ!'' مجمع میں سے ایک رعب دار آواز آئی۔ ماں نے پہچان لیا کہ اس نیلی آنکھوں والے کسان کی آواز ہے۔ ''دوستو! ان لوگوں کو روکو! اگر اسے اندر لے گئے تو مار مار کر جان لے لیں گے اور پھر کہیں گے کہ ہم لوگوں نے مار ڈالا ہے۔ مت جانے دو اندر!''

''کسانو!'' میخائلو کی آواز آئی۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری زندگی کیسی ہے؟ جانتے ہو کہ تمہیں کس طرح لوٹا جاتا ہے، کس طرح دھوکا دیا جاتا ہے اور کس طرح تمہارا خون چوسا جاتا ہے؟ ہر چیز تمہاری ہے۔ اس دھرتی پر تم سب سے بڑی شکتی ہو۔ اور تمہارے حقوق کیا ہیں؟ صرف فاقوں سے مر جانے کا حق!''

کسانوں نے دفعتاً چیخنا اور ایک دوسرے کی بات کاٹنا شروع کیا:

''بالکل سچ کہہ رہا ہے!''

''پولیس افسر کو بلاؤ! کہاں ہے پولیس افسر؟''

سارجنٹ بلانے گیا ہے۔''

''کون، وہ شرابی؟''

''ہم افسروں کو کیوں بلائیں۔''

شور بڑھتا گیا۔

''ہاں تم بولے جاؤ! ہم کسی کو ہاتھ نہیں اٹھانے دیں گے!''

''اس کے ہاتھ کھول دو!''

''کہیں تم نہ پکڑ لئے جاؤ!''

''رسیاں میرے میرے ہاتھ میں چبھ رہی ہیں!'' ریبن نے پرسکون انداز میں کہا لیکن آواز اتنی بھاری تھی کہ سب لوگ سن سکتے تھے۔ ''میں بھاگ نہیں جاوں گا کسانو! میں سچائی سے بھاگ کر نہیں جاوں گا۔ وہ تو میرے اندر رہتی ہے!''

چند لوگ مجمع سے الگ ہو کر ایک طرف ایک طرف جا کر کھڑے ہو گئے اور سر ہلا ہلا کر باتیں کرنے لگے۔ لیکن چیتھڑے لگائے ہوئے لوگ اور زیادہ تعداد میں جمع ہونے لگے۔ ہر شخص جوش میں تھا۔ ان لوگوں نے ریبن کو گھیرے میں لے لیا وہ ان لوگوں کے درمیان کسی جنگل کے مندر کی طرح کھڑا تھا اور ہاتھ سر سے اونچے ہلا کر زور زور سے کہہ رہے تھا:

''شکریہ عزیز دوستو، شکریہ! اگر ہم ایک دوسرے کے ہاتھ نہ کھولیں گے تو پھر کون کھولے گا؟''

اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر اس نے دوبارہ ہاتھ بلند کیا جو خون میں لت پت تھا۔

''یہ ہے میرا خون۔ جو سچائی کی خاطر بہایا گیا!''

ماں سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی لیکن چونکہ وہ مجمع میں کھڑی ہو کر میخائلو کو نہیں دیکھ پر رہی تھی اس لئے وہ پھر سیڑھیوں پر کھڑی ہو گئی۔ کوئی نامعلوم سی خوشی اس کے سینے میں کروٹیں لینے لگی۔

''کسانو! ان پرچوں کو تلاش کر کے ضرور پڑھو! اگر پادری اور عہدے دار کہیں کہ سچائی پھیلانے والے دھریئے اور باغی ہیں تو ان کی بات پر یقین مت کرنا۔ سچائی چھپ کر ساری دھرتی پر گھومتی پھر رہی ہے اور لوگوں کے دلوں میں بسیرا تلاش کر رہی ہے۔ سرکار کے لئے سچائی آگ اور تلوار کی طرح ہے۔ وہ اسے قبول نہیں کر سکتی۔ سچائی انہیں قتل کر دے گی، انہیں جلا ڈالے گی! تمہارے لئے سچائی بہترین دوست ہے، ان کے لئے بدترین دشمن، اس لئے وہ چھپ کر ساری دھرتی کا چکر لگا رہی ہے!...''

ایک بار پھر لوگوں نے باتیں شروع کیں۔

''ایمان والو سنو!''

''تمہارا برا حشر ہوگا، بھائی!''

''تمہاری مخبری کس نے کی؟''

''پادری نے!'' ایک پولیس والے نے جواب دیا۔

دو کسانوں نے گندی سی گالی دی۔

''دیکھتے رہنا بھائیو!'' کسی نے متنبہ کیا۔

16

پولیس افسر چلا آ رہا تھا۔ لمبا قد، بھاری بھر کم جسم، گول سا چہرہ۔ ترچھی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ مونچھیں ایک طرف اوپر اٹھی ہوئی اور ایک طرف نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک بے جان روکھی سی مسکراہٹ نے اس کے منہ کو ٹیڑھا اور مسخ کر دیا ہے۔ وہ الٹے ہاتھ میں تلوار پکڑے ہوئے تھا اور سیدھا ہاتھ زور زور سے ہلا رہا تھا۔ ہر شخص نے اس کے بھاری قدموں کی آواز سنی۔ مجمع نیا سے راستہ دیا۔ لوگوں کے چہروں پر اداس سی مظلومیت آ گئی اور آواز اس طرح دب گئی جیسے زمین میں ڈوبی جا رہی ہو۔ ماں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں جل رہی اور ماتھے کی رگیں پھڑک رہی ہیں۔ اس کا پھر جی چاہا کہ مجمع میں شامل ہو جائے، وہ آگے جھکی اور سانس روک کر کھڑی ہو گئی۔

''بات کیا ہے؟'' پولیس افسر نے ربین کو گھور کر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''ہاتھ کیوں نہیں باندھے گئے؟ سپاہی اس کے ہاتھ باندھو!''

اس کی آواز اونچی اور پاٹ دار تھی لیکن بے رس۔

''ہاتھ بندھے ہوئے تھے، لوگوں نے کھول دیا'' ایک سپاہی نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ لوگ؟ کون لوگ؟''

پولیس افسر نے لوگوں کی طرف دیکھا جو اس کے سامنے ایک نیم حلقہ بنائے کھڑے تھے۔

''کون لوگ ہیں وہ؟'' اس نے اپنی یکساں آواز میں اونچ نیچ پیدا کئے بغیر کہا پھر نیلی آنکھوں

والے کسان کو تلوار کے قبضہ سے ٹھوکا دیا۔

''تم ہی لوگ ہو شاید کیوں چوماکوف؟ اور کون؟ تم بھی تھے میشین؟''

ان میں سے ایک کو اس نے سیدھے ہاتھ سے ڈاڑھی سے پکڑ لیا۔

''یہاں سے چلے جاؤ حرامزادو ورنہ وہ چار چوٹ کی ماردوں گا کہ یاد کرو گے!''

اس کے چہرے پر نہ غصہ تھا نہ دھمکی۔ آواز میں اطمینان تھا اور لوگوں کو اپنے لمبے بازوؤں سے اس طرح مار رہا تھا جیسے اس کی عادت سی پڑ گئی ہو۔ لوگ سر جھکائے، نظریں پھرائے اسکے سامنے سے ہٹتے گئے۔

''اور تم کس مرض کی دوا ہو؟'' اس نے ایک بار پھر ریبن کی طرف دیکھا۔

''اب میں کہتا ہوں ہاتھ پیچھے رکھ!'' اس نے زور سے کہا۔

''میں ہاتھ نہیں بندھاؤں گا!'' ریبن نے کہا۔ ''میں نہ بھاگنا چاہتا ہوں اور نہ لڑنا تو پھر میرے ہاتھ کیوں باندھتے ہو؟''

''کیا کہا؟'' پولیس افسر نے اس کے نزدیک آتے ہوئے پوچھا۔

''لوگوں کو بہت کچل جنگلیو!'' ریبن نے اونچی آواز میں بات جاری رکھی۔ ''مگر تمہارا وقت بھی اب آنے ہی والا ہے!''

پولیس افسر کھڑا اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ پھر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور جنونی انداز میں چلایا:

''سور کے بچے! کیا کہا تو نے ابھی؟''

دفعتاً اس نے ریبن کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔

''تم گھونسوں اور مکوں سے سچائی کو ختم نہیں کر سکتے!'' ریبن نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ''اور مجھے مارنے کا بھی تمہیں کوئی حق نہیں نجس کتے!''

''مجھے حق نہیں؟ مجھے؟'' پولیس افسر غرایا۔

ایک بار پھر اس نے ریبن کے سر پر مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ ریبن جھک گیا، نشانہ خطا ہو گیا اور پولیس افسر گرتے گرتے بچا۔ مجمع میں کوئی ہنسا اور ریبن کی قہر آلود آواز پھر سنائی دینے لگی:

''خبر دار جو مجھے مارا بے ایمان!''

پولیس افسر نے چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ لوگ اور تنگ حلقہ بنا کر کچھ غضبناک انداز میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

''نکیتا!'' افسر چلایا۔ ''اے نکیتا!''

ایک پستہ قد بھاری جسم کا کسان بھیڑ کی کھال کی صدری پہنے مجمع سے باہر آیا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور سر جھکا ہوا۔

''نکیتا!'' پولیس افسر نے اطمینان سے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔ ''ذرا دینا تو اسے ایک مکا۔ زور سے!''

کسان آگے بڑھا۔ ربین کے سامنے رک کر اس نے سر اٹھایا۔ ربین نے اس کے چہرے پر نپے تلے بھاری بھاری الفاظ کی بوچھار کر دی:

''لوگو ذرا تم ہی دیکھو۔ یہ جنگلی کس طرح ہمارا گلا ہمارے ہی ہاتھ سے گھونٹتے ہیں! ذرا دیکھو اور خود ہی سوچو!''

کسان نے آہستہ سے ہاتھ اٹھایا اور ربین کے سر پر ہلکے سے مارا۔

''اسی طرح مارتے ہیں سور کے بچے؟'' افسر چیخا۔

''اے نکیتا!'' مجمع میں سے ایک آواز آئی۔ ''خدا کو مت بھولو!''

''میں کہتا ہوں مارو اسے!'' افسر نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے چیخ کر کہا۔

کسان نے جھکا لیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

''بس بہت ہو گیا...'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا؟''

پولیس افسر کے چہرے پر ایک رنگ آنے ایک جانے لگا۔ پیر پٹختے اور گالی دیتے ہوئے وہ ربین کی طرف دوڑا۔ ایک مکے کی آواز آئی اور ربین چکرا گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا لیکن دوسرے مکے میں ڈھیر ہو گیا اور پولیس افسر نے اس کے سینے، بغل اور سر میں ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔

مجمع میں غصے کی لہر سی دوڑ گئی۔ لوگوں نے افسر کے خلاف بڑھنا شروع کیا لیکن وتاڑ گیا اور پیچھے

ہٹ کر تلوار سونت لی۔

''اس کا کیا مطلب؟ بغاوت؟ اہا! اچھا تو یہ بات ہے!''

اس کی آواز کانپی اور خاموش ہوگئی۔ وہ بلاوجہ بدبدانے لگا۔ دفعتاً آواز کے ساتھ ساتھ اس کی قوت بھی جواب دے گئی۔ ڈھیلا پڑ کر اس نے سر جھکا لیا اور پھیکی پھیکی سے دیکھ کر پیر جماتا پیچھے ہٹنے لگا۔

''اچھی بات'' پھٹی ہوئی آواز میں وہ چلایا۔ ''لے جاؤ اسے۔ میں جا رہا ہوں۔ تم خود ہی سوچو۔ تمہیں معلوم نہیں حرامزادو کہ یہ سیاسی مجرم ہے؟ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ شخص لوگوں کو زار کے خلاف بھڑکاتا ہے؟ اور تم لوگ اس کی وکالت کر رہے ہو! تم لوگ بھی باغی ہو کیوں؟ اچھا تو یہ بات ہے!''

ماں دم سادھے پلک تک جھپکائے بغیر کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کی ساری قوت اور سوچنے سمجھنے کی اہلیت سلب ہوگئی تھی جیسے کوئی ڈراونا خواب دیکھتے وقت ہو جاتی ہے۔ دل پر خوف اور رحم کا غلبہ تھا۔ لوگوں کی بپھری ہوئی غضبناک آوازیں، پولیس افسر کی چڑچڑی آواز اور کسی کی سرگوشی سب مل کر اس کے کان میں بھڑوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔

''اگر کوئی جرم کیا ہے تو عدالت میں لے جاؤ!...''

''حضور، اس پر رحم کیجئے...''

''بالکل صحیح ہے، کوئی قانون مار پیٹ کی اجازت نہیں دیتا...''

''بالکل اجازت نہیں دیتا۔ اگر ایسی بات جائز ہے تو پھر تو ہر شخص ہم جیسے لوگوں کی ٹھکائی کر سکتا ہے اور یہ بہت ہی اچھی بات ہوگی!...''

لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے: ایک نے پولیس افسر کو گھیر لیا۔ اس میں کچھ لوگ چیخ رہے تھے، کچھ التجا کر رہے تھے۔ دوسرا چھوٹا سا گروہ زمین پر پڑے ہوئے ریبن کے گرد جمع تھا اور غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔ اس گروہ میں سے کچھ لوگوں نے ریبن کو زمین سے اٹھایا اور جب سپاہیوں نے اس کے ہاتھ باندھنے کی کوشش کی تو انہوں نے چلا کر کہا:

''اتنی جلدی مت کرو، کمینو!''

میخائلو نے اپنے چہرے اور ڈاڑھی سے دھول اور خون پونچھا اور اپنے چاروں طرف خاموشی سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظر ماں پر پڑی۔ چونک کر وہ اس کی طرف جھک گئی اور غیر ارادی طور پر ہاتھ سے اشارہ

کیا۔لیکن اس نے اپنی نظریں موڑ لیں۔ چند منٹ بعد اس کی نظریں ماں کے چہرے کو تلاش کر رہی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے سیدھا ہو کر اپنا سر اٹھایا اور خون سے لت پت گال تھر تھرانے لگے۔

''مجھے پہچان لیا۔کیا سچ مچ مجھے پہچان لیا؟''

ماں نے اس کی طرف دیکھ کر سر اشارہ کیا۔ وہ کسی شدید خواہش کے تحت سر سے پاوں تک کانپ رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ماں نے غور کیا کہ نیلی آنکھوں والا کسان اس کے پاس کھڑا ہے اور وہ بھی اسے دیکھ رہا ہے۔ایک سکنڈ کے لئے اس کی نظروں نے ماں کو خوف زدہ کر دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہوں میں؟ مجھے بھی گرفتار کر لے جائیں گے!''

اس کسان نے ریبن سے کچھ کہا۔اس نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہی ہے'' اس نے ایسی آواز میں کہا جو کانپ رہی تھی لیکن جس میں ہمت تھی۔''اس دنیا میں میں تنہا نہیں ہوں! ساری سچائی کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں جہاں جہاں بھی رہا ہوں لوگ مجھے یاد کریں گے۔اگر سارا گھر بار ختم کر دیا۔سارے ساتھیوں کو لے گئے...''

''مجھ سے کہہ رہا ہے'' ماں نے خیال کیا۔

''لیکن وہ دن آ رہا ہے جب شاہین آزادی سے پرواز کریں گے۔لوگ زنجیریں توڑ دیں گے!''

ایک عورت گھڑے میں پانی لے آئی اور رو رو کر ریبن کے چہرے کو دھونے لگی۔اس کی اونچی غم الود آواز میخائلو کی باتوں میں الجھ گئی اور ماں پہچان نہ سکی کہ کون سی کس کی آواز ہے۔ چند کسان پولیس افسر کے پیچھے پیچھے آئے اور کسی نے چلا کر کہا:

''قیدی کو لے جانے کیلئے گھوڑا گاڑی لے آؤ! اس وقت کس کی باری ہے؟''

اس کے بعد پولیس افسر کی آواز آئی، اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔جس میں تقریباً خفگی کی جھلک تھی۔

''میں تجھے مار سکتا ہوں لیکن تو مجھے نہیں مار سکتا، تیری ہمت نہیں ہو سکتی بدمعاش!''

''اچھا یہ بات ہے؟ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔اللہ میاں؟'' ریبن چیخا۔

دبی دبی آوازوں نے اس کی بات کو دبا دیا۔

''ان سے بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں بھائی! یہ بھی عہدے داروں میں سے ہیں!''

''حضور اس پر کیا بگڑتے ہیں۔وہ اپنے آپ میں نہین ہے!''

''چپ بے وقوف کہیں کا!''

''تمہیں شہر لے جا رہے ہیں!''

''شہر میں قانون کی کچھ تو عزت ہے!''

لوگوں کے لہجے میں کچھ التجا تھی، کچھ صلح جوئی کا جذبہ۔ ساری آوازیں مل کر کچھ عجیب قسم کی بھنبھناہٹ پیدا کر رہی تھیں جس میں امید کا شائبہ تک نہ تھا۔ سپاہیوں نے ربین کو پکڑ کر اٹھایا اور دفتر کی عمارت کی طرف لے گئے، جہاں پہونچ کر وہ لوگ دروازے میں سے غائب ہو گئے۔ کسان آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگے لیکن ماں نے دیکھا کہ نیلی آنکھوں والا کسان اپنی جھکی ہوئی بھوؤں کے نیچے سے اس کی طرف دیکھتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ اس کے گھٹنوں نے جواب دے دیا، دل بیٹھ سا گیا اور اس پر چکر اور متلی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

''بھاگنا نہیں چاہئے'' اس نے سوچا۔ ''بھاگنا نہیں چاہئے۔''

اس نے حصار کی سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور کھڑی انتظار کرتی رہی۔

پولیس افسر دفتر کی عمارت کے برآمدے میں کھڑا ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کو ملامت کر رہا تھا۔ اس کی آواز میں ایک دفعہ پھر وہی روکھا پن اور بے کیفی آ گئی تھی۔

''تم بالکل احمق ہو، سور کے بچو۔ معاملات کو نہ جانیں نہ پوجھیں لیکن ٹانگ اڑائے دے رہے ہیں یہ ریاستی معاملہ ہے جنگلیو! مجھے دعائیں دو بلکہ سجدہ کرو کہ میں نے تمہیں بچا لیا! اگر چاہتا تو تم سب لوگوں کو قید کرا دیتا...''

چند کسان ٹوپیاں اتارے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ بادل زیادہ گھر آئے اور اندھیرا چھا گیا۔ نیلی آنکھوں والا کسان برآمدے میں آ گیا جہاں ماں کھڑی تھی۔

''دیکھا یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''ہاں'' ماں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کس کام پر آئی ہو یہاں؟'' اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''کسان عورتوں سے بنی ہوئی بیلیں اور جھالر وغیرہ خریدتی ہوں۔ چادریں، غلاف وغیرہ بھی۔''

کسان نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

''ہماری عورتیں یہ سب چیزیں نہیں بناتیں'' اس نے مردہ دلی سے کہا اور پھر دفتر کی عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔

ماں نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور اندر جانے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہی۔ کسان کے خوبصورت چہرے پر فکر کے نشان تھے اور اس کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ اس کا لمبا قد اور چوڑے شانے تھے اور وہ پیوند لگی ہوئی کفتان، صاف سوتی قمیص اور گھر کے بنے ہوئے خاکی کپڑے کی پتلون پہنے تھا، پاؤں میں بغیر موزے کے پھٹے ہوئے جوتے تھے۔

کسی وجہ سے ماں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بھٹکتے ہوئے خیالات سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے دل نے کوئی بات کہی اور وہ دفعتاً بولی:

''رات بھر کے لئے مجھے ٹھیرا سکتے ہو؟''

خود اس کے لئے یہ سوال غیر متوقع تھا اور سوال کرنے کے بعد ہی اس کے بدن کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سیدھی کھڑی ہو کر اس نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ لیکن نکیلے خیالات ذہن میں کچو کے دیتے رہے:

''نکولائی ایوانووچ پر میری وجہ سے مصیبت آئے گی اور میں بہت دنوں تک پاویل سے نہ مل سکوں گی! مجھے ماریں گے!''

زمین پر نظریں گاڑے، کفتان کے بٹن لگا کر کسان نے آہستہ آہستہ جواب دیا:

''رات کی رات ٹھہرو گی؟ کیوں نہیں؟ البتہ میرا جھونپڑا بہت چھوٹا سا ہے...''

''اس کی تو میں عادی ہوں'' ماں نے کہا۔

''اچھی بات ہے'' کسان راضی ہو گیا اور سر اٹھا کر ایک بار پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔

اندھیرا زیادہ چھا چکا تھا اور مدھم روشنی میں اس کی آنکھوں کی چمک کچھ سرد اور چہرہ کچھ زرد سا نظر آیا۔

''تو پھر میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ میرا بکس لے چلو گے؟'' اس نے نرمی سے کہا اور اسے احساس ہوا کہ جیسے وہ پھسلتی ہوئی نیچے چلی جا رہی ہے۔

''اچھی بات ہے۔''

اپنے کاندھے اٹھا کر اس نے کفتان ٹھیک کی۔

''گاڑی آرہی ہے...'' وہ بولا۔

دفتر کی عمارت کے برآمدے میں ربین نظر آیا۔ اس کا چہرہ اور سر کسی خاکی چیز سے لپٹا ہوا تھا اور ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔

''خدا حافظ عزیز دوستو!'' مدھم روشنی کی چیرتی ہوئی اس کی آواز آئی۔ ''سچائی کو تلاش کرو اور اسے سینے سے لگا کر رکھو! ان لوگوں پر یقین کرو جو تمہارے پاس سچی باتیں لاتے ہیں اور سچائی کی حفاظت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا اٹھا نہ رکھنا!...''

''بک بک بند کرو!'' پولیس افسر چلایا۔ ''گھوڑوں کو چابک مار سپاہی کے بچے!''

''کھونے کے لئے تمہارے پاس کچھ بھی نہیں۔ اپنی زندگی پر نظر ڈالو...''

گاڑی چل پڑی، دو سپاہیوں کے درمیان بیٹھے بیٹھے ربین کہتا رہا:

فاقوں سے کیوں مرتے ہو؟ ایک بار آزادی حاصل کر لو تو پھر روٹی بھی مل گی اور انصاف بھی! بات دراصل یہی ہے! خدا حافظ عزیز دوستو!...''

پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز اور پولیس افسر کی چیخوں میں اس کی آواز ڈوب گئی۔

''قصہ تمام ہوا'' کسان نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔ پھر ماں کی طرف مڑ کر اس نے دھیمی آواز میں کہا ''اسٹیشن پر میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

ماں کمرے میں چلی گئی، سماوار کے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اسے غور سے دیکھا اور آہستہ سے اسے طشتری میں واپس رکھ دیا۔ ایک بار پھر اس کا سر چکرانے لگا، اور وہ کچھ بھی نہ کھا سکی۔ اسے اتنی گرمی محسوس ہونے لگی کہ جی گھبرانے لگا، طبیعت ایسی پست ہوئی جیسے دل سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اسے چکر آنے لگا۔ نظروں کے سامنے نیلی آنکھوں والے کسان کا چہرہ پھرنے لگا۔ ایک عجیب اور نامکمل سا چہرہ جسے دیکھ کر اس پر اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کسی وجہ سے وہ یہ نہیں سوچنا چاہتی تھی کہ یہ شخص اسے پولیس کے حوالے کر دے گا لیکن یہ خیال اس کے ذہن میں گھر کر چکا تھا اور دل پر ایک بوجھ کی طرح رکھا ہوا تھا۔

''اس نے مجھے دیکھ لیا'' اس نے کچھ تھکے تھکے انداز میں سوچا۔ ''مجھے دیکھ لیا اور سمجھ گیا۔''
یہ خیال آگے نہ بڑھ سکا بلکہ ناامیدی اور ہلکے ہلکے چکر نے اسے ڈبو دیا۔

کھڑکی سے باہر شور کی جگہ ایک مکمل خاموشی طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ظلم اور خوف کا احساس گاؤں کے اوپر منڈلا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ سے ماں کا تنہائی کا احساس بڑھ گیا اور روح پر نرم اور خاکستری راکھ جیسی مدھم روشنی چھا گئی۔

لڑکی ایک بار پھر دروازے میں نظر آئی۔

''کچھ انڈے تل کر لاؤں؟'' اس نے دریافت کیا۔

''تکلیف مت کرو۔ مجھے بھوک نہیں لگی۔ ان لوگوں کے شور اور چیخوں سے تو میں ڈر سی گئی۔''

میز کے قریب آ کر لڑکی نے دھیمے لیکن پریشانی کے لہجے میں کہا:

''تم دیکھتیں تو معلوم ہوتا کہ پولیس افسر نے اس شخص کو کس بری طرح مارا تھا! میں تو بالکل نزدیک کھڑی تھی۔ اس کے دانت کھڑی تھی۔ اس کے دانت توڑ دئے اور میں نے اسے خون تھوکتے ہوئے دیکھا۔ خون گاڑھا اور گہرا سرخ تھا... آنکھیں بالکل ابلی پڑ رہی تھیں! تارکول کا کام کرتا ہے۔ پولیس سارجنٹ اوپر پڑا ہوا ہے۔ نشے میں دھت لیکن اور شراب مانگ رہا ہے۔ کہتا ہے کہ ایک بڑا بھاری گروہ ہے۔ اور یہ ڈاڑھی والا اس کا سردار ہے۔ جیسے سرپنچ ہوتے ہیں نا! تین کو گرفتار کیا لیکن ایک بھاگ نکلا۔ ان ہی کے گروہ میں سے ایک اسکول ماسٹر کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ یہ لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے اور دوسروں کو بھی بہکاتے رہتے ہیں تاکہ سارے کلیساؤں کو لوٹ لیں۔ بڑے ویسے ہیں یہ لوگ! چند کسانوں کو اس پر بڑا رحم آ رہا تھا لیکن دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ اسے تو ختم ہی کر دینا چاہئے۔ ایسے کمینے کسان بھی ہمارے یہاں بہت ہیں!''

امید وبیم کے جذبے کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے ماں اس لڑکی کی تیز تیز لیکن اکھڑی اکھڑی گفتگو کو غور سے سنتی رہی۔ لڑکی خوش تھی کہ کوئی تو اس کی بات سن رہا ہے اور وہ جوش میں آ کر دھیمے لہجے میں بولتی گئی:

''میرے بابا کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ خراب فصل کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ دو برس سے زمین میں کچھ پیدا ہی نہیں ہوا۔ بالکل بنجر پڑی ہے اس لئے ہمارے کسان اتنے گر گئے ہیں۔ گاؤں کے جلوسوں میں نہ

جانے کیا کیا چیختے اور لڑتے ہیں۔ ایک دن واسیوکوف کا سامان قرض کی علت میں نیلام کیا جا رہا تھا تو اس نے سرپنچ کے منہ پر کس کے طمانچہ مارا! بولا یہ قرض بھی لیتے جاؤ...''

دروازے کے باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ماں نے میز کر پکڑ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ نیلی آنکھوں والا کسان اندر داخل ہوا اور ٹوپی اتارے بغیر بولا:

''تمہارا بکس کہاں ہے؟''

اس نے بکس کو آسانی سے اٹھا کر ہلایا۔

''خالی ہے۔ مارکا، ذرا انہیں میرے گھر تک پہونچا دینا۔''

پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر وہ چلا گیا۔

''رات یہیں رہ رہی ہو؟'' لڑکی نے سوال کیا۔

''ہاں۔ جھالر اور بیلیں لینے آئی تھی۔ میں وہی خریدتی ہوں...''

''یہاں یہ سب نہیں بناتے۔ تنکوو اور دریانو میں لوگ بناتے ہیں، یہاں نہیں'' لڑکی نے سمجھایا۔

''کل وہاں جاؤں گی...''

چائے کے پیسے ادا کرنے کے بعد ماں نے لڑکی کو تین کوپک اوپر دیدئے۔ لڑکی خوش ہوگئی۔ دونوں باہر نکلے۔ لڑکی ننگے پاؤں تیزی سے گیلی زمین پر چلنے لگی۔

''اگر کہو تو میں دریانو جا کر عورتوں سے کہہ دوں کہ بیلیں، جھالر وغیرہ یہیں لے آئیں'' وہ بولی۔ ''وہ لوگ یہیں جائیں گی اور تم جانے سے بچ جاؤ گی کافی دور ہے۔ بارہ ورسٹ☆...''

''تم فکر مت کرو'' ماں نے اس کا ساتھ دینے کے لئے رفتار تیز کر دی۔ ٹھنڈی ہوا نے اسے بشاش کر دیا اور اس کے دل میں ایک مبہم سا ارادہ پیدا ہونے لگا۔ یہ ارادہ آہستہ آہستہ اور غیر یقینی طور پر بڑھتا رہا اور اسے اور تیزی سے بڑھانے کے لئے ماں اپنے آپ سے سوال کرتی رہی:

''کیا کرنا چاہئے؟ اگر میں ہر بات صاف صاف کہہ ڈالتی ہوں تو...''

تاریکی چھا چکی تھی اور ہوا میں خنکی تھی۔ جھونپڑوں کی کھڑکیاں سرخ روشنیوں سے چمک رہی تھیں۔ خاموشی میں کچھ چیخیں اور گائے بیلوں کی آواز سنائی دے رہی تھیں۔ سارا گاؤں کسی خوفناک اور تکلیف دہ فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

’’لو ہم آ گئے‘‘ لڑکی نے کہا۔’’رات گزرانے کے لئے بڑی خراب جگہ پسند کی تم نے۔ بہت غریب کسان ہے بیچارہ۔‘‘

اسی نے دروازے کو ٹٹولا۔ پھر دروازہ کھول کر سر اندر کر کے چلائی:

’’تاتیانا چچی!‘‘

پھر وہ چلی!‘‘

پھر وہ چلی گئی۔

’’خدا حافظ!‘‘ تاریکی میں سے اس کی آواز آئی۔

☆ ورسٹ۔ روس کا مسافت کا پیمانہ جو تقریباً دو تہائی میل کی برابر ہے۔

ماں نے دھلیز پر قدم رکھا اور اپنا ہاتھ آنکھوں تک اونچا کیا تا کہ جھونپڑی کے اندر اچھی طرح دیکھ سکے۔ جھونپڑی میں گنجائش بہت تھوڑی تھی۔ لیکن وہ ایک نظر ہی میں اس کے صاف ستھرے پن سے متاثر ہو گئی۔ ایک نوجوان عورت نے چولھے کے ایک کونے سے اس کی طرف دیکھا، کچھ بولے بغیر سر ہلایا اور پھر ایک بار پرے ہٹ گئی۔ چراغ میز پر جل رہا تھا۔

جھونپڑی کا مالک میز سے لگا بیٹھا اپنی انگلیوں سے میز کو بجا رہا تھا اور اس کی نظریں ماں کی آنکھوں کی تلاش لے رہی تھیں۔

’’اندر آ جاؤ!‘‘ کچھ دیر ٹھہر کر اس نے کہا۔’’تاتیانا، ذرا پیتر کو تو بلا لاؤ اور ہاں ذرا جلدی کرنا۔‘‘

عورت ماں کی طرف دیکھے بغیر چلی گئی جو مرد کے مقابل والی بنچ پر اپنی جگہ سنبھال چکی تھی اور ارد گرد نظریں دوڑا رہی تھی۔ اس کا سوٹ کیس کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ جھونپڑی میں بیزار کن خاموشی چھائی ہوئی تھی جو کبھی کبھی بتی کے بھڑک اٹھنے سے ٹوٹ جاتی تھی۔ کسان کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے اور چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ وہ چہرہ کبھی ماں کی نظروں کے سامنے آتا اور کبھی کچھ دھندلا سا جاتا تھا اور ماں اس سے کچھ جھنجھلا سی رہی تھی۔

’’کہاں ہے میرا سوٹ کیس؟‘‘ اس نے بلند آواز میں یکا یک دریافت کیا جس پر اسے خود بھی حیرت ہوئی۔

کسان نے اپنے کندھے ہلا دئے۔

''کھوئے گا نہیں'' وہ دبی زبان میں بولا۔ پھر آہستہ سے کہا ''وہاں اسٹیشن پر میں نے جان کے، تا کہ وہ لڑکی اسے سن لے، یہ کہا تھا کہ وہ خالی ہے لیکن خالی نہیں ہے۔ کافی وزنی ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' ماں نے پوچھا۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پاس آیا اور جھک کر اس کے کان میں آہستہ سے کہا:

''تم اس آدمی کو جانتی ہو؟''

''ہاں!'' ماں نے بے جھجک جواب دیا حالانکہ اس کے لئے یہ سوال بہت ہی اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس ایک مختصر لفظ نے اندر سے ہر چیز کو روشن کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے ہر بات صاف ہوگئی ہے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور جم کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ کسان مسکرایا۔

''میں اسی وقت تاڑ گیا تھا۔ میں نے اس سے کان میں پوچھا تھا۔ کیا تم اس سے واقف ہو جو برآمدے میں کھڑی ہے؟''

''اور اس نے کیا جواب دیا؟'' ماں نے تیزی سے پوچھا۔

''اس نے؟ اس نے جواب دیا کہ ہم لوگ بہت ہیں، بے انتہا!''

کسان نے سوالیہ انداز سے مہمان کی طرف دیکھا اور پھر ایک بار مسکرا کر کہنے لگا:

''بڑا مضبوط شخص ہے اور بہادر بھی۔ صاف صاف کہہ دیا کہ۔ میں ہوں۔ جو کچھ اسے کہنا ہوتا ہے برابر کہتا ہی جاتا ہے چاہئے وہ لوگ اسے کتنا ہی ماریں پیٹیں...''

اس کی آواز سے جو کہ کمزور اور مذبذب تھی ماں زیادہ سے زیادہ مطمئن ہوتی گئی اور اسکی صاف دلانہ نگاہوں کا بھی اس پر اثر ہوا جو اس کے غیر مکمل سے چہرے میں سے جھانک رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ اس کی اداسی اور خطرے کا احساس ریبن کے لئے بے پناہ خلوص اور ہمدردی میں تبدیلی ہو گیا۔

''مردود! شیطان!'' وہ شدید غصے کی حالات میں چلا اٹھی اور رونے لگی۔

کسان نے نڈھال اور غمگین ہو کر سر ہلا دیا اور وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا۔

''دیکھو تو ذرا ہمارے عہدیداروں کے مددگار کس نامعقول قسم کے لوگ ہیں!''

وہ دوبارہ ماں کی طرف پلٹا اور آہستہ سے بولا:

''میرا خیال ہے کہ سوٹ کیس میں اخبارت ضرور ہوں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں'' ماں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سادگی سے جواب دیا۔ ''میں اسی کے لئے لا رہی تھی۔''

کسان کی بھویں تن گئیں اور کونے میں نظریں گاڑ کر دیکھتے ہوئے اس نے اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑ لیا۔ آخر کار وہ بولا:

''وہ سب اخبار اور کتابیں ہم تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ اور ہم اس آدمی کو جانتے ہیں۔ ہم اس سے ملتے تھے۔''

وہ رکا اور ایک لمحے کے لئے سوچنے لگا۔

''اب تم اس کا۔ سوٹ کیس کا کیا کرو گی؟'' اس نے پوچھا۔

ماں نے اس کی طرف دیکھا جیسے آزمانا چاہتی ہو اور بولی:

تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گی!''

اس نے احتجاج نہیں کیا اور نہ اسے کوئی حیرانی ہوئی۔

''ہمارے پاس...'' اس نے دھرایا۔

سر کے اشارے سے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ بنچ پر بیٹھ گیا اور اپنی انگلیوں کو اپنی ڈاڑھی میں پھیرنے لگا۔

ماں کے ذہن مین اس وحشیانہ سلوک کا منظر منڈلا رہا تھا جو ریبن کے ساتھ کیا گیا تھا اور جو سنگدلانہ اصرار کے ساتھ اس کے دماغ میں برابر آئے رہا تھا۔ اس کے تصور نے اس کے ذہن سے دوسرے سارے خیالات بھگا دئے تھے۔ درد و غم اور غصے کے جذبات نے اور تمام احساسات پر غلبہ پر لیا تھا اس لئے وہ سوٹ کیس یا کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کے قابل نہ رہی تھی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے لیکن اس کے چہرے سے سختی ٹپک رہی تھی اور اس کی آواز بھرائی ہوئی نہ تھی جب کہ اس نے کہا:

''خدا کرے ان پر قہر نازل ہو اس لئے کہ وہ انسانوں کو خاک میں گسیٹتے، انہیں مارتے پیٹتے اور لوٹتے ہیں۔''

''وہ بہت مضبوط ہیں، بہت مضبوط'' کسان نے آہستہ سے جواب دیا۔

''اور کہاں سے انہیں یہ طاقت مل جاتی ہے؟'' ماں نے مایوسی سے کہا۔ ''یہ طاقت ہم ہی سے ملتی

ہے۔ہم عام انسانوں سے۔ہاں ہر چیز ہمیں سے ملتی ہے۔''

وہ اس محبت آمیز لیکن پراسرار سے چہرے والے کسان پر کچھ جھنجھلاسی رہی تھی۔

''ہاں''اس نے لمبا سانس لے کر کہا۔''پہیا...''

یکا یک وہ دروازے کی طرف جھکا اور اس نے اپنے کان کھڑے کر دئے۔

''وہ لوگ آرہے ہیں''اس نے بہت آہستہ سے کہا۔

''کون؟''

''دوست...معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے!...''

اس کی بیوی داخل ہوئی اور اس کے پیچھے ایک کسان جس نے اپنی ٹوپی کونے میں پھینک دی اور تیزی سے جھونپڑی کے مالک کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا بات ہے؟''اس نے پوچھا۔

پہلے کسان نے سر ہلا دیا۔

''استیپان!''اس کی بیوی چولھے کے پاس سے، جہاں کھڑی تھی، بول اٹھی۔''مہمان سے کھانے کے لئے تو پوچھ لو۔''

''نہیں شکریہ بہن۔''ماں نے کہا۔

دوسرا کسان ماں کے قریب آیا اور تیزی سے پھٹی پھٹی آواز میں بولا:

''میں اپنا تعارف تو کرا دوں۔میرا نام پیتر یگوروف ریابینن لیکن لوگوں نے میرا نام سوار رکھ دیا ہے۔میں تمہاری سرگرمیوں کے بارے میں تھوڑی بہت معلوم رکھتا ہوں۔مجھے پڑھنا لکھنا بھی آتا ہے اور میں کچھ بہت ٹھس بھی نہیں...''

اس نے ماں کا بڑھا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میزبان کی طرف پلٹا۔

''دیکھا تم نے استیپان!''اس نے کہا۔''میرا خیال ہے واروارا نکولائی ونا کافی ہمدرد عورت ہے۔لیکن اس کا کہنا ہے کہ یہ سرگرمیاں احمقانہ اور مضرت رساں ہیں۔کہتی ہے کہ نوجوان اور طالب علم لوگوں کے دماغوں میں حماقت ٹھونس رہے ہیں۔لیکن تم اور میں دیکھ رہے ہیں کہ آج جس کسان کو انہوں نے گرفتار کیا ہے وہ ایک سو فی صدی کسان تھا اور ادھر دیکھو۔ایک ادھیڑ عمر کی عورت دیکھنے میں کھاتے

پیتے لوگوں میں سے بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ معاف کرنا میں اگر پوچھوں کہ تمہارا کس طبقے سے تعلق ہے؟''

وہ سانس روکے بغیر تیزی سے اور صاف صاف بولتا جار ہا تھا، اسکی ڈاڑھی قدرے ہل رہی تھی اور اس نے اپنی آنکھیں ماں کے چہرے پر گاڑ دیں تھیں۔ اس کے کپڑے تار تار اور بوسیدہ تھے اور بال جیسے چٹائی بن گئے تھے جیسے وہ کچھ ہی دیر پہلے اپنے دشمن سے مقابلے کر کے آیا ہو اور اس مقابلے میں اس پچھاڑنے پر خوشی بھی ہو رہی ہو۔ ماں کو فوراً ہی اس کے انداز پسند آ گئے کیونکہ وہ صاف صاف اپنے دل کی باتیں کہتا جار ہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جب کہ وہ اس کے سوال کا جواب دے چکی تھی۔ اس کے بعد اس نے پھر ایک بار ہاتھ ملایا اور ایک بے جان سا قہقہہ لگایا۔

''بہت صاف سیدھا کام ہے استیپان'' اس نے کہا۔ ''بڑا اچھا کام۔ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ یہ عوام ہی کا پھیلایا ہوا ہے؟ لیکن وہ نیک بخت عورت۔ وہ تم سے کوئی سچی سچی بات نہیں کہتی۔ اس کا خود کا نقصان ہوگا اگر وہ سچی سچی بات تم سے کہہ دے۔ کہنے کی بات نہیں لیکن میں اس کی عزت کرتا ہوں۔ کافی اچھی ہے اور ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔ اپنے آپ کو کوئی گزند پہونچائے بغیر۔ لیکن عام لوگ۔ وہ تو بے تکان ایسے کام میں کود پڑتے ہیں۔ اور انہیں گزند یا نقصان کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ان کے لئے فرق کیا پڑتا ہے؟ عمر بھر نقصان اٹھاتے ہیں۔ ہر کام میں، چاہے کوئی ہو، انہیں ٹھیس ہی پہونچتی ہے۔ ان کے لئے دنیا میں منہ چھپانے کو کوئی جگہ نہیں۔ صرف ایک ہی لفظ سنا کرتے ہیں، رک جاؤ، چاہے وہ کسی بھی راستے پر کیوں نہ جارہے ہوں۔''

''اچھا اچھا!'' استیپان نے گردن ہلائی اور فوراً ہی بولا۔ ''انہیں سوٹ کس کی بڑی فکر ہے۔''

پیتر نے جان بوجھ کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ سے اشارہ کیا۔

''فکر نہ کرو'' اس نے تسلی کے انداز میں کہا۔ ''ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی ماں۔ تمہارا سوٹ کس میرے گھر ہے۔ آج جب اس نے تمہارے بارے میں بتایا کہ تم بھی اس کام میں الجھی ہوئی ہو اور اس آدمی کو جانتی ہو۔ میں نے اس سے کہہ دیا 'یاد رکھنا۔ استیپان! جلدی سے اس طرح کے معاملے میں کس چیز پر پھسل نہ پڑو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم تمہارے برابر ہی وہاں کھڑے ہوئے تھے تو تم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم کون ہیں۔ کسی ایماندار آدمی کو دیکھ کر اسے پہچاننا مشکل کام نہیں ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ایسے بہت سے آدمی ہمیں نہیں نظر آتے۔ اپنے سوٹ کس کی فکر نہ کرو...''

وہ اس کے برابر بیٹھ گیا اور سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''اگر ان سب چیزوں سے جو اس کے اندر ہیں تم پیچھا چھڑانا چاہتی ہو تو ہمیں تمہاری مدد کرتے ہوئے بڑی خوشی ہو گی۔ ہم ان کتابوں اور کاغذات کو استعمال کر سکتے ہیں...''

''یہ تو ان سب چیزوں کو ہمارے پاس چھوڑ دینا چاہتی ہیں'' استیپان نے کہا۔

''اچھی بات ہے ماں! ہر چیز کے لئے ہم جگہ نکال لیں گے۔''

وہ ایک مختصر قہقہے کے بعد اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر فرش پر ٹہلنے لگا۔

''قسمت اچھی ہے۔ بات کچھ زیادہ عجیب نہ سہی۔ بس رسی جو ایک جگہ سے ٹوٹ گئی تو دوسری جگہ رک گئی۔ یہ ٹھیک بھی ہے۔ اخبار بہت اچھا ہے ماں اور اس سے کام بھی نکل جاتا ہے۔ لوگوں کی آنکھوں پر سے پٹیاں ہٹا دیتا ہے۔ کھاتے پیتے لوگ اس کی زیادہ قدر نہیں کرتے۔ میں ایک عورت کے لئے جو یہاں سے کافی دور رہتی ہے، بڑھتی کام کام کرتا ہوں۔ کافی اچھی ہے، اس کا ممنون ہونا چاہئے کہ وہ کتابیں ہمیں دیتی ہے بعض وقت ایسی چیزیں بھی پڑھنے میں آجاتی ہیں جو صحیح معنوں وقت ایسی چیزیں بھی پڑھنے میں آجاتی ہیں جو صحیح معنوں میں آنکھیں کھولنے والی ہوتی ہیں۔ بہر حال ہم اس کے ممنون ہیں۔ لیکن ایک بار میں نے یہ اخبار اسے دکھایا اور وہ چیز اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ 'ایسی چیزیں مت پڑھا کرو پیتر!، اس نے کہا 'یہ مدرسوں کے چند بیوقوف لڑکے ہیں جو اس طرح کی چیزیں لکھا کرتے ہیں۔ اور تم اسے پڑھ کر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالو گے۔ جیل اور سائبیریا، اس نے کہا۔''

پھر ایک بار وہ کچھ پوچھنے سے پہلے خاموش ہو گیا۔

''آج وہ جو آدمی تھا۔ ماں کیا وہ تمہارا رشتہ دار ہے؟''

''نہیں'' ماں نے جواب دیا۔

پیتر نے مسکرا کر اپنا سر ہلا دیا گویا کسی چیز کی اسے بہت خوشی ہے۔

''میرا رشتہ دار نہ سہی لیکن میں بہت دنوں سے اسے جانتی ہوں اور بھائی کی۔ بڑے بھائی کی۔ طرح اس کی عزت کرتی ہوں۔'' ماں نے جلدی سے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔ گویا ریبن کی رشتہ داری سے انکار کر کے اس نے کوئی غلطی کی ہو۔

اس اپنے احساس کے لئے احساس کیلئے صحیح الفاظ نہ مل سکے اور یہ بات اتنی تکلیف دہ تھی کہ وہ پھر

ایک بار رونے لگی۔ایک بوجھل، منتظر سی خاموشی جھونپڑی میں چھائی ہوئی تھی۔ پیتر اس طرح سر جھکائے کھڑا رہا گویا وہ کچھ سن رہا ہے۔استیپان اپنی کہنیوں کو میز پر ٹکائے بیٹھا تھا۔اس کی بیوی چولھے کے پاس جھکی ہوئی تھی اور ماں اس عورت کی ان نظروں کو جو اس کے چہرے پر گڑ گئی تھیں محسوس کر رہی تھی۔خود ماں نے بھی اس نوجوان عورت کے چہرے پر نظریں دوڑائیں جو سانولا اور بیضوی تھا۔اس کی ناک ستواں اور ٹھوڑی مضبوط تھی اور اس کی سبزی مائل آنکھوں میں بلا کی تیزی اور ذہانت تھی۔

''تو وہ تمہارا دوست ہے'' پیتر نے آہستہ سے کہا۔''آدمی سمجھ دار ہے۔اپنے متعلق بڑی اونچی رائے رکھتا ہے، اور ٹھیک بھی ہے۔اس کہتے ہیں مرد تاتیانا! اور تم کہتی ہو...''

''شادی شدہ ہے کیا؟'' بیچ میں تاتیانا مخل ہوئی اور اپنے چھوٹے سے منہ میں اپنے لبوں کو بھینچ لیا۔

''رنڈوا ہے'' ماں نے مغموم انداز میں کہا۔

''اسی لئے اتنا جری ہے'' تاتیانا نے زوردار لیکن مترنم آواز میں کہا۔''ایک شادی شدہ شخص ایسا راستہ نہیں اختیار کر سکتا۔ڈرتا ہے۔''

''میرے بارے میں کیا ارشاد؟'' پیتر نے کہا۔''میں شادی شدہ نہیں ہوں؟''

''ہونہہ۔ پڑوسی'' عورت نے شرارت سے مسکرا کر اس کی نظروں سے نظریں ہٹا کر کہا۔''تم کرتے کیا ہو؟ صرف باتونی ہو اور کبھی کبھار ایک آدھ کتاب پڑھ لیتے ہو بس۔تمہارے اور استیپان کے کسی تاریک گوشے میں اس طرح کھس پھس کر لینے سے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔''

''بہت سارے لوگ میری باتوں کو سنتے ہیں'' کسان نے آہستہ سے احتجاج کیا جیسے عورت کے الفاظ سے اسے تکلیف ہوئی تھی۔''یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں یہاں خمیر کی طرح اندر کام کرتا ہوں۔لیکن تمہیں یہ نہ کہنا چاہئے کہ...''

استیپان نے خاموشی سیا پنی بیوی کی طرف اور پھر اپنا سر جھکا لیا۔

''کسان کو شادی کرنے کی کیا ضرورت کہ اس کے لئے کام کرے۔لیکن وہ بھی کوئی کام میں کام ہے!''

''کیا تمہارے لئے کافی کام نہیں ہے؟'' استیپان نے بے رس لہجے میں کہا۔

''اس کام میں کوئی سمجھ کی بھی بات نظر آتی ہے؟ زندگی بھی نیم فاقوں کی حالت میں ایک دن کے

بعد دوسرا دن کاٹنا۔ اگر بال بچے ہوں تو ان کی دیکھ بھال بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی، حالانکہ روٹی تب بھی نہیں ملتی۔''

وہ ماں کے قریب گئی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ مسلسل بولتی رہی لیکن اس کی آواز میں شکایت یا غم نہیں تھا۔

''میرے دو بچے تھے۔ ان میں سے ایک کے بدن پر ابلتا ہوا پانی گر پڑا تھا اس وقت صرف دو سال ہی کا تھا۔ دوسرا مردہ پیدا ہوا۔ اپنے وقت سے پہلے۔ سب کچھ اسی بدبخت کام کی بدولت۔ اس کام سے مجھے کبھی کائی خوشی بھی میسر ہوئی؟ میں تم سے سچ کہتی ہوں کہ کسان کے لئے شادی کرنا بے کار ہے۔ اچھے خاصے بلا کسی جوکھم کے ٹھیک زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ بہتر زندگی کیلئے کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن خود اپنے ہاتھوں میں زنجیریں ڈال لیتے ہیں۔ اس وقت اس آدمی کی طرح حقیقت کی طرف خود ہی چل پڑتے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا ماں؟''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو'' ماں نے کہا۔ ''ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ ورنہ اس زندگی می کوئی تبدیلی نہیں آسکتی...''

''تمہارا آدمی ہے؟''

''مر گیا۔ میرا ایک لڑکا ہے...''

''تمہارے ساتھ رہتا ہے؟''

''جیل میں ہے'' ماں نے کہا۔

جیسے ہی اس نے یہ الفاظ کہے ماں کو غرور کا احساس ہوا اس پہلے یہ خیال اس کے دل کو سخت تکلیف پہونچاتا تھا۔

''یہ دوسری مرتبہ ہے کہ اس جیل میں ڈال دیا گیا۔ سب کچھ اس لئے کہ اس نے خدا کی سچائی کو لوگوں کے دلوں میں بویا تھا۔ نوجوان، خوبرو اور ہوشیار لڑکا ہے۔ وہی تھا جسے تمہارے اخبار کا خیال آیا، اور وہی ہے جس نے میخائلو ایوانووچ کو صحیح راستہ پر لگایا حالانکہ میخائلو اس سے دگنی عمر کا ہے۔ بہت جلد میرے بیٹے پر مقدمہ چلایا جائے گا اور اسے سائبیریا بھیج دیں گے۔ لیکن وہ بھاگ کھڑا ہوگا اور یہاں واپس آجائے گا تا کہ اپنے کام کو جاری رکھ سکے...''

جیسے جیسے وہ کہتی جارہی تھی احساس غرور اس کے سینے میں جاگتا جارہا تھا اور ایک ہیرو کے تصور کو اس کے ذہن میں ابھار رہا تھا جس کا مطالبہ تھا کہ اسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے۔اس تاریکی کے مقابے کے لئے جو اس نے اس دن دیکھی تھی، ایسی تاریکی جس کا بھیانک احساس اور جس کی شرمناک زیادتیاں اس کے ذہن کو اپنا شکار بنائے ہوئے تھیں، ضروری تھا کہ وہ کسی معقول اور روشن شئے کو اپنے سامنے لا کے کھڑا کرے۔غیر شعوری طور پر اپنی صحت مند روح کے مطالبات کے سامنے جھکتے ہوئے اس نے ان تمام چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیا جنہیں وہ پاکیزہ اور مقدس سمجھتی تھی اور پھر انہیں ایک عظیم الشان شعلے میں تبدیلی کر دیا جس کی روشنی نے خود اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی۔

''اس کے جیسے بہت سے آدمی ہیں اور دن بدن زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور اپنی آخر زندگی تک وہ آزادی اور سچائی کے لئے لڑتے رہیں گے...''

اس نے احتیاط ہی چھوڑ دیا اور اگر چہ اس نے کسی کا نام نہیں لیا لیکن اس پوشیدہ کام کے بارے میں جو حرص اور لالچ کی بیڑیوں سے عوام کو چھڑانے کے لئے کیا جارہا تھا، اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتی تھی۔جب اس نے ان لوگوں کا ذکر کیا جو اسے دل و جان سے عزیز تھے تو اس نے اپنے الفاظ میں اپنی اس محبت کی ساری توانائی اور شدت سموری جو زندگی کے گونا گوں مصائب کی وجہ سے عمر کے اس پختہ دور میں اس کے دل میں پھلی پھولی تھی۔اور اس نے خود بھی بہت مسرت کے ساتھ ان لوگوں کو جو اس کے ذہن کے پردے پر ابھر رہے تھے، اپنے احساس سے منور اور جاوداں ہوتے دیکھا۔

''اور اس طرح یہ کام ساری دنیا میں ہو رہا ہے، سارے شہروں میں، ہر جگہ جہاں کہیں بھی اچھے لوگ موجود ہیں، اس کی کوئی حد نہیں، اس کا کوئی حساب نہیں، کام بڑھتا ہی جاتا ہے اور بڑھتا ہی جائے گا یہاں تک کہ فتح کا وقت آپہونچے...''

اس کی آواز میں تسلسل تھا اور الفاظ کی تلاش میں اسے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا۔ الفاظ اس کی زبان سے رنگین موتیوں کی طرح ڈھلتے اور اس کی تمناؤں کی لڑی میں پروئے جارہے تھے تا کہ اسکے دل پر اس دن کے خون اور گرد کا شائبہ بھی نہ رہے۔وہ دیکھ رہی تھی کہ یہ کسان ان باتوں سے جو اس نے چھیڑی تھیں بے حد متاثر سے ہو گئے تھے۔وہ اس کے چہرے پر اپنی آنکھیں گاڑے خاموش بیٹھے تھے اور ماں اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت کے سامنے کے زیر و بم کو سن رہی تھی۔اور یہ سب کچھ اسکے اس

عقیدہ کو مضبوط کر رہا تھا جس کا اظہار وہ اپنے الفاظ میں اور ان لوگوں سے کئے ہوئے وعدوں میں کر رہی تھی...

''سارے لوگ جو مصیبت کی زندگی گزارتے ہیں، وہ سب جو ظلم اور ضرورت سے نڈھال ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان سب کو ان لوگوں کے ساتھ جا ملنا چاہئے جو جیلوں میں سڑتے اور عوام کی خاطر جان لیوا ظلم کے آگے اپنے کو قربان کر دیتے ہیں۔ اپنے بارے میں بغیر کچھ سوچے وہ سارے انسانوں کی مسرت اور خوشی کا راستہ ہمیں دکھا جاتے ہیں۔ بلا کسی مکر وفریب کے۔ وہ کہتے ہیں راستہ کٹھن ہے،۔ اور اس راستہ پر چل پڑنے کیلئے کسی پر جبر نہیں کرتے۔ لیکن ایک بار جب کوئی انسان ان کے ساتھ ہو جاتا ہے تو پھر کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اس لئے کہ وہ دیکھتا ہے کہ یہی ایک راستہ ہے، دوسرا کوئی نہیں...''

وہ خوش تھی کہ وہ ایک ایسا کام کر رہی ہے جسے وہ ایک عرصہ دراز سے کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود ہی لوگوں سے سچائی کے متعلق باتیں کر رہی تھی!

''سیدھے سادے آدمیوں کو ایسے لوگوں کے ساتھ ساتھ چل پڑنے میں پریشان نہ ہونا چاہئے۔ ایسے لوگ چھوٹے موٹے فایدوں سے مطمئن نہیں ہوا کرتے۔ وہ اس وقت تک نہیں رکتے جب تک کہ وہ ساری برائیوں، دھوکوں اور لالچ سے لوگوں کو نجات نہ دلا دیں۔ اس وقت تک اپنے ہاتھ باندھ لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے جب تک کہ سارے لوگ ایک نہ ہو جائیں اور ایک آواز سے نہ پکار اٹھیں۔ 'اب میں مالک ہوں اب میں خود ہی قوانین بناؤں گا جو سب کے لئے ایک سے ہوں گے،!''

ایک دم تھکن محسوس کر کے اس نے بات بند کر دی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسے پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ اس کے الفاظ ضائع نہیں گئے۔ کسان اس کی طرف امید اور آس سے دیکھتے رہے۔ پیتر نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور آنکھیں میچ لیں، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ استیپان نے اپنی ایک کہنی میز پر رکھی۔ اس کا سارا جسم آگے کو اس طرح جھکا ہوا تھا گویا اب بھی وہ باتیں سن رہا ہو۔ اس کا چہرہ سایہ میں تھا اور اسی وجہ سے اس وقت پہلے سے زیادہ مکمل معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی جو ماں سے لگی بیٹھی تھی، اپنی کہنیوں کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر فرش کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ایسا ہی ہے'' پیتر نے سانس روک کے کہا اور وہ آہستہ سے بنچ پر بیٹھ گیا۔

استیپان نے کمر سیدھی کی، اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح اٹھایا گویا کہ وہ

سب سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے۔

''اگر ایک بار اس کام میں پڑ گئے'' اس نے سوچ کر کہنا شروع کیا۔ ''تو اس کو پورے دل و جان سے کرنا پڑے گا۔''

''ہاں بے شک۔ پیچھے پلٹنے کی بات ہی نہیں!...'' پیتر نے سوچ میں پڑ کر کہا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ بات بڑے پیمانے پر شروع ہوگئی ہے'' استیپان نے بات جاری رکھی۔

''عالمگیر پیمانے پر!'' پیتر نے اضافہ کیا۔

18

ماں دیوار کے سہارے ٹک گئی، سر پیچھے کی طرف کر لیا اور ان کے ان دھیمے پرسکون الفاظ کو سننے لگی جو وہ چیزوں کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ تاتیانا نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر بیٹھ گئی۔ کسانوں کی طرف اس نے حقارت اور ناراضگی سے دیکھا تو اس کی سبزی مائل آنکھوں میں ایک سرد چمک پیدا ہوگئی تھی۔ دفعتاً وہ ماں سے مخاطب ہوئی۔

''تم نے زندگی میں بڑے دکھ اٹھائے ہوں گے'' اس نے کہا۔

''سو تو ہے'' ماں نے جواب دیا۔

''مجھے تمہاری باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ تمہارے الفاظ دل کے تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں۔ تمہاری باتیں سنتی ہوں تو سوچتی ہوں۔ خدایا جس قسم کے لوگوں کے بارے میں یہ باتیں کر رہی ہے ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے میں کیا کچھ نہیں کر سکتی! اور خود اس زندگی کی جھلک! یہاں کی زندگی میں کیا ہے؟ ہم کیا ہیں، بھیڑ بکریوں کا گلہ! میری ہی بات لو، مجھے لکھنا پڑھنا آتا ہے، کتابیں پڑھتی ہوں اور بے انتہا سوچتی ہوں۔ کبھی کبھی تو اتنا سوچتی ہوں کہ راتوں کو نیند نہیں آتی۔ لیکن اس سے فایدہ کیا؟ اگر سوچنا بند کر دوں تو بلا وجہ ختم ہو جاؤں گی اور اگر سوچتی رہوں تب بھی وہی ہوگا۔''

باتیں کرتے وقت اس کی آنکھوں میں استہزا تھا اور کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے لفظوں کو دھاگے کی طرح بٹ رہی ہے۔ کسان خاموش بیٹھے رہے۔ ہوا کھڑکیوں کے شیشوں پھوس کو اڑا رہی تھی۔ ایک کتا بھونکا۔ کبھی کبھی بارش کا ایک قطرہ کھڑکی سے آ کر ٹکرا جاتا تھا۔ چراغ کی لو کانپی اور تقریباً ختم ہوگئی

لیکن دوبارہ اور زیادہ تیزی اور استقامت سے جلنے لگی۔

''تمہاری باتیں سن کر میں سوچتی رہی۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے انسان پیدا ہوتا ہے! اور کتنی عجیب بات ہے کہ تمہاری باتیں سنیں تو ایسا لگا کہ مجھے یہ سب کچھ پہلے ہی سے معلوم ہے! لیکن میں نے آج تک ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں اور نہ میرے ذہن میں کبھی ایسے خیالات آئے تھے...''

''اب کچھ کھا پی کر چراغ گل کر دینا چاہئے، تاتیانا'' استیپان نے تیوری چڑھا کر آہستہ سے کہا۔ ''ممکن ہے لوگ سوچیں کہ آج رات کو چوماکوف کے گھر میں روشنی بہت دیر تک جلتی رہی۔ ہمارے لئے تو کوئی بات نہیں لیکن ہمارے مہمان کے لئے یہ اچھی بات نہیں...''

تاتیانا اٹھ کر چولھے کے پاس چلی گئی۔

''ہاں'' پیتر مسکرایا۔ ''آج کل بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے پڑوسی! یہ اخبار جس دن نظر آئیں گے اس دن...''

''میں اپنے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں۔ اگر مجھے گرفتار بھی کر لیا تو کون بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

اس کی بیوی نے میز کے پاس آ کر کہا:

''چلو، ہٹو یہاں سے۔''

وہ اٹھ کر ایک طرف کو ہو گیا اور اسے کھانا لگاتے دیکھتا رہا۔

''بھائی، ہماری تمہاری قیمت تو پانچ ٹکے ڈھیری ہے۔ اور وہ بھی جب ڈھیری میں کم سے کم سو ہوں'' اس نے طنز کے ساتھ مسکرا کر کہا۔

اس پر ماں کا دل دکھنے لگا۔ اسے دیکھ دیکھ کر ماں کو محبت آ رہی تھی۔ اپنی باتیں ختم کر چکنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس دن کی گندگیوں سے اس نے اپنے آپ کو پاک کر لیا ہے۔ وہ اپنے آپ سے خوش تھی اور ہر شخص کی طرف محبت سے دیکھ رہی تھی۔

''غلط خیال ہے تمہارا میرے دوست'' وہ بولی۔ ''اس قیمت کو مت تسلیم کرو جو تمہارا خون چوسنے والوں نے تمہاری مقرر کی ہے۔ تمہیں خود اپنی قیمت لگانا چاہئے۔ اصلی قیمت اس کی ہے جو تمہاری اندر ہے۔ اصلی قیمت وہ ہے جو تمہارے دوستوں کی لگائی ہوئی ہے، دشمنوں کی نہیں۔''

''ہمارے دوست ہی کون ہیں؟'' کسان نے آہستہ سے کہا۔ ''دوست۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے پر تو ہم ہمیشہ لڑتے رہتے ہیں۔''

''لیکن میں کہتی ہوں عام لوگوں کے دوست ہوتے ہیں۔''

''ممکن ہے لیکن یہاں نہیں ہیں'' استیپان نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر یہاں دوست پیدا کیوں نہیں کرتے؟''

استیپان نے جواب دینے سے پہلے ایک لمحے کے لئے کچھ غور کیا:

''ہونہہ، کرنا تو یہی چاہئے...''

''بیٹھو، کھانا تیار ہے'' تاتیانا نے سب کو بلایا۔

کھانا کھاتے وقت پیتر پھر رنگ میں آ گیا۔ ماں ن ے جو باتیں بتائی تھیں اس کا اس پر بہت اثر تھا۔

''ماں تو صبح سویرے ہی چلی جانا تا کہ کوئی دیکھ نہ سکے'' وہ بولا۔ ''اور بس سیدھی دوسرے اسٹیشن تک چلی جانا۔ قصبے کے اندر مت جانا۔ کرائے کی گھوڑا گاڑی اچھی رہے گی۔''

''کرائے کی گھوڑا گاڑی کیوں کریں۔ میں خود جا کر چھوڑ آؤں گا'' استیپان بولا۔

''نہیں، بالکل نہیں۔ اگر عہدداروں نے کچھ کہا تو کیا کرو گے۔ رات تمہارے یہاں بسر کی تھی؟، 'میں اسٹیشن تک چھوڑ آیا ہوں،' 'آہا! تو تم نے اسے بھاگ نکلنے میں مدد دی!، اور پھر سیدھے جیل چلے جاؤ گے۔ اتنی جلدی جیل جانے کا کوئی تک نہیں ہے۔ ہر چیز اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ وہ مثل ہے نا کہ زار بھی اس وقت مرتا ہے جب اس کی موت آتی ہے۔ لیکن اب کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ رات یہاں کہیں رہیں۔ صبح گاڑی کرائے پر لی اور چلی گئیں۔ رات کو بہت سے لوگ آتے ہیں کیونکہ ہمارا گاؤں بڑی سڑک پر ہے...''

''اتنا ڈر کہاں سے سیکھا ہے پیتر؟'' تاتیانا نے طنز سے پوچھا۔

''ہر چیز کرنے کا سلیقہ ہونا چاہئے پڑوسی'' پیتر نے گھٹنوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''کبھی ڈرنا پڑتا ہے اور کبھی بہادری دکھانی پڑتی ہے۔ یاد ہے اخبار کی وجہ سے وگانوف کی کیا بری حالت کر دی تھی؟ اب تو روپیہ کا لالچ دو تب بھی کتاب ہاتھ میں نہیں لے گا! لیکن مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہو ماں میں بڑا اچھا

ہو آدمی ہوں اور تمہارے پرچے اور اخبار ہر جگہ تقسیم کر دوں گا۔ جتنے چاہو اور جہاں چاہو۔ یہ صحیح ہے ہ ہمارے لوگ زیادہ تر ان پڑھ ہیں اور ڈرتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ یہ سبکچھ کئے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اور ان پرچوں میں بالکل سچی باتیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے: ذرا دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ دو اور دو کو ملا کر چار بنانا ہوتا ہے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے ان پڑھ لوگ پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ جلدی سمجھل یتے ہیں۔ خاص طور پر جب پڑھے لکھوں کے پیٹ بھی بھرے ہوں۔ میں ان علاقوں میں بہت پھرا ہوں۔ اور میں نے دیکھا بھی بہت کچھ ہے۔ ہم انتظام تو کر ہی لیں گے لیکن ذرا دماغ لڑانا اور بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ ورنہ شروع ہی میں پکڑے جائیں گے۔ عہدے داروں کو پتہ چل گیا ہے کہ کسان اب وہ پرانا کسان نہیں رہ گیا ہے۔ اب اس نے مسکرانا چھوڑ دیا ہے اور کسی قسم کی مروت بھی نہیں کرنا۔ یعنی عام طور پر ایسا لگتا ہے کہ عہدہ داروں سے ٹوٹ کر ادھر آ جائے گا۔ تھوڑے دن ہوئے اسمولیا کو وامیں۔ یہیں نزدیک ایک گاؤں ہے۔ ٹیکس جمع کرنے کے لئے عہدے دار آئے۔ کسان لاٹھیاں لے کر کھڑے ہو گئے! پولیس افسر نے بھی دوٹوک بات کر دی 'تو زار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہو، حرامزادو!، اس نے چلا کر کہا۔ ایک کسان تھا۔ نام تھا اسپی واکن۔ اس نے فوراً اٹھ کر جواب دیا 'تم بھی زار کے ساتھ جہنم واصل ہو جاؤ۔ یہ کیسا زار ہے کہ ہمارے بدن سے چیتھڑے بھی اتار لینا چاہتا ہے؟...، تو اب ایسی حالت ہو گئی ہے ماں! اسپی واکن کو ظاہر ہے پکڑ کر لے گئے اور اسے جیل میں ڈال دیا۔ لیکن اس کے الفاظ تو وہیں رہ گئے۔ بچوں تک کو یاد ہے اس نے کیا کہا تھا۔ اس کے الفاظ تو اب بھی زندہ ہیں اور فضا میں گونج رہے ہیں!''

اس نے کھایا کچھ بھی نہیں لیکن تیز سے دھیمے لہجے میں بولتا رہا۔ اپنی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا ماں سے کسانوں کی زندگی کے متعلق دل کھول کر باتیں کرتا رہا جیسے تھیلی میں سے تانبے کے سکے نکل نکل کر گر رہے ہوں۔

استیپان نے دوبارٹوک کر کہا:

''کچھ کھا بھی تو لو۔''

دونوں مرتبہ پیتر نے روٹی کا ٹکڑا اور چمچہ اٹھایا اور پھر اپنے قصے بیان کرنے لگا۔ وہ یہ سب کچھ اس آسانی سے سنا رہا تھا جیسے کوئل کوکتی ہے۔ کھانے کے بعد وہ دفعتاً کھڑا ہو گیا اور بولا:

''اچھا میرے جانے کا تو وقت ہو گیا! خدا حافظ ماں'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔' [ہوسکتا ہے

کہ ہم لوگ اب دوبارہ کبھی نہ مل سکیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم یہ سمجھ لو کہ میرے لئے یہ سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ تم سے ملنا اور تمہاری باتیں سننا! پرچوں وغیرہ کے علاوہ کچھ اور بھی ہے اس سوٹ کیس میں؟ اونی شال؟ بہت ٹھیک۔ اونی شال۔ یاد رکھنا استیپان! یہ ابھی ایک منٹ میں تمہارا سوٹ کیس لے آئے گا۔ چلو استیپان! خدا حافظ!...''

ہوا چھت پر سرسراتی چمنی میں شور پیدا کر رہی تھی اور کھڑکی پر بارش کے قطرے پڑ رہے تھے۔ آتش دان کے اوپر کی نشست پر سے کچھ اوڑھنے کی چیزیں اتار کر تاتیانا نے بنچ پر بچھا دیں اور ماں کے لئے بستر تیار کر دیا۔

''بڑا زندہ دل نوجوان ہے'' ماں نے کہا۔ دوسری عورت نے تیوری چڑھائی۔

''ہنگامہ بہت مچاتا ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔''

''تمہارا شوہر کس قسم کا آدمی ہے؟'' ماں نے دریافت کیا۔

''اچھا ہے کافی بھلا آدمی ہے۔ پیتا بالکل نہیں۔ ہم دونوں کافی خوش ہیں صرف یہ ہے کہ کردار کا کمزور ہے...''

پھر وہ سنبھل گئی۔

''اب کرنا کیا چاہئے؟'' کچھ دیر بعد وہ بولی۔ ''لوگوں کی بغاوت کا وقت نہیں آیا؟ ظاہر ہے بغاوت کر دینی چاہئے! ہر شخص یہی بات سوچ رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر شخص دل کی دل ہی میں رکھے ہوئے ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ لوگ ذرا اونچی آواز میں سوچیں۔ لیکن کسی کو پہلی کرنی ہوگی...''

بنچ پر بیٹھ کر اس نے دفعتاً سوال کیا:

''تم کہتی ہو کہ کھاتے پیتے لوگوں کی نوجوان لڑکیاں بھی اس کام میں شریک ہو رہی ہیں۔ مزدوروں سے ملتی ہیں اور انہیں پڑھاتی ہیں۔ بھلا یہ کام ہو سکتا ہے ان سے؟ ڈرتی نہیں ہیں؟''

ماں کا جواب غور سے سن کر اس نے گہرا سانس لیا پھر اس نے آنکھیں جھکا لیں اور سر نیچا کر کے اپنی بات جاری رکھی:

''ایک کتاب میں میں نے ایک جملہ لکھا دیکھا تھا۔ بے معنی زندگی۔ پہلی ہی نظر مین سمجھ گئی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ اس طرح کی زندگی سے میں خوب واقف ہوں! معنی تو ہوتے ہیں مگر بے ربط۔ جیسے گلے

بان کے بغیر بھیڑ بکریاں۔ جیسے انہیں کوئی ایک ساتھ جمع کرنے والا نہ ہو۔ اسی کو تو کہتے ہیں بے معنی زندگی۔ اگر ممکن ہوتا تو میں ایسی زندگی سے کہ ایک بار مڑ کر بھی نہ دیکھتی۔ جب حقیقت نظر آ جاتی ہے تو کس قدر نا قابل برداشت حالت ہو جاتی ہے!''

اس عورت کی سبزی مائل آنکھوں کی خشک سی چمک، اس کے پتلے سے چہرے اور اس کے لہجے میں جو تکلیف اور درد تھا ماں اسے سمجھ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے دلاسا دے، اس کا دل بڑھائے۔

''جو کچھ کرنا ہے اسے تو تم اچھا خاصا سمجھتی ہو، دوست...''

''لیکن یہ کافی نہیں۔ یہ بھی تو جاننا ضروری ہے کہ کیسے کیا جائے؟'' تاتیانا نے آہستہ سے بات کاٹی۔ ''تمہارا بستر تیار ہے۔''

وہ چولھے کے پاس جا کر کھڑی ہوئی سنجیدگی سے کچھ سوچتی رہی۔ ماں کپڑے تبدیل کئے بغیر لیٹ گئی۔ وہ تھک کر چور چور ہو چکی تھی اور آہستہ آہستہ کراہ رہی تھی۔ تاتیانا نے چراغ بجھا دیا اور جب جھونپڑی میں تاریکی چھا گئی تو اس نے آہستہ آہستہ باتیں کرنا شروع کیں۔ اس کی آواز سن کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ تاریکی کے سپاٹ چہرے سے کوئی چیز پونچھ رہی ہے۔

''اچھا تو تم دعا بھی نہیں پڑھتیں۔ میں بھی خدا کو نہیں مانتی اور نہ معجزوں کو۔''

ماں نے بے چینی سے بنچ پر پہلو بدلا۔ کھڑکی سے رات کی اتھاہ گہرائی اس کی طرف منہ کھولے جمائی لی رہی تھی۔ اور دھیمی دھیمی آوازیں تاریکی میں رینگ رہی تھیں۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں سرگوشی کی:

''جہاں تک خدا کا تعلق ہے۔ میں یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن میں یسوع مسیح کو مانتی ہوں...'' مجھے اس کے الفاظ پر اعتقاد ہے 'اپنے پڑوسی سے بھی اپنی ہی طرح محبت کرو'۔ اس پر تو مجھے اعتقاد ہے!...''

تاتیانا خاموش رہی۔ ماں کو اس کے سیدھے جسم کے خطوط جو چولھے کے تاریک پس منظر میں خاکستری معلوم ہو رہا تھا مبہم اور دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ وہ بالکل ساکن اور ساکت کھڑی تھی ماں کو اتنا دکھ ہوا کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

دفعتاً اس نے اس عورت کو سرد لہجے میں کہتے سنا:

''اپنے بچوں کی موت کے لئے میں خدا اور انسان کسی کو بھی معاف نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں!...''

پلاگیا چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اسے احساس تھا کہ جس نے یہ الفاظ ادا کئے ہیں اس کو کتنی تکلیف ہوگی۔

''تم ابھی نوجوان ہو ابھی تو اور بچے ہو سکتے ہیں'' اس نے نرمی سے کہا۔

عورت نو فوراً جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا:

''کبھی نہیں۔ مجھ میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اب میرے بچے نہیں ہو سکتے...''

فرش پر ایک چوہا دوڑ گیا۔ کوئی چیز زور سے ٹوٹی اور آواز کی ان دیکھی بجلی نے خاموشی کو چکنا چور کر دیا۔ چھت پر بارش کی آواز پھر آنے لگی۔ گھاس پھوس کی سرسراہٹ پھر سنائی دینے لگی جیسے کوئی اپنی باریک انگلیاں اس میں ڈرڈر کر پھیر رہا ہو۔ زمین پر پانی کے قطرے دھیرے دھیرے ٹپکتے، موسم خزان کی اس رات کے گزرنے کا اعلان کرتے رہے...''

ماں اونگھ گئی لیکن اسے پہلے باہر اور پھر ڈیوڑھی میں پیروں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ احتیاط سے کھولا گیا اور کسی نے کہا:

''سو گئیں تا تیانا؟''

''نہیں!''

''معلوم تو ہوتا ہے۔''

ایک روشنی چمکی، ایک لمحے کیل ئے لہرائی اور پھر تاریکی نے اس کا دم گھونٹ دیا۔ کسان نے ماں کے بستر کے نزدیک آ کر کوٹ کو ٹھیک سے اس کے پیروں پر ڈال دیا۔ اس کی اس سادگی آمیز توجہ نے ماں پر بہت اثر کیا اور اس نے مسکرا کر آنکھیں پھر بند کر لیں۔ استیپان نے خاموشی سے کپڑے بدلے اور تختوں پر چڑھ گیا۔ ہر شخص خاموش تھا۔

ماں خاموشی سے لیٹی خواب آمیز تاریکی کے سناٹے کی طرف غور سے کان لگائے رہی اور اس کی نظروں کے سامنے ریبن کا خون آلودہ چہرہ پھرنے لگا۔

تختوں پر کچھ آواز ہوئی:

''دیکھتے ہو کس قسم کے لوگ اس کام میں شامل ہو رہے ہیں؟ بوڑھے لوگ جنہوں نے عمر بھر محنت کی اور زندگی مین کیا کچھ مصیبت نہیں اٹھائی۔ اب تو ان کے آرام کا وقت تھا۔ لیکن تم خود ہی دیکھو کہ وہ آج کیا کر رہے ہیں۔ اور تم نوجوان ہو، صحت مند ہو... آہ استیپان...''

کسان نے بھرپور آواز میں جواب دیا:

''پہلے اس کے متعلق کافی غور کر لینا پڑے گا...''

''یہ تو میں پہلے بھی سن چکی ہوں...''

ایک منٹ کے لئے آوازیں بند ہو گئیں لیکن استیپان کی آواز پھر آئی:

''کام اس طرح شروع کرنا چاہئے۔ پہلے کسانوں سے الگ الگ بات کی جائے۔ مثلاً الکسی ماکوف۔ پڑھا لکھا جوشیلا آدمی ہے اور عہدے داروں سے کچھ خوش بھی نہیں۔ سرگر شورن بھی ہوشیار شخص ہے۔ کنیازیف ایماندار بھی ہے اور نڈر بھی۔ شروع میں تو یہی لوگ کافی ہیں۔ اس نے ہمیں جیسے لوگوں کے بارے میں بتایا ہے بس ہم اس قسم کے لوگوں سے رابطہ اور تعلق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میں کلہاڑی لے کر شہر چلا جاؤں گا جیسے لکڑی کاٹ کر کچھ اور پیسے کمانے کی فکر ہے۔ بڑی ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ ماں بالکل ٹھیک کہتی تھی کہ ہر شخص کو خود اپنی قیمت مقرر کرنی چاہئے آج والے کسان ہی کو لو۔ اگر خدا کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا جائے تب بھی وہ ہار نہیں مانے گا اور وہ نکیتا؟ اس نے ثابت کر دیا کہ اس کا ضمیر زندہ ہے۔ بھلا کسے یہ یقین ہو سکتا تھا!''

''تم لوگوں کی نظروں کے سامنے ایک شخص کو اس بری طرح مارا پیٹا گیا اور تم لوگ منہ پھاڑے دیکھتے رہے...''

''اتنی جزباتی مت بنو! یہی کیا کم ہے ہم ہی لوگوں نے اسے نہیں مارا پیٹا۔ اس شخص کو!''

بڑی دیر تک وہ سرگوشی کے انداز میں باتیں کرتا رہا کبھی آواز مدھم ہو جاتی کہ ماں کو ایک لفظ بھی سنائی نہ دیتا اور کبھی وہ پوری آواز سے بولنے لگتا۔ کئی دفعہ اس کی بیوی نے اسے خاموش کیا:

''ہش! اسے جگا نہ دینا!...''

ماں گہری نیند سو گئی جس نے اسے بادل کی طرح گھیر لیا تھا۔

تاتیانا نے اسے اٹھایا تو سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دھندلی دھندلی روشنی نظر آ رہی تھی اور کلیسا کا گھنٹہ رات کی پاسبانی کے خاتمے کا اعلان کر رہا تھا۔

''میں نے سماوار چڑھا دیا ہے۔ پہلے ایک گلاس چائے پی لو، بستر سے اٹھتے ہی چلی جاؤ گی تو سردی معلوم ہو گی۔''

استیپان نے اپنی الجھی ہوئی ڈاڑھی میں کنگھی کرتے ہوئے ماں سے شہر کا پتہ دریافت کیا۔ اسے

ایسا محسوس ہوا کہ رات ہی رات میں کسان کے چہرے میں بڑی اچھی تبدیلی آ گئی تھی۔ جیسے اب وہ زیادہ مکمل ہو گیا ہو۔

''یہ سب کچھ جس طرح ہوا وہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے نا!'' استیپان نے چائے پیتے وقت ہنس کے کہا۔

''کیا؟'' تاتیانا نے سوال کیا۔

''یہی ہم لوگوں کی ملاقات۔ اتنی آسانی سے...''

''ہمارے کام سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں میں بہت ہی حیرت ناک سادگی ہوتی ہے'' ماں نے سوچتے ہوئے کہا۔

ماں سے رخصت ہوتے وقت میزبان میاں بیوی دونوں بہت اداس تھے۔ وہ لوگ باتیں بہت کم کر رہے تھے مگر ہزار چھوٹے موٹے طریقوں سے کوشش کر رہے تھے کہ ماں کو آرام ملے۔

گھوڑا گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ماں نے سوچا کہ استیپان کام شروع تو بڑی احتیاط اور خاموشی سے کرے گا لیکن میں ہمیشہ لگا رہے گا۔ اور اس کی بیوی کی شکایتیں اس کے کان میں ہمیشہ گونجا کریں گے۔ بیوی کی سبز آنکھوں کی آگ ہمیشہ باقی رہے گی اور جب تک وہ زندہ رہے گی دل میں اپنی مرے ہوئے بچوں پر ایک ایسی ماں کی طرح دل دکھائے گی جس میں جاں سوز غم بھی ہو اور انتقامی جذبہ بھی۔

پھر اسے ریبن یاد آیا۔ اس کا خون، اس کا چہرہ، اس کی جلتی ہوئی آنکھیں اور اس کے الفاظ۔ اور خوفناک ظلم کے مقابلے میں بے بسی کے تکلیف دہ احساس سے اس کا دل بیٹھ سا گیا۔ ٹمیالے ٹمیالے سے دن کے پس منظر میں راستے بھر میخائلو کا چہرہ اس کی نظروں میں گھومتا رہا۔ اس کا مضبوط جسم، سیاہ ڈاڑھی سے بھرا ہوا چہرہ، پھٹی ہوئی قمیص، زخمی سر اور ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے۔ ایک ایسا شخص جس کے دل میں اس صداقت کے لئے بھرپور اعتقاد ہو جس کی وہ کالت کر رہا ہے۔ ماں نے ان لاتعداد دیہات کے متعلق سوچا جو زمین پر اس لاچارگی سے بکھرے پڑے تھے، اور اس نے ان لوگوں کے متعلق بھی سوچا جو دل میں انصاف کی آمد کا انتظام کر رہے تھے اور ان ہزارہا انسانوں کے متعلق بھی جنہوں نے اپنی ساری زندگی بے معنی محنت میں صرف کر دی اور نہ کبھی احتجاج کیا نہ کسی بہتر چیز کی امید کی۔

اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے زندگی ایک وسیع، بے جتی زمین ہے جو خاموشی لیکن بے چینی سے ہل

چلانے والے کا انتظار کر رہی ہے... ایسا محسوس ہوا کہ زمین آزاد ایماندار انسانوں سے کہہ رہی ہے:
ایسا محسوس ہوا کہ زمین آزاد ایماندار انسانوں سے کہہ رہی ہے: ''میرے سینے میں صداقت اور عقل کے بیج بو دو اور میں تمہاری محنت کا صلہ سوگنا دوں گی!''

جب اس نے سوچا کہ اس کی کوشش قدر کامیاب رہی تو دل خوشی سے مگن ہو گیا لیکن اس نے اس جذبے کو دبا دیا۔

گھر پہونچی تو دروازہ نکولائی نے کھولا۔ اس کا لباس بے ترتیب تھا اور ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

''اتنی جلدی؟'' وہ خوشی سے چلا پڑا۔ ''تم تو سچ مچ بہت جلدی آگئیں!''

عینک کے پیچھے سے اس کی محبت بھری آنکھیں چمکتی رہیں۔ ماں کو اس نے کوٹ وغیرہ اتارنے میں مدد دی اور پیار سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کل رات ہمارے گھر کی تلاش ہوئی تھی'' وہ بولا۔ ''اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم کو کچھ نہ ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے گرفتار نہیں کیا۔ اگر تم گرفتار ہو جاتیں تو یقیناً مجھے بھی پکڑ کے لے جاتے۔''

کھانے کے کمرے میں اسے لے جاتے ہوئے وہ اسی محویت کے انداز میں باتیں کرتا رہا:

''نوکری تو ظاہر ہے چلی جائے گی۔ لیکن اس کی مجھے زیادہ پرواہ نہیں ہے۔ میں تو اب اس بات تھک گیا ہوں کہ میز پر بیٹھے یہ گنتا رہوں کہ کتنے کسانوں کے پاس گھوڑے نہیں ہیں۔''

کمرہ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے کسی دیوھیکل شخص نے دفعتاً لالچ اور بغض سے مغلوب ہو کر مکان کی دیواروں کو اتنا ہلایا ہو کہ ایک ایک چیز درہم برہم ہو جائے۔ تصویریں فرش پر بکھری پڑی تھیں، دیواروں کے کاغذ جگہ جگہ سے پھاڑ دیئے گئے تھے اور ان کی دھجیاں اڑ رہی تھیں، ایک جگہ فرش کا ایک تختہ اکھاڑ دیا گیا تھا۔ ایک کھڑکی کی چوکھٹ کو اکھاڑ پھینکا گیا تھا اور چولہے کی راکھ فرش پر بکھری پڑی تھی۔ یہ جانی پہچانی حالت دیکھ کر ماں نے افسوس سے سر ہلایا اور نکولائی کی طرف غور سے دیکھا کیونکہ اسے اس میں کوئی نئی کیفیت آ رہی تھی۔

سرد سماوار اور جھوٹے برتن میز پر جمع تھے۔ پنیر اور مصالحے دار گوشت طشتریوں کے بجائے ان ہی کاغذوں میں رکھا ہوا تھا جن میں خریدا گیا تھا۔ دسترخوان پر کتابیں اور روٹی کے ٹکڑے اور سماوار سے نکلے ہوئے کوئلے کے چھوٹے چھوٹے ریزے بکھرے پڑے تھے۔ ماں ہنسی اور نکولائی بھی شرمندگی سے

مسکرایا۔

اس ہنگامے میں کچھ تو میرا کیا ہوا بھی ہے۔لیکن سب ٹھیک ہے نلوونا۔ میں نے سوچا وہ لوگ پھر آئیں گے اس لئے میں نے صفائی وغیرہ نہیں کی۔اچھا کچھ اپنے سفر کے متعلق بتاؤ؟''

اس سوال پر ماں کا دل پھر بیٹھ گیا۔ ریبن کا چہرہ ایک بار اس کی نظروں میں پھرنے لگا۔اور اس محسوس ہوا کہ نکولائی سے اس کے متعلق فوراً نہ کہہ کر اس نے غلطی کی تھی۔اس نے نکولائی کی طرف جھک کر اسے سارے واقعات سنانے شروع کئے۔کوشش کرتی رہی ہے کہ اپنے جذبات کو نمایاں نہ ہونے دے اور کوئی چیز چھوٹ بھی نہ جائے۔

''اسے گرفتار کرلیا...''

نکولائی کا چہرہ اتر گیا۔

''واقعی؟''

ماں نے اشارے سے اسے روکا اور اس طرح باتیں کرتی رہی جیسے مجسم انصاف کے سامنے کھڑی، ان اذیتوں کے خلاف احتجاج کررہی ہو جسے خود اس کی نظروں نے ایک انسان پر ہوتے دیکھا تھا۔نکولائی نے کرسی کی پشت سے ٹک کر سننا شروع کیا۔اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ آہستہ سے اس نے اپنی عینک اتار کر میز پر رکھ دی اور منہ پر ہاتھ پھیرا جیسے کسی نظر نہ آنے والے مکڑی کے جالے کو صاف کررہا ہو۔ایک دم اس کے چہرے کے نقش بہت تیز اور تیکھے ہو گئے، اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر گئیں اور اس کے نتھنے کانپنے لگے۔ ماں نے اسے پہلے کبھی اس کیفیت میں نہیں دیکھا۔اور اب وہ اس سے ڈرسی گئی۔

بات ختم ہوئی تو وہ اٹھ بیٹھا اور جیبوں میں اندر تک پورے ہاتھ گھسا کے فرش پر ٹہلنے لگا۔

''بڑا زبردست شخص ہوگا'' اس نے بھنچے ہوئے دانتوں کے ساتھ کہا۔''جیل میں رہنا اس کے لئے مشکل ہوگا۔اس کی قسم کے لوگ یہ سب حرکتیں مشکل سے برداشت کرپاتے ہیں۔''

اپنی اضطرابی کیفیت کو قابو میں لانے کے لئے وہ مٹھیوں پر زور ڈالتا رہا۔لیکن ماں کو اس کی ہیجانی حالت کا اندازہ تھا اور وہ خود بھی کم وبیش اس کیفیت میں مبتلا تھی۔نکولائی نے آنکھیں میچ لیں یہاں تک کہ چاقو کی نوک کی طرح نظر آنے لگیں۔ٹہلتے ہوئے اس نے ایک بار پھر غصے میں بولنا شروع کیا:

''ذرا اس وحشیانہ پن کو تو دیکھو! لوگوں پر اپنا تباہ کن تسلط قائم کر ھنے کے خبط مین مٹھی بھر بے ہودہ لوگ ہر شخص کو مارتے پیٹتے اور ہر شخص کا گلا دباتے پھرتے ہیں! درندگی میں اضافہ ہوتا ہے اور بے رحمی زندگی کا قانون بن جاتی ہے۔ ذرا سوچو تو! کچھ لوگ دوسرے لوگوں کو مارتے پیٹتے ہیں اور بالکل درندوں کا رویہ اختیار کرتے ہیں کیونکہ انہیں علم ہے کہ وہ قانون کی زد سے باہر ہیں۔ انہیں ایزا رسانی سے ایک شہوانی لطف ہوتے ہے جس کے تصور سے ان کی بوٹی بوٹی پھڑ کنے لگتی ہے۔ یہ غلاموں کا گھناؤنا مرض ہے جنہیں اپنے غلامانہ احساسات اور درندہ صفت عادتوں کو تسکین دینے کی پوی آزادی ہوتی ہے۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو انتقام کے مرض کا شکار ہیں۔ کچھ اور ہیں جن کی خوداتنی مرمت ہو چکی ہوتی ہے کہ گونگے، بہرے ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے دلوں کو داغ دار کیا جا رہا ہے۔ سارے لوگوں کو!''

رک کر وہ خاموش ہو گیا اور دانت پیسنے لگا پھر اس نے آہستہ سے کہا:

''اس درندہ صفت زندگی میں ہر شخص اپنی مرضی کے خلاف درندہ ہو جاتا ہے!''

لیکن اس نے پوری کوشش کر کے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور روتی ہوئی ماں کی طرف مڑا۔ اس وقت وہ تقریباً پرسکون ہو چکا تھا اور اس کی آنکھین ایک شعلہ مستحکم سے چمک رہی تھیں۔

''لیکن وقت برباد نہیں کرنا چاہئے نلووونا! ہم ذرا اپنے آپ کو سنبھال لیں تو بہتر ہے کامریڈ...''

ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ماں کے نزدیک جا کر اس کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھا:

''تمہارا سوٹ کیس کہاں ہے؟''

''باروچی خانے میں!''

''ہمارے دروازے پر خفیہ کے لوگ متعین ہیں۔ اتنا سامان باہر لے جائیں گے تو نظر ضرور پڑے گی اور یہاں چھپانے کی کوئی جگہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آج رات کو پھر تلاشی ہوگی۔ اس لئے دل چاہے جتنا دکھے مگر ساری چیزیں جلا دینی ہوں گی۔''

''کون سی چیزیں؟'' ماں نے سوال کیا۔

''وہی جو کچھ سوٹ کیس میں ہے۔''

ماں سمجھ گئی اور افسردگی کے باوجود اپنے کارنامے پر فخر کے احساس سے مسکرا اٹھی۔

''اس میں کچھ بھی نہیں ہے، ایک کاغذ کا پرزہ بھی نہیں!'' اس نے جواب دیا۔ چوماکوف خاندان

سے ملاقات کا ذکر کرتے کرتے اس کی طاقت رفتہ رفتہ واپس آتی گئی۔

شروع میں اس کی باتیں سنتے ہوئے نکولائی نے فکر مندی سے ماتھے پر بل ڈال لئے لیکن جلد ہی ماتھے کے بلوں کی جگہ حیرت نے لے لی یہاں تک کہ اس کی بات کاٹ کر کے وہ بے چینی سے بول پڑا:

''یہ تو کمال کر دیا! تم بہت ہی خوش قسمت ہو!''

اس کا ہاتھ تھام کر اس نے نرمی سے کہا:

''لوگوں میں تمہارا اعتقاد بڑے غضب کا ہے، بہت پر اثر...اور میں بالکل اپنی ماں کی طرف تم سے محبت کرتا ہوں۔''

اس کی طرف تعجب سے دیکھ کر وہ مسکراتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس شخص میں اتنی زندگی اور جوش کہاں سے آ گیا۔

''غرض کہ ہوا بہت ہی خوب'' اس نے ہاتھوں کو ملتے ہوئے آہستہ سے ہنس کر کہا۔''میرے پچھلے چند دن بہت اچھے گزرے۔ سارے وقت مزدوروں ہی میں رہا۔ انہیں پڑھ کر سناتا رہا، ان سے باتیں کرتا رہا، ان کی زندگی کا مطالعہ کرتا اور میرا دل ایک عجیب پاکیزہ اور روشن احساس سے لبریز ہو گیا ہے! اتنے اچھے لوگ ہیں وہ نلوونا کہ کیا بتاؤں! وہی نوجوان مزدور۔ کس قدر صحت منداور حساس۔ اور پھر ہر چیز معلوم کرنے کے لئے بیتاب! ان لوگوں کو دیکھنے کے بعد تو خیال ہوتا ہے کہ روس ایک دن دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری ملک ہوگا!''

وہ رکا اور اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا گویا کوئی عہد کر رہا ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا:

''لیکن کتابوں اور اعداد وشمار کو لئے بیٹھا بیٹھا تو میں خود زنگ آلودہ ہو گیا ہوں۔ تقریباً ایک سال سے ایسی زندگی گزار رہا ہوں۔ بالکل بے ہودہ! میں تو مزدوروں میں رہنے کا عادی ہوں اور جب وہاں سے ہٹ جاتا ہوں تو عجیب سا احساس ہوتا ہے۔ جیسے تھک گیا ہوں یا مجھ پر بوجھ لاد دیا گیا ہو۔ لیکن اب میں پھر آزاد انسان کی طرح رہوں گا۔ بس ان ہی لوگوں کے ساتھ رہوں گا اور ان ہی کے ساتھ کام کروں گا سمجھیں؟ اب میں نئے خیالات کے گہوارے کے پاس رہوں گا۔ پر شباب تخلیقی قوت کے ساتھ رہوں گا۔ کتنی حیرت ناک حد تک سادہ اور خوبصورت ہے یہ زندگی۔ اور اس سے کتنی امنگ بڑھتی ہے۔ انسان

سچ مچ جوان اور طاقتور ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی گزارنے کا بھرپور طریقہ ہے، نلوونا...''

وہ شگفتہ خاطری سے ہنسا لیکن اس میں کچھ جھینپ کی آمیزش بھی تھی اور ماں اس کی مسرت کو سمجھ گئی۔ اور اس کی خوشی میں شامل ہو گئی۔

''اور پھر۔ تم خود بھی کتنی اچھی ہو!'' نکولائی بولا۔ ''عوام کے متعلق تم کتنی وضاحت کے ساتھ بتاتی ہو اور ان کے کتنی اچھی طرح سمجھتی ہو!''

وہ ماں کے پاس بیٹھ گیا۔ پہلے اپنے ہنستے ہوئے چہرے کو اس نے ایک طرف موڑ لیا اور اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے بالوں کو تھپتھپاتا رہا لیکن جلد ہی وہ ماں کی طرف مخاطب ہو گیا کیونکہ وہ اپنے تجربوں کی سادہ اور واضح تصویر کھینچ رہی تھی۔

''بڑی خوش قسمتی سمجھو!'' وہ بولا۔ ''کافی امکان تھا کہ تمہیں بھی جیل میں ڈال دیا جاتا اور اس کے بجائے... ہاں نظر تو یہی آرہا ہے کہ کسان بھی اٹھنے لگے ہیں۔ بالکل لازمی بات ہے۔ وہ عورت۔ میری نظروں میں بہت واضح طریقے سے اس کی تصویر پھر گئی... دیہات میں کام کرنے کے لئے خاص آدمیوں کو بھیجنا ہوگا! لیکن لوگوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے! سینکڑوں کی ضرورت ہے!''

''کاش پاویل آزاد ہوتا اور آندری!'' ماں نے آہستہ سے کہا۔

اس نے ماں کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

''میں جو کچھ کہتا ہوں ممکن ہے وہ تمہیں اچھا نہ لگے نلوونا لیکن میں پاویل سے اچھی طرح واقف ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ جیل سے کبھی فرار نہ ہوگا۔ وہ چاہتا ہے کہ مقدمہ چلے۔ وہ تو ایسے موقع کی تلاش ہی میں ہے جب بھرپور انداز میں وہ اپنے جوہر دکھا سکے اور ایسے موقع کو کبھی ٹھکرائے گا نہیں۔ اور ٹکرائے بھی کیوں! سائبیریا پہونچ کر بھی بھاگ سکتا ہے۔''

ماں نے ٹھنڈا سانس لے کر آہستہ سے جواب دیا:

''ہاں۔ میرا خیال ہے وہ بہتر ہی سمجھتا ہے...''

''ہونہہ'' نکولائی نے عینک میں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کاش وہ تمہارا کسان ذرا جلدی کر کے ایک بار ادھر آجاتا۔ ریبن کے متعلق کسانوں کے لئے ایک پرچہ لکھنا ضروری ہے۔ جب وہ خود اتنی دلیری سے سب کچھ کہہ سکتا ہے تو اس کے متعلق لکھنے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوگا۔ میں آج ہی

لکھ دوں گا اور لدمیلا پلک جھپکاتے میں چھاپ دے گی...لیکن پرچے ان لوگوں تک پہونچیں گے کیسے؟''

''میں لے جاؤں گی...''

''نہیں،شکریہ!'' نکولائی نے فوراً کہا۔''میں سوچتا ہوں۔شاید وسوف شیکوف یہ کام کر سکے۔''

''میں اس سے بات کرلوں؟''

''ہاں کوشش کرواور ذرا سمجھا بھی دو کہ کیسے کرنا چاہئے۔''

''لیکن میں کیا کام کروں؟''

''فکر مت کرو،تمہارے لئے بھی کام مل جائے گا۔''

وہ لکھنے کے لئے بیٹھ گیا۔میز صاف کرتے وقت ماں نے اس کی طرف دیکھا۔وہ دیکھتی رہی کہ کاغذ پر سیاہ سیاہ حروف لکھتے وقت اس کی انگلیوں میں قلم کس طرح کانپ رہا تھا۔بعض وقت اس کی گردن کے پٹھے پھڑکنے لگتے اور جب وہ گردن پیچھے کر کے آنکھیں بند کر لیتا تو اس کی ٹھوڑی کانپنے لگتی۔اس بات نے ماں کو پریشان کر دیا۔

''تیار ہو گیا'' آخر اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔''یہ لو اس پرچے کو کہیں اپنے کپڑوں میں چھپالو۔لیکن اگر پولیس والے آئے تو تمہاری بھی تلاشی لیں گے۔''

''ان کی ایسی تیسی'' اس نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

اس شام کو ڈاکٹر ایوان دانیلووچ آ گیا۔

''یہ عہدے دار دفعتاً اتنے گھبرا کیوں گئے ہیں؟'' اس نے کمرے میں تیزی سے ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''کل رات سات گھروں کی تلاشی لے ڈالی۔میرا مریض کہاں ہے؟''

''کل چلا گیا'' نکولائی نے جواب دیا۔''آج سنیچر ہے اور وہ اپنے تعلیمی حلقے سے غیر حاضر نہیں ہونا چاہتا تھا۔''

''یہ تو بالکل حماقت ہے۔سر پھٹا ہوا ہے لیکن تعلیمی حلقہ میں بیٹھیں گے۔''

''میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی فایدہ نہیں ہوا....''

''شاید اپنے ساتھیوں کو دکھانا چاہتا تھا'' ماں نے کہا۔''یہ دیکھو۔میں نے بھی اپنا خون بہایا ہے...''

ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھا اور مذاقاً منہ بناتے ہوئے جھوٹی سختی سے بولا:

''ہش! تم بھی کتنی کٹھور دل ہو!''

''اچھا۔ ایوان یہاں زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے مہمان کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔ اب جاؤ! نلوونا وہ کاغذ انہیں دے دو۔''

''کوئی اور پرچہ!'' ڈاکٹر نے تعجب سے کہا۔

''یہ لو اسے چھاپے خانے میں دے دینا۔''

''لے لیا اور اسے دے بھی دوں گا۔ اور کوئی بات؟''

اور کچھ نہیں۔ دروازے پر ایک خفیہ کا آدمی کھڑا ہے۔''

''میں نے دیکھ لیا تھا، میرے دروازے پر بھی ایک ہے۔ اچھا خدا حافظ، خدا حافظ کٹھور دل محترمہ! ارے ہاں دوستو وہ قبرستان والی لڑائی کا نتیجہ اچھا ہی نکلا۔ سارے شہر مین اس کی گفتگو ہے۔ اس کے متعلق تمہارا پرچہ بھی بہت اچھا تھا اور بڑے وقت سے نکلا۔ میں تو ہمیشہ کہتا ہوں کہ اچھی لڑائی بری صلح سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔''

''اچھا، اب جاؤ۔''

''یہ کہاں کی مہمان نوازی ہے! اچھا اپنا ہاتھ بڑھاؤ نلوونا! اس لڑکے نے واقعی حماقت کی! کچھ معلوم ہے کہاں رہتا ہے؟''

نکولائی نے اسے پتہ بتایا۔

''کل دیکھنے جاؤں گا۔ اچھا لڑکا ہے کیوں ہے نا؟''

''بہت...''

''ذرا اس کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ بڑے اچھے دماغ کا لڑکا ہے'' ڈاکٹر نے جاتے ہوئے کہا۔ ''اسی قسم کے لوگ تو ہیں جنہیں پرولتاری دانشور بننا چاہئے۔ یہی لوگ اس وقت ہماری جگہ لیں گے جب ہم اس دنیا میں ہوں گے جہاں غالباً کوئی طبقاتی امتیازات نہیں ہیں...''

''تم ادھر کچھ عرصے سے بہت باتونی ہو گئے ہو ایوان۔''

''اس لئے کہ میں ذرا مست اور خوش ہوں۔ تو تم جیل جانے والے ہو؟ خوب آرام کرلو!''

''شکریہ۔ مجھے تھکن نہیں محسوس ہو رہی۔''

ماں نے ان دونوں کی باتیں سنیں تو اسے اچھا لگا کہ یہ لوگ مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے اس لڑکے کے متعلق اتنی ہمدردی اور محبت سے باتیں کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ماں اور نکولائی کھانے کے لئے بیٹھ گئے اور رات کے مہمانوں کے انتظار میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ نکولائی جلاوطن ساتھیوں اور ان لوگوں کے متعلق بات کرتا رہا جو بچ کر نکل بھاگے تھے اور نام بدل کر کام کر رہے تھے۔ ننگی دیواروں سے ٹکرا کر اس کے الفاظ اس طرح واپس آرہے تھے جیسے نئی زندگی کی تعمیر کے مقصد عظیم کے لئے اپنی جانوں کی قربانی دینے والے منکسر مزاج سورماؤں کی یہ داستانیں ناقابل یقین ہیں۔ ایک نرم و گرم سایے نے ماں کو اپنی آغوش محبت میں لے لیا اور ان انجانے لوگوں سے اس کے دل میں محبت کے سوتے پھوٹنے لگے۔ اس کے تصور میں یہ سب لوگ ایک عظیم نڈر فرد کی شکل میں تبدیل ہو گئے جو آہستہ مگر عزم کے ساتھ دھرتی پر قدم بڑھاتا، صدیوں پرانے جھوٹ کے جالوں کو صاف کرتا جارہا ہے تاکہ انسان زندگی کی واضح اور سادہ صداقت کو دیکھ سکے۔ اور یہ ایک نیا جنم لی ہوئی عظیم صداقت بلاتفریق تمام لوگوں کو اپنی طرف بلائے گی اور تمام لوگوں کو لالچ اور نفرت اور جھوٹ۔ وہ تین دیو جو لوگوں کو خوف زدہ کر کے غیر انسانی قوت کے ذریعے ساری دنیا کو غلام بنائے ہوئے ہیں۔ ان سے آزادی کا مژدہ سنائے گی۔ اس تصویر نے اس میں ویسا ہی جذبہ بیدار کیا جیسا وہ شکرا گذاری کے انداز میں مقدس تصویروں کے سامنے جھک کر اس وقت محسوس کرتی تھی جب وہ دن دوسرے دنوں کے مقابلے میں زیادہ آسانی کٹ جایا کرتا تھا۔ اب وہ ان دنوں کو بھول چکی تھی۔ لیکن انہوں نے جو احساسات پیدا کئے تھے وہ بڑھ کر زیادہ تابناک اور زیادہ مسرت انگیز ہو گئے تھے، اس کی روح کی اور زیادہ مسرت انگیز ہو گئے تھے، اس کی روح کی اور زیادہ عمیق گہرائیوں میں بس گئے تھے اور ایک شعلے کی طرح روشن تھے۔

''ایسا لگتا ہے کہ اب پولیس والے نہیں آئیں گے۔'' نکولائی نے دفعتاً کہا۔

''میں کہتی ہوں ان کو مارو گولی'' ماں نے اس کی طرف تیزی سے دیکھ کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔ لیکن اب تم ذرا جا کر سو رہو نلوونا۔ بہت تھک گئی ہو گی۔ اس سے تو انکار نہیں کہ غضب کی مضبوط کاٹھی پائی ہے تم نے! اس قدر خطرات اور اتنا ہیجان اور اضطراب اور تم اطمینان سے یہ سب برداشت کر لیتی ہو لیکن تمہارے بال بہت تیزی سے سفید ہو رہے ہیں۔ اچھا اب تم جا کر کچھ دیر آرام کر

لو۔''

کوئی زور زور سے باورچی خانے کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ ماں کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا بڑے صبر اور استقلال سے مسلسل کھٹکھٹا رہا تھا۔ ابھی کافی اندھیرا اور سناٹا تھا اور اس مسلسل کھٹکھٹاہٹ میں سے ایک عجیب سے خوف وخطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ ماں نے جلدی سے اپنے گرد کچھ لپیٹا اور باورچی خانے کی طرف لپکی۔

''کون ہے؟'' اس نے دروازے پر رک کر پوچھا۔

''میں'' ایک نا آشنا آواز سنائی دی۔

''کون؟'' ماں نے پھر پوچھا۔

''دروازہ کھولو'' آنے والے نے نیچی آواز میں التجا کی۔ ماں نے چٹخنی ہٹائی اور پاؤں سے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ ایگنات اندر آیا۔

''اوہ، تو میں نے غلطی نہیں کی'' وہ خوشی سے چلا اٹھا۔

وہ پاؤں سے کمر تک کیچڑ میں لت پت تھا۔ اس کا چہرہ راکھ کے رنگ کا ہو رہا تھا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور اس کے گھنگھریالے بال ٹوپی کے نیچے سے نکلے ہوئے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔

''بڑی مشکل میں پڑ گئے ہم لوگ'' اس نے دروازے کو مقفل کرتے آہستہ سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔''

ماں کی یہ بات سن کر لڑکے کو بڑی حیرت ہوئی۔

''تم کیسے جانتی ہو؟'' اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

ماں نے مختصر الفاظ میں اس کی وضاحت کی، پھر بولی:

تمہارے ان دونوں ساتھیوں کو بھی پکڑ لے گئے؟''

''نہیں۔ وہ اتفاق سے باہر تھے۔ ابھی بھرتی ہوئے ہیں، حاضری دینے گئے تھے۔ کل پانچ پکڑے گئے۔ ان ہی میں چچا میخائلو بھی ہیں۔''

اس نے ایک گہرا سانس لیا پھر مختصراً ہنستے ہوئے بولا:

''میں بچ گیا۔اب وہ لوگ مجھے کھوج رہے ہوں گے۔''

تم کس طرح بچ نکلے؟'' ماں نے پوچھا۔

اس وقت دوسرے کمرے کا دروازہ کسی قدر کھلا۔

''میں؟ میں کیسے بچ گیا؟'' ایگنات نے ایک بنچ پر بیٹھتے ہوئے چاروں طرف نظروں دوڑائی پھر اس طرح کہنا شروع کیا: ''ان کے آنے سے کوئی ایک دومنٹ پہلے محکمہ جنگلات کا چوکیدار دوڑا آیا اور کھڑکی کھٹکھٹائی 'ہوشیار رہنا دوستو، اس نے آواز دی' وہ تمہاری تلاس میں ہیں!...''

اتنا کہہ کر وہ پھر خاموشی سے ہنسا اور کوٹ سے چہرے کو پونچھا۔

''چچا میخائلو کسی طرح بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بولے 'ایگنات، تم شہر چلے جاؤ۔فوراً۔ وہ بوڑھی خاتون یاد ہیں نا؟، اس کے بعد ایک کاغذ کے پرزے پر چند سطریں گھسیٹیں اور مجھے دیتے ہوئے کہا 'یہ لو... یہ انہیں پہنچا دینا!، تو بس میں پھرتی سے جھاڑیوں میں جا چھپا اور دیکھتا کیا ہوں کہ وہ لوگ سچ مچ چلے آرہے ہیں۔ ایک دو تین۔ بہت سارے... ہر طرف رینگ رہے تھے کم بخت۔ جلدی سے انہوں نے ہمارے تارکول کے کارخانے کو گھیر لیا... میں جھاڑیوں میں دم سادھے بیٹھا رہا اور وہ میرے پاس سے گزر گئے...تب میں نے اٹھ کر جتنا تیز ممکن تھا بھاگنا شروع کیا اور پوری دو راتوں اور ایک دن سے بغیر دم لئے بھاگتا چلا آرہا ہوں۔''

وہ اپنے آپ سے بہت ہی مطمئن اور خوش نظر آرہا تھا۔اس کی گہری بادامی آنکھوں میں ایک ہلکی مسکراہٹ ناچ رہی تھی اور اس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹ مسلسل پھڑک رہے تھے۔

''ابھی تمہارے لئے چائے لاتی ہوں'' ماں نے سماوار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''یہ لو... یہ چٹھی'' اس نے درد سے کراہتے اور منہ بناتے ہوئے بڑی مشکل سے اپنا پاؤں اٹھا کر بنچ پر رکھا۔

اسی وقت نکولائی دروازے پر آیا۔

''آداب کامریڈ!'' اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔'' آؤ میں تمہاری مدد کروں'' اور وہ جھک کر اس کے پاؤں سے ان گندے کپڑوں کو کھولنے لگا جو موزوں کے بجائے لپیٹے گئے تھے۔

''نہیں !نہیں!'' لڑکے نے اپنا پاؤں گھسیٹ لیا اور تعجب سے ماں کی طرف دیکھا۔

''اس کے پیروں کی وودکا سے خوب مالش کرنی ہوگی'' ماں نے اس کی نگاہوں کو نظر انداز کر کے کہا۔

''بیشک'' نکولائی نے جواب دیا۔

ایگناٹ بری طرح گھبرا رہا تھا...

نکولائی نے چٹھی اٹھائی۔ مڑے تڑے بھورے کاغذ کو کھول کر پھیلا اور آنکھوں سے بالکل قریب لا کر پڑھنے لگا؛

''ماں! ہمارا کام نہ رکنے پائے، اسے نہ چھوڑنا، اور اس دراز قد شریف خاتون سے کہنا کہ ہمارے کام کے بارے میں اور زیادہ لکھنا نہ بھولیں۔ یہ میری التجا ہے۔ خدا حافظ۔ ریبن۔''

''غیر معمولی!'' نکولائی نے آہستہ سے کہا اور دھیمے سے اپنا وہ ہاتھ جس میں کاغذ کا پرزہ تھا نیچے چھوڑ دیا۔

ایگناٹ اپنے ننگے پاؤں کے گندے انگوٹھوں کو بڑی احتیاط سے حرکت دیتا ہوا ان دونوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اتنے میں ماں اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پانی کا ایک طشت اٹھالائی اور اس کے قریب جھک کر پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ارے نہیں'' وہ جیسے ڈر کر چلا اٹھا اور تیزی سے اپنا پاؤں بنچ کے نیچے گھسیٹ لیا۔

''پاؤں ادھر رکھو۔ جلدی۔ لاؤ'' ماں کہہ رہی تھی۔

''میں تھوڑی سی اسپرٹ لاتا ہوں'' نکولائی نے کہا۔

لڑکے نے اپنا پاؤں بنچ کے نیچے اور زیادہ اندر کو کھینچ لیا۔

''کیا سمجھتی ہو تم۔ کیا میں کسی شفاخانے میں ہوں؟'' وہ بڑبڑایا۔

ماں بغیر کچھ کہے خاموشی سے اس کے دوسرے پاؤں کی پٹیاں کھولنے لگی۔

ایگناٹ نے زور سے ناک سڑکی اور مسلسل گردن موڑ موڑ کر ماں کو دیکھتا رہا۔

''میخائلو ایوانووچ کو بہت مارا'' ماں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''سچ؟'' لڑکے نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں، جب اسے نکولس کوئے لائے تب ہی اس کی حالت خراب تھی اور وہاں پولیس سارجنٹ اور

پولیس افسر نے اسے پھر مارا۔ لاتیں، گھونسے۔ چہرے پر، یہاں وہاں۔ یہاں تک کہ وہ بیچارا لہولہان ہو گیا۔''

''اس کی تو خیر انہیں خوب مشق ہے۔'' لڑکے کی بھوویں چڑھ گئیں۔ اس کے شانے کانپ رہے تھے۔ ''مجھے ان سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ جیسے کوئی بھوتوں سے ڈرتا ہے۔ کیا کسانوں نے بھی مارا؟''

''پولیس افسر کے حکم دینے پر ایک کسان نے اس پر ہاتھ اٹھایا لیکن دوسروں نے کچھ نہیں کیا بلکہ اس کی طرف داری کی اور کہا کہ انہیں اسے مارنے کا کوئی حق نہیں...''

''ہونہہ! کسان بھی اب سمجھنے لگے ہیں کہ کون کس کی طرف ہے اور کیوں۔''

''ان کے درمیان بھی کچھ سمجھدار لوگ موجود ہیں...''

''سمجھدار لوگ تو ہر جگہ ہی ہیں۔ وہ تو ضرورت اور حاجت انہیں ایسا بنا دیتی ہے۔ سمجھدار لوگ ہیں تو سہی صرف یہ کہ انہیں پانا مشکل ہے۔''

نکولائی اسپرٹ کی ایک بوتل لے آیا، اس نے سماوار میں اور تھوڑا کوئلہ ڈالا اور بغیر کچھ کہے باہر چلا گیا ایگناٹ اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

''یہ کون صاحب ہیں، کوئی ڈاکٹر؟'' نکولائی کے چلے جانے پر اس نے ماں سے پوچھا۔

''ہمارے درمیان صاحب واحب کوئی نہیں۔ ہم سب ساتھی ہیں...''

''مجھے بڑی عجیب بات معلوم ہوت ہے'' ایگناٹ نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ سے شک اور الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کیا بات عجیب معلوم ہوتی ہے؟''

''عام طور پر سبھی کچھ۔ ایک طرف وہ ہیں۔ جو سر توڑتے ہیں، خون بہاتے ہیں اور دوسری طرف وہ ہیں جو پاؤں دھوتے ہیں۔ اور اس کے درمیان جانے کیا ہے؟

اسی وقت دروازہ کھلا اور نکولائی نے کہا:

''اس کے درمیان وہ لوگ ہیں جو تمہارا خون بہانے والوں کے تلوے سہلاتے ہیں اور ان کا خون چوستے ہیں جن پر ظلم ہوتا ہے، جن کا خون بہایا جاتا ہے۔' یہی کچھ ہے درمیان میں!

میں سمجھتا ہوں، تم بڑی حد تک ٹھیک کہتے ہو، ایگنات نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ پھر اٹھ کر

چند قدم چلا۔ ''یہ تو جیسے نئے پیر مل گئے۔ شکریہ'' وہ ماں کی طرف پیار بھری مشکور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

پھر وہ لوگ چائے پینے کے لئے کمرے میں چلے گئے اور ایگناٹ نے انہیں اپنی زندگی کی کہانی سنائی، اس کی آواز میں بڑی گہرائی اور تاثیر تھی۔

''میں اپنا اخبار بانٹا کرتا تھا۔ بڑا انتھک چلنے والا ہوں۔''

کیا قصبے کے بہت لوگ اخبار پڑھتے تھے؟'' نکولائی نے پوچھا۔

''ہاں، سب ہی پڑھے لکھے لوگ، خواہ امیر ہی کیوں نہ ہوں... البتہ جو دولتمند ہیں وہ ہم سے نہیں لیتے... وہ خوب جانتے ہیں کہ کسان زمینداروں کا خون بہا کر رہیں گے تاکہ اپنی زمینوں کو ان کے پنجے سے نکال سکیں اور ایک مرتبہ جو انہیں زمین مل گئی وہ اسے اس طرح تقسیم کریں گے کہ نہ زمیندار باقی رہے گا نہ بھاڑے کا ٹٹو۔ یہ بالکل صاف بات ہے۔ ورنہ پھر لڑائی کیوں مول لی جاتی؟''

وہ کچھ آزردہ سا معلوم ہوتا تھا اور نکولائی کو سوالیہ اور شکی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

نکولائی مسکرایا اور خاموش رہا۔

''اگر ہم سب لوگ اکٹھا ہو کر آج لڑیں اور فتح پائیں، لیکن کل پھر وہی امیر اور غریب کا فرق موجود ہو تو بھلا ایسی لڑائی سے کیا فائدہ ہے؟ نہیں شکریہ! تم ہمیں ایسا بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ دولت خشک ریت کی طرح ہے وہ کبھی ایک جگہ نہیں ٹھیرتی وہ اڑ اڑ کر ہر طرف پہنچتی رہتی ہے! ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔''

''خیر، اس پر اتنا گرم ہونے کی ضرورت نہیں'' ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

نکولائی کچھ سوچ رہا تھا۔ آخر اس نے متفکرانہ انداز میں کہا:

''مجھے فکر یہ ہے کہ ریبن کی گرفتاری کے بارے میں تمہارے ساتھیوں تک وہ پرچے کسی طرح جلد سے جلد پہنچائے جائیں۔''

ایگناٹ کے کان کھڑے ہو گئے۔

''تو کیا ایسا پرچے نکل چکے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں۔''

''تو لاؤ، مجھے دو، میں لے جاؤں گا'' لڑکے نے اپنے ہاتھ رگڑتے ہوئے سرگرمی سے کہا۔

ماں اس کی طرف دیکھے بغیر خاموشی سے ہنستے ہوئے بولی:

''لیکن تم تھکے ہوئے ہو اور ابھی تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں بڑا ڈر لگتا ہے۔''

ایگنات نے اپنے گھنگھریالے بالوں کو چوڑی ہتھیلی سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کاروباری انداز میں کہا:

''ڈر کے بات الگ ہے اور کام کی الگ۔ اس میں ہنسی کی کیا بات۔ تم بھی خوب ہو!''

ایگنات کی اس طفلانہ سادگی اور بیساختگی سے ماں کے دل میں ایک عجیب سی خوشی جاگ اٹھی۔ وہ اسے دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھی:

''نادان بچے!''

''ہونہہ۔ بچہ!'' ایگنات مسکرا کر بڑبڑایا۔

''تمہیں وہاں واپس نہ جانا چاہئے'' نکولائی نے خوش طبعی سے جلدی جلدی آنکھیں جھپکاتے ہوئے اس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں! پھر میں کہاں جاؤں؟'' ایگنات نے بے چینی سے پوچھا۔

''پرچے کوئی اور لے جائے گا، تم صرف اسے اچھی طرح سمجھا دینا کہ اسے کیا کرنا ہوگا اور کیسے! ٹھیک ہے نا؟''

''اچھی بات ہے'' ایگنات بادل ناخواستہ راضی ہو گیا لیکن اس کے لہجے میں ناامیدی تھی۔

''ہم تمہارے لئے نیا پاسپورٹ بنوا دیں گے اور تمہیں ایک محافظ جنگلات کا کام مل جائے گا۔''

''اور جو کسان ایندھن یا اور کچھ چرانے آئیں تو میں کیا کروں گا...انہیں پکڑوں اور باندھ کر رکھوں؟ نہیں بھئی یہ کام میرے بس کا نہیں...''

اس پر ماں اور نکولائی دونوں ہی ہنس پڑے...ایگنات کو یہ برا لگا اور وہ پھر کچھ بے چین سا ہو گیا۔

''اس کی فکر نہ کرو، تمہیں کسی کسان کو باندھنا پکڑنا نہیں پڑے گا'' نکولائی نے اسے دلاسا دیا۔ ''میں تمہیں اس کا یقین دلاتا ہوں۔''

''تب تو ٹھیک ہے'' ایگنات خوشی سے مسکرایا۔ ''لیکن کسی کارخانے میں کام مل جائے تو میں اسے زیادہ پسند کروں گا۔ لوگ کہتے ہیں کارخانے والے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار اور مستعد ہوتے

ہیں...''

ماں میز سے اٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''زندگی بھی کتنی عجیب ہے!'' وہ کچھ سوچ کر بولی۔''یہاں خوشی اور غم کیسے ملے جلے ہیں...اچھا ایگناٹ چائے پی چکے۔اب اٹھو کچھ دیر سولو۔''

''مجھے نیند نہیں آ رہی...''

''نہیں۔بس اٹھو اور سو جاؤ۔''

''ماں تم بہت سخت ہو۔اچھا لو ابھی جاتا ہوں۔چائے کا شکریہ...اور تمہاری مہربانی کا...''

ماں کے بستر پر چڑھتے ہوئے وہ بڑبڑا رہا تھا:

''اب ان ساری چیزوں میں تارکول بس جائے گا۔بھلا سونا ایسا کیا ضروری ہے۔مجھے تو بالکل نیند نہیں آ رہی ہے۔درمیان والے لوگوں کی بات کیا جلدی سے بولا...عجیب وغریب لوگ...''

اور دوسرے ہی لمحے وہ سو گیا اور زور زور سے خراٹے لینے لگا۔اس کا منہ آدھا کھلا تھا اور بھویں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔

21

اس شام وہ ایک تہہ خانے کے چھوٹے کمرے میں وسوف شیکوف کے سامنے بیٹھا لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا:

''درمیانی دریچہ پر چار مرتبہ...''

''چار مرتبہ؟'' نکولائی نے بے صبری سے پوچھا۔

''ہاں... پہلے تین۔اس طرح'' اس نے میز پر ہاتھ سے کھٹ کھٹ کر کے بتایا۔''ایک۔دو۔تین...پھر ایک لمحے کا وقفہ اور پھر ایک اور۔''

''ٹھیک ہے، سمجھ گیا۔''

''ایک سرخ بالوں والا کسان دروازہ کھولے گا اور پوچھے گا 'تم دائی کے لئے آئے ہو'۔تو تم کہنا 'ہاں کارخانے کے مالک کی بیوی کے واسطے...بس اتنا کافی ہے۔وہ سمجھ جائے گا۔''

وہ دونوں مضبوط توانا نوجوان سر جوڑے نیچی آواز میں باتیں کر رہے تھے اور ماں دونوں ہاتھ باندھے چپ چاپ کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے ان تمام پراسرار اشاروں اور شناختی الفاظ میں ایک عجیب لطف آ رہا تھا۔

''یہ تو ابھی تقریباً بچے ہی ہیں۔'' اس نے سوچا۔

ایک دیواری چراغ نے زمین پر پڑے ہوئے فولادی چادر کے ٹکڑوں اور ٹوٹی پھوٹی گاگروں کو روشن کر دیا تھا۔ کمرہ زنگ اور روغن اور سیلن کی بو سے بسا ہوا تھا۔

ایگناٹ کسی بالوں دار کپڑے کا بنا ہوا بھاری کوٹ پہنے ہوئے تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ اسے بہت پسند کرتا ہے۔ ماں نے اسے بڑے پیار سے کوٹ کی آستین کو تھپکنے اور گردن موڑ موڑ کر شانوں کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''بالکل بچے ہیں'' اس نے سوچا۔ ''اچھے اور مبارک...''

''بس اتنا ہی کہنا تھا'' ایگناٹ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے موراتوف کے پاس جانا اور دادا سے ملنے کی خواہش ظاہر کرنا مت بھولنا۔''

''نہیں بھولوں گا'' وسوف شیکوف نے جواب دیا۔

لیکن ایگناٹ کو اب بھی پورا اطمینان نہیں ہوا تھا اور جانے سے پہلے اس نے ایک بار پھر ان تمام ہدایتوں، اشاروں اور الفاظ کو اس کے سامنے دھرایا...

''اچھا اب رخصت'' آخر کار اس نے خدا حافظ کہا۔ ''انہیں میرا اسلام پہونچا دینا۔ تم خود ہی دیکھ لو گے کہ وہ کتنے اچھے لوگ ہیں۔''

پھر اس نے اپنے آپ پر ایک مطمئن نظر ڈالی اور کوٹ کی آستین کو تھپتپاتے ہوئے ماں سے مخاطب ہوا:

''تو اب مجھے چلنا چاہئے۔''

''راستہ تو نہ بھٹک جاؤ گے؟''

''ہاں! تم فکر نہ کرو، میں راستہ پا لوں گا'' سیدھے شانے، ابھری ہوئی چھاتی، سر پر نئی ٹوپی ترچھی رکھی اور ہاتھ جیبوں میں ڈالے وہ کتنا نڈر اور بیباک دکھائی دے رہا تھا اور اس کے خوبصورت گھنگھریالے

بالوں کے لچھے کنپٹیوں پر ہلتے ہوئے کتنے بھلے لگ رہے تھے۔

''اچھا ساتھیو خدا حافظ!'' بالاخر یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

''آخر کار...اب مجھے ایک کام ملا ہے'' وسوف شیکوف نے آہستہ سے ماں کے قریب آتے ہوئے کہا۔''میں سچ مچ بیزار ہو چلا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ آخر میں جیل سے کیوں بھاگا...کوئی کام نہیں بس رات دن چھپے بیٹھے رہو۔ وہاں ہوتا تو کچھ سیکھ ہی لیتا۔ پاویل نے ہمیں جس طرح اپنے دماغ سے کام لینا سکھایا، واقعی اس کا جواب نہیں۔ ہاں نلوونا! ان کے فرار ہونے کے بارے میں کیا طے پایا؟''

''مجھے کچھ پتہ نہیں'' ماں نے ٹھنڈا سانس لیا۔

نکولائی نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھا اور چہرہ اس کے اور قریب لاتے ہوئے بولا:

''تم انہیں سمجھاؤ۔ وہ تمہاری بات ضرور مان لیں گے۔ یہ کچھ بھی تو مشکل نہیں۔ تم خود دیکھو... یہ جیل کی دیوار ہے اور اسی سے بالکل متصل یہ روشنی کا کھمبا اور وہاں مقابل میں ایک خالی قطعہ زمین۔ بائیں طرف قبرستان اور دائیں جانب گلیاں اور عمارتیں... ہر روز ایک چراغ جلانے والا لیمپ صاف کرنے آتا ہے تو بس سمجھو اس نے ایک سیڑھی دیوار سے لگائی اس پر چڑھا اور ایک رسی کی سیڑھی دیوار کی اوپری اینٹوں میں سے ایک سے باندھ کر جیل کے صحن میں چھوڑ دی اور معاملہ ختم...جیل کے اندر انہیں پہلے ہی سے پتہ ہوگا کہ یہ سب کب ہونے والا ہے۔ وہ ادھر عادی مجرموں سے بات چیت کر کے انہیں اس پر اکسائیں کہ کچھ گڑ بڑ مچائیں یا نہیں تو خود کچھ ایسا ہنگامہ کھڑا کریں کہ سنتریوں کی توجہ تھوڑی دیر کے لئے بٹ جائے۔ اس اثناء میں وہ لوگ سیڑھی پر چڑھ کر رفو چکر ہو جائیں۔ ایک۔ دو۔ تین۔ آنکھ جھپکی اور میدان صاف۔ دیکھا تم نے کتنی آسان بات ہے!''

اس کی نظر میں یہ اتنی ہی سیدھی سادی معمولی سی بات تھی جیسے کہ کوئی دروازہ کھول کر نکل جائے اور اس کی کامیابی پر اسے پورا اعتماد تھا...

ماں نے ہمیشہ نکولائی کو بالکل اجڈ اور اناڑی سمجھا تھا۔ پہلے وہ ہر چیز کو بڑی بدمزاجی، نفرت اور شک وشبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن اس وقت جیسے وہ از سر نو جی اٹھا تھا۔ اس کے اندر کسی نے نئی زندگی پھونک دی تھی اور اس کی باتوں نے ماں کے افسردہ دل میں بھی ایک نئی گرمی اور حرارت پیدا کر دی، اس کے اندر جیسے کئی چراغ جل اٹھے۔

''اور ذرا سوچو تو سہی'' وہ پھر کہہ رہا تھا۔ ''یہ سب کچھ دن کے وقت ہوگا سورج کی چمکتی روشنی میں۔ تو کسی کو دور دور بھی یہ خیال نہں ہوسکتا کہ کوئی قیدی دن کے وقت فرار ہونے کی کوشش کرسکتا ہے۔ اس وقت جب کہ جیل میں ہر طرف چہل پہل ہے، سارے قیدی بیدار ہیں؟...''

''اور جوان لوگوں نے گولی چلا دی؟'' ماں نے ڈر اور خوشی کے ملے جلے جذبے سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''کون گولی چلائے گا؟ وہاں کون سپاہی بیٹھا ہے... پہرہ دار! وہ اپنے ریوالور صرف کیلیں ٹھونکنے کے لئے استعمال کرتے ہیں...''

''بہ ظاہر تو یہ بہت آسان معلوم ہوتا ہے مگر...''

''مگر وگر... کچھ نہیں۔ تم دیکھنا... بس وہ آمادہ ہوجائیں... باقی سب میرے پاس تیار ہے۔ رسی کی سیڑھی، ہک، آنکڑا اور یہ جو ہمارا مکان دار ہے وہ ہمارا چراغ جلانے والا ہوگا۔''

دروازے کی دوسری طرف سے کسی کے کھانسنے اور کچھ الٹ پلٹ کرنے اور کچھ ٹین کھڑکنے کی آواز سنائی دی۔

''یہ وہی ہے'' نکولائی نے کہا۔

اسی وقت ایک بڑا سا ٹین کا ٹب دروازے پر نمودار ہوا اور ایک بیٹھی ہوئی آواز بڑبڑاتی سنائی دی:

''چل بھی... اندر گھس، کم بخت!...'' اور ٹب کے اوپر ایک خوش مزاج سے چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں، بھورے بال اور مونچھیں...''

نکولائی نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹب اندر لانے میں اس کی مدد کی۔ ایک دراز قامت، خمیدہ آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے بغیر ڈاڑھی کے کلے پھلائے دھونکنی کی طرح کھانستا رہا پھر زور سے زمین پر تھوک کر مہمانوں کو سلام کیا۔

''کیسے مزاج ہیں؟'' اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

''لو۔ تم خود ان سے ہی پوچھ لو'' نکولائی بے اختیار بول اٹھا۔

''مجھ سے پوچھ لو۔ آخر کیا؟''

''وہی، اس فرار کے بارے میں...''

''ہاں!''، قلعی گر نے اپنی داغدار انگلیوں سے مونچھیں پونچھیں۔

''یاکوف وسیلیوچ! انہیں یقین ہی نہیں آتا کہ کتنا آسان کام ہے۔''

''یقین نہیں آتا؟ اس کا مطلب ہے کہ یہ چاہتی ہی نہیں کہ ایسا ہو۔ لیکن میں اور تم چاہتے ہیں اس لئے ہم یقین رکھتے ہیں''، قلعی گر نے بڑے ٹھنڈے دل سے کہا۔ دفعتاً اسے پھر کھانسی اٹھی اور وہ تقریباً دوھرا ہو گیا۔ اور جب کھانسی رکی تو وہ بڑی دیر تک کھڑا اپنا سینہ سہلاتا اور ماں کو ابلی ہوئی آنکھوں سے بغور دیکھتا رہا۔

''پاویل اور اس کے ساتھی ہی تصفیہ کریں گے'' ماں نے کہا۔

نکولائی نے سر جھکا لیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

''یہ پاویل کون ہے؟''، قلعی گر نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا لڑکا ہے۔''

''پورا نام؟''

پاویل ولاسوف۔''

اس نے سر ہلایا اور تمباکو کی تھیلی نکال کر پائپ بھرتے ہوئے بولا:

''نام سنا ہے۔ میرا بھتیجا اسے جانتا ہے۔ وہ بھی جیل میں ہے۔ اس کا نام یاوچینکو ہے، سنا؟ اور میرا نام گابون ہے۔ جلدی ہی سارے نوجوانوں کو سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیں گے۔ ہم بوڑھوں کے لئے زیادہ جگہ نکل آئے گی! ایک پولیس افسر کہتا تھا کہ میرے بھتیجے کو سائبیریا بھیج دیں گے۔ ذلیل سور! جو نہ کریں تھوڑا ہے۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے بار بار فرش پر تھوک رہا تھا۔ اب وہ نکولائی کی طرف مڑا اور پائپ کے کچھ کش کر اپنی اکھڑی سی آواز میں بولا:

''تو یہ نہیں چاہتی ہیں؟ خیر یہ جانیں اور ان کا کام! ایک آزاد شخص۔ بیٹھے بیٹھے تھک جائے تو چلنا شروع کر سکتا ہے اور چلتے چلتے تھک جائے تو بیٹھ سکتا ہے... اگر تمہیں لوٹیں تو آنکھیں بند کر لو، ماریں پیٹیں تو فریاد نہ کرو اور اگر مار بھی ڈالیں تب بھی کچھ نہیں۔ یہ ہر شخص جانتا ہے۔ لیکن میں اپنے بھتیجے کو تو بہر حال لاؤں گا۔ میں اسے ضرور نکال لاؤں گا!''

وہ جس طرح اپنے کھردرے ٹوٹے پھوٹے جملوں کو ادا کر رہا تھا اس نے ماں کو حیرت میں ڈال دیا لیکن جس انداز سے اس نے آخری الفاظ کہے تھے اس پر اسے واقعی بڑا رشک آ رہا تھا۔

اور جب وہ ٹھنڈی ہوا اور بارش میں باہر گلی میں چلی جا رہی تھی تو نکولائی کے بارے میں سوچ رہی تھی:

''دیکھو تو سہی۔ کیسا بدل گیا ہے!''

پھر اسے گوبن کا خیال آیا۔ اور وہ تقریباً دعائیہ انداز میں دھیرے دھیرے کہنے لگی ''میں ہی اکیلی نہیں ہوں جس نے زندگی کو ایک نئی گرفت میں لیا ہے۔''

اور یکا یک اس کے دل میں اپنے لڑکے کی کتنی ہی یادیں جاگ اٹھیں اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی ''کاش وہ راضی ہوتا۔ صرف اپنی رضامندی کا اظہار کر دیتا!''

22

اگلے اتوار کو جب وہ جیل کے آفس میں پاویل سے رخصت ہو رہی تھی تو اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے نامعلوم طور پر کاغذ کی ایک چھوٹی سی گولی اس کی مٹھی میں پکڑا دی۔ ماں نے اس کا لمس محسوس کیا اور ایسے چونک پڑی جیسے کسی نے اس کا ہاتھ جھلس دیا ہو۔ پاویل کی طرف سوالیہ کی نیلی آنکھوں میں وہی ہمیشہ جیسی ایک پرسکون دلیر مسکراہٹ جھانک رہی تھی۔

''خدا حافظ'' اس نے ٹھنڈا سانس لیا۔

پاویل نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

''خدا حافظ ماں'' اس نے نرم لہجے میں کہا اور ماں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ ایک بڑی پیار بھری روشنی سے دمک رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے رہی جیسے کسی اور چیز کی منتظر ہو۔

''پریشان نہ ہو ماں! اور مجھ پر ناراض نہ ہونا'' پاویل نے بہت دھیرے سے کہا۔

''ہائے میرے اللہ'' وہ سر جھکائے بڑبڑائی۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

اور اس پر دوسری نظر ڈالے بغیر تیزی سے باہر نکل گئی کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسوؤں اور ہونٹوں کی بیتاب کپکپی کو نہ دیکھ لے۔

تمام راستہ اسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے اس کا وہ ہاتھ جس میں پاویل نے کاغذ کا پرزہ تھما دیا تھا درد سے ٹوٹا جا رہا ہو اور پورا بازو بوجھ سے ایسا لٹک سا گیا ہے جیسے کسی نے شانے پر زور سے ضرب لگائی ہو۔

گھر پہونچتے ہی اس نے کاغذ نکولائی کے ہاتھ میں دے دیا اور جتنی دیر وہ اسے کھول کر صاف کرتا اور پھیلاتا رہا بڑی بے چینی کے ساتھ دل میں امید کی لو جلائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی لیکن نکولائی نے اس کی امید پوری نہیں کی۔ ایک لمحے کے لئے امید کی جو لو اس کے سینے میں بھڑکی تھی وہ پھر بجھ گئی۔

''وہ لکھتا ہے'' نکولائی نے کاغذ کا آنکھوں سے قریب رکھ کر پڑھنا شروع کیا:

''ساتھیو! ہم ہرگز بھاگنے بھاگنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے کوئی ساتھ ایسا نہیں کر سکتا اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم اپنا وقار بیٹھیں گے۔ لیکن اس کسان کی مدد کرنے کی کوشش کرو جو ابھی حال ہی میں گرفتار ہوا ہے۔ اسے تمہاری توجہہ کی ضرورت ہے۔ تم اس کے لئے جو کچھ بھی کرو وہ اس کا مستحق ہے۔ وہ یہاں بڑی آفت میں مبتلا ہے۔ ہر روز کسی نہ کسی افسر سے جھگڑا کر بیٹھتا ہے چنانچہ اس وقت تک چوبیس گھنٹے تہ خانے میں گزار چکا ہے۔ اسے اذیتیں دے دے کر جان سے مار ڈالیں گے۔ ہم سب اس کے لئے اپیل کرتے ہیں۔ میری ماں کو دلاسا دینا انہیں سب کچھ بتا دو وہ سمجھ جائیں گی۔''

ماں نے سر اٹھایا اور خاموش کانپتی ہوئی آواز میں بولی:

''بتانا کیا ہے؟ میں سمجھتی ہوں۔''

نکولائی نے جلدی سے ایک طرف مڑ کر رومال نکالا اور ناک صاف کی۔

''یہ کمبخت نزلہ...'' وہ بڑبڑایا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے عینک کو ٹھیک کیا اور بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے بولا:

''ٹھیک ہے۔ مقدمہ ہی چلنے دو'' ماں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا اور اس کے دل پر غم کی گہری دھند چھا گئی۔

''یہ دیکھو ابھی سینٹ پیٹرز برگ کے ایک ساتھی کے پاس سے یہ خط آیا ہے...''

''وہ سائبیریا سے بھی تو فرار ہو سکتا ہے۔ کیوں ہے نا؟''

''بیشک کیوں نہیں ۔ یہ ساتھی لکھتا ہے کہ مقدمہ بہت جلد چلایا جانے والا ہے لیکن سزا پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ سب کے لئے جلاوطنی ۔ یہ ڈاکو! بدمعاش! انہوں نے عدالتوں کو بھی ایک ذلیل مذاق بنا رکھا ہے۔ سوچو تو سہی ابھی مقدمہ شروع نہیں ہوا اور سینٹ پیٹرز برگ میں فیصلہ ہو گیا!...''

''پریشان نہ ہو۔ نکولائی ایوانووچ!'' ماں نے بڑے استقلال سے کہا۔ ''مجھے دلاسا دینے کی یا سمجھانے کی ضرورت نہیں پاویل جو کرے گا ٹھیک ہی کرے گا۔ وہ اپنے کو اور اپنے ساتھیوں کو کسی غیر ضروری آفت میں نہیں ڈالے گا۔ وہ مجھے چاہتا ہے، مجھ سے بہت پیار کرتا ہے، تم خود دیکھو نا اسے میرا کتنا خیال ہے۔ کہتا ہے کہ اسے سمجھاؤ، اسے دلاسا دو!''

شدت جذبات سے اس کا سر گھوم گیا اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

''تمہارا بیٹا بڑا باوقار آدمی ہے!'' نکولائی ایک غیر فطری حد تک اونچی آواز میں بول اٹھا۔ ''میں اس کی بے انتہا عزت کرتا ہوں!''

''ریبن کو مدد پہنچانے کی کوئی تدبیر سوچنی چاہئے'' ماں نے اپنے کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت اس کے اندر جو طوفان اٹھ رہا تھا وہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ چاہتا تھا۔ وہ اس وقت کچھ کرنا چاہتی تھی، کہیں دور، بہت دور جانا چاہتی تھی۔ ایسی کہ چلی ہی چلی جائے یہاں تک کہ تھکن سے چور چور ہو کر گر پڑے۔

''بیشک'' نکولائی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''کاش اس وقت ساشا یہاں ہوتی...''

''وہ آئے گی۔ میں جس دن پاویل سے ملتی ہوں وہ ضرور آتی ہے۔''

نکولائی ماں کے قریب تخت پر بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر تک سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوبا ہونٹ چباتا اور ڈاڑھی کو مڑوڑتا رہا۔

''یہ بہت برا ہوا کہ میری بہن اس وقت یہاں نہیں'' تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔

''کتنا اچھا ہو جو ہم پاویل کے یہاں رہنے تک کچھ کر سکیں۔ اسے کتنی خوشی ہو گی'' ماں کہہ رہی تھی۔

پھر دونوں دیر تک چپ بیٹھے رہے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کیوں نہیں چاہتا؟'' ماں نہ چاہتے ہوئے بھی وہی سوچے جا رہ

تھی۔

نکولائی یکا یک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔اسی وقت گھنٹی بجی، دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''غالباً ساشا ہے'' نکولائی نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں۔اس کے لئے میرا دل بہت کڑھتا ہے۔بچاری!''

گھنٹی پھر بجی۔لیکن اس دفعہ آواز زیادہ استوار نہیں تھی۔ایسا لگتا تھا جیسے آنے والا کچھ مذبذب سا ہو۔نکولائی اور ماں دونوں ہی دروازے کی طرف لپکے لیکن باورچی خانے میں پہنچ کر نکولائی ایک طرف کھڑا ہو گیا:

''بہت ہے کہ تم اکیلی ہی جاؤ'' اس نے ماں سے کہا۔

''اس نے انکار کر دیا؟'' ماں کے دروازہ کھولتے ہی لڑکی نے بڑی جرأت سے دریافت کیا۔

''ہاں۔''

''میں جانتی تھی'' ساشا نے سادگی سے کہا لیکن اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔اضطراری طور پر ایک ہی دفعہ اس نے کوٹ کے سارے بٹن کھول دیئے پھر کچھ کو دوبارہ لگا لیا اور کوٹ اتارنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

''آندھی! بارش! بڑا خوفناک موسم ہے'' وہ کہہ رہی تھی۔''وہ اچھا تو ہے؟''

''ہاں۔''

''بالکل تندرست اور خوش'' ساشا نے ملائم لہجے میں کہا اور کھڑی اپنے ہاتھوں کو تکتی رہی۔

''وہ کہتا ہے ہمیں ریبن کو چھڑانے کی کوشش کرنی چاہئے'' ماں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''اچھا؟ میں سمجھتی ہوں اگر ہم ایسا کریں تو ہمیں اپنے پرانے منصوبے سے ہی کام لینا چاہئے'' لڑکی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے!'' نکولائی نے دفعتاً دروازے پر نمودار ہوتے ہوئے کہا۔''ہلو ساشا!''

لڑکی نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''ہاں۔کیوں نہیں۔ہر شخص مانتا ہے کہ منصوبہ اچھا ہے۔''

''لیکن اسے انجام کون دے گا؟ ہم سب اتنے مصروف ہیں...''

''مجھ پر چھوڑ دو، میں کرسکتی ہوں'' ساشا جلدی سے بول اٹھی۔ ''میرے پاس وقت ہے۔''

''اچھی بات ہے لیکن پہلے تمہیں دوسروں سے پوچھنا ہوگا...''

''میں ان سے پوچھ لوں گی۔ میں ابھی جاتی ہوں۔''

اور وہ پھر ایک مرتبہ اپنی نازک پتلی انگلیوں سے کوٹ کے بٹن لگانے لگی۔

''کچھ دیر آرام تو کرلو'' ماں نے کہا۔

''نہیں ماں! میں بالکل تھکی نہیں ہوں'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر خاموشی سے دونوں سے ہاتھ ملایا اور باہر چلی گئی۔ بظاہر پھر اسی طرح پرسکون اور سنجیدہ۔

ماں اور نکولائی دونوں کھڑکی میں کھڑے اسے احاطے میں سے گزرتے اور پھاٹک سے باہر جاتے دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو نکولائی نے ہلکے سے سیٹی بجائی اور میز کے قریب جا کر لکھنے بیٹھ گیا۔

''یہ اس کے لئے اچھا ہی ہے۔ کام میں لگی رہے گی تو خیال بٹ جائے گا'' ماں نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔

''بیشک'' نکولائی نے جواب دیا۔ پھر اس نے مڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور بڑی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:

''نلوونا! معلوم ہوتا ہے یہ جام کبھی تمہارے ہونٹوں تک نہیں آیا۔ ایسا لگتا ہے کبھی تم نے یہ جانا ہی نہیں کہ کسی کی تمنا کیا معنی رکھتی ہے، اس میں کیسی تڑپ اور کسک ہوتی ہے۔''

''ہونہہ'' ماں نے ہاتھ کی جنبش کے ساتھ کہا۔ ''مجھے تو ہر وقت بس یہی خوف رہتا تھا کہ میری شادی کردی جائے گی۔''

''کیا سچ مچ تم نے کبھی کسی کو نہیں چاہا؟''

''مجھے یاد نہیں۔ شاید چاہا ہو۔ میں سمجھتی ہوں میں نے ضرور کسی کو چاہا ہوگا، لیکن اب یاد نہیں۔''

''میرا شوہر مجھ اتنا مارتا تھا کہ اس نے میرے دماغ سے سب کچھ نکال دیا۔ شادی سے پہلے کی تمام یادوں کو جیسے دھکے دے دے کر نکال دیا۔ میں سب کچھ بھول گئی'' اس نے سادگی سے بات ختم کی اور ایک پرغم سکون کے ساتھ نکولائی کی طرف دیکھا۔

نکولائی پھر میز کی طرف پلٹ گیا اور ماں ایک لمحے کے لئے باہر چلی گئی۔

جب وہ واپس لوٹی تو نکولائی نے اس کی طرف بڑے محبت آمیز انداز سے دیکھا۔اس کے ذہن میں ماضی کی حسین یادیں مچل رہی تھیں۔

''مجھے بھی زندگی میں کچھ ساشا جیسا تجربہ ہوا ہے'' وہ کہہ رہا تھا۔''مجھے بھی اپنی زندگی میں کچھ ایسا ہی تجربہ ہوا ہے... مجھے ایک لڑکی سے محبت تھی۔وہ ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔بہت ہی زوردار! جب میں اس سے ملا اس وقت میری عمر کوئی بیس سال ہوگی تب ہی سے اس کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہے، میں آج بھی اسے چاہتا ہوں اسی شدومد اور جذبے کے ساتھ جیسے اس وقت چاہتا تھا، میری رگ رگ میں اس کا پیار رچا ہوا ہے۔ میں نے ہمیشہ اسی سے محبت کی ہے اور کرتا رہوں اور نہایت شکر گزاری کے ساتھ۔''

ماں نے دیکھا نکولائی کی آنکھوں میں ایک بڑی صاف شفاف روشنی جگمگا اٹھی تھی۔وہ اپنے ہاتھ کرسی کی پشت پر رکھے سر کو ان کا سہارا دئے بیٹھا تھا اور اس کی نظریں کہیں بہت دور دیکھ رہی تھیں اور اس کے پورے جسم کو جیسے ایک بے پناہ آرزو اور تمنا اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ایک حسین پیکر کی تمنا! جیسے ایک پھول سورج کی طرف کھنچتا ہے۔

''پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کر لی؟'' ماں نے پوچھا۔

''اس کی شادی ہو چکی۔آج چار سال ہوتے ہیں۔''

''تو تم نے پہلے ہی اس سے شادی کیوں نہ کر لی!''

وہ ایک لمحہ خاموش رہا پھر بولا:

''کوئی نہ کوئی ایسی بات نکل آتی کہ ممکن نہ ہو سکا۔جب میں جیل سے باہر ہوتا وہ جیل میں ہوتی یا جلاوطنی اور جب وہ باہر ہوتی تو میں جیل میں۔ بالکل جیسے پاویل اور ساشا کا معاملہ ہے، ہے نا؟.. بالاخر اسے دس سال کے لئے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ایک بہت ہی دور دراز کے علاقے میں۔ میں بھی اسی کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر۔ مجھے شرم محسوس ہوئی اور اسے بھی...وہاں وہ ایک اور آدمی سے ملی۔ بڑا اچھا آدمی ہے، میرے ساتھیوں ہی میں سے ہے۔ وہ دونوں وہاں سے بھاگ نکلے اور اب کہیں پردیس میں زندگی گزار رہے ہیں...''

نکولائی نے چشمہ اتار کر شیشے صاف کئے، اسے روشنی کے سامنے اونچا کیا اور پھر ایک بار اچھی طرح سے شیشوں کو پونچھا۔

''آہ بیچارا!'' ماں نے سر ہلاتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا۔ وہ اس کیلئے سچ مچ بڑا دکھ محسوس کر رہی تھی لیکن ساتھ ہی اس میں کوئی ایسی چیز بھی تھی جس نے اسے ایک ساتھ ہی اس میں کوئی ایسی چیز بھی تھی جس نے اسے ایک مادرانہ شفقت اور پیار سے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

نکولائی نے پہلو بدلا اور قلم اٹھا کر جیسے اپنے الفاظ کو تال دیتے ہوئے بات جاری رکھی:

''گھریلو زندگی ایک انقلابی کی توانائیوں کو گھٹا دیتی ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بچے! مجبوری! بے کاری، ان کی پرورش کی فکر! کام کی تلاش! اور ایک انقلابی کو اپنی توانائیوں میں برابر اضافہ کرتے رہنا چاہئے تا کہ اس کا کام اور پھیل سکے۔ وقت کا تقاضہ یہی ہے۔ ہمیں ہمیشہ ہر کسی سے آگے چلنا چاہئے اس لئے کہ ہم وہ ہیں جنہیں تاریخ نے منتخب کیا ہے کہ پرانی دنیا کو ختم کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کریں۔ اگر ہم تھک کر، یا کسی چھوٹی موٹی فتح کے نشے میں مخمور ہو کر پیچھے رہ جائیں تو ہمارا قصور کے نشے میں مخمور ہو کر پیچھے رہ جائیں تو ہمارا قصور تقریباً اتنا ہی بڑا اور سنگین ہوگا جتنا کہ مقصد کے ساتھ غداری کرنا۔ ایسا کوئی نہیں جس کے ہمراہ ہم اپنے مقصد کو نقصان پہونچائے بنا چل سکیں اور ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہمارا کام محض چھوٹی موٹی فتح حاصل کرنا نہیں ہے۔ ہمیں تو ایک مکمل فتح اور عظیم کامرانی تک پہنچنا ہے۔''

اس کا چہرہ زرد تھا مگر آواز میں بلا کا استقلال اور جوش تھا اور آنکھوں میں حسب معمول ایک پرسکون اور بھر عزم طاقت چمک رہی تھی۔

پھر کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ وہ لدمیلا تھی۔ اس کے گال سردی سے سرخ ہو رہے تھے اور اس کا پورا جسم ایک پتلے کوٹ کے نیچے جو اس موسم کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہ تھا بری طرح کانپ رہا تھا۔

''مقدمہ کی پیشی آئندہ ہفتے ہونے والی ہے'' اس نے اپنے گھسے ہوئے ربر کے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یقین ہے؟'' نکولائی نے دوسرے کمرے سے پکار کر پوچھا۔

ماں دوڑ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوشی تھی یا خوف جس نے اس

کے دل میں یکا یک ایسی ہل چل مچادی تھی۔ لدمیلا بھی وہیں آ گئی۔

''مجھے یقین ہے'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''عدالت میں وہ اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش بھی نیں کرتے کہ فیصلہ پہلے بھی جا چکا ہے۔'' اس کی آواز میں بلا کا طنز تھا۔ ''آخر اس کا مطلب؟ کیا حکومت ڈرتی ہے کہ کہیں اس کے عہدہ دار اس کے دشمنوں کے ساتھ کچھ رعایت نہ برتیں؟ کیا اسے یہ خوف ہے کہ اپنے نمک خواروں کے دل ودماغ کو کچلنے اور مسخ کرنے کے لئے جو روپیہ اور وقت صرف ہوا ہے وہ کہیں بیکار نہ جائے اور لوگ اتنے پاجی اور بدمعاش نہ نکلیں؟...''

لدمیلا جذبات سے مغلوب ہو کر کوچ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے گال رگڑنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے حقارت ٹپک رہی تھی اور آواز غصہ سے بھرائی ہوئی تھی۔

''اپنی توانائیوں کو اس طرح مت ضائع کرو، لدمیلاً نکولائی نے اس غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری آواز وہاں تک نہیں پہنچ رہی۔ سمجھیں؟...''

ماں بڑے غور سے اس کے ہر لفظ کو سن رہی تھی مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے دماغ میں تو بس ایک ہی خیال چکر کاٹ رہا تھا:

''مقدمہ...اگلے ہفتے!''

دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی غیر انسانی بے رحم طاقت اس کے بالکل نزدیک آ رہی ہے۔

23

وہ دو دن ماں نے بڑی بے چینی، انتظار اور الجھن میں گزارے، بالاخر تیسرے دن ساشا آئی اور اس نے نکولائی سے کہا:

''سب تیار ہے۔ آج ایک بجے...''

''اس قدر جلد!'' اس نے تعجب سے پوچھا۔

''اس میں کرنا ہی کیا تھا، مجھے تو صرف ریبن کے لئے کپڑے فراہم کرنا تھے اور جگہ کا انتظام۔ باقی اور سب گابون نے اپنے ذمے لے لیا۔ ریبن کو کچھ زیادہ دور بھاگنا نہیں پڑے گا۔ وسوف شیکوف بھیس

بدلے اسے ملے گا، اسے ایک کوٹ اور ٹوپی پہنائے گا اور راستہ بتائے گا۔ اور میں مقررہ مقام پر دوسری تمام چیزوں سے لیس اس کا انتظار کر رہی ہوں گی اور اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔''

''ٹھیک، لیکن یہ گابون کون ہے؟'' نکولائی نے پوچھا۔

''تم اسے جانتے ہو۔ اسی کے کمرے میں تم مشین کے مستریوں کو پڑھایا کرتے تھے۔''

''اخاہ! وہ!۔ یاد آیا۔ وہ عجیب وغریب سا آدمی!''

''وہ پنشن یافتہ سپاہی ہے، اور اب قلعی گر کا کام کرتا ہے۔ لکھا پڑھا تو بہت کم ہے لیکن ہر قسم کے ظلم اور جبر کے خلاف اس کے دل میں بڑی گہری نفرت ہے۔ کچھ تھوڑا سا فلسفی بھی ہے'' ساشا نے کچھ سوچتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ کر کہا۔

ماں خاموشی سے سب سن رہی تھی اور اس کے ذہن میں ایک مبہم سا خیال آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔

''گابون، اپنے بھتیجے کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکالنا چاہتا ہے۔ وہی یاف چنکو۔ یاد ہے تمہیں! تم اسے بہت پسند کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ بڑا صاف ستھرا، نک سک درست رہتا تھا۔''

نکولائی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''گابون نے سب انتظامات مکمل کر لئے ہیں'' ساشا نے بات جاری رکھی۔ ''مگر مجھے کچھ اندیشہ ہو رہا ہے۔ جانے کیا ہو؟ دن کے وقت سب ہی قیدی باہر ہوں گے اور سیڑھی دیکھ کر ان میں سے اکثر ہی فایدہ اٹھانا چاہیں گے...''

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور چپ ہو گئی۔ ماں دھیرے سے اس کے قریب آئی۔

''اور ایک دوسرے کا معاملہ بگاڑ دیں گے...''

نکولائی اور ساشا کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے اور ماں بھی ان کے پیچھے کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ان کی تیز تیز گفتگو سے اس کے دل میں عجیب ملے جلے سے احساسات ابھر رہے تھے۔

''میں بھی چل رہی ہوں'' اس نے دفعتاً کہا۔

''کیوں؟'' ساشا نے پوچھا۔

''نہیں ماں! تم مت جاؤ۔ تمہارا جانا ٹھیک نہیں'' نکولائی نے مشورہ دیا۔

ماں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر نرم مگر پر استقلال لہجے میں بولی:

''نہیں۔ میں جاؤں گی...''

''میں سمجھتی ہوں'' ساشا نے اپنے کاندھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ماں کی طرف پلٹی آہستہ سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور اپنے مخصوص سادہ انداز میں جو ماں کو بہت عزیز تھا بولی:

''لیکن ماں! تم جانتی ہو ایسی امید باندھنا بیکار ہے...''

''میں دل کو کیا کروں؟'' میں کانپتے ہاتھوں سے ساشا کو قریب کھینچ کر اسے لپٹاتے ہوئے بولی۔

''مجھے اپنے ساتھ لے چلو، میں تمہاری کسی چیز میں حائل نہ ہوں گی، میں ضرور جاؤں گی۔ یقین نہیں آتا یہ ممکن بھی ہے، یہ جیل سے فرار!''

''میں انہیں ساتھ لے جا رہی ہوں'' ساشا نے فیصلہ کن لہجے میں نکولائی کو سنایا۔

''تم جانو۔'' نکولائی نے سر نیچا کر کے جواب دیا۔

''لیکن ہمارا اکٹھے رہنا ٹھیک نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم باغ کے خالی احاطے میں چلے جاؤ۔ وہاں سے جیل کی دیوار صاف دکھائی دیتی ہے۔ لیکن فرض کرو۔ کوئی تم سے کچھ پوچھ بیٹھے تو کیا کہو گی؟''

''کوئی نہ کوئی بات بنا دوں گی'' ماں کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''مگر یاد رہے کہ جیل کے محافظ تم کو پہچانتے ہیں'' ساشا نے ہوشیار کیا۔ ''اور اگر انہوں نے تم کو وہاں دیکھ لیا...''

''نہیں دیکھ پائیں گے!''

ماں کے دل میں دبی ہوئی امید کی چنگاری پھر سلگ اٹھی تھی۔ ''ہوسکتا ہے وہ بھی...'' اسی موہوم آشا نے جیسے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔

ایک گھنٹے کے بعد ماں جیل کے پیچھے والے احاطے میں تھی۔ ہوا میں بڑی تیزی تھی۔ وہ اس کے سائے کو اڑا رہی تھی اور اس کے تیز و تند جھونکے کی سوکھی باڑ کو جھٹکے دیتے، اس کے اندر سے راستہ بناتے برفیلی زمین پر لوٹتے، اٹھ اٹھ کر جیل کی دیوار سے ٹکرا رہے تھے اور جیل کے اندر انسانی چیخوں کو اپنے دوش پر اٹھائے بلند آسمان تک پہنچا رہے تھے جہاں بھاگتے دوڑتے بادلوں کے اندر سے کبھی کبھی دور دراز نیلے شفاف آسمان کی جھلکیاں دکھائی دے جاتی تھیں۔

ماں کی پشت پر باغ تھا، سامنے قبرستان کے قریب دو سپاہی کوئی ستر فٹ کے فاصلے پر جیل۔

قبرستان کے قریب دو سپاہی کھڑے تھے۔ ایک گھوڑے کو دوڑا دے رہا تھا اور دوسرا زور زور سے زمین پر پاؤں مار کر ٹھٹھے لگا رہا تھا اور سیٹیاں بجا رہا تھا۔ ان کے علاوہ جیل کے قریب اور کوئی نہ تھا۔

وہ بڑی احتیاط سے دبے پاؤں دائیں بائیں آگے پیچھے نظر ڈالتی ان کے پاس سے گزرتی ہوئی اس باڑ تک جا پہونچی جو قبرستان کو گھیرے ہوئے تھی۔ دفعتاً اسے ایسا لگا جیسے اس کے گھٹنے جواب دے رہے ہیں اور پاؤں وہی زمین میں دھنس کر رہ گئے۔ موڑ پر ایک خمیدہ قامت بتی جلانے والا اپنے کاندھے پر سیڑھی رکھے قدم بڑھائے چلا آ رہا تھا۔ خوف سے آنکھیں جھپکا کر ماں نے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ وہ اب ایک جگہ کھڑے تھے اور گھوڑا ان کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ پھر اس نے سیڑھی لے جانے والے پر نظر ڈالی۔ اس وقت تک وہ سیڑھی دیوار کے پاس لگا بھی چکا تھا اور بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ اس پر چڑھ رہا تھا۔ ماں دم سادھے دیکھتی رہی۔ جیل کے اندر صحن کی طرف ایک ہلکی سی جنبش کے بعد وہ تیزی سے سیڑھی سے اترا اور پھر موڑ پر غائب ہو گیا۔ ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وقت جیسے رک گیا تھا۔ جیل کی ٹوٹی پھوٹی داغ دار، بدرنگ دیوار کے پس منظر میں، جس کا جگہ جگہ سے پلاسٹر اکھڑا ہوا تھا اور اندر سے اینٹیں جھانک رہی تھیں، سیڑھی مشکل ہی سے دکھائی دیتی تھی۔ دفعتاً دیوار پر ایک سر نمودار ہوا۔ پھر ایک جسم جس نے پھرتی سے ایک ٹانگ دیوار کے اس طرف ڈالی اور تیزی کے ساتھ دوسری طرف نیچے اتر آیا۔ اس کے پیچھے ہی ایک اور سر موٹے بالوں والی ٹوپی میں اوپر اٹھا۔ ایک سیاہ گولا لڑھکتا ہوا زمین پر گرا اور دوسرے ہی لمحے موڑ پر غائب ہو گیا۔ میخائلو نے سیدھے کھڑے ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی اور سر کو ہلکے سے جھٹکا دیا۔

''بھاگو... بھاگو...'' ماں نے زمین پر پاؤں مارتے ہوئے دبے لہجہ میں پکارا۔

یکا یک اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں اس نے تیز تیز چیخیں سنیں دیوار پر ایک تیسرا سر نمودار ہوا۔ ماں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔ ایک لمحے کیلئے ایک نوجوان کا سنہری بالوں والا سر دیوار پر اس طرح ابھرا جیسے کسی نے نیچے سے اچھال دیا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے میں دیوار کے پیچھے غائب ہو گیا۔ شور بڑھتا گیا اور ہواؤں نے سیٹیوں کی تیز چیخوں کو پوری فضا میں بکھیر دیا۔ میخائلو نے پوری دیوار کی لمبائی طے کی اور جیل اور شہر کی عمارتوں کے درمیانی میدان کو پار کرنے لگا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ بہت آہستہ چل رہا ہے اور سر کو ضرورت سے زیادہ اونچا اٹھائے ہوئے ہے۔ جس کسی نے ایک دفعہ بھی اس کا

چہرہ دیکھا ہوگا اسے ہرگز بھلا نہیں سکتا تھا۔

''جلدی کرو، جلدو!'' ماں نے بے صبری سے دھیمے لہجے میں کہا۔

اسی وقت جیل کی دیوار کے اندر کی طرف ایک زور کا دھما کا ہوا اور ماں کو شیشہ ٹوٹنے کی جنکار سنائی دی۔ میدان میں کھڑے سپاہیوں میں سے ایک زمین میں پاؤں جمائے گھوڑے کی رسی کھینچ رہا تھا اور دوسرا ہاتھ کی مٹھی سی بنا کر منہ پر رکھے زور سے چلا رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح آواز لگانے کے بعد وہ ہواؤں پر کان لگا کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

ماں بے حد چوکنی اور محتاط کھڑی ہر طرف مڑ مڑ کر نظر ڈال رہی تھی اور اس کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں لیکن اب بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جس کام کو وہ اتنا مشکل، اتنا پیچیدہ، اتنا خوفناک سمجھ رہی تھی، وہ اتنا آسان اتنا معمولی نکلا۔ جس تیزی اور پھرتی سے وہ سب کچھ ہوا اس نے اس کے احساس اور شعور کو جیسے سن سا کر دیا تھا اور وہ بھوچکی سی کھڑی تھی۔ ریبن پہلے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اب ایک دراز قد آدمی لانبا کوٹ پہنے گلی سے گزر رہا تھا اور ایک نوجوان لڑکی اسے آگے آگے تیز تیز قدم اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ جیل کے تین سنتری ایک ساتھ اپنے سیدھے ہاتھ آگے کو پھیلائے ہوئے جیل کے کونے سے نکلے۔ میدان میں کھڑا ہوا ایک سپاہی ان کی طرف دوڑا۔ دوسرا گھوڑے کو قابو میں لا کر اس پر سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن جانور سرکش تھا اور کسی طرح قابو میں نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار اسے پکڑنا چاہتا اور ہر بار وہ ہوا میں جست لگا جاتا اور اس کے ساتھ ہر چیز جست لگاتی معلوم ہو رہی تھی۔ دیوانہ وار تیز سیٹیوں کی آواز ہوا کو چیرتی ہوئی ہر طرف پھیل گئی۔ ان بے تابانہ آوازوں نے ماں کے اندر خطرے کا احساس جگا دیا۔ وہ لرز اٹھی اور قبرستان کی باڑ کے ساتھ ساتھ احتیاط سے جیل کے سنتریوں پر نظر رکھے چلنے لگی لیکن سنتری اور سپاہی جیل کے ایک دوسرے کونے پر غائب ہو گئے۔ ان کے بعد جلد ہی ایک اور آدمی نمودار ہوا، اس کے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ماں نے اسے پہچان لیا۔ وہ جیل کا نائب افسر تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے کچھ پولیس والے اور بہت سے تماشائی بھی منظر پر آ گئے۔

ہوا بڑی سبک رفتاری سے چکر کھا کھا کر رقص کر رہی تھی جیسے خوشیاں منا رہی ہو اور ماں کے کانوں تک صرف سیٹیوں اور چیخوں کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور ادھوری آوازیں پہنچ رہی تھیں۔ اس ہل چل میں ماں کا اضطراب دھیما پڑ گیا۔ اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی سوچتی چلی جا رہی تھی:

''وہ بھی اتنی ہی آسانی سے بھاگ سکتا تھا...''

اسی وقت دو سپاہی موڑ پر دوڑتے ہوئے آئے۔ ''ٹھیرو!'' ان میں سے ایک سپاہی جو ہانپ رہا تھا زور سے چلایا۔ ''تم نے کسی کو ادھر سے جاتے ہوئے دیکھا؟ کوئی آدمی جس کے ڈاڑھی ہے؟''

ماں نے باغوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے پرسکون مطمئن لہجے میں کہا:

''اس طرف بھاگا جا رہا تھا۔ مگر کیوں؟''

''یگوروف! سیٹی بجاؤ!''

سپاہی نے پلٹ کر دوسرے ساتھی سے کہا اور پھر وہ ادھر دوڑ گئے۔

ماں گھر کی طرف چل پڑی۔ آہستہ آہستہ ایک نہ معلوم غم اس کے دل پر چھایا جا رہا تھا اور ایک عجیب سی تلخی جیسے اس کے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ جب وہ احاطے سے نکل کر سڑک پر پہونچی تو اسی وقت ایک بگھی اس کے بالکل قریب سے گزری۔ اس نے اندر نظر ڈالی وہاں ایک سنہرے مونچھوں والا نوجوان دکھائی دیا جس کا چہرہ زرد اور تھکا ہوا تھا۔ اس نے بھی اسے دیکھا۔ وہ کسی قدر ترچھا ایک طرف کو جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ شاید اسی لئے اس کا دایاں کاندھا بائیں کاندھے سے اونچا نظر آ رہا تھا۔

گھر پر نکولائی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''کہو کیا ہوا؟'' اس نے خوشی خوشی ماں کا خیر مقدم کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایسا لگتا ہے سب کچھ بخوبی انجام پا گیا۔''

ماں ایک ایک بات یاد کر کے اسے پوری تفصیل سنانے لگی لیکن وہ اس طرح کہہ رہی تھی جیسے اپنے آنکھوں دیکھی بات نہیں بالکہ کسی اور کا قصہ دھرا رہی ہو جس کی صداقت پر اسے بہت کچھ شک ہو۔

''قسمت ہمارے ساتھ ہے'' نکولائی نے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''خدا ہی جانتا ہے میں تمہارے لئے کس قدر پریشان تھا کہ کہیں تم پر کوئی آفت نہ آ جائے۔ دیکھو نلوونا! میں تمہارا دوست ہوں۔ میری بات مانو۔ اس مقدمے کا خوف دل سے نکال دو۔ جتنی جلد یہ مرحلہ طے ہو اتنا ہی اچھا ہے اور پاویل کی آزادی اتنی ہی جلد ممکن ہو سکے گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ راستے ہی سے فرار ہو جائے... رہا مقدمے کا سوال وہ کچھ اسی طرح ہوگا...''

وہ مقدمے کے طریقے کی پوری تفصیل سنا کر ماں کو تسکین اور دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر ماں

نے محسوس کیا کہ وہ خود کچھ نامعلوم اندیشوں میں گھرا ہوا تھا، خود اس کے دل میں کوئی خوف چھپا ہوا تھا۔

''شاید تم ڈرتے ہو کہ میں کہیں عدالت میں کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھوں جو مجھے نہیں کرنی چاہئے'' ماں یکا یک پوچھ بیٹھی۔

''نہیں...نہیں...'' نکولائی نے اسے ہاتھ سے روکتے ہوئے کہا۔''نہیں ماں! یہ بات ن ہیں۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے اسے کچھ برا لگا ہو۔

''میرے دل میں ایک ڈر سا ہے...ایک عجیب سا خوف... یہ سچ ہے۔لیکن یہ خوف، یہ ڈر ف کس بات کا ہے، مجھے نہیں معلوم'' وہ چپ ہو گئی اور تھوڑی دیر تک اس کی نظریں پورے کمرے کا چکر لگاتی رہیں۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔''مجھے اندیشہ ہے کہ وہ پاشا سے سختی سے بات کریں گے۔ وہ کہہ ڈالیں گے:'تم اجڈ جنگلی کسان، گنوار کہیں کے! کسان بچے! یہ تم نے کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے، جو انہوں نے کچھ ایسی بدکلامی کی...تو تم جانتے ہو پاویل بڑا خوددار ہے، وہ اسے برداشت نہیں کرے گا۔ وہ ضرور ترکی بہ ترکی جواب دے گا۔ یا پھر شاید آندری ہی کچھ طنز کو بیٹھے۔ اور دوسرے، وہ بھی تو کچھ کم گرم مزاج نہیں۔ اسی لئے ڈر لگتا ہے۔ خیال ہوتا ہے جو کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی وہ اسے برداشت نہ کر پائے۔ اور کوئی زیادہ سخت سزا سنا دی گئی۔ کوئی ایسی سزا کہ پھر ہم کبھی انہیں دیکھ نہ سکیں!''

نکولائی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور بھویں چڑھا کر ڈاڑھی کھجاتا رہا۔

''تم لاکھ چاہو مگر دماغ سے یہ خیالات کسی طرح نکلتے ہی نہیں'' ماں پھر آہستہ سے کہہ رہی تھی۔ ''اسی لئے تو دل کانپتا ہے۔ اس کے تصور ہی سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ ہر چیز کا جائزہ، ناپ تول، باز پرس۔ اف خدایا! کس قدر خوفناک! سزا اتنی خوفناک نہیں مگر یہ مقدمہ... میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے کہوں...!''

وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ نکولائی اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اور اسی واسطے اس کے لئے اپنے دلی اندیشوں کو بیان کرنا اور بھی دشوار ہو گیا۔

خوف ایک کڑوی گولی اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ جب پیشی کا دن آیا تو وہ بوجھل دل کے ساتھ عدالت پہنچی۔ اس کی پوری ہستی جیسے ایک اندرونی غم کے نیچے دبی جا رہی تھی۔

راستہ میں اداس مجمع میں سے گزرتے ہوئے اس کارخانے کے بہت سے جان پہچان والے

ملے۔انہوں نے اسے سلام کیا اور وہ خاموشی سے سر جھکا کر سب کو سلام کا جواب دیتی گئی۔غلام گردشوں میں اور عدالت کے کمرے میں اسے قیدیوں کے عزیز اور رشتہ دار دکھائی دئے جنہوں نے اس سے بھی سر گوشیوں میں باتیں کیں۔لیکن اسے وہ سارے الفاظ اور باتیں غیر ضروری معلوم ہوئیں وہ انہیں سمجھ نہیں سکی۔ ہر دل میں ایک ہی معلوم ہوئیں وہ انہیں سمجھ نہیں سکی۔ ہر دل میں ایک ہی غم تھا۔ ماں یہ جانتی تھی اور یہ احساس اسے اور زیادہ دل گرفتہ اور اداس بنا رہا تھا۔

''آؤ، یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ'' سیزوف نے بنچ پر ایک طرف سرکتے ہوئے کہا۔

وہ بغیر کچھ کہے خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اپنا سایہ ٹھیک کیا اور ادھر ادھر ایک نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہرے لال نقطے، فیتے اور زرد دھاگے ناچ رہے تھے...

''یہ سب تمہارے لڑکے کے کرتوت ہیں کہ آج ہمارے گریشا کو یہ دن دیکھنا پڑا'' اس کے قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت بڑبڑاتی۔

''خاموش نتالیا!'' سیزوف نے غصے سے کہا۔

ماں نے عورت کی طرف دیکھا۔ وہ سموئلوف کی ماں تھی اور اس سے کچھ دور پر اس کا شوہر بیٹھا تھا۔ ایک قبول صورت مرد، دبلا پتلا چہرہ، گنجا سر اور بڑی سی سرخ ڈاڑھی۔ وہ آنکھیں سیکڑے مسلسل آگے کو تک رہا تھا اور اس تکلیف سے جو اس کے دل کو ہلا رہی تھی، اس کی ڈاڑھی کانپ رہی تھی۔

عدالت کے کمرے میں بلند دریچوں سے جن کے باہر برف جمی ہوئی تھی بہت ہلکی دھندلی سی روشنی داخل ہو رہی تھی۔ دریچوں کے درمیان ایک مرصع سنہری ملمع کے فریم میں زار کی تصویر لٹک رہی تھی جس کے کنارے دریچوں پر پڑے ہوئے بھاری قرمزی رنگ کے پردوں کی تہوں میں چھپے ہوئے تھے۔تصویر کے سامنے تقریباً کمرے کی پوری چوڑائی میں ایک میز رکھی تھی جس پر سبز بانات منڈھی ہوئی تھی۔ کٹھرے کے پیچھے دائیں طرف کی دیوار سے لگی ہوئی لکڑی کی دو بنچیں پڑی تھیں اور بائیں طرف سرخ گدیلوں والی آرام کرسیوں کی دو قطاریں۔ چپراسی سبز کالروں والی وردیوں میں ملبوس، جن کے سامنے نیچے سے اوپر تک سنہری بٹن لگے ہوئے تھے، کانا پھوسی اور دواؤں کی ملی جلی بو سے بھری ہوئی تھی اور یہ تمام چیزیں۔ مختلف رنگ، چمک دمک اور گھٹی گھٹی سی آوازیں اس کی آنکھوں اور کانوں دونوں ہی کو تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ سانس کے ساتھ سینے میں اترتی ہوئی بو باس اس کے دل میں ایک عجیب رکھن کرب آمیز اور

سنسان خوف پیدا کر رہی تھی۔

دفعتاً کوئی زور سے بولا۔ ماں چونک پڑی اور ہر شخص کو کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ بھی سیزوف کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔

بائیں جانب ایک اونچا دروازہ کھلا اور ایک سن رسیدہ آدمی چشمہ لگائے رک رک کر چلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے مٹیالے سے کلوں پر دونوں جانب پتلے پتلے سفید گل مچھے ہل رہے تھے۔ اور اس کا صاف منڈا ہوا اوپری ہونٹ بے دانت کے مسوڑھوں میں دھنسا ہوا تھا۔ یونیفارم کا اونچا کالر اس کی ٹھوڑی اور جبڑوں تک پہنچ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کے نیچے گردن تھی ہی نہیں۔ ایک دراز قد نوجوان جس کا سرخ، گول چہرہ چینی مٹی سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا، اسے تھامے ہوئے تھا۔ ان کے پیچھے تین آدمی سنہری ڈوریاں لگی ہوئی یونیفارم پہنے ہوئے تھے اور تین غیر فوجی لباس میں۔

لمبی میز کے قریب بیٹھنے میں انہوں نے کافی وقت لیا۔ لیکن بالآخر جب وہ سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ لئے تو ایک بے حس اور بے رونق چہرے نے جس کی ڈاڑھی صاف تھی آگے کو جھک کر بوڑھے سے آہستہ آہستہ کچھ کہنا شروع کیا۔ اس کے موٹے موٹے سوجے ہوئے ہونٹ بڑے بے ڈھنگے پن سے ہل رہے تھے۔ بوڑھا حیرت انگیز حد تک سیدھا اور بے حس و حرکت بیٹھا اس سن رہا تھا۔ اس کے چشمے کے شیشوں کے پیچھے ماں کی نظریں دو چھوٹے بے رنگ نقطوں کو دیکھ رہی تھیں۔

میز کے ایک سرے پر لکھنے کی ڈسک کے قریب ایک طویل قامت آدمی جس کا سر بالوں سے بے نیاز تھا کھڑا ہوا اور مثلوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس نے کھنکھار کر حلق صاف کیا۔

بوڑھے جج نے آگے کو جھول کر بولنا شروع کیا۔ اس کے پہلے الفاظ کا تلفظ بہت صاف تھا لیکن اس کے بعد جو الفاظ نکلے وہ اس کے نیلے خاکستری ہونٹوں پر ہی گڈ مڈ ہو کر رہ گئے۔

''میں اعلان کرتا ہوں... انہیں حاضر...''

''دیکھنا!'' سیزوف نے کھڑے ہوتے ہوئے ماں کو کہنی سے ٹھوکا دے کر دھیمی آواز میں کہا۔

کٹہرے کے پیچھے کا دروازہ کھلا۔ ایک سپاہی ننگی تلوار کاندھے پر رکھے اندر آیا اور اسکے پیچھے پاویل، آندری، فیدور مازن، دونوں بھائی گوسیف، سموئلوف، بوکن، سوموف اور پانچ اور نوجوان جن کے نام ماں نہیں جانتی تھی داخل ہوئے۔ پاویل اسے دیکھ کر مسکرایا اور آندری نے دانت نکال کر ہنستے ہوئے سر

کی جنبش سے اسے سلام کیا۔ان کی مسکراہٹوں، انکے شگفتہ بشاش چہروں اور چاق چوبند رفتار نے عدالت کی مصنوعی ٹیپ ٹاپ کی گھٹی ہوئی دھندلی فضا میں جیسے ایک روشنی سی پھیلا دی۔ وردیوں کی سنہری آب وتاب ماند پڑ گئی۔ قیدیوں کے پرسکون اعتماد اور زندگی کی بھرپور طاقت کو دیکھ کر ماں کے ڈوبتے ہوئے حوصلے اور ہمتیں جیسے پھر جی اٹھیں اور ان میں ایک نئی طاقت پیدا ہوگئی...پچھلی بنچوں پر جہاں اب تک لوگ چپ چاپ بجھے ہوئے سے ایک منتظر حالت میں بیٹھے تھے اس سرے سے اس سرے تک آہستہ آہستہ سرسراتی ہوئی باتوں کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔سب ہی بول رہے تھے۔

''کتنے نڈر ہیں!'' سیزوف نے زیرلب کہا۔اسی وقت سموئلوف کی ماں رونے لگی۔

''خاموش!'' سختی اور تیزی سے آواز آئی۔

''میں تم لوگوں کو آگاہ کئے دیتا ہوں...'' بوڑھے جج نے کہا۔

پاویل اور آندری پہلی بنچ پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھے تھے۔اور مازن، سموئلوف اور دونوں بھائی گوسیف بھی ان ہی کے ساتھ تھے۔آندری نے ڈاڑھی تو بنا رکھی تھی لیکن مونچھیں چھوڑ دی تھیں جو بڑی ہو کر نیچے کو لٹک گئی تھیں جس کی وجہ سے اس کا سر بالکل ایک بلے جیسا دکھائی دے رہا تھا۔اس کے چہرے پر ایک نیا تاثر تھا، ہونٹوں پر ایک گہری طنزیہ کیفیت اور آنکھوں میں گمبھیرتا اور سیاھی سی پیدا ہوگئی۔ مازن کے اوپر ہونٹ پر دو سیاہ لکیریں ابھر آئی تھیں اور اس کا چہرہ گول ہو گیا تھا۔سموئلوف کے بال اب بھی ویسے ہی گھنگھریالے تھے اور ایوان گوسیف بھی ہمیشہ کی طرح دانت نکالے ہنس رہا تھا۔

''آہ فیدور،!'' سیزوف نے سر نیچا کر کے دھیمی آواز میں کہا۔

ماں بوڑھے جج کے گڈمڈ سوالات کو جو وہ قیدیوں سے بغیر ان کی طرف دیکھے کر رہا تھا بڑے غور سے سن رہی تھی۔ جج کا سر اونچے کالر پر بالکل بے حس وحرکت رکھا ہوا تھا۔ ماں نے اپنے بیٹے کے پرسکون مختصر جوابات کو بھی سنا اور اسے ایسا لگا کہ سن رسیدہ جج اور اس کے ساتھی اس پر کوئی سختی اور ظلم نہیں کر سکتے۔ پھر جب اس نے لمبی میز کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کو غور سے دیکھا کہ نتیجے کا اندازہ لگا سکے تو اسے اپنے دل میں خود بخود ایک امید سی ابھرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

چینی مٹی سے بنے ہوئے چہرے والا افسر عجیب یکساں سی آواز میں کوئی دستاویز پڑھ رہا تھا۔ حاضرین پر ایک غنودگی سی طاری ہوگئی جیسے وہ اس کی آوز کے یکساں بہاؤ میں کھو گئے ہوں۔ چار وکیل

قیدیوں سے بڑی گرما گرمی کے ساتھ باتیں کر رہے تھے ان کی حرکات میں بڑی پھرتی اور تیزی تھی اور وہ بالکل بڑی بڑی سیاہ چڑیوں جیسے دکھائی دے رہے تھے۔

بوڑھے جج کے برابر والی کرسی کو ایک دوسرے جج کے موٹاپے نے بھر رکھا تھا۔ اس کی ننھی ننھی چھوٹی آنکھیں چربی میں دھنسی ہوئی تھیں اور اس کے دوسری جانب ایک زرد و سرخ مونچھوں والا جج بیٹھا تھا جس کے شانے سامنے کو جھکے ہوئے تھے۔ وہ بے انتہا تھکا ہوا اور نڈھال، سر کو کرسی کی پشت پر ٹکائے آنکھیں آدھی بند کئے بیٹھا تھا اور اس کے خیالات جانے کہاں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ وکیل سرکار کے چہرے پر بھی تھکن اور بیزاری کی جھلک تھی۔ ججوں کے پیچھے تین سر برآوردہ شخصیتیں براجمان تھیں۔ ایک تو میر بلا میئر تھا۔ بھاری بھرکم بارعب انسان جو بیٹھا اپنے گال سہلا رہا تھا۔ دوسرا میر دربار۔ سرخ رخسار، سفید بال، لمبی ڈاڑھی اور بڑی بڑی پر شفقت آنکھیں اور تیسرا حاکم ضلع، جس کی توند اتنی بڑی تھی کہ وہ خود اس سے کچھ گھبرایا ہوا سا تھا اور مسلسل اسے اپنے کوٹ کے دامن سے ڈھانکنے کی کوشش کر رہا تھا جو بار بار پھیل جاتا تھا۔

''یہاں نہ کوئی مجرم ہے نہ کوئی جج'' پاویل کی پرعزم آواز سنائی دی۔ ''یہاں تو صرف فاتح اور مفتوح کا سوال ہے...''

ہر شخص خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں تک ماں ایک قلم کی گھس گھس اور اپنے دل کی تیز دھڑکن کے سوا اور کچھ سن نہ سکی۔

بوڑھا جج بھی کان لگائے سن رہا تھا اور منتظر تھا کہ اور کیا پیش آتا ہے۔ اس کے ساتھیوں میں کچھ حرکت پیدا ہوئی بالآخر اس نے کہا:

''ہونہہ!... آندری نخودکا!... کیا تم اقرار کرتے ہو کہ...''

آندری آہستہ سے اٹھا اور شانے پھیلا کر مونچھوں کو کھینچتے ہوئے اپنی جھکی ہوئی بھوؤں کے نیچے سے بوڑھے جج کی طرف دیکھا۔

''میں جرم کا اقرار کیسے کر سکتا ہوں؟'' خوخول نے کاندھے کو جھٹکا دیتے ہوئے اپنی مترنم دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا، چوری نہیں کی، ڈاکہ نہیں ڈالا۔ میں تو صرف اس طریقہ زندگی کے خلاف ہوں جو لوگوں کو چوری کرنے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر مجبور کرتی ہے...''

''ماں اگلی صف میں بیٹھی تھی اس کے پیچھے آہستہ آہستہ کھلبلی مچ رہی تھی۔ اس نے اسے صاف محسوس کیا۔ لوگ پھر کانا پھوسی کر رہے تھے اور آہستہ آہستہ خاموش مجمع میں پھر ایک دبی دبی سے ہل چل پیدا ہو رہی تھی۔ چینی گڑیا جیسے چہرے والے کی آواز کا طلسم جیسے ٹوٹ رہا تھا اور وہ بے حسی کے اس جال سے باہر نکل رہے تھے۔

''ذرا سننا۔ کیا کہہ رہے ہیں؟'' سیزوف نے سرگوشی کی۔

''جواب دو، فیدور مازن...''

''نہیں۔ میں جواب نہیں دوں گا'' فیدور نے اچھل کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے چھپائے ہوئے تھا۔

سیزوف کا سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ اور ماں کی آنکھیں حیرت واستعجاب سے پھیل گئی تھیں۔

''میں نے وکیل کی خدمات حاصل کرنے سے انکار کیا اور میں کوئی بات کہنے سے بھی انکار کرتا ہوں۔ اس لئے کہ میں اس مقدمے کو بالکل غیر قانونی اور ناجائز سمجھتا ہوں۔ تم ہو کون؟ تم ہو کون؟ کیا لوگوں نے تم کو ہمارے متعلق انصاف کرنے کے لئے مقرر کیا ہے؟ نہیں۔ میں جانتا ہوں عوام نے تم کو ایسا کوئی حق نہیں دیا اور میں تمہارے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں!''

اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گیا اور اپنا جذبات سے مشتعل چہرہ آندری کے کاندھوں کے پیچھے چھپا لیا۔

موٹے جج نے بڑے جج کی طرف سر جھکا کر آہستہ سے کچھ اس کے کان میں کہا۔ زرد رو جج نے آنکھیں کھول کر کنکھیوں سے قیدیوں کی طرف دیکھا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذ پر پنسل سے جلدی جلدی کچھ گھسیٹنے لگا۔ حاکم ضلع نے سر کو ایک جھٹکا دے کر پہلو بدلا تاکہ اپنی توند کو گھٹنوں پر زیادہ آرام کی حالت میں رکھ سکے اور اسے دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا۔ بوڑھے جج نے گردن موڑے بغیر اپنے پورے جسم کو زرد رو جج کی طرف پھیر کر اس سے آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ میر دربار نے وکیل سرکار سے کچھ کہا اور میئر نے، جواب تک اپنے گال سہلا رہا تھا، اس کے الفاظ سننے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ پھر بڑے جج نے اپنی ٹھس آواز میں بولنا شروع کیا۔

''دیکھا! کیا وار کیا اس نے۔ خوب جواب دیا۔ کیوں؟'' سیزوف نے متعجب ہو کر ماں سے سرگوشی

کی۔

ماں بغیر سمجھے یوں ہی مسکرادی۔ یہ سارے سوال و جواب اور باتیں سب اسے ایک محض غیر ضروری تھکا دینے والی تمہید معلوم ہو رہی تھیں، اس خوفناک حقیقت کا پیش خیمہ جو ابھی ابھی سامنے آنے والی تھی اور جوان سب کو اپنے بے رحمانہ دہشت کے نیچے روند ڈالے گی۔ لیکن پاویل اور آندری کے الفاظ میں اسے ایسی مضبوطی اور بے خوفی دکھائی دی جیسے وہ اس عدالت کے کمرے میں نہیں بلکہ مزدوروں کی بستی میں خود ان کے اپنے چھوٹے سے گھر میں کہے گئے ہوں۔

فیدور کے برانگیختہ جذبات کے طوفان نے جیسے اسے سوتے سے جگا دیا۔ یہ تو کوئی غیر معمولی مقدمہ معلوم ہوتا تھا، ورنہ اتنی جسارت اور بے باکی کہاں دکھائی دیتی ہے۔ اور اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں کے جوش اور گرمی کو محسوس کرتے ہوئے اس کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ صرف وہی اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھی۔

''تمہاری کیا رائے ہے؟'' بوڑھے جج نے پوچھا۔

گنجے سر والا وکیل سرکار پھر آٹھا اور ایک ہاتھ ڈسک پر رکھ کر واقعات کے حوالے دیتے ہوئے تیز تیز بولنے لگا۔ اس کی آواز میں کوئی خوف یا دہشت دلانے والی چیز نہیں تھی۔

اسی وقت معاً ماں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک نامعلوم سا خشک اور چبھتا ہوا خوف اس کے دل کو کچوکے دے رہا ہے۔ اسے فضا مین کسی مخاصمانہ سی چیز کا ایک موہوم احساس ہوا، دھمکانے کیلئے گھونسے نہیں تان رہا تھا، جس کی للکار بلند نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر بڑے پراسرار انداز سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ معزز ججوں کے گرد منڈلا رہا تھا گویا انہیں نگل جائے گا، انہین اس ناقابل تسخیر بادل میں لپیٹ لے گا جو ان کے اور لوگوں کے درمیان حائل تھا۔ اس نے ججوں کی طرف دیکھا۔ وہ انہیں سمجھ نہ سکی۔ اس کی توقع کے خلاف وہ پاویل اور فیدور پر برہم نہیں ہوتے بلکہ اسے ایسا لگا جیسے وہ ان تمام سوالات کو جو انہوں نے پوچھے تھے کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے تھے۔ ان کے لہجے میں عجیب بے نیازی اور لاپروائی تھی۔ وہ اپنے اوپر بڑا جبر کے کے سوال کرنے اور جواب سننے کی زحمت گوارا کر رہے تھے، گویا انہیں پہلے ہی سے سب کچھ معلوم تھا، اور یہ سب ایک رسمی چیز تھی۔

اب ایک سپاہی ان کے سامنے کھڑا گہری نیچی آواز میں کہہ رہا تھا:

''پاویل ولاسوف کو ہنگاموں کا اصلی محرک قرار دیا جاتا ہے...''

اور نخودکا؟''موٹے جج نے بے جان اور مجہول سے انداز میں سوالات کیا۔

''وہ بھی...''

ایک وکیل کھڑا ہوا۔

''جناب عالی، اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں...''

اس نے کہا۔

''کیا کوئی اعتراض ہے؟''بوڑھے جج نے کسی سے پوچھا۔

ماں کو ایسا لگا جیسے سب جج بری صحت کا شکار ہیں۔ ان کی تمام حرکات وسکنات اور آوازوں میں ایک غیر صحت مند تھکن اور بیزاری تھی اور ان کے چہرے بھی ایسے ہی نڈھال اور اکتائے ہوئے سے دکھائی دے رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ سب ان کیلئے ایک بار تھا۔ یہ وردیاں، یہ عدالت کا کمرہ، یہ سپاہی وکیل۔ اور آرام کرسیوں پر بیٹھ کر سوالات پوچھنے کی ضرورت اور پوری کارروائی کو سننا۔ یہ سب ایک اچھی خاصی مصیبت ہی تو تھی۔

زرد رو افسر جیسے وہ پہچانتی تھی اب ان کے سامنے کھڑا اپنے مخصوص انداز اور اونچی آواز میں چبا چبا کر پاویل اور آندری کے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کر رہا تھا۔

''تم کچھ بہت نہیں جانتے...'' ماں نے سوچا اور کٹہرے کے پیچھے بیٹھنے والوں کو بے خوف نظروں سے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ان کے لئے نہ خوف تھا نہ ترحم۔ اس کے دل میں صرف حیرت اوستعجاب کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا اور محبت کی ایک تیز لہر تھی کہ اس کے دل میں پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ وہاں دیوار سے لگ بیٹھے تھے۔ جوان اور طاقتور! گواہوں اور ججوں کی یکساں گفتگو ان کے لئے بے معنی تھی۔ وہ اس پر بہت کم توجہ دے رہے تھے۔ وکیل سرکار کے ساتھ وکیلوں کی بحث میں بھی ان کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ وقتاً فوقتاً کوئی ساتھی طنز سے ہنستا ہوا کوئی فقرہ کستا تو سب ہی کی چہروں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ پاویل اور آندری ایک وکیل صفائی کے ساتھ جیسے ماں نے نکولائی کے پاس دیکھا تھا تقریباً مسلسل آہستہ آہستہ باتیں کئے جا رہے تھے اور مازن جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بے چین اور مشتعل تھا خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ کبھی سموئلوف ایوان گوسیف سے کچھ کہتا تو اسے کے جواب میں وہ اپنے ساتھی کو ٹہوکا

دے کر ہنسی ضبط کرنے کی اتنی کوشش کرتا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ گال پھول جاتے اور اسے بہت نیچے تک سر جھکانا پڑتا۔ دو مرتبہ تو وہ سچ مچ زور سے ٹھٹھا مار کر ہنس ہی پڑا اور اس کے بعد بڑی دیر تک انتہائی کوشش کے ساتھ اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ جوانی اور شباب کا ایک دریا گویا ہر قیدی کے اندر موجیں مار رہا تھا جو بڑی آسانی کے ساتھ ہر اس مخالف طاقت کو دعوت مقابلہ کر سکتا تھا جو اس کے ابھار اور جوش کو دبانے کی کوشش کرے۔

سیزوف نے ہلکے سے ماں کی کہنی کو چھوا۔ وہ مڑی اور اس نے دیکھا کہ وہ بہت خوش تھا مگر ساتھ ہی کچھ متفکر بھی۔

''دیکھو تو سہی۔ یہ لڑکے کتنے طاقتور اور مستحکم وہ گئے ہیں'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا شان ہے ان کی!''

عدالت کے کمرے میں گواہ اپنی تیز تیز بے رونق آواز میں بولے جا رہے تھے اور ججوں کی آوازوں میں وہی شدید ناگواری اور بیزاری تھی۔ موٹا جج اپنا فربہہ ہاتھ منہ پر رکھے جمائی پر جمائی لے رہا تھا۔ سرخ مونچھوں والے کا چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا تھا اور وہ رہ رہ کر چھت کو بے نور آنکھوں سے تکتا ہوا بڑی تکلیف کے ساتھ اپنی انگلیوں سے کنپٹی کو دبا رہا تھا۔ وکیل سرکار میر دربار کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ کبھی کبھی پنسل اٹھا کر کچھ لکھ لیتا تھا اور میر دربار اپنی کھچڑی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا، اپنی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گھماتا اور گردن کو ایک شاہانہ انداز میں خم دیتا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اور میئر ٹانگ پر ٹانگ رکھے انگلیوں سے اپنے گھٹنوں پر مسلسل طبلہ بجاتے ہوئے انہیں گھور کے دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ صرف ایک حاکم ضلع ہی تھا جو اپنی توند کو گھٹنوں پر سہارا دیئے اور اس کے گرد اپنے بازو رکھے ہوئے ان یکساں تھکا دینے والی آوازوں کی بھنبھاہٹ کو سن رہا تھا یا پھر وہ بوڑھا جج جو اپنی کرسی پر بالکل بادنما کی طرح، جو ہوا رکی ہو تو ایک ہی جگہ ٹھہرا رہتا ہے، بے حس وحرکت بیٹھا تھا۔ اس صورت حال نے کچھ اتنا طول کھینچا کہ حاضریں پر پھر ایک انتہائی بیزاری کا سناٹا چھا گیا۔ ان کے ذہن جیسے سن ہو رہے تھے۔

''میں اعلان...'' بوڑھے نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا لیکن اس کے باقی الفاظ اس کے پتلے ہونٹوں پر ہی ٹھٹھر کر رہ گئے۔

عدالت کا کمرہ سرد آہوں، خاموش چیخوں، گھٹی گھٹی آوازوں، کھانسی اور قدموں کی چاپ سے گونج

اٹھا۔قیدی واپس لے جائے جارہے تھے۔انہوں نے مسکراتے ہوئے خاموشی سے سر جھکا کر اپنے ماں باپ اور عزیزوں کو سلام کیا۔اور ایوان گوسیف نے تو جاتے جاتے آواز بھی دی:

''دل چھوٹا نہ کرو یگور!...''

ماں اور سیزوف گیلری میں نکل آئے۔

''کیوں نہ کسی سرائے میں چل کر ایک پیالہ چائے پی لیں؟'' سیزوف نے فکر مندی سے کہا۔''ابھی تو پورا ڈیڑھ گھنٹہ ہے۔''

''مجھے تو کچھ خواہش نہیں۔''

''خواہش تو خیر مجھے بھی نہیں۔ان لڑکوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ایں! وہ تو وہاں ایسے بیٹھے تھے جیسے ساری دنیا میں بس وہی وہ ہوں۔اور باقی سب کچھ گویا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔اور وہ فیدور!''

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ سموئلوف کا باپ ٹوپی ہاتھ میں پکڑے ان کے پاس آیا۔

''میرے گریگوری کو دیکھا؟'' اس نے غمگین تبسم کے ساتھ کہا۔''عذرداری سے بھی انکار کر دیا اور اس بارے میں سننا بھی نہیں چاہتا... یہ بات سب سے پہلے اسی کو سوجھی۔تمہارا لڑکا تو، پلاگیا۔وکیلوں کے ذریعہ پیروی کے حق میں تھا۔لیکن میرا لڑکا یہ بھی نہیں چاہتا۔اس کے بعد اور چار نے بھی انکار کر دیا۔''

اس کی بیوی قریب ہی کھڑی، آنکھیں جھپکا جھپکا کر آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور شال کے ایک کونے سے ناک پونچھے جا رہی تھی۔

''کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا!'' سموئلوف نے اپنے ڈاڑھی سہلاتے ہوئے فرش پر نظریں جمائے بات جاری رکھی۔''ان بدمعاشوں کو دیکھو تو بڑا افسوس ہوتا ہے، رنج ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے کو کیسی تباہی میں ڈالا۔مگر پھر فوراً ہی خیال ہوتا ہے کہ کون جانے جو سچ ان ہی کی جانب ہو، وہی حق پر ہوں، خاص طور پر اب جب کہ کارخانے میں ان کی تعداد بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔پولیس انہیں پکڑ پکڑ کر بند کرتی جاتی ہے۔اور وہ ہیں کہ دریا کی مچھلی کی طرح بڑھتے پھیلتے ہی جاتے ہیں۔اور پھر یہ خیال آتا ہے۔ہوسکتا ہے طاقت ان کی طرف ہو؟''

''ہمارے لئے یہ سب سمجھنا بڑا مشکل ہے، استیپان پیترووچ!'' سیزوف نے کہا۔

''ہاں، سچ کہتے ہو'' سموئلوف نے اقرار کیا۔

''بڑے زوردار نوجوان ہیں کم بخت...'' اس کی بیوی نے ناک سڑکتے ہوئے کہا۔

پھر وہ اپنے چوڑے ڈھیلے ڈھیلے چہرے پر ایک مسکراہٹ لئے ماں کی طرف مڑی:

''نلوونا! مجھ سے خفا مت ہو'' اس نے کہا۔ ''صبح میں اس کے لئے تمہارے بیٹے کو برا بھلا کہہ رہی تھی مگر پتہ نہیں کون زیادہ ذمہ دار ہے۔ تم نے سنا نہیں سپاہی اور جاسوس ہمارے گریگوری کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟ اس نے بھی تو اپنے جوہر دکھا دئے! شیطان کہیں کا!''

وہ اپنے بیٹے پر یقیناً نازاں تھی، اس کے لئے فخر محسوس کر رہی تھی گو وہ خود اپنے احساسات کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہی تھی۔ مگر ماں نے اس کو خوب سمجھ لیا اور ایک مہربان مسکراہٹ کے ساتھ پرخلوص لہجے میں جواب دیا:

''نوجوان دل ہمیشہ سچائی کو پکڑنے میں زیادہ تیز ہوتے ہیں...''

لوگ غلام گردش میں چکر لگا رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی لکڑیوں میں بٹے ہوئے دبی دبی پرجوش آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ شاید کوئی بھی اکیلا نہیں تھا اور ہر چہرے سے بات کرنے، کچھ پوچھنے اور جواب سننے کی بیتاب خواہش ٹپک رہی تھی۔ وہ دیواروں کے درمیان تنگ سفید گیلری میں جیسے ہوا کے تیز جھونکوں سے ٹکراتے ہوئے آگے پیچھے ٹہل رہے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی مضبوط سہارے کی تلاش میں تھے جسے وہ پکڑ سکیں۔

بوکن کا بڑا بھائی، ایک لمبا اونچا انسان، بوکن کی طرح گورا چٹا، زور زور سے اپنے ہاتھوں کو آگے پیچھے پھینکتا ہر طرف مڑ مڑ کر کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا:

''وہ کلیپانوف حاکم ضلع۔ وہ یہاں کیوں آیا؟ اس کا یہاں کیا کام؟''

''کیا کرتے ہو کونسٹنتن، چپ بھی رہو!'' ایک پستہ قد بوڑھے آدمی نے جو اس کا باپ تھا احتیاط سے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں ہرگز چپ نہیں رہوں گا'' وہ چلایا۔ ''کون نہیں جانتا... ہر طرف یہ افواہ گرم ہے کہ پچھلے سال اس نے اپنے ایک منشی کو مار ڈالا۔ اس کی بیوی کو ہتھیانے کے لئے۔ اور اب اس کے ساتھ رہتا ہے۔ تم اس کو کیا کہو گے؟ یہی شرافت اور انصاف ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ اول نمبر کا چور

ہے...''

''خدا کے واسطے، کونستنتن!...''

''بالکل ٹھیک!'' سموئلوف نے کہا۔ ''بالکل سچ کہتے ہو، کسی طرح بھی اس مقدمے کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا...''

بوکن یہ سن کر تیزی سے اس کے قریب جا پہونچا اور کچھ دوسرے بھی جیسے اس کے ساتھ کھنچے چلے آئے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ مسلسل بازوؤں کو جھلاتے ہوئے کہہ رہا تھا:

''جب کوئی قتل یا چوری کا معاملہ ہوتا ہے تو جیوری بیٹھتی ہے جس میں عام لوگ۔ کسان مزدور، شہری، سب شامل ہوتے ہیں لیکن جب لوگ خود حکومت یا اس کے عہدہ داروں کے خلاف اٹھتے ہیں تو خود وہی حاکم اور عہدہ دار ان پر مقدمہ چلاتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے! اگر تم میری توہین کرو اور میں تمہیں ایک چانٹا رسید کروں اور پھر تم میرا مقدمہ سنو تو ظاہر ہے تم مجھے مجرم قرار دو گے۔ لیکن پہلی غلطی کس نے کی؟ یقیناً تم نے۔ اور کون؟''

ایک بھورے بالوں اور طوطے کی طرح مڑی ہوئی ناک والے گارڈ نے جس کے سینے پر تمغے ہی تمغے تھے مجمع کو منتشر کر دیا اور بوکن کی طرف انگلی دکھا کر آہستہ سے متنبہ کیا:

''چلانا بند کرو۔ یہ کوئی شراب خانہ نہیں...''

''ٹھیک ہے! میں سمجھتا ہوں۔ لیکن میں تمہیں چانٹا ماروں اور میں ہی تمہارا جج بنوں تو تم کیا سمجھتے ہو...''

''میں سمجھتا ہوں، بہتر یہ ہوگا کہ میں تمہیں یہاں سے باہر نکال دوں۔ سمجھے؟''

''کیا کہا؟ باہر نکال دو گے۔ کیوں؟''

''اس لئے کہ تم اتنا شور مچا رہے ہو۔ تم اس کے مستحق ہو کہ گلی میں نکال دیا جائے۔''

بوکن نے اپنے چاروں طرف کھڑے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور دھیمے لہجے میں بولا:

''دیکھا! یہ لوگ صرف ایک ہی بات چاہتے ہیں۔ لوگوں کے منہ بند کرنا!''

''بیشک! تم اور کیا سمجھتے تھے؟'' بوڑھا آدمی کرخت آواز میں چلایا۔

بوکن نے حقارت سے کندھے سکیڑتے ہوئے اب کسی قدر دھیمی آواز میں بات شروع کی:

''اور سب ہی لوگوں کو مقدمے کی کارروائی سننے کی اجازات کیوں نہ دی جائے۔صرف رشتہ دار ہی کیوں؟ اگر تم حق بجانب ہو تمہارا الزام جائز ہے، مقدمہ واجبی ہے تو سب کو سننے دو، ڈر کس بات کا ہے؟''

''مقدمہ سرتاسر ناجائز اور غیر قانونی ہے اس میں تو کوئی شک ہی نہیں...'' سموئلوف نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا۔

مقدمے کے ناجائز اور غیر قانونی ہونے کے بارے میں ماں نے نکولائی سے بہت کچھ سنا تھا اور اس وقت وہ سب کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن وہ اس کی ہر بات پوری طرح سمجھ نہیں پائی تھی اور پھر کچھ الفاظ بھی بھول گئی تھی۔ ان کو یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ ایک طرف کو بڑھی تو دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک سنہری مونچھوں والا نوجوان اسے گھور رہا تھا۔ وہ اپنا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے ہوئے تھا جس کی وجہ سے اس کا بایاں کاندھا دائیں کاندھے سے نیچا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک عجیب خصوصیت، جو ماں کو کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہوئی۔ لیکن اتنے مین وہ تیزی سے مڑ گیا اور پیٹھ ماں کی طرف کر دی اور وہ اپنے خیالات میں ایسی منہمک تھی کہ اسے پھر بھول گئی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے کان میں آواز آئی:

''یہ عورت؟''

''ہاں'' کسی نے جواب دیا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ اٹھے ہوئے کاندھے والا نوجوان ترچھا کھڑا اپنے قریب کھڑے ایک سیاہ ڈاڑھی والے نوجوان سے کچھ کہہ رہا تھا جو ایک چھوٹا کوٹ اور گھٹنوں تک بوٹ پہنے تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے حافظے پر زور ڈالا۔ وہ بڑی الجھن میں گرفتار تھی۔ لیکن قطعی طور پر اسے کچھ بھی یاد نہیں آیا۔ اس کے دل میں اپنے بیٹے کے مقصد کو لوگوں کے سامنے رکھنے اور ان سے بات چیت کرنے کی ایک بے پناہ خواہش ابھر رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ اس کے خلاف کیا کہیں گے اور اس طرح اندازہ لگانا چاہتی تھی کہ عدالت کا فیصلہ کیا ہوگا۔

''اسی طرح مقدمہ چلایا جاتا ہے؟'' آخر اس نے سیزوف سے مخاطب ہو کر بڑی احتیاط اور آہستگی سے کہنا شروع کیا۔ ''سارا وقت وہ لوگ یہی معلوم کرنے میں صرف کر دیتے ہیں کہ کس نے کیا کیا؟ اور اس پر ذرا بھی توجہ نہیں کرتے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ اور وہ سب بوڑھے لوگ ہیں۔ نوجوان لوگوں پر

نوجوانوں ہی کو مقدمہ چلانا چاہئے...''

''بیشک!'' سیزوف نے اتفاق کیا۔''ہمارے لئے اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے... بہت دشوار...'' اور اس نے بڑے متفکرانہ انداز میں سر ہلایا۔

گارڈ نے عدالت کا دروازہ کھولا اور آواز دی:

''رشتے دارو! اپنے ٹکٹ دکھاؤ...''

''ٹکٹ!'' کسی نے جل کر کہا۔''کیا کوئی سرکس ہو رہا ہے؟'' سب کے دلوں میں ایک موہوم سے جھلاہٹ اور غصہ پیدا ہو رہا تھا۔ لوگ زیادہ پرشور ہو گئے تھے۔ اپنے جذبات کو زیادہ ڈھیل دے دی تھی۔ اسی لئے گارڈوں سے الجھ رہے تھے۔

25

سیزوف بنچ پر بیٹھ کر زیرلب بڑبڑایا۔

''کیا بات ہے؟'' ماں نے سوال کیا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔ لوگ بے وقوف...''

ایک گھنٹی بجی۔ کسی نے اعلان کیا:

''عدالت میں نظم اور خاموشی...''

جج داخل ہوئے تو لوگ ایک بار پھر کھڑے ہو گئے اور جج پہلے ہ کی طرح اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ قیدی اپنی جگہ لائے گئے۔

''یہ لو!'' سیزوف نے کہا۔''سرکاری وکیل تقریر کرنے جا رہا ہے۔''

ماں اپنے پورے جسم سے آگے کی طرف بڑھی، اسے کسی نئی خوفناک چیز کا خطرہ تھا۔

وکیل سرکار ججوں کی دائیں طرف انہیں کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ ایک کہنی ڈسک پر رکھے ہوئے تھا۔ ایک ٹھنڈا سانس لے کر اور سیدھے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے بولنا شروع کیا۔ ماں اس کے شروع کے الفاظ نہ سمجھ سکی۔ اس کی آواز بھاری اور ہموار تھی لیکن یکساں نہیں۔ کبھی تیز بولنے لگتا، کبھی آہستہ، کچھ دیر تک الفاظ دھیرے دھیرے، رہ رہ کر نکلتے رہے جیسے محنت کر کے بخیہ کر رہا ہو۔ پھر دفعتاً

الفاظ اتنی تیزی سے گونجنے لگے جیسے شکر کے آس پاس مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔لیکن اسے ان الفاظ میں کوئی کمینگی کا عنصر نظر نہیں آیا۔الفاظ کمرے میں بکھرتے رہے، برف کی طرح سرد اور راکھ کی طرح مٹیالے الفاظ۔انہوں نے کمرے کو آہستہ آہستہ ایک کرکری ریت کی طرح کی ناخوشگوار چیز سے بھر دیا۔ایسا معلوم ہوتا تھا۔کہ یہ تقریر جس میں اتنے بھاری بھرکم الفاظ تھے،لیکن جس میں نام کو بھی کوئی تاثیر نہیں تھی، پاویل اور اس کے ساتھی سن نہیں رہے تھے یا کم از کم ان پر کئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔وہ لوگ اسی طرح اطمینان اور سکون سے بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔کبھی مسکراتے کبھی ہنسی چھپانے کے لئے منہ بناتے۔

''جھوٹ بول رہا ہے'' سیزوف نے دھیرے سے کہا۔

وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔اس نے وکیل سرکار کے الفاظ سنے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بلا تخصیص تمام قیدیوں پر الزام لگا رہا ہے۔ پاویل کی باتیں کرتے کرتے اس نے فیدور کی بات شروع کی دی اور فیدور کے متعلق کہہ چکنے کے بعد بوکن کے متعلق کچھ کہنا شروع کر دیا۔ایسا لگتا تھا جیسے وہ ان سب کو ایک ہی تھیلے میں بڑی احتیاط سے بھر رہا ہو۔لیکن اس کے الفاظ کے لفظی معنوں سے وہ مطمئن نہیں تھی جنہوں نے نہ تو اس پر کوئی اثر کیا اور نہ اس میں کوئی غصہ یا خوف پیدا کیا۔وہ کسی خوفناک چیز کی اب تک منتظر تھی اور اس کے الفاظ سے پرے کچھ تلاش کر رہی تھی۔اس کے چہرے میں،آنکھوں میں،آواز میں، اس کے سفید ہاتھوں میں جو بڑی لطافت کے ساتھ ہوا میں لہرا رہے تھے۔لیکن اس کے باوجود یہاں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس سے خوف معلوم ہوتا تھا۔اسے اس کا احساس تھا لیکن اپنے دل کے آگاہ کرنے کے باوجود وہ اس پر انگلی رکھ کر کہہ نہیں سکتی تھی کہ یہ چیز ہے جس سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔

اس نے ججوں کی طرف دیکھا۔صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ اس تقریر سے اکتا گئے ہیں،ان کے بے جان خشک زرد چہروں پر کسی قسم کے جذبات کے آثار نہیں تھے۔وکیل سرکار کے الفاظ ایک ایسا غبار بن گئے۔جو نظر نہیں آ رہا تھا جو ججوں کے چاروں طرف چھاتا چلا جا رہا تھا اور انہیں بے تعلقی اور تھکے انتظار کے پردے میں لپیٹے لے رہا تھا۔ بڑا جج تن جکر سیدھا بیٹھا ہوا تھا،اور بعض اوقات اسکی عینک کے پیچھے کے خاکی نقطے پگھل کر اس کے بے جان چہرے کی وسعتوں میں گم ہو جاتے تھے۔

اور ماں نے اس سرد بے نیازی، اس بے روح بے تعلقی کی طرف دیکھا تو اپنے آپ سے سوال کئے بغیر نہ رہ سکی:

''کیا یہ لوگ سچ مچ فیصلہ سنانے کے لئے جمع ہوئے ہیں؟''

اس سوال سیاس کا دل سکڑنے سا لگا۔ رفتہ رفتہ خوف تو دل سے نکل گیا اور صرف ایک شدید تکلیف کا احساس باقی رہ گیا۔

وکیل سرکار کی تقریر غیر متوقع طور پر ختم ہوگئی۔ اس نے آخری جملے تیزی سے کہے، ججوں کے سامنے جھکا اور بیٹھ کر ہاتھ ملنے لگا۔ میر دربار نے سر کے اشارے سے تعریف کی اور آنکھیں گھمانے لگا، میئر نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور حاکم ضلع صرف اپنی توند کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جج اس کی تقریر سے کچھ خوش نہیں ہوئے۔ وہ لوگ اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔

''اب'' بوڑھے شخص نے ایک کاغذ اٹھا کر پڑھتے ہوئے کہا۔ ''عدالت فیدوسیف، مارکوف اور زاگاروف کی طرف سے صفائی کے وکیل کی جرح سنے گی۔''

ماں نے نکولائی کے یہاں جس وکیل کو دیکھا تھا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بڑا بھولا سا چہرہ تھا، چھوٹی چھوٹی آنکھیں سرخی مائل بھوؤں کے نیچے سے تیز دھار کی طرح چمک رہی اور فضا کو قینچی کی طرح کاٹ رہی تھیں، وہ اونچی واضح آواز میں رک رک کر بول رہا تھا لیکن ماں اس کی تقریر پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔

''سمجھیں اس نے کیا کہا؟'' سیزوف نے اس کے کان میں کہا۔ ''سمجھیں؟ کہتا ہے قیدی بہت پریشان تھے، نیم پاگل ہوگئے تھے۔ میرے فیدور کے لئے تو یہ بات بالکل ٹھیک نہیں بیٹھتی!''

یاس و نا امیدی سے وہ اتنی مغلوب ہو چکی تھی کہ جواب ہی نہ دے سکی۔ تکلیف کا احساس بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس کے دل پر ایک بوجھ بن کر چھا گیا۔ اب پلاگیا کی سمجھ میں آگیا کہ اس نے انصاف کی توقع کیوں کی تھی۔ اسے توقع تھی کہ اس کے بیٹے اور اس پر الزام لگانے والوں کا غیر جانب داری اور ایماں داری کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ کیا جائے گا۔ اسے امید تھی کہ جج اس کے بیٹے سے بہت دیر تک غور و فکر کے ساتھ سوالات کریں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس کے دل و دماغ میں کیا خیالات پیدا ہو رہی ہیں، وہ سمجھتی تھی کہ وہ لوگ اس کے تمام خیالات اور کارگزاریوں کو گہری نظر سے دیکھیں گے، اور جب انہیں سچائی نظر آجائے گی تو وہ لوگ واضح الفاظ میں اعلان کر دیں گے:

''یہ شخص بالکل سچ کہتا ہے!''

لیکن اس قسمکی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جن لوگوں پر مقدمہ چل رہا ہے وہ اتنی دور ہیں کہ ججوں کی نگاہیں وہاں تک پہونچتی ہی نہیں اور یہ کہ قیدیوں کی نظروں میں ججوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ تھکن نے مقدمے کے ساتھ ماں کی ساری دلچسپی ختم کردی اور کچھ سنے بغیر سوچتی رہی:

''اس کو مقدمہ کہتے ہیں؟''

''اچھی بات کہی!'' سیزوف نے دھیرے سے تعریف کی۔

اب کوئی دوسرا وکیل بول رہا تھا۔ اس کے زرد چہرے کے خطوط واضح تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے مذاق اڑا رہا ہوا۔ جج اسے بار بار ٹوک رہے تھے۔

وکیل سرکار غصے میں اٹھ کھڑا ہوا ضبط کے متعلق کوئی بات کہی۔ اس کے بعد بوڑھے شخص نے بہت آہستہ سے ملامت کی۔ صفائی کے وکیل نے مودبانا طریقے سے سر جھا کر یہ سب کچھ سنا اور پھر اپنی تقریر جاری رکھی۔

''بولے جاؤ'' سیزوف نے کہا۔ ''اس وقت تک بولے جاؤ جب تک پتے کی بات نہیں کہتے۔''

کمرے میں تعریفی جملے سنائی دیے۔ وکیل نے ججوں کی موٹی کھال پر چبھتے ہوئے الفاظ کی بارش شروع کی تو لوگوں کی جارحانہ قوت ابھر آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ جج ایک دوسرے کے نزدیک آکر کچھ منہ لٹکائے چڑ چڑے انداز میں بیٹھے تھے تاکہ اس کی تقریر کے حملوں سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

اب پاویل کھڑا ہوا اور دفعتاً کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ماں آگے کو جھکی۔ پاویل بڑی متانت سے بول رہا تھا:

''پارٹی ممبر کی حیثیت سے میں صرف اپنی پارٹی کے فیصلے کو تسلیم کرتا ہوں اور اس لئے میں اپنی صفائی میں کچھ نہ کہوں گا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کی درخواست پر، جنہوں نے خود بھی صفائی پیش کرنے سے انکار کر دیا ہے میں وہ باتیں سمجھانے کی کوشش کروں گا، جو آپ کی سمجھ میں نہیں آئی ہیں۔ وکیل سرکار نے کہا ہے کہ سوشل ڈیموکریسی کے پرچم کے نیچے ہمارا مظاہرہ حکمران قوت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ بلکہ وہ تو ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ ہم لوگ زار کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں، میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری نظر میں استبدادی شخص حکومت وہ واحد زنجیر نہیں ہے جس نے ہمارے ملک کو جکڑ رکھا ہے۔ یہ تو

سب سے پہلی اور سب سے نزدیک کی زنجیر ہے جس سے عوام کو نجات دلانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں...''

اس کی رعب دار آواز کی گونج میں خاموشی اور بھی گمبھیر ہوگئی اور ایسا لگتا تھا جیسے عدالت کے کمرے کی دیواریں پیچھے کی طرف کھسک رہی ہیں اور پاویل اونچا اٹھ کر کہیں دور کھڑا کر دیا گیا ہے۔

جج اپنی کرسیوں پر بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے، میر دربار نے بے جان سے جج کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلا کر بوڑھے جج کے سیدھے کان میں کچھ کہا اور بیمار جج نے اس کے الٹے کان میں۔ بوڑھے نے دائیں، بائیں دونوں طرف کے نرغے کے درمیان زور سے کچھ کہا لیکن اس کی آواز ولاسوف کی تقریر کے وسیع اور ہموار بہاؤ میں گم ہوگئی۔

''ہم اشتراکی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نجی ملکیت کے خلاف ہیں، یہ وہ نظام معیشت ہے جو سماج میں انتشار پیدا کرتا ہے، لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیتا ہے، مختلف مفادات کے درمیان ناقابل مصالحت دشمنی پیدا کر دیتا ہے اور اس دشمنی کو چھپانے یا اسے جائز ثابت کرنے کیلئے مکر وفریب کے ہتھیار استعمال کرتا ہے اور لوگوں کو نفرت، جھوٹ، دغا اور غلط کاریوں کے ذریعہ ذلیل بنا دیتا ہے۔ ہمارا کہنا ہے کہ ایسا سماج جو ایک فرد کو ذاتی منفعت کا صرف ایک ذریعہ سمجھے غیر انسانی ہے اور ہمارے مفاد کے خلاف ہے۔ ہم اس کے جھوٹے اور دوغلے نظام اخلاق کو تسلیم نہیں کرتے۔ فرد کی طرف اس کا جو غیر انسانی اور بے رحمانہ رویہ ہے اس کی ہم مذمت کرتے ہیں، ہم ان تمام جسمانی اور اخلاقی غلامی کی شکلوں کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں، اور لڑتے رہیں گے، جو یہ سماج افراد پر مسلط کرتا ہے، ان تمام چیزوں کے خلاف لڑتے رہیں گے جن کے ذریعہ انسانوں کو خودغرضانہ حرص کے لئے کچلا جاتا ہے۔ ہم مزدور ہیں، ایسے انسان ہیں جن کی محنت سے بچوں کے کھلونوں سے لے کر دیوہیکل مشینوں تک ہر چیز بنتی ہے لیکن ہم ہی وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی انسانیت کا بچاؤ کرنے کا حق بھی نہیں۔ ہر شخص ہمیں اپنے ذاتی منفعت کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ فی الحال ہم اس حد تک آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جو بالاخر ہمیں اس قابل بنا دے گی کہ سارا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ ہمارے نعرے بہت سادھے ہیں: 'نجی ملکیت مردہ باد!'، 'تمام ذرائع پیداوار عوام کے ہاتھ میں ہوں!'، 'محنت ہر شخص کا فرض ہے!'، ان باتوں سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں ہم صرف باغی نہیں ہیں!''

پاویل ایک مختصر ہنسی ہنسا اور پھر اپنی انگلیوں سے سر میں کنگھی کرنے لگا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں کی

چمک کچھ اور تیز ہوگئی تھی۔

''میں کہتا ہوں کہ بے تعلق بات مت کہو'' بوڑھے جج نے اونچی آواز میں واضح طور پر کہا۔ اس نے مڑکر پاویل کی طرف دیکھا اور ماں کو محسوس ہوا کہ اس کی بے جان سی بائیں آنکھ میں ایک روشنی چمکی جس میں لالچ تھا اور کمینگی تھی۔ تمام ججوں نے اس کے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ان لوگوں کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں، جیسے اس کی قوت کو نچوڑ رہے ہوں، جیسے اس کے خون کے پیاسے ہوں تاکہ خود ان کے مردہ جسموں میں دوبارہ جان پڑ جائے لیکن وہ دراز قامت اور سیدھا وہاں کھڑا ہوا تھا۔ قوی اور جری۔ اور ہاتھ کے اشارے سے کہتا جا رہا تھا:

''ہم انقلابی ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک کچھ لوگ صرف حکمرانی کرتے ہیں اور دوسرے صرف محنت کرتے ہیں۔ ہم اس سماج کے خلاف ہیں جس کے مفاد کو بچانے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے، ہم اس کے جانی دشمن ہیں اور تمہارے بھی، اور ہم دونوں کے درمیان اس وقت تک کسی قسم کی مصالحت ممکن نہیں جب تک کہ ہم اس جنگ میں جیت نہ جائیں اور ہم مزدور یقیناً جیتیں گے! تمہارے آقا اتنے طاقتور نہیں جتنا کہ ان کا اپنا خیال ہے وہی نجی ملکیت جس کے اضافے اور حفاظت کے لئے وہ لوگ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں، وہی قوت جو انہیں ہم پر غلبہ حاصل کرنے دیتی ہے، وہی خود ان کے درمیان پھوٹ ڈالتی ہے اور انہیں جسمانی اور اخلاقی طور پر ختم کر دیتی ہے۔ نجی ملکیت کی حفاظت کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ دراصل تم سب لوگ جو کہ ہمارے آقا ہو ہم سے زیادہ غلام ہو، تمہاری غلامی روحانی ہے۔ ہماری صرف جسمانی۔ تم اس قابل نہیں کہ عادت اور تعصب کے جوے کو کاندھے سے ہٹا سکو۔ یہ وہ جوا ہے جس نے تمہیں روحانی طور پر قتل کر دیا ہے۔ لیکن ہمیں کوئی قوت روحانی طور پر آزاد ہونے روک نہیں سکتی۔ وہ زہر جو تم ہمیں کھلاتے ہو وہ اس تریاق کے مقابلے میں بہت کمزور ہے جو تم۔ اپنی مرضی کے خلاف ہی سہی۔ ہمارے شعور میں پٹکا دیتے ہو۔ سچائی کے متعلق ہمارا علم مسلسل بڑھ رہا ہے اور بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے، بہترین لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے، خود تمہارے حلقے میں ایسے لوگ کھنچ کر آ رہے ہیں جو روحانی طور پر آزاد ہیں۔ ذرا خود دیکھو۔ کوئی بھی تو نہیں جو تمہارے طبقے کی طرف سے اخلاقی جواز پیش کر سکے۔ تمہارے سارے دلائل ختم ہو چکے ہیں جو تمہیں تاریخی انصاف کے زبردست دباؤ سے محفوظ کر سکتے تھے۔ تم اس قابل کہ نئے خیالات کو جنم دے سکو۔

روحانی اعتبار سے تم بانجھ ہو چکے ہو۔ ہمارے خیالات پروان چڑھ رہے ہیں، روشن سے روشن تر ہوتے جا رہے ہیں، لوگوں کی ہمتیں بندھا رہے ہیں اوران کی آزادی کی جدوجہد کو منظّم کر رہے ہیں۔ مزدور طبقہ جو اہم پارٹ ادا کرنے والا ہے اس کا علم ساری دنیا کے مزدور طبقے کو متحد کر کے ایک عظیم قوت بنائے دے رہا ہے اور تمہارے پاس بے رحمی اور انسان دشمنی کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں جس کے ذریعے تم اس نئی شکتی کا مقابلہ کر سکو جو وہ اس دنیا میں لا رہے ہیں۔ لیکن انسان دشمنی کی صورت چھپتی نہیں اور بے رحمی سے غصہ پیدا ہوتا ہے۔ آج وہ ہاتھ جو ہمارے گلوں کو دبانے کے لئے اٹھ رہے ہیں کل ہماری رفیقانہ مصافے کے لئے بڑھیں گے۔ تمہاری شکتی سونے میں اضافہ کرنے کی بے روح شکتی ہے۔ یہ پھوٹ ڈال کر تمہیں ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہے جو ایک دوسرے کو کھا جانے پر مجبور ہیں۔ ہماری قوت کا انحصار تمام محنت کشوں کے اتحاد کے مضبوط اور ہمیشہ بڑھتے ہوئے شعور پر ہے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ مجرمانہ ہے کیونکہ اس کا مقصد لوگوں کو غلام بنانا ہوتا ہے۔ تمہارے جھوٹ اور لالچ اور تمہاری بدمعاش نے بھوت پریت اور دیووں کی ایک دنیا کھڑی کر دی ہے جس سے لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے ہو۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانوں کو ان بھوتوں سے آزاد کرائیں۔ تم نے انسان کو زندگی سے الگ کر لیا اور اسے ختم کر دیا ہے۔ اشتراکیت تمہاری اس برباد کی ہوئی دنیا کو اپنے ہاتھ میں لے گی اور اس کی نئی تعمیر کر کے ایک مکمل اور عظیم دنیا کیشکل دے گی۔ یہ ہو کر رہے گا!''

پاویل ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر اس نے زیادہ مضبوط لیکن نرم لہجے میں کہا:

''یہ یقیناً ہو کر رہے گا!''

ججوں نے آپس میں کچھ کانا پھوسی کی اور پاویل کے چہرے کی طرف سے نظریں ہٹائے بغیر عجیب عجیب سے منہ بنائے۔ اور ماں کی ایسا محسوس ہوا کہ یہ لوگ اپنی نگاہوں سیاس کے مضبوط جسم کو ناپاک کئے دے رہے ہیں جیسے اس کی صحت، اس کی طاقت اور اس کی تازگی ان کی نظروں میں کھٹک رہی ہو۔ قیدی اپنے ساتھی کی تقریر بڑی محویت سے سن رہے تھے۔ چہرے زرد تھے اور آنکھوں میں خوشی ناچ رہی تھی۔ ماں اپنے بیٹے کا ایک ایک لفظ پی رہی تھی اور اس کے سارے الفاظ اس کے ذہن میں صفیں بنا کر جمتے چلے جا رہے تھے بوڑھے جج نے پاویل کو ٹوک ٹوک کر کچھ وضاحت کرنی چاہی اور ایک بار تو اس کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ بھی نمودار ہو گئی۔ پاویل ہر بار رک کر اس پر سکون عزم کے ساتھ تقریر شروع کرتا کہ

لوگ سننے پر مجبور ہو جاتے۔ اس نے ججوں کی خواہش کو اپنی مرضی کے تابع کر لیا تھا۔لیکن آخرکار بوڑھے جج نے چیخ کر ہاتھ بڑھایا۔لیکن جواب میں پاویل کی آواز میں صرف طنز پیدا ہو گیا:

''میں اب اپنی بات ختم ہی کر رہا ہوں۔ میرا ہرگز یہ منشا نہیں ک ہ آپ کو ذاتی طور پر ناراض کروں۔ اس کے برخلاف میں یہاں بیٹھے بیٹھے اپنی مرضی کے خلاف اس تماشے کو دیکھتا رہا جسے آپ مقدمہ کہتے ہیں تو مجھے آپ لوگوں پر ترس سا آ گیا۔ آپ بھی بہرحال انسان ہیں اور ہم جب کبھی دیکھتے ہیں کہ انسان، خواہ وہ ہمارے مقصد کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں، وحشیانہ قوت کی خدمت میں اتنی بے شرمی سے نیچے گر گئے ہیں کہ ان میں انسانی وقار کا احساس تک باقی نہیں رہ گیا تو ہمیں غصہ آ جاتا ہے...''

ججوں کی طرف دیکھے بغیر وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور ماں نے سانس روک کر ان لوگوں پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔

آندری نے پاویل کا ہاتھ دبایا تو اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ سموئیلوف، مازن اور دوسرے ساتھی اس کی طرف جھکے اور پاویل اپنے ساتھیوں کے جوش کو دیکھ کر کچھ گھبرا مسکرانے لگا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا اور سر سے اس طرح اشارہ کی جیسے سوال کر رہا ہو:

''مطمئن تو ہو نا!''

خوشی کا ٹھنڈا سانس اس کا جواب تھا۔ محبت کی لہر نے اس کے چہرے کو تمتما دیا تھا۔

''اب اصلی مقدمہ شروع ہوا ہے'' سیزوف نے سرگوشی کی۔ ''بہت منہ توڑ جواب دیا۔ کیوں؟''

اس نے جواب دیئے بغیر گردن ہلا دی۔ اسے خوشی تھی کہ اس کا بیٹا اتنی جرأت سے بولا تھا۔ شاید زیادہ خوشی اس کی تھی کہ اس نے تقریر ختم کر دی۔ ایک سوال اس ذہن میں کوندتا رہا:

''یہ لوگ اب کیا کریں گے؟''

اس کے بیٹے نے کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جو اس کے لئے نئی ہو۔ وہ اس کے تمام خیالات سے واقف تھی، لیکن یہاں، اس عدالت کے سامنے اس نے پہلی بار اس کے اعتقاد کی عجیب وغریب کشش کو محسوس کیا۔ پاویل کی متانت اور سکون سے وہ حیران تھی اور اس کی تقریر ماں کی نظروں میں ایک ایسے

روشن ستارے کی مانند تھی جو اس کی عظیم مقصد اور اس مقصد کی آخری فتح میں یقین کامل کی جیتی جاگتی، جگمگاتی علامت ہو۔ اسے امید تھی کہ اب جج اس سے گرما گرم بحث شروع کریں گے، غصے میں اس کی تردید کریں گے اور خود اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ لیکن آندری کھڑا ہوا، کچھ جھوم کر اپنی جھوؤں کے نیچے سے ججوں کو دیکھا اور بولا:

''عذر داری کرنے والے حضرات...''

اس وقت تم ججوں سے مخاطب ہو کسی عذر داری کرنے والے سے نہیں'' بیمار جج نے اونچی غضبناک آواز میں کہا۔ ماں نے دیکھا کہ آندری کے چہرے پر شرارت کھیل رہی ہے۔ اس کی مونچھیں کانپ رہی تھیں اور ماں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں ایک بلی کی طرح انتقامی شعلے کی روشنی سے چمک رہی تھیں۔ اپنے سر کو لمبے دبلے ہاتھ سے زور سے رگڑ کر اس نے گہرا سانس لیا۔

''اچھا؟'' وہ بولا۔ ''میرا خیال تھا کہ آپ لوگ جج نہیں بلکہ عذر داری کرنے والے ہیں...''

''میں کہتا ہوں، مطلب کی طرف آؤ!'' بوڑھے شخص نے روکھے پن سے کہا۔

''مطلب کی بات؟ بہت خوب۔ اب فرض کیجئے کہ میں کوشش کر کے یہ یقین کر لوں کہ آپ لوگ سچ مچ جج ہیں، باعزت ہیں، آزاد خیال ہیں...''

''عدالت کو تمہاری سفارش کی ضرورت نہیں!''

''اچھا یہ بات ہے؟ بہر حال میں بات جاری رکھتا ہوں... تو یہ سمجھ لیا جائے کہ آپ لوگ غیر جانبدار لوگ ہیں، کسی کی طرف سے کوئی تعصب نہیں ہے، اپنا اور پرایا نہیں جانتے۔ دو آدمی آپ کے سامنے لائے جاتے ہیں، ایک کہتا ہے 'اس نے مجھے لوٹ لیا اور مار مار کر ادھ موا کر دیا'۔ دوسرا کہتا ہے: 'مجھے لوگوں کو لوٹنے اور مار مار کر ادھ موا کر دینے کا حق ہے کیونکہ میرے پاس بندوق ہے'...''

''تم مطلب کی بات نہیں کہہ سکتے؟'' بوڑھے شخص نے آواز بلند کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ماں کو خوشی کہ اسے غصہ آ رہا تھا۔ لیکن آندری کے رویے سے وہ ناخوش تھی۔ یہ بات اس کے بیٹے کی تقریر سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ وہ چاہتی کہ ان لوگوں کے دلائل میں سنجیدگی اور وقار ہو۔

خوخول نے بات جاری رکھنے سے پہلے بوڑھے شخص کی طرف خاموشی سے دیکھا۔

''مطلب کی بات؟'' اس نے ماتھا پونچھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے مطلب کی بات کیوں کروں؟ فی الحال تم سے جو کچھ کہنا تھا وہ میرے ساتھی نے ابھی ابھی کہہ دی اجب وقت آئے گا تو دوسرے لوگ باقی باتیں بتائیں گے...''

بوڑھا شخص کرسی سے اٹھ کر چلایا:

''خوخول نے ہونٹ بھینچ لئے اور آہستہ سے بنچ پر بیٹھ گیا۔ سموئلوف اس کے نزدیک ہی کھڑا ہو کر اپنے گھنگھریالے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے ڈالنے لگا۔

''وکیل سرکار نے میرے ساتھیوں کو جنگلی اور تہذیب وتمدن کا دشمن کہا ہے...''

''صرف وہی بات کرو جس سے تمہارے مقدمے کا تعلق ہے۔''

''اس کا تعلق ہے۔ ایسی کون سی بات ہے جس سے ایماندار لوگوں کا تعلق نہ ہونا چاہئے، اور مہربانی کر کے مجھے ٹوکئے مت۔ تمہاری تہذیب وتمدن ہے کیا۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں؟''

''ہم یہاں تم سے بحث کرنے نہیں آئے ہیں! کام کی باتیں کرو!'' بوڑھے شخص نے اپنے نچلے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

آندری کے رویہ سے ججوں میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے الفاظ نے کوئی چیز ادھیڑ دی ہو، ان کے مٹیالے چہروں پر دھبے آ گئے اور آنکھوں میں غصے کی سرد چمک پیدا ہو گئی۔ پاویل کی تقریر سے انہیں غصہ آیا تھا لیکن اس کے الفاظ کی قوت نے مجبور کر دیا تھا کہ اس کی عزت کریں اور غصے کا اظہار نہ کریں۔ خوخول نے ضبط کے اس پردے کو چاک کر دیا اور جو کچھ نیچے تھا وہ نظر آنے لگا تھا۔ ان لوگوں نے آپس میں سرگوشیاں کیں اور عجیب عجیب منہ بنا کر غیر معمولی طور پر ہاتھوں کو ہلانا شروع کیا۔

''تم لوگوں کو جاسوسی کی تربیت دیتے ہو، تم عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کو خراب کرتے ہو، تم انسانوں کو چور اور قاتل بنا دیتے ہو، تم ان کے خون میں وودکا، بین الاقوامی لڑائیوں، جھوٹ، عیاشی اور بربریت کا زہر گھول دیتے ہو۔ یہ ہے تمہاری تہذیب! ہم ایسی تہذیب کے دشمن ہیں!''

''میں کہتا ہوں...'' بوڑھا شخص چلایا۔ لیکن سموئلوف کا چہرہ تمتما رہا تھا آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ بھی جواب میں چلایا:

''ہم اس دوسری تہذیب کی عزت کرتے ہیں جس کی وکالت وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں تم سڑانے

کے لئے اور پاگل کرنے کے لئے جیل میں ڈالتے ہو!...''

''خاموش! دوسرا ملزم۔فیدور مازن!''

فیدورا چھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک نوک دار خنجر کی طرح سیدھا اور دبلا پتلا تھا۔

''میں۔قسم کھاتا ہوں کہ میں برابر اپنا کام کرتا رہوں گا! میں جانتا ہوں کہ سزا کا فیصلہ تو تم پہلے ہی کر چکے ہو'' وہ سانس لینے کے لئے رکا اور اتنا زرد پڑ گیا کہ ایسا معلوم ہوا کہ صرف اس کی آنکھیں باقی رہ گئی ہیں۔''میں۔عہد کرتا ہوں!'' اس نے ہاتھ آگے کی طرف بڑھا کر کہا۔''تم جہاں جی چاہے مجھے بھیجو میں بھاگ کھڑا ہوں گا اور ہمیشہ کام کرتا رہوں گا۔ساری عمر۔میں قسم کھا کے کہتا ہوں!''

سیزوف زور سے غرایا اور اپنی نشست پر کسمسا کر رہ گیا۔عام لوگوں میں کچھ عجیب سی آوازوں کی بھنبھناہٹ شروع ہوگئی۔لوگوں میں آہستہ آہستہ جوش بڑھتا جارہا تھا۔ایک عورت نے سسکیاں بھریں اور کسی پر کھانسی کا دورہ پڑا۔پولیس والوں نے قیدیوں کی طرف حیرت اور لوگوں کی طرف غصے سے دیکھا۔ جج کرسیوں میں جھولا سا جھولتے رہے اور بوڑھے شخص نے چیخ کر کہا:

''دوسرا ملزم۔ایوان گوسیف!''

''مجھے کچھ کہنا نہیں ہے!''

''دوسرا۔واسیلی گوسیف!''

''مجھے بھی کچھ نہیں کہنا!''

''فیدور بوکن!''

وہ سفید چہرے والا شخص جس کے جسم سے معلوم ہوتا تھا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہے، مشکل سے اپنی جگہ سے اٹھا۔

''تم لوگوں کو شرم آنی چاہئے'' اس نے اپنا سر ہلا کر کہا۔''میں بہت دیر میں سمجھ پاتا ہوں لیکن میری سمجھ میں آگیا ہے کہ انصاف کیا ہے؟''

اس نے اپنا بازو اوپر اٹھایا اور خاموش ہو گیا آنکھیں آدھی بند کرلیں جیسے کسی دور کی چیز کی طرف دیکھ رہا ہو۔

''یہ کیا بات ہے؟'' بوڑھے شخص نے کچھ حیرت زدہ ہو کر غصے سے کہا اور کرسی کی پیٹھ سے ٹک گیا۔

''تمہاری ایسی تیسی...''

بوکن بیزاری سے بیٹھ گیا۔اس کے سخت الفاظ میں کوئی بہت اہم بات تھی،کوئی ایسی بات جس میں معصومیت اور رکھ بھری ملامت شامل تھی۔ ہر شخص نے اسے محسوس کیا،ججوں نے بھی کان کھڑے کئے، جیسے صدائے بازگشت کا انتظار کر رہے ہوں جو شاید بوکن کے الفاظ سے بھی زیادہ واضح ہوگی۔لوگوں کے درمیان خاموشی چھا گئی،صرف کچھ رونے کی سی آوازیں آرہی تھیں۔آخر وکیل سرکار نے اپنے کاندھے جھٹکے اور مختصر ہنسی ہنسا،میر دربار نے کھانسنا شروع کیا اور عدالت کے کمرے میں پھر کانا پھوسی ہونے لگی۔

''کیا اب جج کچھ کہیں گے؟'' ماں نے سیزوف سے سرگوشی کے انداز میں سوال کیا۔

''سب چیز ختم ہوگئیں۔بس اب سزا باقی ہے...''

''اور کچھ بھی نہیں؟''

''نہیں...''

اسے یقین نہیں آیا۔

سموئلوف کی ماں بنچ پر بے چینی سے ادھر ادھر ہو رہی تھی اور پلاگیا کو کاندھوں اور کہنیوں سے دھکے دئے جا رہی تھی۔

''یہ کیا بات ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے اپنے شوہر سے سوال کیا۔

''تم خود ہی دیکھ لونا۔ ہر چیز ممکن ہے۔''

''اپنے گریشا کو کیا سزا دیں گے؟''

''ارے خاموش بھی رہو!''

ہر شخص کو کسی خلاف قاعدہ بات کا،کسی قسم، کی بدنظمی اور بدعنوانی کا،کسی چیز کے ٹوٹ جانے کا احساس تھا۔لوگ جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہے تھے جیسے کچھ سمجھ ہی میں نہیں آرہا ہو، جیسے ان کی نظروں کے سامنے کسی ڈھیر میں آگ لگی ہوئی ہو اور اس کے خطوط صاف نظر نہ آرہے ہوں،اس کی اہمیت سمجھ میں نہ آرہی ہو،لیکن جس کی قوت اپنی طرف کھینچے لئے جا رہی ہو۔ایک بہت عظیم الشان چیز نے انہیں اپنی صورت دکھائی تھی لیکن چونکہ وہ اسے سمجھ نہ سکے تھے اس لئے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے جو ان کی سمجھ میں آگئی تھیں۔

''اچھا سنو۔ ان لوگوں کو کچھ کہنے کا موقع کیوں نہیں دیا جاتا؟'' بڑے بوکن نے اونچی آواز میں سرگوشی کی۔ ''سرکاری وکیل تو جو جی میں آیا اسے خوب بولنے کی اجازت دی...''

بنچوں کے پاس ایک عہدہ دار کھڑا ہو گیا اور لوگوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''خاموش، خاموش...'' اس نے ڈانٹا۔

سموئلوف اپنی بیوی کے پیچھے جھکا اور اٹک اٹک کر بولا:

''اچھا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ لوگ مجرم ہیں تب بھی انہیں صفاء پیش کرنے کا موقع تو دینا چاہئے! یہ لوگ کس کے خلاف ہیں؟۔ یہی تو میں پوچھنا چاہتا ہوں! مجھے بھی تو اپنا فائدہ عزیز ہے...''

''ہش!'' عہدے دار نے سموئلوف کی طرف انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔

سیزوف نے افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔

ماں ججوں کو دیکھتی رہی اس نے محسوس کیا کہ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے کرتے وہ لوگ کچھ جوش میں آ رہے تھے۔ ان کی باتوں جکی سرد اور لجلجی آواز سن کر ماں کے کلے کانپنے لگے اور اسکے منہ مزا خراب ہو گیا۔ کسی وجہ سے اسے ایسا محسوس کہ یہ لوگ اس کے بیٹے اور اس کے ساتھیوں کے جسموں، ان کے نوجوان رگ پٹھوں اور اعضا کی باتیں کر رہے ہیں جن میں گرم خون گردش کر رہا ہے، جن میں زندگی کی فراوانی ہے ایسے جسم دیکھ کر ان کے دلوں میں فقیروں جیسا کمینہ حسد، بیماروں اور ناکارہ لوگوں جیسا بے ہودہ لالچ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ چٹخارے لے لے کر ایسے جسموں پر رشک کر رہے تھے جو محنت کرنے اور دولت پیدا کرنے، تخلیق کرنے اور لطف اٹھانے کے قابل تھے۔ اب یہ جسم زندگی کی عام رو سے ہٹائے جا رہی تھے، مسترد کئے جا رہے تھے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ان جسموں کو خریدا نہیں جا سکتا، لوٹا نہیں جا سکتا، کچلا نہیں جا سکتا۔ اور اسی وجہ سے ان نوجوانوں کو دیکھ کر بوڑھے ججوں کے دلوں میں ایسے کمزور خونخوار جانوروں کا تکلیف دہ انتقامی غصہ پیدا ہو رہا تھا، جنہیں اپنی تازہ غذا سامنے نظر آتی ہے لیکن جھپٹ کر اسے پکڑنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ خونخوار جانور، جواب دوسرے جانوروں سیا پنا پیٹ بھرنے کی سکت نہیں رکھتے لیکن کھانے کا سامان سے جاتے ہوئے دیکھ کر صرف غرا سکتے ہیں۔

ججوں کو اور غور سے دیکھنے کے بعد یہ عجیب وغریب ناتراشیدہ خیالات اس کے ذہن میں واضع شکل اختیار کرنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ لوگ اپنے بھوکے درندوں کے سے لالچ اور ناکارہ غصے

کو جو پہلے تر مال اڑانے کی لذت سے اشنا تھے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہے۔ایک عورت، ایک ماں کے لئے جسے اپنے بیٹے کا جسم بہرحال اس چیز سے زیادہ عزیز تھا جسے روح کہتے ہیں یہ منظر کتنا تکلیف دہ تھا کہ ججوں کی بے نور نظریں اس کے بیٹے کے چہرے پر رینگ رہی تھیں، اس کے سینے، اس کے شانوں، اس کے بازوؤں کو چھو رہی تھیں، اس کے نوجوان جسم کو ٹٹول رہی تھیں، جیسے ہر حرکت خود ان کے مردہ رگ پٹھوں میں خون کو گرما دے گی۔ان نوجوانوں کے تصور سے جو شہوت، حرص اور حسد ان کے دلوں میں پیدا ہوا تھا اس سے ان لوگوں میں کچھ جان سی پڑ گئی تھی۔ان نوجوانوں کے تصور سے جنہیں وہ سزا دینے پر تلے ہوئے تھے اور اس طرح ہمیشہ کے لئے خود کو ان جسموں سے محروم کر رہے تھے۔اسے ایسا محسوس ہوا کہ پاویل کو ان بھیگی ناخوشگوار نگاہوں کا احساس ہے اور وہ ماں کی طرف کچھ کانپ کر دیکھ رہا ہے۔

پاویل اس کی طرف متانت اور محبت سے دیکھ رہا تھا۔اس کی نظروں میں تھکن کی ایک خفیف سی جھلک تھی۔کبھی کبھی وہ اس کی طرف دیکھ کر سر کو جنبش دیتا اور مسکرا دیتا۔

''بہت جلد۔آزادی!''اس کی مسکراہٹ میں وہ یہی الفاظ پڑھ سکی اور اسے کچھ تسکین ہوئی۔

دفعتاً سب جج کھڑے ہو گئے۔ماں بھی غیر ارادی طور پر کھڑی ہو گئی۔

''یہ لوگ تو چل دیئے''سیزوف نے کہا۔

''سزا طے کرنے کے لئے؟''ماں نے سوال کیا۔

''ہاں...''

وہ جو تناؤ محسوس کر رہی تھی وہ دفعتاً ٹوٹ گیا۔اور کمزوری اور تھکن نے اس پر غلبہ حاصل کر لیا۔ بھویں کانپنے لگیں اور پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔اپنے دل پر اسے تکلیف اور ناامیدی کا بھاری بوجھ محسوس ہوا اور وہ جلد ہی ججوں اور عدالت کے لئے حقارت میں تبدیل ہو گیا۔سر میں درد محسوس کر کے اس نے ماتھے پر سختی سے ہاتھ پھیرا اور سر اٹھا کے دیکھا۔قیدیوں کے رشتے دار سلاخوں کے پاس پہونچ گئے تھے اور عدالت کے کمرے میں گفتگو کا شور پیدا ہو رہا تھا۔وہ بھی پاویل کے نزدیک گئی، اس کا ہاتھ دبا کر رونے لگی، اس کے دل میں تکلیف بھی تھی اور خوشی بھی، اس وقت کچھ عجیب متضاد قسم کے جذبات میں الجھی ہوئی تھی۔پاویل اس سے محبت کی باتیں کرتا رہا اور خوخول ہنستا اور مذاق کرتا رہا۔

ساری عورتیں رو رہی تھیں لیکن اس رونے میں تکلیف سے زیادہ عادت کو دخل تھا۔کوئی ایسا شدید غم

نہ تھا جو دفعتاً کہیں سے آ گرا ہو، صرف اپنے بچوں سے ناگزیر جدائی کا حسرتناک احساس تھا۔لیکن آج کے دن کے تاثرات نے اس احساس کو بھی نسبتاً مدہم کر دیا تھا۔ ماں باپ اپنے بچوں کو کچھ ملے جلے جذبات سے دیکھ رہے تھے۔نوعمری کی طرف سے بے یقینی اور اپنی بزرگی اور برتری کا احساس احترام کے جذبے میں گھل مل گیا تھا۔ یہ تکلیف دہ خیالات کہ اب ان کی زندگی کیسے بسر ہوگی مدہم پڑتے گئے اور لوگ اس بات سے متاثر تھے کہ ان نوجوانوں نے کسی جرأت اور جوانمردی سے یہ بتایا تھا کہ ایک نئی اور بہتر زندگی کس طرح تعمیر کریں گے۔ جذبات دبے ہوئے تھے۔ کیونکہ انہیں اظہار کا موقع نہیں مل رہا تھا۔الفاظ کی خوب فراوانی تھی لیکن صرف ایسی سیدھی سادھی باتوں کے متعلق جیسے کپڑے دھوبی اور صحت کے بارے میں۔

بڑا بوکن اپنے چھوٹے بھائی کو ماتھ ہلا ہلا کر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا:

''انصاف۔یہی تو اصل مسئلہ ہے!اس کے سوا اور کچھ نہیں!''

''میری مینا کا خیال رکھنا...'' چھوٹی بھائی نے جواب دیا۔

''ضرور!...''

سیزوف نے اپنے بھتیجے کا ہاتھ پکڑ کر کہا:

''فیدور، اس کے معنے ہیں کہ تم ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہو...''

فیدور نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور شرارت سے مسکرانے لگا۔سنتری بھی مسکرا دیا لیکن فوراً ہی سنجیدہ منہ بنا کر کھنکارا۔

دوسری عورتوں کی طرح ماں بھی اپنے بیٹے سے باتیں کرتی رہی۔ کپڑوں کے متعلق اور اس کی صحت کے بارے میں، لیکن اس کے سینے میں ساشا کے متعلق، خود اپنے متعلق اور اپنے بیٹے کے متعلق ہزاروں سوال تھے۔اور ان سب سے اوپر بیٹے کے لئے ایک اتھاہ محبت پرواز کناں تھی، اور یہ خواہش کہ اسے خوش کرے، اس کے دل کے نزدیک آ جائے۔ یہ خطرہ کہ اسے کچھ ہونے والا ہے دور ہوتا گیا اور اب صرف ججوں کو یاد کر کے دماغ کے کسی گوشے میں ایک خوفناک تاثر کے تحت وہ کبھی کبھی کانپ اٹھتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کے دل کے اندر ایک حسین اور روشن مسرت جنم لے رہی ہے جسے وہ پوری طرح سمجھ نہیں پا رہی تھی اور بہت جھجکتے جھجکتے قبول کر رہی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ خوخول ہر شخص سے بات کر رہا ہے اور

یہ محسوس کر کے کہ اسے پاویل سے بھی زیادہ محبت اور شفقت کی ضرورت ہے اس نے اس سے باتیں شروع کیں:

''مجھے تمہارا یہ مقدمہ کچھ پسند نہیں آیا!''

''کیوں ننکو؟'' اس کی مسکراہٹ میں شکر گذاری تھی۔ ''چکی پرانی ہو چکی ہے، لیکن چلے جاتی ہے...''

''اس نے کسی کو ڈرایا نہیں لیکن کسی کو یہ بھی نہیں بتایا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط ہے'' اس نے کچھ جھجھک کر کہا۔

''اچھا تو یہ تھا تمہارا مطلب!'' آندری بولا۔ ''تم سمجھتی ہو کہ ان لوگوں کو صداقت معلوم کرنے میں کوئی دلچسپی ہے!''

''میں سمجھتی تھی کہ کوئی بڑی خوفناک چیز ہونے والی ہے'' اس نے گہرا سانس لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''عدالت میں نظم اور خاموشی ہو جائے!''

ہر شخص جلدی سے اپنی اپنی جگہ واپس دوسرے ہاتھ میں ایک کاغذ اپنے منہ کے سامنے لئے ہوئے تھا۔ اس نے باریک آواز میں پڑھنا شروع کیا۔

''فیصلہ پڑھ رہا ہے'' سیزوف آگے جھک کر سنتے ہوئے بولا۔

کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ ہر شخص نے کھڑے ہو کر اس بوڑھے شخص پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ پستہ قد، دبلا پتلا خشک سا آدمی کچھ چھڑی سے مشابہ تھا جسے کوئی غیر مرئی ہاتھ پکڑے ہوئے ہو۔ دوسرے جج بھی کھڑے تھے۔ حاکم ضلع گردن ایک طرف جھکائے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، میئر سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے تھا، میر دربار اپنی ڈاڑھی کو سہلا رہا تھا، بیمار سا جج، اس کا گول مٹول ساتھی اور وکیل سرکار سب کے سب قیدیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ججوں کی پشت پر سے زار تصویر میں جھانک رہا تھا۔ جسم پر سرخ وردی تھی، سفید چہرے پر بے اعتنائی تھی اور اس وقت اس کے چہرے پر ایک مکھی رینگ رہی تھی۔

''جلاوطنی'' سیزوف نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔ ''شکر ہے خدا کا کہ معاملہ ختم ہوا! مجھے ڈر تھا کہ قید بامشقت نہ ہو جائے کہیں! ماں، یہ بہتر ہے۔''

''مجھے معلوم تھا کہ یہی ہونے والا ہے''اس نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔

''بہر حال اب ہمیں یقین ہو گیا۔کون جانے کیا سزا سنا دیتے...''

اس نے مڑ کر قیدیوں کی طرف دیکھا جنہیں لے جایا جا رہا تھا۔

''خدا حافظ فیدور!'' وہ چلایا۔''اور تم سب لوگوں کا بھی! خدا تمہاری مدد کرے!''

ماں نے خاموشی سے اپنے بیٹے اور دوسروں کے سلام کا جواب دیا۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن اسے روتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔

27

عدالت کے کمرے سے باہر نکلی تو اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ رات ہو گئی تھی۔ سڑکوں کے کنارے چراغ روشن ہو گئے تھے اور آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ عدالت کے پاس لوگ جمع تھے، ہوا سرد تھی اور برف چرمر کر رہی تھی۔ نوجوانوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بھورے رنگ کا راہبانہ چغہ پہنے ہوئے ایک شخص نے سیزوف کی طرف دیکھا اور جلدی سے پوچھا:

''کیا سزا دی گئی؟''

''جلاوطنی۔''

''سب کو؟''

''ہاں۔''

''شکریہ۔''

وہ شخص چلا گیا۔

''دیکھا؟'' سیزوف بولا۔''لوگوں کو دلچسپی پیدا ہو گئی ہے...''

تھوڑی دیر بعد دس بارہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے انہیں گھیر لیا اور سوالات کی بوچھار کر دی۔ انہیں دیکھ کر اور لوگ بھی مجمع میں شامل ہو گئے۔ ماں اور سیزوف رک گئے۔ ان سے سزا کے بارے میں دریافت کیا گیا، یہ پوچھا گیا کہ قیدیوں کا رویہ کیسا رہا۔ کس کس نے تقریریں کیں اور کیا کیا کہا، اور ہر سوال کے پیچھے کچھ معلوم کرنے کی ایک بے چین خواہش تھی جس کے خلوص اور تپاک کی وجہ سے اسے

تسکین پہونچانے کو جی چاہتا تھا۔

''دوستو! یہ پاویل ولاسوف کی ماں ہیں!'' کسی نے پکار کر کہا اور فوراً خاموشی ہوگئی۔

''مجھے مصافحہ کرنے کی اجازت دو!''

کسی کے مضبوط ہاتھ نے ماں کا ہاتھ تھام لیا، اور کسی کی ہیجانی آواز آئی:

''تمہارا بیٹا ہم سب لوگوں کے لئے جوانمردی کی مثال ہے۔''

''روسی مزدور زندہ باد!'' ایک اونچی آواز آئی۔

آوازیں بڑھتی گئیں، بلند ہوتی گئیں، کبھی یہاں سنائی دیتیں کبھی وہاں۔ ہر طرف سے لوگ دوڑے چلے آرہے تھے اور سیزوف اور ماں کے پاس آکر کھڑے ہو رہے تھے۔ پولیس والوں کی سیٹیوں نے چیخنا شروع کیا، لیکن ان آوازوں کو ڈبو نہ سکیں۔ سیزوف ہنسا۔ ماں کو یہ سب کچھ ایک پر مسرت خواب کی طرح معلوم ہو رہا تھا وہ مسکراتی، لوگوں کے سامنے جھکتی، ہاتھ ملا رہی تھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی تھیں، پیر تھکن سے کانپ رہے تھے لیکن اس کے محبت سے بھرپور دل میں ہر چیز اس طرح چمک رہی تھی جیسے جھیل کی صاف شفاف سطح۔

اس کے نزدیک ہی کسی نے واضح مگر گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:

''ساتھیو! آج اس دیو نے جو روسی عوام کو نگلے جا رہا ہے پھر اپنے خونی جبڑوں میں...''

''ماں اب یہاں سے چلو'' سیزوف بولا۔

اسی وقت ساشا مجمع میں داکل ہوئی اور ماں کو بازو سے پکڑ کر سڑک کے دوسرے طرف لے گئی۔

اس سے پہلے کہ پولیس والے مار پیٹ اور گرفتاریاں شروع کریں یہاں سے نکل چلو'' اس نے کہا۔ ''جلاوطنی؟ سائبیریا؟''

''ہاں، ہاں!''

''اس کی تقریر کیسی تھی؟ لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہاں وہی سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ سادہ مزاج تھا۔ اور سب سے زیادہ سخت بھی۔ وہ فطرتاً بڑا نازک مزاج اور حساس ہے لیکن اس کا اظہار کرتے اسے شرم آتی ہے۔''

اس کی محبت کے ان الفاظ نے، جو اتنی گومی سے کہے گئے تھے، ماں کو تسکین دی اور اسے نئی طاقت

محسوس ہوئی۔

''تم اس کے پاس کب جارہی ہو؟'' اس نے محبت سے ساشا کا ہاتھ دباتے ہوئے سوال کیا۔

''جیسے ہی کوئی شخص میرا کام سنبھالنے کے لئے مل جائے گا'' لڑکی نے اپنے سامنے اعتماد سے دیکھتے ہوئے کہا۔''بات یہ ہے کہ میں بھی سزا کا انتظام کر رہی ہوں۔ غالباً مجھے بھی سائبیریا بھیج دیا جائے گا۔ اگر ہوا تو میں ان سے کہوں گی مجھے بھی اسی جگہ بھیج دیں جہاں اسے بھیجا ہے۔''

''ایسی بات ہے تو میرا سلام لیتی جانا'' سیزوف کی آواز ائی۔''بس اتنا کہہ دینا 'سیزوف نے سلام کہا ہے'۔ وہ مجھ سے واقف ہے۔ فیدور مازن کا چچا...''

ساشا نے مڑ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''میں فیدور کو جانتی ہوں۔ میرا نام ساشا ہے۔''

''اور پدری نام؟''

اس کی طرف دیکھ کر ساشا نے جواب دیا:

''میرا کوئی باپ نہیں۔''

''انتقال ہو گیا؟''

''نہیں، انتقال نہیں ہوا'' لڑکی کی آواز میں بڑی سختی اور ضد تھی اور اس کے چہرے پر بھی یہی رنگ پیدا ہو گیا۔''وہ زمیندار ہے اور اب دیہی منتظم بھی ہے۔ کسانوں کو بہت لوٹتا ہے...''

''ہونہہ'' سیزوف بولا۔ اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اور وہ لڑکی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اسے کنکھیوں سے دیکھتا رہا۔

''اچھا تو خدا حافظ ماں'' آخر وہ بولا۔''میں یہاں سے الٹے ہاتھ کو جاؤں گا خدا حافظ دوست! اپنے باپ کے متعلق بڑی سخت ہو، ہے نا؟ لیکن خیر یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے...''

''اگر تمہارا بیٹا کسی کام کا نہ ہوتا، اگر وہ لوگوں کو نقصان پہونچاتا اور تم اس سے نفرت کرتے تو ایسی ہی بات نہ کہتے؟'' ساشا نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ کہتا تو شاید ایسا ہی؟'' بوڑھے شخص نے کچھ وقفے کے بعد جواب دیا۔

''اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں انصاف اپنے بیٹے سے زیادہ عزیز ہے۔ اور مجھے انصاف اپنے باپ

سے زیادہ عزیز ہے...''

سیزوف نے مسکرا کر سر ہلایا۔

''بہت تیز ہو! اگر اتنی طاقت ہے کہ اسے برقرار رکھ سکو تو ایک دن تم جوان لوگ بڑے بوڑھوں کا کامیابی سے مقابلہ کرلو گے! بڑی زندگی ہے تم میں! اچھا خدا حافظ، کرے تم کامیاب ہو! لیکن ذرا لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ تو حرج کیا ہے، کیوں؟ خدا حافظ نلوونا! پاویل سے ملنا تو کہنا کہ میں نے اس کی تقریر سنی تھی۔ پوری تو سمجھ میں نہیں آئی، کچھ باتوں سے ڈر معلوم ہوا لیکن مجموعی طور پر اچھی تقریر تھی۔''

ٹوپی اتار کر اس نے سلام کیا اور دھیرے دھیرے مڑ گیا۔

''اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے!'' اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر ساشا نے کہا۔

ماں کو ایسا محسوس ہوا کہ آج لڑکی کے چہرے پر اور دنوں کے مقابلے میں زیادہ نرمی ہے۔

گھر پہونچ کر دونوں تخت پر ایک دوسرے کے نزدیک بیٹھ گئیں اور پاویل سے ساشا کی آئندہ ملاقات کی باتیں کرنے لگیں۔ ماں کو خاموشی سے آرام سے محسوس ہوا۔ ساشا گھنی بھویں اٹھا کر پوری کھلی ہوئی، خواب آلود آنکھوں سے کہیں دور دیکھنے لگی، اس کے زرد چہرے پر ایک پرسکون غور وفکر کر آثار تھے۔

''پھر جب تمہارے بچے پیدا ہوں گے میں آ کر انہیں کھلایا کروں گی اور ہم لوگوں کی زندگی یہاں سے زیادہ بدتر نہیں ہوگی۔ پاویل کو کام ملنا زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کوئی بھی کام کرسکتا ہے...''

ساشا نے ماں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ابھی اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''اس کے لئے میرا مصرف ہی کیا؟'' ماں نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا۔ ''اگر بھاگنا چاہے تو میں بلاوجہ بیچ میں حائل ہوں گی۔ میرے جانے پر کبھی راضی نہ ہوگا۔''

ساشا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ کبھی راضی نہ ہوگا۔''

''اس کے علاوہ مجھے یہاں اپنا کام بھی تو کرنا ہے'' ماں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''ہاں'' ساشا نے جواب دیا۔ ''یہ بات ٹھیک ہے۔''

دفعتاً وہ چونک پڑی جیسے کسی چیز کو پھینک دیا ہو اور آہستہ آہستہ سادگی سے باتیں کرنے لگی:

''وہاں نہیں رہ سکتا۔ وہاں سے ضرور بھاگے گا...''

''اور تم کیا کرو گی؟ اگر بچہ ہوا تو کیا ہوگا؟''

''وقت آئے گا تو دیکھیں گے۔ میرے بارے میں اسے ابھی نہیں سوچنا چاہئے۔ میں اس کے راستے میں کبھی نہ آؤں گی۔ اس سے جدا ہونا میرے لئے بڑا مشکل ہے لیکن میں برداشت کرلوں گی۔ اس کے راستے میں کبھی حائل نہ ہوں گی!''

ماں نے محسوس کیا کہ ساشا جو کہہ رہی ہے وہ کرنے کی اہل بھی ہے اور اس لڑکی کے لئے اس کا کڑھنے لگا۔

''بہت تکلیف ہوگی تمہیں!'' اس نے اسے سینے سے لگا کر کہا۔

ساشا دھیرے سے مسکرائی اور ماں کے نزدیک اور کھسک آئی۔

اس وقت نکولائی تھکا ہارا کمرے میں داخل ہوا اور چیزیں رکھتے ہوئے تیزی سے کہنے لگا:

''ابھی وقت ہے ساشا تم یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ خفیہ کے دو آدمی صبح سے میرے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں، اس طرح کھلم کھلا کہ مجھے شبہ ہے کہ گرفتار کرنے والے ہیں۔ میرا شبہ کبھی غلط نہیں نکلتا، کوئی نہ کوئی بات ہوئی ضرور ہے۔ ارے ہاں یہ لو، یہ پاویل کی تقریر۔ اسے چھاپنے کا فیصلہ ہوا ہے۔ لدمیلا کے پاس لے جا کر کہو کہ جلد از جلد چھاپ دے۔ پاویل کی تقریر بہت اچھی تھی نلوونا!... ذرا خفیہ والوں کا خیال رکھنا ساشا...''

باتیں کرتے وقت وہ اپنے ٹھنڈے ہاتھوں کو مسلسل رگڑتا جا رہا تھا اور اس کے بعد میز کے پاس جا کر اس نے خانے میں سے کاغذات نکالنا شروع کئے۔ کچھ کاغذات پھاڑ ڈالے اور کچھ کو ایک طرف رکھ دیا۔ وہ تھکا تھکا اور پریشان معلوم ہو رہا تھا۔

''ان خانوں کو صاف کئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے، یہ نئی نئی چیزیں کم بخت نہ جانے کہاں سے آ جاتی ہیں! میرا خیال ہے نلوونا کہ تم بھی رات کو گھر پر مت رہو۔ کیا خیال ہے؟ ہے تلاشی کا تماشا بہت اکتا دینے والا ہوتا ہے! اور پھر ممکن ہے تمہیں بھی گرفتار کرلیں۔ تمہیں پاویل کی تقریر لے کر بہت جگہ جانا ہے...''

''مجھے گرفتار کر کے کیا کریں گے؟''

نکولائی نے اپنے آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے اعتماد سے کہا:

''میں ایسی چیزوں کو بہت جلدی بھانپ لیتا ہوں۔تم لدمیلا کی کافی مدد کر سکتی ہو۔خطرہ مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں...''

ماں کو اس تصور سے بہت خوشی ہوئی کہ اپنے بیٹے کی تقریر چھاپنے میں ہاتھ بنائے گی۔

''اگر یہ بات ہے تو۔ میں جانتی ہوں'' وہ بولی اور پھر خود ہی اپنی بات پر حیرت کرتے ہوئے اس نے کہا۔''خدا کا شکر ہے کہ اب میں کسی بات سے نہیں ڈرتی!''

''بہت خوب!'' نکولائی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔''لیکن بہتر ہوا گر تم مجھے یہ بتاتی جاؤ کہ میرا تھیلا اور قمیص، چادریں، غلاف وغیرہ کہاں ہیں؟ تم نے اپنی اس ہر چیز پر قبضہ جمانے کی عادت کی وجہ سے سب کچھ اپنے انتظام میں لے لیا ہے اور اب خود اپنی چیزیں بھی مجھے نہیں ملتیں!''

ساشا خاموشی سے کاغذوں کو چولہے میں جلا کر راکھ کو کوئلوں میں ملا رہی تھی۔

''جانے کا وقت ہو گیا ساشا'' نکولائی نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔''خدا حافظ اگر کوئی دلچسپ کتاب آجائے تو مجھے ضرور بھیج دینا۔خدا حافظ عزیز کامریڈ! ذرا احتیاط کرنا...''

''تمہارا خیال ہے کہ سزا لمبی ہوگی!'' ساشا نے سوال کیا۔

''کون جانے، شاید لمبی ہی ہو، میرے خلاف کافی مسالہ ہے۔نلوونا تم بھی ان ہی کے ساتھ چلی جاؤ نا! دو آدمیوں کا پیچھا کرنا کافی مشکل کام ہے۔''

''اچھی بات ہے'' ماں نے جواب دیا۔''میں ابھی کپڑے بدل لیتی ہوں۔''

نکولائی کو وہ بہت غور سے دیکھتی رہی لیکن صرف اتنا دیکھ سکی کہ اس کے معمولاً مشفق اور مہربان چہرے پر پریشانی کا ہلکا سا نشان ہے لیکن نہ اس کی چال ڈھال میں پریشانی تھی اور نہ اس پر کوئی ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ یہ شخص جو دوسروں کے مقابلے میں اسے زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ ہر شخص کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا تھا، ہمیشہ بڑی محبت سے پیش آتا تھا، ہمیشہ سکون کے ساتھ تنہا رہتا تھا، اور اب بھی وہ ہر شخص کے لئے وہی پرانا ساتھی تھا۔ایسی ہستی جس کی کوئی اپنی چھپی ہوئی داخلی زندگی تھی جو دوسری زندگیوں سے کہیں بہت دور تھی۔ ماں کو معلوم تھا کہ دوسروں کے مقابلے میں اس سے وہ زیادہ روحانی

قربت محسوس سے پیش آتی تھی جیسے خود اپنے اوپر یقین نہ ہو۔اس وقت اس کے لئے ماں کا جس طرح دل کڑھ رہا تھا وہ نا قابل برداشت تھالیکن وہ اس کا اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی کہیں نکولائی گھبرا کر پریشان نہ وہ کچھ مضحکہ خیز سا معلوم ہونے لگتا تھا اور ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مضحکہ خیز معلوم ہو۔

ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نکولائی ساشا کے ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا:

''بہت خوب۔ میرا خیال ہے اس کیلئے اور تمہارے لئے یہ بہت اچھا رہے گا۔تھوڑی سی شخصی خوشی سے کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔تم تیار ہو گئیں نلوونا؟''

مسکراتا، اپنا چشمہ ٹھیک کرتا وہ اس کے نزدیک آیا۔

''اچھا خدا حافظ۔تین یا چار مہینے کے لئے۔ میرا خیال ہے حد سے حد چھ مہینے کیلئے۔ چھ مہینے! زندگی کا کافی بڑا حصہ ہے۔ذرا اپنا خیال رکھنا۔سمجھیں؟ اچھا آؤ آخری بار گلے مل لیں...''

دبلے نازک سے نکولائی نے اس کے گلے میں اپنی مضبوط باہیں ڈال دیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگا۔

''تم سے مجھے کچھ عشق ہو گیا ہے شاید'' وہ ہنسا۔''اس طرح گلے سے لگا کر کھڑا ہوا ہوں...''

ماں نے کچھ کہے بغیر اس کے ماتھے اور رخساروں پر پیار کیا لیکن ہاتھ کانپ رہے تھے۔اس نے ہاتھ ہٹا لئے کہ کہیں نکولائی کی نظر نہ پڑ جائے۔

''دیکھو ذرا احتیاط کرنا! ایسا کرنا۔ کہ صبح کو ایک چھوٹے لڑکے کو ادھر بھیج دینا لدمیلا جانتی ہیا یک ایسے لڑکے کو۔ وہ آ کر یہاں کی خبر لے جائے گا۔اچھا، خدا حافظ ساتھیو! اب مجھے اطمینان ہے!...''

سڑک پر پہونچنے کے بعد ساشا نے دھیرے سے کہا:

''اگر یہ شخص کبھی مرنے بھی جائے گا تو بالکل اسی سادہ طریقے سے اور اس جلد بازی سے۔اور جب موت اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے گی تو اپنا چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے کہے گا 'بہت خوب!' اور مر جائے گا۔''

''مجھے اس سے بہت محبت ہو گئی ہے'' ماں نے دھیرے سے کہا۔

''اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے لیکن محبت نہیں آتی۔ میں بے انتہا عزت کرتی ہوں اس کی۔ بہت مفقفانہ انداز ہے اس کا اور کبھی کبھی تو وہ بہت نرم دلی کا ثبوت دیتا ہے۔لیکن کچھ خشک سا آدمی ہے۔

جتنی گرمی ہونی چاہیئے ایک انسان میں وہ نہیں ہے...ایسا لگتا ہے کہ ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔اب الگ الگ ہو جانا بہتر ہے۔اگر تمہیں خیال ہوا کہ تمہارا پیچھا کیا جا رہا ہے تو لدمیلا کے گھر مت جانا۔''

''ظاہر ہے'' ماں نے کہا لیکن ساشا اصرار کرتی گئی:

''وہاں مت جانا۔اس کے بجائے میرے یہاں چلی آنا۔خدا حافظ۔''

وہ تیزی سے مڑ گئی اور واپس اسی راستے پر چلی گئی۔

28

چند منٹ کے بعد ماں لدمیلا کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی چولھے سے آگے تاپ رہی تھی۔خود لدمیلا ایک سیاہ لباس پہنے، چمڑے کی پیٹی باندھے فرش پر ٹہل رہی تھی۔کمرے میں اس کے لباس کی سرسراہٹ اور تحکمانہ آواز گونج رہی تھی۔

چولہے سے آگ کے چٹخنے اور چنگھاڑنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔آگ ہوا کو نگل رہی تھی اور لدمیلا کی آواز ایک ہی انداز میں سنائی دے رہی تھی:

''لوگ اتنے برے اور ظالم نہیں ہیں جتنے احمق ہیں۔انہیں صرف وہی چیزیں نظر آتی ہیں جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہوں اور حاصل کی جا سکیں۔لیکن نزدیک کی ساری چیزیں گھٹیا ہیں۔صرف دور کی چیزیں اچھی ہیں۔سچ پوچھو تو اگر زندگی مختلف ہوتی۔اگر زندگی ذرا آسانی سے گزرتی اور لوگ زیادہ سمجھدار ہوتے۔تو ہر شخص زیادہ خوش اور زیادہ بہتر حالت میں ہوتا۔لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے تھوڑی مصیبت مول لینی پڑے گی۔''

دفعتاً وہ ماں لینی پڑے گی۔''

''میں زیادہ لوگوں سے مل نہیں پاتی اور اگر کوئی مجھ سے ملنے آ جاتا ہے تر میں تقریر بازی شروع کر دیتی ہوں'' اس نے معذرتی انداز میں کہا۔''تم مجھے پاگل سمجھتی ہوں گی؟''

''کیوں؟'' ماں نے کہا۔وہ یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ یہ عورت چھاپنے کا کام کہاں کرتی ہے۔لیکن اسے کوئی غیر معمولی چیز نظر نہیں آئی۔کمرے میں تین کھڑکیاں تھیں جو سڑک پر کھلتی تھیں، ایک تخت تھا، ایک کتابوں کی الماری، ایک میز، کچھ کرسیاں اور ایک پلنگ۔ایک کونے میں منہ ہاتھ دھونے کا انتظام تھا،

دوسرے میں چولھا تھا۔ دیواروں پر تصویریں لٹکی ہوئی تھیں، اور ان سب چیزوں پر ان کی مالکن کے سخت گیر جسم کا سرد سایہ پڑ رہا تھا۔ ماں نے یہ تو محسوس کر لیا کہ کہیں کوئی چیز چھپی ہوئی ہے لیکن یہ نہ سمجھ سکی کہ کہاں ہے۔ اس نے دروازوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس دروازے سے داخل ہوئی تھی جو گیلری میں کھلتا تھا۔ دوسرا دروازہ اونچا اور پتلا سا تھا، بالکل چولھے سے لگا ہوا۔

''میں کام سے آئی ہوں'' اس نے کچھ جھجکتے، جھینپتے ہوئے کہا کیونکہ لدمیلا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے معلوم ہے۔ لوگ کسی اور وجہ سے مجھ سے ملنے نہیں آتے...''

ماں کو لدمیلا کے لہجے میں کچھ عجیب سی بات محسوس ہوئی۔ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے پتلے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک خفیف سی پرچھائیں تھی۔ عینک کے پیچھے سے اس کی آنکھیں دھندلے پن سے چمک رہی تھیں۔ ماں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے پاویل کی تقریر بڑھا دی۔

''یہ لو۔ تم سے کہا گیا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے چھاپ دو۔''

پھر اس نے بتایا کہ نکولائی کی گرفتاری کا خطرہ ہے۔ لدمیلا نے خاموشی سے کاغذ اپنی پیٹی میں اڑس لیا اور بیٹھ گئی۔ اس کے عینک کے شیشوں پر آگ کا عکس دمکتا رہا اور اس کی گرم چمک اس کے ساکن و ساکت چہرے پر کھیلتی رہی۔

''مجھے گرفتار کرنے آئیں گے تو میں گولی مار دوں گی اس نے ماں کی باتیں سننے کے بعد آہستہ سے عزم کے ساتھ کہا۔'' زبردستی کے خلاف اپنے آپ کو بچانا میرا حق ہے۔ اور اگر یہ بات میں دوسروں سے کہتی رہتی ہوں تو مجھے بھی مقابلے کر کے دکھانا ہوگا۔''

آگ کی چمک اس کے چہرے پر سے دور ہو گئی اور چہرے پر ایک بار پھر سختی اور خود پسندی کے آثار نمایاں ہو گئے۔

''زندگی گزارنے کا یہ طریقہ ذرا بھی اچھا نہیں ہے'' ماں نے ہمدردی سے سوچا۔

لدمیلا بے دلی کے ساتھ پاویل کی تقریر پڑھنے لگی لیکن جیسے جیسے آگے پڑھتی گئی وہ کاغذ پر اور جھک گئی۔ اس کے بعد وہ بڑے شوق سے ایک صفحے کے بعد دوسرا صفحہ الٹتی گئی۔ آخر وہ اٹھ بیٹھی، کاندھوں کو

سیدھا کیا اور ماں کے نزدیک آئی۔

''بہت اچھی تقریر ہے'' وہ بولی۔

کچھ دیر تک وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

''میں تمہارے بیٹے کے متعلق بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اس سے کبھی نہیں ملی اور مجھے ایسی گفتگو پسند نہیں جس سے تکلیف ہوتی ہو، مجھے معلوم ہے کہ اپنی عزیز ترین ہستی جیل چلی جائے تو کیسا لگتا ہے لیکن۔ میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم خوش ہو کہ تمہارے ایسا بیٹا ہے؟''

''بہت!'' ماں نے کہا۔

''اور۔ ڈر نہیں لگتا؟''

''اب نہیں لگتا'' ماں نے پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

لدمیلا نے اپنے بالوں کو سہلایا اور کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ اس کے چہرے پر ایک ہلکا سا سایہ لہرا رہا تھا۔ شاید دبی ہوئی مسکراہٹ کا سایہ۔

''ٹائپ جلد ہی جما دوں گی۔ تم لیٹ جاؤ، دن میں تم نے کافی کام کیا۔ تھک گئی ہو گی۔ یہاں بستر پر لیٹ جاؤ۔ میں نہیں سوؤں گی اور شاید رات کو تم سے مدد لینے کے لئے جگا بھی دوں گی... لیٹنے کے بعد روشنی بجھا دینا۔''

چولھے میں دو لکڑیاں ڈالنے کے بعد وہ پتلے سے دروازے سے باہر چلی گئی اور دروازے کو سختی سے بند کر دیا۔ ماں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر کپڑے اتارتے ہوئے لدمیلا کے متعلق سوچتی رہی:

''کسی چیز پر غم کھا رہی ہے...''

تھکن سے ماں کو چکر آ رہا تھا۔ لیکن اس کی روح پرسکون تھی اور اسے ہر چیز ایک ایسی نرم اور لطیف روشنی سے چمکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی جو آہستہ آہستہ اس کی روح پر چھائی جا رہی تھی۔ وہ اس سکون سے واقف تھی۔ شدید جذباتی دباؤ کے بعد اسے ہمیشہ اس قسم کا سکون ملتا تھا۔ شروع میں اس کیفیت سے اسے کچھ پریشانی سی ہوتی تھی لیکن اب تو اس کی وجہ سے بس اس کی روح کچھ اور پھیل کر زیادہ لطیف احساسات سے مالا مال ہو جاتی تھی۔ روشنی بجھا کر وہ سرد بستر پر چڑھ گئی اور کمبل کے نیچے گھس کر جلد ہی غافل ہو گئی...

آنکھ کھلی تو کمرے میں سردی کی روشن صبح کی سرد وسفید روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ لدمیلا تخت پر ایک کتاب لئے لیٹی تھی۔ وہیں سے ماں کو دیکھ کر کچھ عجیب طریقے سے مسکرائی۔

''افوہ!'' ماں پریشان ہوکر بولی۔ ''میں بھی کیا چیز ہوں! کیا بہت دیر ہوگئی؟''

''آداب!'' لدمیلا نے جواب دیا۔ ''دس بجنے ہی والے ہیں۔ اٹھو تو ہم لوگ چائے پیئیں۔''

''مجھے جگا کیوں نہیں دیا؟''

''جگانے جا رہی تھی لیکن جب تمہارے نزدیک آئی تو تم خواب میں ایسے پیار سے مسکرا رہی تھیں کہ جگانے کو میرا دل نہ چاہا۔''

تیزی سے وہ تخت پر سے اٹھ گئی اور پلنگ کے نزدیک جا کر ماں کے اوپر جھک گئی۔ اس نوجوان عورت کی بےنور سی آنکھوں میں ماں کو ایسا تاثر نظر آیا جو اسے بہت عزیز تھا اور جس سے وہ خوب واقف تھی۔

''تمہیں جگانے کے خیال سے مجھے تکلیف ہوئی۔ شاید کوئی بڑا اچھا سا خواب دیکھ رہی تھیں...''

''کوئی خواب نہیں دیکھ رہی تھی۔''

''بہر حال مجھے تمہاری مسکراہٹ پسند آئی۔ اتنی پرسکون اور اچھی اور... ساری چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔'' لدمیلا ہنسی اور اس کی ہنسی میں مخمل کی سی نرمی تھی۔

''تمہاری مسکراہٹ دیکھ کر میں نے تمہارے متعلق سوچنا شروع کیا۔ تمہاری زندگی خاصی کٹھن ہے نا؟''

ماں کی بھویں پھڑکیں اور اس نے خاموشی سے سوچنا شروع کیا:

''کٹھن تو ظاہر ہے کہ ہوگی!'' لدمیلا بولی۔

''یقین سے نہیں کہہ سکتی'' ماں نے دھیرے سے کہا۔ ''کبھی کبھی بہت کٹھن معلوم ہوتی ہے لیکن بہت بھرپور بھی ہے۔ اور زندگی میں ہر چیز اتنی سنجیدہ اور اتنی حیرتناک ہے اور ایک کے بعد دوسری چیز اتنی تیزی سے آجاتی ہے کہ...''

جرأت کی جانی پہچانی لہر اس کے سینے میں پھر اٹھنے لگی اور اس کے ذہن میں مختلف خیالات اور شکلیں آنے لگیں۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

''زندگی بس گذرتی ہی جاتی ہے۔ایک ہی منزل کی طرف لیکن کبھی کبھی بڑی کٹھن ہو جاتی ہے۔ لوگ رکھ اٹھاتے ہیں، مار کھاتے ہیں، بے رحمی سے مارے جاتے ہیں اور مسرت کے دروازے ان پر بند کر دئے جاتے ہیں۔کتنی کٹھن ہوتی ہے زندگی!''

لدمیلا نے سر کو جھٹکا دے کر اس کی طرف دیکھا اور بولی:

''لیکن تم اپنے بارے میں تو کچھ بتا ہی نہیں رہی۔''

ماں نے بستر سے نیچے آ کر کپڑے بدلنے شروع کئے۔

''اپنی زندگی کو ایسے لوگوں سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے جن کے لئے دل میں جگہ ہو، جن سے محبت کی جائے۔ ہر شخص کے متعلق خوف محسوس ہوتا ہو، سب پر دل دکھے۔سارے کے سارے ہی تو دل میں بسے ہوئے ہیں...ان لوگوں کو اپنے آپ سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے؟''

کپڑے پہنتی ہوئی، خیالات میں گم وہ کچھ دیر تک کمرے کے وسط میں کھڑی رہی۔اسے ایسا محسوس ہوا کہ اب وہ پہلی سی عورت نہیں رہی تھی جسے بیٹے کے متعلق ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا، ہر وقت فکر لگی رہتی تھی کہ اس کی حفاظت کس طرح کی جائے۔اب اس عورت کا وجود تک نہ تھا۔وہ جا چکی تھی، کہیں بہت دور چلی گئی تھی یا شاید اپنے ہی جذبات کی آگ میں جل گئی تھی اور اس کی وجہ سے اس کی روح لطیف اور پاک صاف ہو گئی تھی۔اور اس میں ایک نئی شکتی آ گئی تھی۔وہ اپنے دل کو ٹٹولتی رہی، اس کی دھڑکنوں کو سنتی رہی اور ڈرتی رہی کہ وہی پرانے خوف کہیں پھر سے نہ جاگ پڑیں۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' لدمیلا نے اس کے نزدیک جا کر سوال کیا۔

''معلوم نہیں'' ماں نے جواب دیا۔

ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھ کر دونوں مسکرائیں۔پھر لدمیلا یہ کہتی ہوئی کمرے سے چلی گئی:

''پتہ نہیں میرے سماوار کا کیا حال ہے؟''

ماں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔دن سرد اور روشن تھا اور اس کے سینے میں بھی روشنی تھی اور گرمی بھی۔ وہ ہر چیز کے متعلق بات کرنا چاہتی تھی۔ان تمام چیزوں کی وجہ سے جو اس کی روح کی گہرائیوں میں داخل ہو گئی تھیں اور وہاں شفق کی سہانی روشنی میں چمک دمک رہی تھیں، وہ چاہتی تھی کہ کسی کے لئے اپنے مبہم سے جذبہ تشکر کا اظہار کرے، دیر تک مسرت اور زندہ دلی سے باتیں کرے۔دل میں دعا مانگنے کی خواہش آج

پھر پیدا ہوئی حالانکہ ایک عرصے سے اس نے دعا چھوڑ رکھی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک نوجوان سا چہرہ گھومنے لگا اور اس کے کانوں میں واضح آواز آئی۔ ''یہ پاویل ولاسوف کی ماں ہیں!...'' ساشا کی آنسوؤں سے لبریز، دمکتی ہوئی آنکھیں، ربین کا سیاہ جسم، اپنے بیٹے کا تمیایا ہوا مضبوط چہرہ، نکولائی کی پلک جھپکاتی ہوئی آنکھیں۔ یہ سب چیزیں اس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگیں اور پھر دفعتاً سب مل کر ایک قوس قزح کے رنگوں والے، شفاف بادل میں تبدیل ہوگئیں جو اس کے سارے خیالات پر چھا گیا اور اسے سکون وطمانیت کے احساس سے مالا مال کر دیا۔

''نکولائی نے ٹھیک ہی کہا تھا'' لدمیلا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''اسے گرفتار کر لیا گیا۔ تمہارے کہنے کے مطابق میں نے لڑکے کو بھیجا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ باہر احاطے میں پولیس والے تھے اور ایک پولیس والا دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا اور چاروں طرف خفیہ کے لوگ ہیں۔ لڑکا ان لوگوں کو پہچانتا ہے۔''

''اوہ'' ماں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بیچارہ...''

اس نے ٹھنڈا سانس لیا لیکن اس میں رنج کی آمیزش نہیں تھی اور اس بات پر وہ دل ہی دل میں حیرت کرنے لگی۔

''پچھلے دنوں وہ شہر میں مزدوروں کو پڑھانے لگا تھا، میرا خیال ہے ان حالات میں اسکی گرفتاری یقینی ہوگئی تھی'' لدمیلا نے متانت سے کہا لیکن اس کے ماتھے پر شکنیں پڑے ہوئی تھیں۔ ''ساتھیوں نے کہا بھی اب تم یہاں سے چلے جاؤ لیکن اس نے بات نہ مانی۔ میرا خیال ہے کہ ایسی حالت میں لوگوں کو سمجھا بجھا کے نہیں بلکہ زبردستی ہٹا دینا چاہیے۔''

اس وقت ایک لڑکا داخل ہوا۔ اس کے بال سیاہ، گال سرخ، آنکھیں خوبصورت اور نیلی، اور ناک ستواں تھی۔

''سماوار لے آؤں کیا؟'' اس نے سوال کیا۔

''اگر تکلیف نہ ہو سرگی'' ماں کی طرف مڑتے ہوئے اس نے کہا۔ ''یہ میری نگرانی میں ہے۔''

ماں کو ایسا محسوس ہوا کہ آج لدمیلا کچھ مختلف سی نظر آ رہی تھی، اس میں زیادہ سادگی اور اپنائیت تھی۔ اس کے جسم خوبصورت اور لطیف حرکات میں زیادہ دلکشی اور توانائی آ گئی تھی اور اس کی وجہ سے اس کا زرد،

سخت چہرہ کچھ نرم سا پڑ گیا تھا۔ رات نے اس کی آنکھوں کے حلقوں کو اور گہرا کر دیا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی روح میں شدت کا تناؤ ہے۔

لڑکا سماوار لے آیا۔

''تم سے تعارف نہیں ہوا سرگی۔ یہ پلا گیا نلوونا ہیں۔ کل جس مزدور ساتھی پر مقدمہ چلا تھا ان کی ماں۔''

سرگی نے کچھ کہے بغیر جھک کر ماں کو آداب کیا، ہاتھ ملایا اور کمرے سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ڈب روٹی لا کر میز پر بیٹھ گیا۔ چائے انڈیلتے وقت لدمیلا نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ابھی گھر جانا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ پولیس والے کسی کے انتظار میں ہیں۔

''ہوسکتا ہے کہ تمہارا انتظار کر رہے ہوں! غالباً جرح کرنے کے لئے تمہیں طلب کریں گے...''

''بلانے دو'' ماں نے جواب دیا۔ ''اور گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو کر لینے دو۔ کون بڑا نقصان ہو جائے گا۔ البتہ پہلے پاویل کی تقریر تقسیم ہو جاتی تو اچھا تھا!''

''میں نے ٹائپ تو جما دیا ہے۔ کل تک شہر اور مزدور بستی کیلئے کافی کاپیاں نکل آئیں گی... نتاشا کو جانتی ہو؟''

''ہاں، ہاں!''

''اس کو لے جا کر دے دینا۔''

لڑکا اس طرح اخبار پڑھ رہا تھا جیسے کچھ سن ہی نہ رہا ہو لیکن کبھی کبھی اخبار کے اوپر سے ماں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اور جب ماں سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں تو اسے بڑا اچھا معلوم ہوا اور وہ مسکرا دی۔ لدمیلا نے پھر نکولائی کی باتیں شروع کیں لیکن ان باتوں میں افسوس کا اظہار نہ تھا اور ماں کو اس میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی۔ آج وقت جلدی گذر رہا تھا۔ ان لوگوں نے ناشتہ ختم کیا تو تقریباً دوپہر ہو گئی تھی۔

''اوفوہ کس قدر وقت گذر گیا!'' لدمیلا بولی۔

اس وقت کسی نے تیزی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لڑکے نے کھڑے ہو کر لدمیلا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''دروازہ کھول دو سرگی۔ کون ہوسکتا ہے؟'' بہت اطمینان کے ساتھ اس نے فراک کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا اور ماں سے بولی:

''اگر پولیس والے ہوں تو تم اس کونے میں کھڑی ہو جانا پلاگیا نلوونا۔ اور سرگی تم...''

''مجھے معلوم ہے'' لڑکے نے جاتے ہوئے کہا۔ ماں مسکرائی۔ ان تیاریوں سے اب اسے کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ اس کے دل میں کسی آنے والے خطرے کا وسوسہ نہیں تھا۔

لیکن دروازے میں ڈاکٹر نظر آیا۔

''سب سے پہلے بات تو یہ'' اس نے تیزی سے کہا۔ ''کہ نکولائی گرفتار ہو گیا ہے۔ اچھا تو تم یہاں ہو نلوونا! گرفتاری کے وقت تم گھر پر نہیں تھیں؟''

''اس نے مجھے یہاں بھیج دیا تھا۔''

''ہونہہ۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں!... اور دوسرے یہ کہ کل رات کو چند نوجوانوں نے تقریر کی کوئی پانچ سو کاپیاں ہاتھ کی مشین سے نکالی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے۔ زیادہ بری نہیں ہیں۔ اچھی، صاف اور واضح ہیں۔ وہ لوگ آج رات کو شہر میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں اس کا مخالف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پریس میں چھپی ہوئی کاپیاں شہر میں تقسیم کی جائیں اور ان کو کسی دوسری جگہ کے لئے اٹھا رکھا جائے۔''

''میں انہیں نتاشا کے پاس لے جاتی ہوں!'' ماں نے اشتیاق سے کہا۔ ''لاؤ مجھے دو!''

اسے بڑی بے چینی تھی کہ اپنے پاویل کی تقریر جتنی جلد ممکن ہو سکے تقسیم کر دے، ساری دھرتی پر اپنے بیٹے کا پیغام پہنچا دے۔ اس نے ملتجی نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنا شروع کیا اور جواب کا انتظار مرنے لگی۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت تمہیں یہ کام اپنے سر لینا بھی چاہیئے یا نہیں، اس نے جیب سے گھڑی نکالتے ہوئے رک رک کر کہا۔ ''اس وقت گیارہ بج کر انتالیس منٹ آئے ہیں۔ دو بج کر پانچ پر ایک گاڑی جاتی ہے جو تمہیں سوا پانچ گھنٹے میں پہنچا دے گی، یعنی شام ہو جائے گی لیکن بہت زیادہ دیر کا وقت نہ ہوگا۔ لیکن اصل میں اہم بات یہ نہیں ہے....''

''اہم بات یہ نہیں ہے'' لدمیلا نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

''اہم بات کیا ہے؟'' ماں نے ان کے نزدیک آ کر سوال کیا۔ ''صرف یہ کہ کام اچھی طرح ہونا چاہیئے۔''

لدمیلا نے اسے متلاشی نظروں سے دیکھا اور ماتھا پونچھتے ہوئے بولی:

تمہارے لئے یہ کام خطرناک ہوگا...''

''کیوں؟'' ماں نے شدت سے اصراس کرتے ہوئے پوچھا۔

''وجہ ظاہر ہے!'' ڈاکٹر نے تیزی سے ٹوٹے جملوں میں کہا۔ ''نکولائی کی گرفتاری سے صرف ایک گھنٹہ پہلے تم گھر سے نکلی تھیں۔ وہاں سے تم کارخانے گئیں۔ جہاں تم استانی کی چچی کی حیثیت سے مشہور ہو۔ تھوڑی ہی دیر بعد کارخانے میں غیر قانونی پرچے نظر آئے۔ یہ سب باتیں مل کر تمہارے گلے کے لئے پھندا بن جائیں گی۔''

''وہاں مجھے کوئی بھی نہ دیکھ سکے گا'' ماں نے اصراف کیا۔ ''اگر واپسی میں گرفتار بھی کریں اور پوچھیں کہ کہاں گئی تھیں...''

وہ کچھ دیر ہچکچائی، لیکن پھر چیخ پڑی:

''جو کچھ کہنا ہے مجھے معلوم ہے! وہاں سے سیدھی مزدور بستی جاؤں گی۔ وہاں میرا ایک دوست ہے، سیزروف۔ کہہ دوں گی کہ عدالت سے سیدھے اس کے گھر گئی تھی۔ ذرا دل کو تسکین دینا تھا، اسے بھی تسکین کی ضرورت ہے۔ اس کے بھتیجے کو بھی سزا ہوگئی ہے۔ میں جو بھی کہوں گی وہ اس کی تائید کرے گا!''

اس یقین کے ساتھ کہ یہ لوگ بہر حال اس کی خواہش کو ضرور پورا کریں گے اور معاملہ کو جلدی سے پورا کرنے کے لئے وہ اصرار کرتی رہی۔ آخر وہ لوگ ہار مان گئے۔

''اچھا تو جاؤ!'' ڈاکٹر نے بادلِ ناخواستہ کہا۔

لدمیلا کچھ نہ بولی۔ صرف غور کرتی ہوئی فرش پر ٹہلتی رہی۔ اس کے شہرے پر تھکن اور کمزوری کے آثار تھے اور گردن کے تنے ہوئے پٹھوں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کتنی مشکل سے گردن کو اٹھائے ہوئے ہے۔ ماں نے یہ سب دیکھ لیا۔

''تم سب لوگ میری فکر کیا کرتے ہو'' وہ مسکرائی، ''لیکن اپنی فکر بالکل نہیں کرتے...''

''یہ صحیح نہیں ہے'' ڈاکٹر بولا۔ ''اپنی بھی فکر کرتے ہیں۔ فکر کرنی ہی پڑتی ہے اور ان لوگوں کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آنا پڑتا ہے جو بلا وجہ اپنی توانائی ضائع کرتے ہیں۔ اچھا تو، اسٹیشن پر تمہیں تقریر کی کاپیاں مل جائیں گی...''

اس نے سمجھایا کہ کاپیاں کس طرح دی جائیں گی۔ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا:

''اچھا جاؤ۔ میں تمہاری کامیابی کا متمنی ہوں!''

لیکن جاتے وقت اس کے چہرے پر کچھ خفگی کے آثار تھے۔ لدمیلا ماں کے نزدیک آئی۔

''تمہاری بات میں سمجھ سکتی ہوں'' اس نے آہستہ سے ہنس کر کہا۔

اس نے ماں کا بازو پکڑا اور ایک بار پھر ٹہلنے لگی۔

''میرا بھی ایک بیٹا ہے۔ تیرہ برس کا ہو گیا لیکن اپنے باپ کے پاس رہتا ہے۔ میرا شوہر نائب وکیل سرکار ہے اور بچہ ــــ اس کے ساتھ ہے۔ وہ کیا بنے گا؟ میں اکثر اس کے متعلق سوچتی ہوں...''

اس کی آواز بھرا گئی۔ ایک منٹ کے بعد اس نے آہستہ کچھ سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا۔

''ایسا شخص اسے پال پوس رہا ہے جو ان لوگوں کا جانا بوجھا دشمن ہے، جس سے میں محبت کرتی ہوں، جنہیں میں دنیا کے بہترین انسان سمجھتی ہوں۔ ممکن ہے میرا بیٹا بھی میرا دشمن ہو جائے۔ وہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میں ایک دوسرے نام سے رہ رہی ہوں۔ آٹھ برس سے اسے نہیں دیکھا۔ آٹھ برس کتنا لمبا عرصہ!''

وہ کھڑکی پاس جا کر رک گئی اور باہر دھندلے ویران آسمان کو دیکھنے لگی۔

''اگر میرے ساتھ رہتا تو مجھے تقویت ملتی۔ دل میں ہر وقت یہ ناسور تکلیف نہ دیتا... اگر مر جاتا تب بھی مجھے سکون ملتا...''

''آہ بے چاری!'' ماں نے سسکی لی۔ اس کا دل لدمیلا کے لئے رحم کے جذبے سے پھٹا جا رہا تھا۔

''تم خوش قسمت ہو! لدمیلا نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کتنا اچھا ہے۔ ماں اور بیٹا ایک ساتھ.... بہت کم ہوتا ہے ایسا!''

''ہاں بہت اچھا لگتا ہے، پلاگیا نے کہا اور خود ہی تعجب کرنے لگی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا جیسے کوئی راز کی بات کہہ رہی ہو، اور تم سب لوگ ــــ نکولائی اور ایوانووچ اور وہ تمام لوگ جو سچائی کی طرف جا رہے ہیں۔ تم سب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہو! دیکھتے دیکھتے ہی ہم سب لوگ ایک دوسرے کے عزیز اور پیارے ہو گئے اور میں تم سب لوگوں کو سمجھتی ہوں۔ میں الفاظ نہیں سمجھ پاتی لیکن اور ساری چیزیں سمجھ لیتی ہوں۔''

''ہاں بات یہی ہے، لدمیلا نے دھیرے سے کہا۔''بات تو یہی ہے۔''

ماں لدمیلا کی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر بہت ہی دھیمے لہجے میں باتیں کرتی گئی جیسے خود ہی اپنے الفاظ پر غور کر رہی ہے۔

''ہمارے بچے دھرتی پر قدم بڑھائے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ ہمارے بچے دھرتی پر قدم بڑھاتے جا رہے ہیں۔ ساری دھرتی پر۔ ہر طرف سے۔ ایک ہی منزل کی طرف۔ ان کے دل پاکیزہ ہیں، ان کے ذہن منور ہیں، اور وہ لوگ بدی کے خلاف قدم جمائے جھوٹ کو پیروں تلے روندتے آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ جوان ہیں، صحت مند ہیں، طاقت ور ہیں اور ساری قوت ایک ہی مقصد کے حصول میں صرف کر رہے ہیں۔ انصاف! وہ آگے بڑھتے جا رہے ہیں تا کہ انسانی دکھ پر فتح حاصل کر لیں۔ انہوں نے صفیں باندھ لی ہیں تا کہ تمام بدبختوں کو نیست و نابود کر دیں، بدصورتی کو دنیا سے ختم کر دیں۔ اور اس میں کس کو شک ہے کہ فتح ان ہی کی ہوگی! ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم ایک نئے آفتاب کو روشن کریں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور روشن کریں گے۔ وہ کہتے ہیں سارے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑیں گے۔ اور میں کہتی ہوں وہ یقیناً جوڑیں گے!''

بھولی دعاؤں کے الفاظ سے یاد آنے لگے اور اس نے ان میں ایک نیا اعتقاد بھر دیا۔ الفاظ اس کے دل سے چنگاریوں کی طرح نکل رہے تھے:

''ہمارے بچے صداقت اور عقل کے راستے پر چل رہے ہیں، انسانی دلوں کو محبت بخش رہے ہیں، زمین پر ایک نیا آسمان بنا رہے ہیں، دھرتی کو ایک نئی آگ دے رہے ہیں۔ روح کی ایک ایسی آگ جو کبھی نہیں بجھ سکتی۔ اس کے شعلوں سے ایک نئی زندگی جنم لے رہی ہے، ساری انسانیت کے لئے ہماری محبت اس زندگی کی تخلیق کر رہی ہے اور کون ہے جو ان شعلوں کو بجھا سکے؟ کون؟ وہ کون سی قوتیں ہیں جو انہیں ختم کر سکیں وہ کون سی قوتیں ہیں جو ان کی مخالفت کر سکیں؟ وہ زمین کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں اور خود زندگی ان کی فتح کی منتظر ہے۔ خود زندگی منتظر ہے!''

وہ خود اپنے جذبات سے مغلوب ہوگئی اور لدمیلا کے پاس سے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ گہرے سانس لینے لگی۔ لدمیلا بھی خاموشی کے ساتھ بڑی احتیاط سے وہاں سے ہٹ گئی جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی وجہ سے کوئی چیز درہم برہم نہ ہو جائے۔ وہ کمرے میں ٹہلتی رہی، بے نور سی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں اور ایسا

معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اور زیادہ لمبی، سیدھی اور نازک ہوگئی ہے۔ اس کے پتلے سے سخت چہرے پر شدید فکر کے آثار تھے اور اس کے ہونٹ جذباتی انداز میں بھنچے ہوئے تھے۔ کمرے کی خاموشی سے ماں کو کچھ تسکین ہوئی لدمیلا کی کیفیت کو دیکھ کر اس نے مجرمانہ انداز میں پوچھا:

''شاید میں ایسی بات کہہ گئی جو نہ کہنا چاہئے تھی؟...''

لدمیلا نے اس کی طرف مڑ کر اس طرح دیکھا جیسے ڈر گئی ہو۔ اس نے ماں کی طرف ہاتھ بڑھایا جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو اور پھر تیزی سے کہنے لگی:

''نہیں، نہیں۔ بالکل صحیح کہا، بالکل صحیح۔ لیکن اب اس کے متعلق ہم لوگ بات نہ کریں گے۔ تم نے جو کچھ کہہ دیا وہی کافی ہے'' اس نے زیادہ پرسکون آواز میں اتنا اور کہا۔ ''تم جلدی جاؤ۔ بہت دور جانا ہے۔''

''کاش تم سمجھ سکتیں کہ میں کتنی خوش ہوں! اپنے بیٹے کے الفاظ، اپنے گوشت پوست کے الفاظ تک لے جانا! جیسے دوسروں کو میں خود اپنی روح دے رہی ہوں!''

وہ مسکرائی۔ لیکن لدمیلا کے چہرے پر اس مسکراہٹ کا کوئی واضح جواب نہ ملا۔ ماں کو ایسا محسوس ہوا کہ اس عورت کے ضبط کی وجہ سے اس کی خوشی دب رہی ہے اور دفعتاً اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس سخت روح کے اندر اپنی ساری گرمی منتقل کر دی۔ اس عورت کے دل کو بھی خوشی سے بھرپور دل کی تمناؤں سے آشنا کرا دے۔ اس نے لدمیلا کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبائے اور بولی:

''میری پیاری! اس بات کا علم ہونا کتنا اچھا ہے کہ ایک روشنی ہے جو سب لوگوں کو راستہ دکھا رہی ہے اور وہ وقت آئے گا جب سب لوگ اس دیکھ سکیں گے اور تن، من، دھن کے ساتھ اس کے پیچھے چلیں گے!''

ماں کے بڑے سے شفیق چہرے پر ایک لرزش سی دوڑ گئی، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور آنکھوں کے اوپر بھویں اس طرح پھڑک رہی تھیں گویا آنکھوں کی چمک کو پر پرواز دعطا کر رہی تھیں۔ اپنے ان عظیم الشان خیالات سے وہ خود کچھ چکرا سی گئی جن میں اس نے اپنے سارے وجود کو بھر دیا تھا، اپنے سارے تلخ وشیریں تجربوں کو سمو دیا تھا۔ ان خیالات کے جوہر کو اس نے الفاظ کے سخت، چمکتے ہوئے بلور میں بھر دیا

اور یہ بلور کے ٹکڑے اس کے خزان رسیدہ دل کے اندر بڑھتے گئے اور بہار کے آفتاب کی تخلیق قوت سے چمک اٹھے، اوران کی دمک اوران کی آب وتاب تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

''ایسا لگتا ہے کہ انسانوں کے لئے ایک نیا خدا پیدا ہورہا ہے! ہر چیز سب کے لئے۔ سب ہر کے لئے! میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ صحیح معنوں میں ہم لوگ رفیق ہیں، ہماری روحیں ایک ہیں، سب ایک ہی ماں کی اولاد ہیں جس کا نام صداقت ہے!''

ایک بار پھر وہ جذبات سے مغلوب ہوگئی۔ خاموش ہوکر اس نے گہرا سانس لیا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر، جیسے کسی کی گردن میں باہیں ڈالنے والی ہو، بولی:

''اور جب میں یہ لفظ۔ کامریڈ۔ کہتی ہوں تو مجھے۔ ان کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ جیسے سب قدم ملا کر آگے بڑھتے۔ میرے دل کے اندر چلے آرہے ہیں!''

اس کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ لدمیلا کے چہرے پر ایک رنگ دوڑ گیا، اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور بڑے بڑے موتی جیسے آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔

ماں نے اسے اپنی باہوں میں لے لیا اور خاموشی سے مسکراتی ہوئی اپنے دل کی فتح پر مسرور ہوتی رہی۔

رخصت ہوتے وقت لدمیلا نے ماں کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولی:

''تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ رہنے سے کتنی خوشی ہوتی ہے؟''

ماں سڑک پر پہونچی تو یخ بستہ ہواؤں نے خیر مقدم کیا، اس کی ناک بالکل سرد ہوگئی اور تھوڑی دیر کیلئے تو سانس لینا مشکل ہوگیا۔ رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک کونے میں ایک گاڑی بان بالوں والی ٹوپی پہنے اپنی گاڑی میں بیٹھا تھا اور آگے ایک شخص جھکا ہوا چلا جا رہا تھا، اس کا سر جھک کر کاندھوں کے درمیان آ گیا تھا، اس سے بھی پرے ایک سپاہی کانوں کو سہلاتا چلا جا رہا تھا۔

''سپاہی کو کسی کام سے دکان تک بھیجا گیا ہوگا'' اس نے سوچا اور چلی کھڑی ہوئی۔ پیروں کے نیچے برف کی چرمراہٹ سے ایک خاص قسم کی خوشی محسوس ہورہی تھی۔ وہ اسٹیشن پر گاڑی کے وقت سے پہلے پہونچ گئی۔ لیکن گندے، غلیظ تھرڈ کلاس ویٹنگ روم میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ سردی کی وجہ سے لائن پر کام کرنے والے مزدور، کئی گاڑی بان، بہت سے گھرے لوگ اور چیتھڑے لگائے ہوئے انسان ویٹنگ

روم میں پناہ لینے کے لئے آ گئے تھے۔ وہاں مسافر بھی تھے۔ کچھ کسان، ایک موٹا سا تاجر جو کسی جانور کی کھال کا کوٹ پہنے ہوئے تھا، ایک پادری اور اسی کی چیچک رولڑکی، پانچ چھ سپاہی اور چند گھبرائے گھبرائے سے شہر کے رہنے والے۔ لوگ سگریٹ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ چائے اور وودکا کا دور بھی چل رہا تھا ریفرشمنٹ روم کے کاؤنٹر کے سامنے کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ دھویں کے بادل سر پر منڈلا رہے تھے، دروازہ کھلتا تو چرچراہٹ ہوتی اور کھڑکیوں کے شیشے کانپنے لگتے۔ کمرے میں تمباکو اور نمکین مچھلی کی بو بسی ہوئی تھی۔

ماں دروازے کے پاس بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔ دروازہ کھلتا تو سر سے پیر تک سرد ہوا کے تیز جھونک میں نہا جاتی۔ اسے اس میں مزہ آ رہا تھا اور ہر بار وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ زیادہ تر لوگ سامان لئے ہوئے اور گرم کپڑوں کے بوجھ سے لدے ہوئے دروازے میں داخل ہوتے تو کوئی نہ کوئی چیز سے لدے ہوئے دروازے میں داخل ہوتے تو کوئی نہ کوئی چیز پھنس جاتی، گالیاں دے کر یہ لوگ اپنا سامان فرش یا بنچ پر پھینک دیتے بڑبڑاتے ہوئے اپنی آستینوں، کالر اور ڈاڑھی، مونچھوں سے برف صاف کرتے جاتے۔

ایک نوجوان چمڑے کا سوٹ کیس لئے ہوئے اندر داخل ہوا اور ادھر ادھر دیکھ کر سیدھا ماں کے نزدیک پہنچ گیا۔

''ماسکو جا رہی ہو؟'' اس نے آہستہ سے سوال کیا۔

''ہاں۔ تانیا کے پاس'' اس نے جواب دیا۔

''یہاں۔''

اس نے سوٹ کیس ماں کے نزدیک بنچ پر رکھ دیا، سگریٹ سلگائی، آہستہ سے اپنا ہیٹ چھوا اور دوسرے دروازے سے نکل کر چلا گیا۔ ماں نے سوٹ کیس کے سرد چمڑے کو تھپتھپایا، اس پر کہنیاں رکھ کر جھکی اور لوگوں کو بڑے اطمینان سے دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر وہ ایک دوسری نشست کی طرف گئی جو باہر جانے والے دروازے کے زیادہ قریب تھی۔ اس وقت وہ سر اٹھا کر لوگوں کے پاس سے انہیں دیکھتی ہوئی گذر رہی تھی، ہاتھ میں سوٹ کیس جو زیادہ بھاری نہیں تھا، اطمینان سے لئے ہوئے تھی۔

ایک نوجوان سا شخص اونچا سا، کوٹ پہنے، کالر اٹھائے ہوئے اس سے ٹکرا گیا، پھر ایک طرف ہو کر

اپنا ہاتھ سر تک لے گیا۔ ماں کو محسوس ہوا کہ کوئی جانی پہچانی صورت ہے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو معلوم کہ وہ بھی اپنی زردسی آنکھوں سے اسے گھور رہا ہے۔ ان تیز نگاہوں نیا سے چاقوں کی طرف کچوکا دیا، جس ہاتھ میں سوٹ کیس تھا اس میں رعشہ سا ہوا اور دفعتاً بوجھ بھاری ہو گیا۔

''میں نے اس سے پہلے اسے کہیں دیکھا ہے'' ماں نے سوچا۔ اس ناخوشگوار سے احساس کو اس نے سینے کے اندر دبا دینے کی کوشش کی، کوئی خیال آہستہ آہستہ لیکن وہ اسے ٹالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن یہ احساس بڑھتا گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا تالو خشک ہو رہا ہے بے تحاشا جی چاہ رہا تھا کہ مڑ کر اس شخص کی طرف ایک بار پھر دیکھے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ وہیں کھڑا ہوا تھا۔ کبھی ایک پاؤں پر، کبھی دوسرے پر بوجھ ڈال کر وہ وہیں کھڑا رہا جیسے کچھ کرنا چاہتا ہو لیکن ابھی فیصلہ نہ کر پایا ہو کہ کرے یا نہ کرے سیدھا ہاتھ کوٹ کے بٹنوں کے درمیان تھا، بایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا جس کی وجہ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا سیدھا شانہ الٹے کے مقابلے میں اونچا ہے۔

وہ بنچ کے پاس جا کر آہستہ سے احتیاط کے ساتھ بیٹھ گئی جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی چیز اس کے اندر ٹوٹ جائے گی۔ شکوک اور شبہات کے درمیان سوچتی رہی کہ اس شخص کو کہاں دیکھا ہے اور آخر اسے دو مواقع یاد آئے جب اسے دیکھا تھا: ایک بار شہر کے کنارے کھلے میدان میں جب کہ ریبن فرار ہوا تھا دوسری بار مقدمے کے دوران میں۔ اس وقت وہ پولیس والا جسے اس نے ریبن کے تعاقب میں غلط راستے پر لگا دیا تھا اس شخص کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ بات بہت صاف تھی۔

پکڑی گئیں؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ایک لمحے بعد اس نے کانپ کر خود ہی جواب دیا:

''ممکن ہے ابھی نہ پکڑی جاؤں...'' لیکن فوراً ہی اس نے ہمت کر کے دل ہی دل میں کہا:

''پکڑی گئیں!''

اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ ذہن میں خیالات چنگاریوں کی طرح چمک چمک اٹھتے تھے:

''سوٹ کیس چھوڑ کر چلی جاؤں؟''

اس کی جگہ ایک زیادہ چمکدار چنگاری نے لے لی:

''کیا؟ اپنے بیٹے کی تقریر کو چھوڑ کر چلی جاؤں؟ ایسے ہاتھوں میں دیدوں؟''

اس نے سوٹ کیس کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''اسے لے کر چلی جاؤں؟... یہاں سے بھاگ جاؤں؟...''

''ایسے خیالات اس کے لئے نئے تھے جیسے کسی نے زبردستی اس کے ذہن میں ٹھونس دئے ہوں۔ یہ خیالات کسی آتشیں تاگے کی طرح اس کے دل ودماغ میں بخیہ سا کر کے انہیں جلانے لگے۔ اس تکلیف کی شدت نے اسے اپنے آپ سے، پاویل سے اور ان تمام چیزوں سے جو اسے بہت عزیز تھیں اور ہٹا دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی مخالف قوت اس کے کاندھوں اور سینے کو دبائے ڈال رہی ہے اور انتہائی خوف نے اسے دبوچ لیا۔ کنپٹیوں کی رگیں پھڑکنے لگیں اور بالوں کی جڑیں جلنے لگیں۔

دفعتاً اس نے ایک انتہائی کوشش کے ساتھ اپنے ان خیالات کو دور پھینک دیا۔ ان تمام گھٹیا، چھوٹی چھوٹی کمزور چنگاریوں کو بجھا ڈالا، روند ڈالا اور اپنے آپ سے بہت تحکمانہ لہجے میں کہا:

''تمہیں شرم آنی چاہئے!''

اسے فوراً ہی سکون سا محسوس ہوا۔ بلکہ ہمت بندھ گئی اور خود ہی بولی:

''اپنے بیٹے کی توہین مت کراؤ! پاویل اور اس کے دوست تو کبھی نہیں ڈرتے!''

اس کی آنکھیں کسی کی بے رونق، ڈرپوک سی نگاہوں سے لڑ گئیں۔ اس کے ذہن میں ریبن کا چہرہ کوند گیا۔ چند لمحاگ کی ہچکچاہٹ نے اب اس کو زیادہ مضبوط اور پرعزم بنا دیا اور دل کی دھڑکن معمول پر آ گئی۔

''اب ہوگا کیا؟'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

خفیہ کے آدمی نے اسٹیشن کے گارڈ کو بلا کر آنکھوں سے ماں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ گارڈ نے اس کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ دوسرا گارڈ آیا، اور اس کی باتیں سن کر اس نے تیوریاں چڑھائیں۔ یہ گارڈ بوڑھا تھا۔ لمبا، سفید بال، ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ اس نے خفیہ کے آدمی کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور اس بنچ کی طرف چلا جس پر ماں بیٹھی تھی۔ خفیہ کا آدمی غائب گیا۔

گارڈ آہستہ آہستہ آ رہا تھا اور ماں کے چہرے ک وناپسندیدگی کے ساتھ دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ بنچ پر سکڑ

کر بیٹھ گئی۔

''اگر مجھے ماریں نہ تب بھی غنیمت ہے...''اس نے سوچا۔

وہ اس سامنے آ کر رک گیا۔ایک منٹ خاموش رہ کر دفعتاً سختی سے بولا:

''کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو؟''

''کسی چیز کا نہیں۔''

''اچھا یہ بات ہے، چور کہیں کی! اس عمر میں یہ حرکتیں!''

اس کے الفاظ ماں کے منہ پر تھپڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ایک دو! اس کے لہجے کی ناشائستہ کمینگی اتنی تکلیف دہ تھی گویا اس نے ماں کا گال نوچ ڈالا ہو، اس کی آنکھیں نکال لی ہوں۔

''میں؟ میں چور نہیں ہوں! تم جھوٹ بول رہے ہو!'' وہ زور سے چلائی۔اسے چاروں طرف ہر چیز اس کے غصے کے طوفان، اس کی توہین کی تلخی سے گھوم سی گئی۔اس نے سوٹ کیس کو ایک جھٹکا دے کر کھول دیا۔

''یہ لو دیکھو! دیکھو، سب لوگ دیکھو!'' اس نے چیخ کر کہا۔ پھر اچھل کر کھڑی ہو گئی اور چند پرچے ہوا میں بکھیر دئے۔اس کے کان بج رہے تھے لیکن وہ لوگوں کی آوازیں سن سکتی تھی جو ہر طرف سے دوڑ کر اس کے نزدیک آ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟''

''وہاں دیکھو۔خفیہ کا آدمی...''

''بات کیا ہے؟''

''ان کا کہنا ہے کہ یہ چور ہے...''

''ایسی شریف خاتون؟ چہ چہ...''

''میں چور نہیں ہوں!'' ماں نے زور سے چیخ کر کہا۔لوگوں کو اپنے چاروں طرف دیکھ کر اس کی کچھ ڈھارس بندھ گئی تھی۔

''کل سیاسی قیدیوں کا مقدمہ تھا اور ان میں میرا بیٹا ولاسوف بھی تھا۔وہاں اس نے تقریر کی تھی۔یہ دیکھو! میں اسے لوگوں تک لے جا رہی ہوں تا کہ وہ لوگ پڑھیں اور صداقت کو سمجھیں...''

کسی نے بڑے احتیاط سے ایک پرچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ماں نے پرچے لوگوں کے سروں کے اوپر ہوا میں بکھیر دئے۔

''تمہاری مرمت کر دیں گے یہ لوگ!'' کوئی ڈر کر چیخا۔

ماں نے دیکھا کہ لوگ پرچے لے کر جلدی جلدی اپنے کوٹوں کے اندر اور جیبوں میں رکھتے جا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ماں ایک بار پھر ثابت قدمی سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے اور زیادہ پرسکون اور پرزور طریقے سے بولنا شروع کر دیا۔ اس احساس تھا کہ اس کے دل میں فخر اور خوشی کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ تقریر کرتے ہوئے وہ سوٹ کیس سے پرچے نکال کر ادھر ادھر تقسیم کر رہی تھی، ان ہاتھوں میں دے رہی تھی جو بڑی بے تابی سے انہیں حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میرے بیٹے اور دوسرے لوگوں پر مقدمہ کیوں چلایا گیا؟ میں بتاتی ہوں اور تم ایک ماں کے دل پر اور اس کے سفید بالوں پر یقین کر سکتے ہو۔ ان لوگوں پر مقدمہ صرف اس لئے چلا گیا کہ وہ سب لوگوں کو صداقت سے آگاہ کر رہے تھے! اور مجھے کل معلوم ہوا کہ صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کوئی نہیں!''

مجمع بڑھ گیا۔ ہر شخص خاموش تھا۔ اس عورت کے چاروں طرف انسانوں کا ایک حلقہ بن گیا۔

''مفلسی، بھوک اور بیماری۔ لوگوں کو محنت کا یہی صلہ تو ملتا ہے! ہر چیز ہمارے خلاف ہے۔ ساری زندگی، دن رات خون پسینہ ایک کر کے کام کرتے ہیں، ہمیشہ گندگی میں رہتے ہیں، ہمیشہ بے وقوف بنائے جاتے ہیں، ہمیں ایسا رکھا جاتا ہے جیسے کتے کو زنجیر سے باندھ کر رکھتے ہیں۔ اور ہم کسی چیز سے واقف نہیں! ہم ڈرتے ہیں۔ ہر چیز سے ڈرتے ہیں! ہماری زندگی کیا ایک طویل تاریک رات ہے!''

''بالکل صحیح''، کسی نے آہستہ سے کہا۔

''بند کرو اس کا منہ!''

ماں نے دیکھا کہ مجمع کے پیچھے خفیہ کا آدمی دو سپاہیوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہے اور اس نے آخری پرچے بھی تیزی سے تقسیم کرنے شروع کر دئے۔ لیکن جب اس نے سوٹ کیس میں ہاتھ ڈالا تو کسی اور کے ہاتھ پر ہاتھ پڑا۔

''لے جاؤ، لے جاؤ'' اس نے جھک کر کہا۔

''منتشر ہو جاؤ!'' پولیس والوں نے لوگوں کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔لوگ با دل ناخواستہ ہٹنے لگے لیکن شاید غیر ارادی طور پر ان کو دھکے سے دینے لگے جس کی وجہ وہ لوگ آگے نہ بڑھنے پا رہے تھے۔لوگ ایک عجیب کشش کے تحت اس عورت کی طرف کھینچتے چلے آ رہے تھے جس کے بال سفید تھے اور جس کے محبت بھرے چہرے پر بڑی بڑی، سادگی سے لبریز بے لوث آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ زندگی مین ایک دوسرے سے الگ، ایک دوسرے سے دور رہتے تھے لیکن اس وقت ان سب لوگوں نے یہاں اپنے کو یکجا پایا اور وہ بہت گہرے جذبات کے ساتھ ان شعلہ فشان الفاظ کو سن رہے تھے، اور شاید ان میں سے بہت سے دل، جو زندگی کی ناانصافیوں کے زخم کھائے ہوئے تھے، مدت سے ان ہی الفاظ کی تلاش میں تھے۔ جو لوگ ماں کے نزدیک تھے وہ خاموش تھے ان کی پرشوق نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور ماں ان کے گرم سانسوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر سکتی تھی۔

''اب یہاں سے چلو خاتون!''

''ایک منٹ میں تم کو پکڑ لے جائیں گے!''

''کتنی ہمت کی عورت ہے!''

''ہٹو یہاں سے! مجمع منتشر کرو!'' پولیس والوں نے اور نزدیک آ کر چیختے ہوئے کہا۔ ماں کے نزدیک لوگ کچھ ہلے اور انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے۔

اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ لوگ سمجھنے کے لئے اور اس پر یقین کرنے کے لئے آمادہ ہیں اور وہ چاہتی تھی کہ وہ جو کچھ بھی جانتی ہے، جن خیالات کی قوت کا اسے تجربہ ہو چکا ہے، وہ سب ان لوگوں کو جلدی سے بتا دے۔ خیالات اس کے دل کی گہرائیوں سے آسانی کے ساتھ نکل کر گیت میں تبدیل ہو رہے تھے لیکن اسے یہ محسوس کر کے تکلیف ہوئی کہ وہ گانے کے قابل نہیں ہے۔ اس کی آواز پھٹی اور بے سری تھی۔

''میرے بیٹے کے الفاظ ایک ایماندار مزدور کے الفاظ ہیں جس نے اپنی روح کو نہیں بیچا ہے، کتنے سچے الفاظ ہیں یہ۔ الفاظ کی جرأت اور بے باکی سے ان کی ایمانداری اور خلوص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے!''

دو نوجوان چمکتی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں، ان میں خوف بھی تھا اور مسرت بھی۔

کسی نے اس کے سینے پر مارا اور وہ بنچ پر گر پڑی۔ پولیس والوں کے ہاتھ لوگوں کے سروں پر لہرا رہے تھے۔ کسی کا گریبان پکڑا، کسی کا شانہ، کچھ کو ادھر گرایا، کچھ کی ٹوپیاں چھین کر کونے میں پھینک دیں۔

ماں کی آنکھوں کے آگے ہر چیز تاریک ہوگئی اور چکرانے لگی۔ لیکن اس نے تکلیف پر قابو پا کر رہی سہی قوت سے چلا کر کہا:

''لوگو متحد ہو کر ایک مضبوط قوت بن جاؤ!''

ایک پولیس والے نے اپنے بڑے موٹے سے ہاتھ سے گریبان پکڑ کر اسے جھٹکے دئے۔

''خاموش!''

اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کیلئے اس کے دل پر خوف کا تند دھواں چھا گیا لیکن جرأت اور بے جگری کا شعلہ ایک بار پھر آب و تاب سے چمکا اور اس نے دھوئیں کو نکال باہر کیا۔

''ہٹ جاؤ یہاں سے!'' پولیس والے نے کہا۔

''کسی چیز سے ڈرنے کی ضرورت نہیں! تمہاری زندگی سے زیادہ تلخ اور کیا چیز ہوگی!...''

''میں کہتا ہوں زبان بند کر!''

پولیس والے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا۔ دوسرے پولیس والے نے دوسرا ہاتھ پکڑا اور دونوں اسے پکڑ کر لے چلے۔

''...وہ تلخی جو روزانہ تمہارے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کئے ڈالتی ہے، تمہارے سینے کو چھلنی دے رہی ہے!''

خفیہ کا آدمی اس کے آگے گھونسہ دکھاتا چیختا چلا جا رہا تھا:

''چپ رہ کتیا!''

اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ جبڑے ایک دوسرے پر جم گئے۔ چکنے پتھروں کے فرش پر مشکل سے پیروں کو جماتے ہوئے اس نے چیخ کر کہا:

''یہ لوگ میرے روح کو۔ میری زندہ روح کو قتل نہیں کر سکتے!''

''کتیا کہیں کی!''

خفیہ کے آدمی نے منہ پر طمانچہ مارا۔

''بالکل ٹھیک۔ بوڑھی چڑیل کی یہی سزا ہے!'' کسی نے کمینگی سے چلا کر کہا۔

ایک لمحے کے لئے ماں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور منہ میں اس نے خون کا نمکین مزا

محسوس کیا۔

تیز تیز جملے سن کر اسے کچھ ہوش آیا:

''خبردار جو اسے مارا!''

''ادھر آؤ دوستو!''

''بدمعاش کہیں کے!''

''اسے مزا چکھا دو!''

''یہ ہمارے ذہنوں کو خون آلودہ نہیں کر سکتے!''

پولیس والے اسے پیچھے سے گردن پکڑ کر دھکے دے رہے تھے، اس کے شانوں اور سر پر مار رہے تھے۔ اسے چیخ پکار، سیٹیوں کی آواز کے طوفان میں ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کوئی بھاری بھرکم سی چیز اس کے کان پر پڑی، اس کے گلے پر پڑی۔ اس کے دم گھٹنے لگا، پیر سن ہو گئے، گھٹنے کانپنے لگے، درد کی شدت سے جسم میں نشتر سے چبھ رہے تھے، جسم بھاری ہو کر بے بسی سے جھکولے کھانے لگا۔ لیکن اس کی آنکھوں کی چمک ختم نہیں ہوئی۔ اور اس نے یہ آنکھیں دوسری آنکھوں سے ملیں، سبکی سب اسی روشن، تیز اور بے باک آگ سے چمک رہی تھیں جس سے وہ خوب واقف ہو چکی تھی، جو اسے بہت عزیز تھی۔

اسے دھکا دے کر ایک دروازے کے اندر لے جایا جانے لگا۔

ایک ہاتھ چھڑا کر اس ن ے دروازے کا ایک پٹ پکڑ لیا۔

''خون کا ساگر بھی صداقت کو نہیں ڈبو سکتا!''

اس کے ہاتھ پر پھر کسی نے زور سے مارا۔

''بے وقوفو! اس سے نفرت میں اضافہ ہوگا! یہ سب کچھ تمہارے سروں پر گرنے والا ہے!''

ایک پولیس والے نے اس کی گردن پکڑ کر گلا گھونٹنا شروع کیا۔

''کمبختو...'' وہ دم گھٹنے کی وجہ سے ہانپنے لگی۔

کسی نے زور سے سسکیاں لے کر اس کا جواب دیا۔